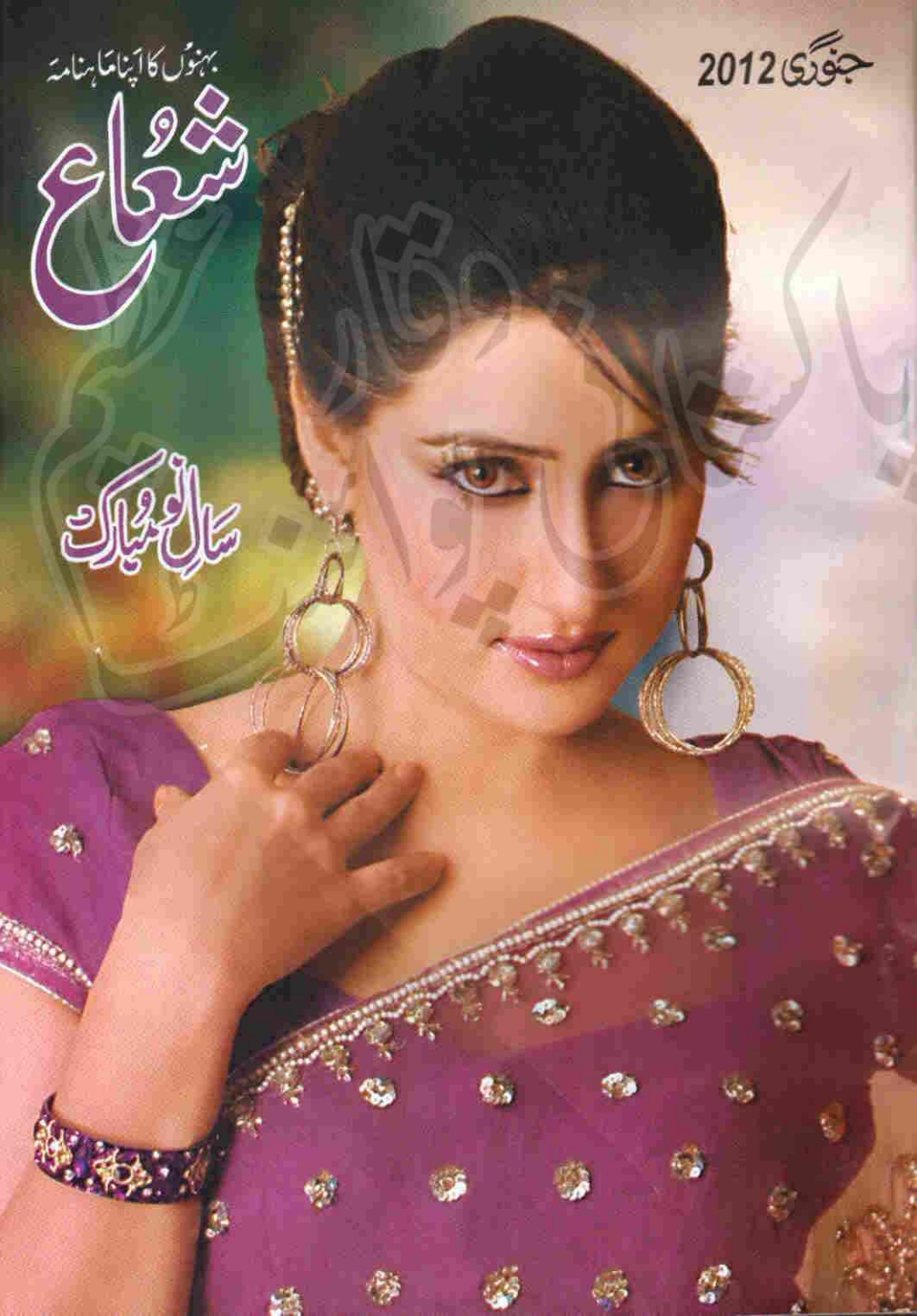


جنوری 2012

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

سالِ نیاک





- خطاب کے  
مُسکراہٹیں  
ایٹینہ خاتون  
یا لوں سے خوشنویس  
یا رخ کے چھوکنے
- رضیہ جمیل 274  
سائزہ غلام نبی 271  
تبصیر نشاط 284  
شگفتہ جاہ 263  
امت الصبور 287
- موسم کے پیکوان  
خو بصورت بنے  
جوڑی 2012  
جلد 26 شمارہ 5  
قیمت 50 روپے
- 281 خالدہ جیلانی  
289 ادارہ

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل خاتون حسن پرورشنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقارنہ: ۲۰۱۲ ایڈیٹری سی ایچ این سوانی کراچی  
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872  
Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com



- 192 سائزہ عارف 'صبح کا ستارہ'  
212 نعیمہ ناز 'پرچھائیں'  
78 سیرا گل 'زرد فرشتے'



- 60 صبا نور 'کوئی تیرا کہہ'  
256 راشدہ رفعت 'دو چہرے'  
137 عنیقہ مجید 'دلوان'  
67 ملیح صدیقی 'شکایت گان'  
72 حیات باری 'رب کی مرضی'



- 261 انشاجی 'غزل'  
262 علی زریون 'غزل'  
262 حسن عباسی 'غزل'



انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ ڈرامائی ٹھیکیں اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی نسل میں لائی جاسکتی ہے۔

- 10 رضیہ جمیل 'پہلی شمع'  
11 مولانا حسن رضا خان 'محمد نعت'  
11 غفار باہر 'نئی کی باتیں'  
12 ادارہ



- 17 آغا شیراز 'بندھن'  
22 شاہین رشید 'دستک'  
267 باقوماہی قادری 'مشاعری'  
27 ادارہ 'کیا ہوا ہے سال بھر'



- 36 عالیہ بخاری 'دلوار شرب'  
242 آرمہ ریاض 'ستارہ شام'



- 102 نریت شہزادہ 'جس راہ چلے'  
144 جوش افتخار 'ضبط عشق'



شعاع کا جنوری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔  
نئے سال کا پہلا شمارہ۔

دن بہتوں میں، ہفتے ہفتوں میں بدلے اور پھر سالوں کی مسافت طے کر کے تاریخ کا حصہ بننے جا رہے ہیں۔ تاریخ جس میں قوموں کے عروج و زوال کی بے شمار داستانیں رقم ہیں۔ ان قوموں کے نقشے جنہوں نے مملاتی احکام سے روگردانی کی اور عبرت کا نشان بن گئیں۔ وہ حکمران جنہوں نے اپنے عیش و نشاط کے لیے چند سکون کے عوض اپنی ہی قوم کی آزادی کا سودا کیا اور اپنی نسلوں کو صدیوں تک کے لیے غلامی کا طوق پہنا دیا۔ وہ قومیں جو آپس کے جھگڑوں میں اُلجھی دشمنی کے قدیوں کی چاپ زن بن سکیں اور زمانے میں عبرت کا نشان بن گئیں۔

تاریخ کے یہ اسباق ہمارے حال کی کہانی سنارہے ہیں اور شاید؛ گزرے سال پر نظر آئیں تو دیکھ، اہم اور اُسو ہی نظر آتے ہیں۔ ایک طرف قدرتی آفات ہیں۔ سندھ میں بارش کے پتھروں، بڑے والی تباہی سے آج بھی لاکھوں افراد بے گھر و بے سر و سامان ہیں۔ دوسری طرف قومی اداروں کی زبوں حالی ہے جس سے لاکھوں افراد کا روزگار و البستہ ہے۔ بہت کچھ ہاتھ سے نکل چکا ہے لیکن ابھی بہت کچھ باقی ہے جسے بچایا جاسکتا ہے۔ وقت کسی کے لیے دُکٹا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کامل یقین، نیک نیتی اور دیانت داری سے کوشش کی جائے تو ہم حالات کے اس گرواب سے نکل سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نیا سال آپ کے لیے ہمارے لیے، ہمارے ہمارے ملک کے لیے اور تمام اُمتِ مسلمہ کے لیے امن، سلامتی اور خوشحالی لے کر آئے۔ آمین۔

### اس شمارے میں،

- نہایت شہانہ جہد کا مکمل ناول۔ جس راہ پر چلے،
- مہوش انتظار کا مکمل ناول۔ ضبطِ عشق،
- نغمہ ناز اور سیراگل کے ناولٹ،
- ساثرہ عارف کے ناولٹ "میری صبح کا ستارہ"، کی آخری قسط،
- عالیہ بخاری اور امین ریاض کے ناول،
- راشدہ رفعت، صبا نور، عتیقہ محمد ریگ، ملیحہ صدیقی اور حیات بخاری کے افسانے،
- آغا شیراز اور شب آغا کا "بندھن"،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ دستک،

• شاعری کا مجموعہ ہے، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔ شعاع کو خوب سے خوب تر نزلنے کے لیے ہم ہر کھڑی کوشاں رہتے ہیں۔ اس کوشش میں آپ کی تنقید و توفیق ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے سے روانہ کیے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

ہے پاکِ رتبہ فکر سے اُس بے نیاز کا  
کچھ دخل عقل کا ہے نہ کام امتیاز کا  
شہ رگ سے کیوں وصال ہے آنکھوں کیوں چھا  
کیا کام اس جگہ خرد ہرزہ تاز کا  
سب بند اور دل میں وہ جلوے بھرے ہوئے  
اللہ سے جگر ترے آگاہِ راز کا !!  
حُش آگیا کلیم سے مشتاقِ دید کو  
جلوہ بھی بے نیاز ہے اُس بے نیاز کا  
افلاک و ارض سب ترے فرماں پذیر ہیں  
حاکم ہے تو جہاں کے نشیب و فراز کا  
اس بے کسی میں دل کو مرے ٹیک لگ گئی  
شہرہ سنا جو رحمتِ بے کس نواز کا  
مانندِ شمع تیسری طرف لو لگی رہے  
دے لطفِ میری جاں کو سوز و گداز کا  
تو بے حساب بخش کہ ہیں بے شمار جُرم  
دیتا ہوں واسطہ تجھے شاہِ حجاز کا  
بندے پر تیرے نفسِ لعین ہو گیا محیط  
اللہ کہ علاجِ مریِ حصوصِ واز کا  
کیوں کہ نہ میرے کام بنیں غیب سے حسن  
بندہ بھی ہوں تو کیسے بڑے کار ساز کا

مولانا حسن رضا خان

میں نے اس ذات پر نکلنے کی جسارت کی ہے  
جس کے دامن پر فرشتوں نے عبادت کی ہے  
جس نے ہم خاک نشینوں کو فلکِ بوس کیا  
جس نے یونوں کو عطا خلعتِ قامت کی ہے  
کس کی جرأت میرے آقا کے برابر آئے؟  
میرے آقا نے تو نبیوں کی امامت کی ہے  
زخم کھاکر بھی جو پھولوں کی ردائیں بخشے  
میرے آقا نے تو کانٹوں سے محبت کی ہے  
اللہ اللہ وہ کیا لوگ تھے جن لوگوں نے  
چلتے پھرتے میرے آقا کی زیارت کی ہے  
اُن پر سوچوں تو مدینہ نظر آتا ہے مجھے  
طے جو لمحات میں برسوں کی مسافت کی ہے  
میں کہ اک ذرہ ناچیز ہوں خورشیدِ کلفت  
مجھ پر اُس ذاتِ گرامی نے عنایت کی ہے  
میرے مولا کی رضا ہے میرے آقا کی رضا  
میرے آقا نے تو بابر وہ ریاضت کی ہے  
آسمانوں پر زمینوں پر حکومت کی ہے  
جس نے بابر میرے آقا کی اطاعت کی ہے

غفار مکیا



## باب : ۲ - وصیت کی ترغیب

۳۴۹۹ - حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے رسول اللہؐ نے فرمایا۔

”مسلمانوں کا یہ حق نہیں کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی چیز موجود ہو جس کے بارے میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو وہ وراثت میں بھی اس حال میں گزارے کہ اس کی وصیت اس کے بارے میں لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔“

فوائد و مسائل : وصیت ایسی چیز ہے کہ اس کا فائدہ اور ثواب مرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے جب وصیت پر عمل کیا جاتا ہے انسان کو اپنی موت کے وقت کا غم نہیں ممکن ہے بندے کو اس حال میں موت آجائے کہ اسے وصیت کرنے کا موقع نہ ملے اس لیے بستر ہے کہ وصیت ہر وقت تیار رکھی جائے پہلے سے وصیت لکھ رکھنے کا یہ بھی فائدہ ہے کہ انسان اس میں حسب خواہش تبدیلی کر سکتا ہے قرض اور امانت وغیرہ کی تفصیل ہمیشہ لکھ کر رکھنی چاہیے۔

۳۵۰۰ - حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”محروم وہ ہے جو اپنی وصیت کرنے سے محروم رہا۔“

فائدہ : مذکورہ روایت اکثر محققین کے نزدیک ضعیف ہے حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص وصیت کیے بغیر فوت ہو گیا وہ ان فوائد سے محروم ہو گیا جو اسے وصیت سے حاصل ہو سکتے تھے مثلاً صدقہ کرنے کی وصیت کرنا تو اسے بعد میں اس کا ثواب ملتا قرض کی ادائیگی کی وصیت کرنا تو وارث اس

کا قرض ادا کر دیتے اور وہ بری الذمہ ہو جاتا۔ فوت ہونے کے بعد اس کو تہائی کی تلافی ناممکن ہے اس لیے ایسا شخص بہت سی خیر سے محروم رہ گیا۔

۳۵۰۱ - حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جو شخص

وصیت کر کے فوت ہوا وہ سیدھی راہ پر اور سنت طریقے پر (عمل کرتا ہوا) فوت ہوا۔ وہ تقویٰ اور شہادت کی موت مرا اور اس حال میں مرا کہ اس کی بخشش ہو چکی تھی۔“

### جائز وارث کو حصہ نہ دینا

۳۵۰۲ - حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص اپنے وارث کو ترک کر دینے سے بھاگے گا (ایسی وصیت کرے گا جس سے جائز وارث کو حصہ نہ ملے یا اس کے اصل حصے سے کم ملے) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس کی جنت کی میراث سے محروم فرما دے گا۔“

### وصیت میں ناانصافی

۳۵۰۳ - حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اُدی ستر سال تک نیک لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے پھر جب (مرے وقت) وصیت کرتا ہے تو وصیت میں ناانصافی کرتا ہے اس طرح اس کا انجام برے کام پر ہوتا ہے چنانچہ وہ جہنم میں چلا جاتا ہے اور ایک اُدی ستر سال تک برے لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے پھر (مرے وقت) وصیت میں انصاف سے کام لیتا ہے تو

اس طرح اس کا انجام نیک کام پر ہوتا ہے چنانچہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔“

### صحیح وصیت کا اجر

۳۵۰۵ - حضرت معاویہ بن قرقہ اپنے والد (حضرت قرقہ بن ایاس بن بلال مزینیؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جس کی وفات کا وقت آیا تو اس نے وصیت کی اور اس کی وصیت اللہ کی کتاب کے مطابق تھی اس کا یہ عمل اس کی زندگی میں ترک شدہ نیکو کاروں کا ثواب بن جائے گا۔“

## باب : ۳ - زندگی میں نیک اور مرتے

### وقت فضول خرچی کی ممانعت

۳۵۰۶ - حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

”ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

”اللہ کے رسول! مجھے بتائیے کہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ہاں قسم ہے تیرے باپ (کے رب) کی! تجھے ضرورتاً تو اس کا پیروی کرنے والے حسن سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔“

اس نے کہا۔ ”پھر کون؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”پھر تیری ماں۔“

اس نے کہا۔ ”پھر کون؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”پھر تیری ماں۔“

اس نے کہا۔ ”پھر کون؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تیرا باپ۔“

مجھے میرے مال کے بارے میں بتائیے کہ میں اس میں سے کس طرح صدقہ کروں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”ہاں قسم ہے اللہ کی! تجھے ضرورتاً تو اس کا یہ (وہ اس طرح ہے کہ) تو اس وقت صدقہ کرے جب تو تندرست ہو اور مال سے محبت رکھتا ہو تجھے زندہ رہنے کی امید ہو اور فقر کا اندیشہ ہو۔ (یہ صدقہ کا صحیح وقت ہے) اور تو خرچہ کرنا چاہے کہ جب تیری جان بھال (حلق تک) پہنچ جائے پھر تو کہے میرا مال فلاں کو دے دینا میرا مال فلاں کو بھی دے دینا۔ وہ تو ان ہی کا ہو چکا اگرچہ تجھے یہ (حقیقت) ناگوار محسوس ہو۔“

فوائد و مسائل : اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے قسم کھانا جائز ہے جواب دینے سے پہلے تمہید کے طور پر کوئی بات کہنے سے مسائل جواب کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے جیسے آپ کا یہ فرمانا ”میں تجھے ضرورتاً تو اس کا یہ“

قسم صرف اللہ کی ذات کی کھانا جائز ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں وارد ہے ارشاد نبویؐ ہے۔

”اللہ تعالیٰ تمہیں باپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے پس جو شخص قسم کھائے وہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔“ (صحیح بخاری) اس لیے اس حدیث میں ”باپ کی قسم“ سے مراد ”باپ کے رب کی قسم“ ہے عربی زبان میں قرینے کی موجودگی میں الفاظ حذف کر دینا عام ہے۔

حسن سلوک میں ماں کا حق زیادہ ہے کیونکہ وہ باپ کی نسبت زیادہ نرم دل اور زیادہ حساس ہوتی ہے تاہم اگر ماں کسی ایسے کام کا حکم دے جو شرعاً ممنوع یا مکروہ ہو اور باپ اس غلط کام سے منع کرے تو باپ کا حکم ماننا ضروری ہے اور یہ ماں سے حسن سلوک کے متنافی نہیں۔

صحّت کی حالت میں صدقہ زیادہ افضل ہے کیونکہ اس وقت دل میں مال کی محبت زیادہ شدید ہوتی ہے اور اسے خرچ کرنا اس لیے بھی مشکل محسوس ہوتا ہے کہ



مستقبل میں حالات خراب ہونے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے جبکہ موت کے وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ اب میں اسے استعمال تو نہیں کر سگوں گا! لہذا صدقہ کر کے فائدہ حاصل کر لوں۔ اس وقت دل میں مال کی محبت نہیں رہتی۔

زندگی کے آخری ایام میں صدقہ کرنا وصیت کرنا شرعاً درست ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں بھی صدقے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

### باب : ۵ - تہائی ترکے کی وصیت

۳۷۰۸۔ حضرت عامر بن سعدؓ نے اپنے والد (حضرت سعد بن ابی وقاصؓ) سے روایت کیا انہوں نے فرمایا۔

”ختم مکہ کے سال میں بیمار ہو گیا حتیٰ کہ موت کے کنارے پہنچ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرا مال بہت زیادہ ہے اور میری وارث میری صرف ایک بیٹی ہے تو کیا میں اپنا وہ تہائی مال صدقہ کر دوں؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”آوھا؟“

فرمایا۔ ”نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تہائی؟“

فرمایا۔ ”تہائی (جائز ہے) اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ تیرا اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑنا نہیں مفلس چھوڑ جانے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔“

فوائد و مسائل : بیمار کی عیادت کرنا مسلمان کے حقوق میں شامل ہے اور یہ بہت بڑا نیک عمل ہے۔ جب انسان محسوس کرے کہ اس کا آخری وقت قریب ہے تو اس وقت اسے ترکے کے ایک تہائی حصے سے زیادہ صدقہ کی وصیت نہیں کرنی چاہیے۔

اگر کوئی شخص تہائی حصے سے زیادہ کی وصیت کر کے فوت ہو جائے تو اس کی وصیت پر صرف تہائی ترکے تک عمل کیا جائے گا۔ (دیکھیے حدیث : ۳۳۳۵)

بہتر یہ ہے کہ تہائی مال سے کم وصیت کی جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہائی کی اجازت دینے کے باوجود اسے ”زیادہ“ فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس حدیث سے یہی سمجھا ہے۔ (دیکھیے حدیث : ۲۷۵۹)

۳۷۰۹۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ صدقہ کیا ہے کہ وفات کے وقت تمہیں تہائی مال (میں وصیت کا حق) دے دیا ہے تاکہ تمہارے نیک اعمال میں اضافہ ہو جائے۔“

فوائد و مسائل : مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محقق نے سنداً ”ضعیف“ قرار دیا ہے لیکن بعض محققین نے دیگر شواہد کی بنا پر حسن قرار دیا ہے۔

تفصیل کے لیے دیکھیے : (الموسوعة الفقهية، مسند الامام احمد : ۳۷۳۵، ۳۷۳۶، والارواء، رقم : ۳۷۳۶) بنا بریں اسلامی شریعت کے احکام دنیا اور آخرت میں فائدے کا باعث ہیں۔

اچھے کام کی وصیت کرنے سے مرنے والے کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جب اس کی وفات کے بعد اس کی وصیت پر عمل کیا جاتا ہے تو مرنے والے کو اس کا ثواب پہنچتا ہے۔

اگر پسماندگان اچھے کام کی وصیت پر عمل نہ کریں تب بھی فوت ہونے والے کو اچھی وصیت کا ثواب ضرور ملے گا۔

۳۷۱۰۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) اے آدم کے بیٹے! وہ چیزیں (میں نے تجھے دی ہیں) ان میں سے ایک بھی تیرے ہاتھ میں نہیں تھی۔ میں نے تیرے مال میں اس وقت تیرا حصہ مقرر کر دیا جب میں تیری سانس بند

کر رہا ہوں (یہ اس لیے) تاکہ تجھے پاک صاف کر دوں اور (دوسری چیز) تیری زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد میرے بندوں کا تجھ پر نماز جنازہ ادا کرنا۔“

### باب : ۶ - وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں

۳۷۱۱۔ حضرت عمرو بن خارجهؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب فرمایا، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری (اونٹنی) پر سوار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری خوب جگلی کر رہی تھی اور اس کا لعاب میرے کندھوں کے درمیان (پشت پر) گر رہا تھا۔ (اس موقع پر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کو ترکے کا حصہ تقسیم کر کے دے دیا ہے، لہذا وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے اور بدکار کے لیے پھر ہیں۔“

جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا ہوئے کا دعوا کرے یا اپنے آزاد کرنے والوں کے سوا کسی اور کی طرف آزادی کی نسبت کرے تو اس پر اللہ کی فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اس کا نہ فرض قبول ہو گا اور نہ نقل۔“

یا فرمایا۔ ”یہ نقل قبول ہو گا نہ فرض۔“

فوائد و مسائل : ترکے میں جن رشتہ داروں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے، انہیں ان کا مقرره حصہ ضرور ملنا چاہیے۔

جن رشتہ داروں کا وارثت میں حصہ نہیں ان کے حق میں مناسب وصیت کرنا بہتر ہے۔

بعض لوگ یتیم پوتے کی وارثت کا مسئلہ لے کر شریعت کے نظام میراث پر اعتراض کرتے ہیں۔ مثلاً ”ایک شخص فوت ہوتا ہے اس کا ایک بیٹا زندہ ہے، دو سرائیٹا فوت ہو چکا ہے لیکن اس فوت شدہ بیٹے کا ایک بیٹا جو اب فوت ہونے والے کا پوتا ہے، وہ

موجود ہے، اصول میراث کے مطابق یہ پوتا محروم ہے

کیونکہ قریبی عصبہ کی موجودگی میں دور کا عصبہ رشتے دار محروم ہوتا ہے۔ اس قسم کی استثنائی اور تاثر صورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون میں تبدیلی کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

شرعی طور پر اس کا حل موجود ہے اور وہ یہ کہ فوت ہونے والا اپنے غیر وارث پوتے کے حق میں کچھ وصیت کر جائے۔ اگر وصیت نہ ہو تو وارثوں کے لیے مستحب اور بعض علماء کے نزدیک واجب ہے کہ وارث محروم الارث پوتوں وغیرہ کو وارثت میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دیں۔ قرآن کریم کی آیت :

ترجمہ : ”وارثت کی تقسیم کے وقت رشتہ دار یتیم اور مساکین آ حاضر ہوں تو تم مال وارثت میں سے انہیں کچھ دے دو۔“ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اکثر لوگ اس حکم قرآنی کو محض اخلاقی ہدایت سمجھ کر اپنے نہایت قریبی رشتہ داروں (بھتیجیوں وغیرہ) کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام کا قانون وارثت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنتا ہے، حالانکہ

اس میں تو ایسی کوئی چیز نہیں جس پر انگشت نمائی کی جاسکے چچا تایا اپنے بھتیجیوں وغیرہ کے ساتھ شفقت، ہمدردی اور صلہ رحمی کا معاملہ کریں جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے تو ایک اسلامی معاشرے میں پوتوں وغیرہ کی وارثت یا عدم وارثت کا مسئلہ زیر بحث ہی نہ آئے کیونکہ صلہ رحمی کے اعتبار سے ان کی محرومی وارثت کا ازالہ خوش اسلوبی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے اعتراضات ان غیر مسلموں کی طرف سے بھی پیش کیے جاتے ہیں جن کے ہاں وارثت کا کوئی اصول و ضابطہ سرے سے موجود ہی نہیں، سوائے اس کے کہ

مرنے والے کا بڑا بیٹا بیٹی تمام ترکے کی مالک بن جاتی ہے، خواہ یہ کروڑوں کی جائیداد ہو۔ میت کی باقی اولاد بالکل محروم ہوتی ہے، حالانکہ اولاد ہونے کے لحاظ سے وہ اس کے برابر حق دار ہیں۔

۱۵

ماہنامہ شعلہ

جونری ۲۰۱۲

۱۴

ماہنامہ شعلہ

جونری ۲۰۱۲





بندگہی

آتش گیر زہر شکرِ اعلیٰ

شہابین شید

آتش گیر از کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔  
 ”بھول کی شرارتیں بھی تو بہت مزاحمتی ہیں۔“  
 ”بالکل گھبر کی رونق ہوتے ہیں اور شرارتیں اس  
 وقت مزے دار ہوتی ہیں جب کوئی نقصان نہ ہو۔۔۔  
 اور آتش کی شرارتیں تو ابھی بہت معصوم اور بے ضرر  
 ہیں۔“  
 ”آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟“  
 ”ہماری شادی 8 جون 2007ء کو ہوئی تھی،  
 اس سے آپ حساب لگائیں کہ کتنے سال ہو گئے ہیں؟“

آتش گیر از کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔  
 ”مہول فنکار ہیں۔ انتہائی بااخلاق اور تعاون کرنے  
 والے۔ انڈیو کے لیے کبھی پریشان نہیں کرتے  
 ”اندھن“ کے سلسلے میں ان سے بات چیت حاضر ہے۔  
 ”کیسے ہیں آتش گیر از! بیگم کیسی ہیں اور بیٹا بھی۔“  
 ”الحمد للہ میں بھی ٹھیک ہوں، بیگم بھی اور بیٹا بھی۔“

”ابا نام ہے، بیٹے کا اور کتنے سال کا ہو گیا ہے؟“  
 ”بیٹے کا نام آتش ہے اور ماشاء اللہ وہ ڈھائی سال کا  
 ہو گیا ہے اور کچھ کچھ بڑا ہو رہا ہے اس کی شرارتیں

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت پوری  
 کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا اور تم یہ آیت  
 پڑھتے ہو : ”اس“ وصیت کے بعد جو وہ وصیت  
 کرے یا قرض کے بعد۔“ (النساء ۱۱۴) اور سگے بھائی  
 ایک ماں کے بیٹے وارث ہوں گے، سوتیلے بھائی  
 نہیں۔“

فوائد و مسائل : قرض کی اہمیت وصیت کے  
 مقابلے میں اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ قرض زندگی میں  
 بھی واجب الادا ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی جبکہ  
 وصیت موت کے بعد ہی قابل عمل ہوتی ہے۔ قرض  
 جتنا بھی ہو ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، جبکہ وصیت اگر  
 تمنا کی ترکے سے زیادہ ہو تو تمنا کی تک قابل عمل ہوتی  
 ہے ”فائدہ نہیں۔“

میت کے مال میں سب سے پہلے کفن و دفن پر خرچ  
 کیا جاتا ہے پھر قرض ادا کیا جاتا ہے پھر جو کچھ بچے اس  
 کے تمنا کی مال یا اس سے کم کی جو وصیت ہو وہ پوری کی  
 جاتی ہے۔ اس کے بعد باقی ترکہ وارثوں میں تقسیم کیا  
 جاتا ہے۔

آیت میں وصیت کا ذکر قرض سے پہلے ہونے کا یہ  
 مطلب نہیں کہ پہلے وصیت پوری کی جائے، پھر قرض  
 ادا کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دونوں چیزیں واجب  
 ہیں، ان میں سے جو چاہی جائے وہ ادا کی جائے، اگر  
 دونوں (وصیت اور قرض) موجود ہوں تو ترکے میں سے  
 دونوں کی ادائیگی کرنے کے بعد باقی ترکہ تقسیم کیا  
 جائے علاوہ ازیں وصیت کا ذکر پہلے کرنے میں یہ نکتہ  
 بھی ہو سکتا ہے کہ وصیت پر عمل کرنے کو زیادہ اہمیت  
 نہیں دی جاتی جبکہ قرض تو لوگ زبردستی بھی وصول  
 کر لیتے ہیں۔ وصیت کو پہلے بیان کر کے واضح کر دیا کہ  
 اس پر عمل کرنے میں بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے مگر  
 اس پر عمل قرض کی ادائیگی کے بعد ہی کیا جائے گا۔  
 میت کے سگے بہن بھائی اس کے سوتیلے بہن  
 بھائیوں پر مقدم ہیں۔

انصاف سے اس قدر بعد رواج پر عمل کرنے  
 والوں کی طرف سے اسلام کے انتہائی عادلانہ نظام  
 وراثت کی ایک شگفتہ تلاش کر کے اس پر غلط سلط  
 اعتراض کرنا اور اس طرح پوری شریعت کو ناقابل عمل  
 قرار دینے کی کوشش کرنا معقول طرز عمل نہیں۔  
 افسوس ہے کہ بعض نام نہاد مسلمان بھی غیر  
 مسلمانوں سے متاثر ہو کر ان ہی کی زبان بولنا شروع  
 کر دیتے ہیں اور اپنا ایمان خطرے میں ڈال لیتے ہیں۔  
 وارث کے حق میں وصیت سے منع کرنے میں یہ  
 حکمت ہے کہ اگر وہ وصیت قرآن و سنت کے مطابق  
 ہو تو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان  
 وارثوں کو شرعاً وہی حصہ ملے گا خواہ وصیت کی جائے  
 یا نہ کی جائے اور اگر اس کی وصیت قرآن و سنت کے  
 خلاف ہو تو اس وصیت پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اس  
 طرح جوہ کا عدم ہے۔

نسبی تعلق ایک ناقابل تبدیل تعلق ہے، اسی وجہ  
 سے اسلام کی نظر میں متنبی (منہ یولے بنے) کو اصل  
 باپ کی بجائے اپنی طرف منسوب کرنا اور اظہارِ ربوبی  
 کو ماں بہن قرار دینا غیر قانونی بلکہ گناہ ہے۔  
 ولاء (آزادی) کا تعلق بھی ناقابل تبدیل ہے جس  
 نے کسی کو آزاد کیا ہے، اسی کا آزاد کردہ (مولیٰ) کہنا  
 چاہیے۔ آزاد کرنے والے کے احسان کو فراموش  
 کر کے کسی اور کو مولیٰ قرار دینا بہت بڑا گناہ ہے۔

وارث کے لیے وصیت

”۳۰۰ حضرت ابو امامہ (صدیق بن عثمان) کبائلی  
 سے روایت ہے، ”انہوں نے فرمایا۔  
 ”میں نے حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی  
 اللہ علیہ وسلم کو اپنے خطبہ مبارک میں یہ فرماتے سنا۔  
 ”اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا  
 ہے لہذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔“

باب : ۱۔ وصیت پوری کرنے سے  
 پہلے قرض ادا کیا جائے

۳۰۰ حضرت علیؓ سے روایت ہے، ”انہوں نے



”پانچ سال۔۔۔ ان پانچ سالوں میں کوئی نمایاں تبدیلی آئی؟“  
 ”نہیں کوئی خاص نہیں میں یہ کہ پہلے کام کم کرتا تھا۔ اب ماشاء اللہ بہت کام ہے اور شادی کے بعد ہی کام میں اضافہ ہوا ہے۔ اب فارغ وقت ملتا ہی نہیں ہے۔“  
 ”گویا آپ کی عیلم آپ کے لیے بہت لگی ثابت ہوئی ہیں۔“  
 ”بالکل۔۔۔ بالکل آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ واقعی عیلم اور بیٹے کے آجانے سے کام میں اضافہ ہوا ہے۔ اللہ کا بڑا ہی کرم ہے۔“  
 ”لو کے عمو! دیر سے شادی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں کہ بیوی کے آجانے سے آزادی ختم ہو جائے گی اور دوستوں میں اچھے بیٹھے کاموں میں ملے گا تو آپ کی آزادی ختم ہوئی؟“  
 ”میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ آزادی ختم ہو جاتی ہے، لیکن شادی کے بعد اندازہ ہوا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ شادی کے بعد تو مرد خاص طور پر زیادہ آزاد گزرتا ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہر کام میں دلچسپی آجاتا ہے اور وہ پہلے سے زیادہ اچھی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔“  
 ”لیکن ایسا سب کے ساتھ تو نہیں ہوتا؟ کس لحاظ سے آپ کہہ رہے ہیں کہ زندگی زیادہ اچھی گزرنے لگتی ہے؟“  
 ”بھئی اس لحاظ سے کہ گھر پہ کوئی انتظار کرنے والا ہوتا ہے وقت پہ سارے کام ہو جاتے ہیں۔ بغیر کے ہوئے عیلم خاطر مدارات کے ساتھ ساتھ خدمت بھی کرتی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انسان بھگتا نہیں اس کی اپنی ایک فیملی بن جاتی ہے اور پھر اللہ اولاد کی نعمت سے نواز دے تو زندگی جیسے مکمل ہو جاتی ہے۔“  
 ”کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شادی کم عمری میں ہونی چاہیے۔ کچھ تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“  
 ”خیال تو میرا بھی یہی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کا تعلیم

یافتہ ہونا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ وقت کا پتا نہیں ہوتا کہ کس وقت کیا ہو جائے اس لیے انسان کے پاس اتنی تعلیم ضرور ہو کہ وہ اپنے بڑے وقت کے ساتھ مقابلہ کر سکے اور تعلیم تو پانچ تیس سال کی عمر میں مکمل ہو جاتی ہے، تو لڑکیوں کی اس عمر میں شادی ہو جانی چاہیے اور لڑکے کے اوپر چونکہ گھر کی مال باپ کی اور بیوی بچوں کی ذمہ داری ہوتی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر سر روزگار ہو جائے اور تمام تر ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ہو جائے تو پھر شادی کرے۔“

”آپ کی عیلم ”شب“ کتنا بڑی ہوئی ہیں؟“  
 ”شب نے اے سی سی اے کیا ہوا ہے اور ماشاء اللہ سب سے تعلیم یافتہ ہیں۔ شب کی والدہ پچھڑیں۔“  
 ”شب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور کوئی رشتہ داری آپ دونوں کی؟“

”نہیں ہم دونوں کی کوئی رشتہ داری نہیں ہے اور شب کو میں نے اس کے گھر میں ہی دیکھا تھا۔“  
 ”کیا مطلب پہلے سے آنا جانا تھا؟“  
 ”نہیں ایسا نہیں ہے۔ ہماری ایک رشتہ داری ہے۔ انہوں نے شب اور اس کی فیملی کے بارے میں بتایا تھا تو ہم لوگ ان کے گھر گئے تھے تب پہلی بار میں نے شب کو دیکھا اور بس۔“  
 ”اور اگر شب پسند نہ آتی تو؟“

”در اصل میں نے پہلے شب کی تصویر منگوائی تھی اور تصویر دیکھ کر ہی ہم سب نے فیصلہ کیا تھا کہ شب کے گھر جائیں گے تصویر میں شب اچھی لگی۔ اس لیے شادی کا فیصلہ کیا اور یہ سو فیصد رائج میں ہے۔“  
 ”آپ کے خیال میں کیا بہتر ہوتا ہے ”رائج“ یا ”لو؟“  
 ”رائج۔۔۔ اگر میری کوئی پسند ہوتی تو گھر والوں کو بتا دیتا۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی اور میں چاہتا بھی یہی تھا کہ گھر والوں کی پسند سے ہی میری شادی ہو۔“  
 ”پھر کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوا؟“  
 ”نہیں ہر گز نہیں۔ کیونکہ شب میری توقعات



سے بڑھ کر اچھی ہے۔ بہت فرمانبردار بہت سلجھی ہوئی اور سکھ رہے۔“

”تعلیم یافتہ، سکھ تیز دار، سلجھی ہوئی۔ اتنی خوبیاں ہیں تو پھر مغرور تو نہیں ہے؟“  
 ”ارے نہیں، بالکل بھی نہیں۔ لڑکیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے کہ اتنی خوبیوں کے باوجود ان میں اکثر نہ ہو، غرور نہ ہو اور آپ کو بتاؤں کہ شب مزاج کی بھی بہت اچھی ہے۔ ابھی آپ بات کریں گی تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔“

”چکن سنبھال لیتی ہیں؟“  
 ”سنبھال لیتی ہیں؟ پورا چکن ہی اس کے ہاتھ میں ہے۔ بہت اچھا پکانی ہے۔ اب تو سب اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے کے عادی ہو گئے ہیں اور چکن میں کیا پورے گھر میں اب اس کی حکمرانی ہے۔“  
 ”والدہ کو تمام ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا ہے؟“  
 ”بالکل جی امی کا بھی آرام کادل چاہتا ہے۔ انہوں نے بہت خدمت کر لی ہے، ہم سب کی اور میری امی اپنی بہو سے بہت خوش ہیں۔ اب تو ان کا زیادہ وقت آپس کے ساتھ گزرتا ہے۔“

”فصل خراج کون ہے آپ یا شب؟“  
 ”ہم دونوں ہی فصل خراج ہیں۔ ہم دونوں ہی

خوب خرچ کرتے ہیں۔ کوئی بھی اچھی چیز دیکھ لیں ہاتھ رکھنا ہی نہیں ہے۔“



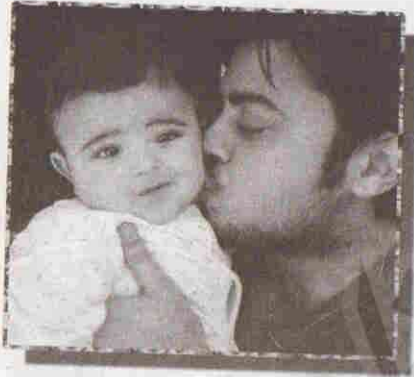
### شب آغا شیراز

”کیسی ہیں؟ شب آپ کا نام بہت خوب صورت ہے۔“  
 ”جی میں ٹھیک ہوں اور میرا نام سب کو ہی بہت پسند آتا ہے میرے ماں باپ نے یہ خوب صورت نام رکھا ہے۔“  
 ”پہلے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ، پھر آگے چلتے ہیں۔“

”جی امیر نام شب آغا شیراز ہے۔ میرے والد کا تعلق راجہ فیملی پاکستان سے ہے جبکہ والدہ کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے ہے۔ میری والدہ ٹیچنگ کے شعبے سے وابستہ ہیں اور والد صاحب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اور میں نے اے سی سی اے کیا ہوا ہے۔“

”والدین کی اکلوتی اولاد لازمی بھی بہت ہوتی ہے اور تھوڑی سی بکڑی ہوئی یعنی تھوڑی تھوڑی، خود سر بھی تو کیا؟“





”اچھا۔۔۔ تو پھر آپ نے ان سب باتوں میں اتنا شیراز کو کیا پایا؟“

”بہت اچھا پایا۔۔۔ شانی میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ خامیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر کچھ برائی ہے تو یہ کہ ان کا غصہ تیز ہے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر اکثر انہیں بہت غصہ آجاتا ہے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے بغیر ہو جائے تو بس ان کا موڈ انتہائی خراب ہو جاتا ہے۔“

”پھر تو دوستوں کا حلقہ بھی کم ہو گا۔ کیونکہ غصے والے انسان کو لوگ ذرا کم ہی پسند کرتے ہیں۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ ان کا حلقہ احباب اور حلقہ پاراں بہت وسیع ہے اور کوئی بھی ان کے غصے کی شکایت نہیں کرنا بلکہ سب یہی کہتے ہیں کہ ابھی آپ کے میاں تو بہت ہی لمبا اور خوش اخلاق ہیں اور ہے بھی ایسا ہی عیس غصہ تو صرف گھروالوں کے لیے ہے۔“

”جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں یا زمین پر؟“

”جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور زمین پر مکمل ہوتے ہیں۔ اب دیکھیں تاکہ یہ ایران کے اور میں پنجابی تو جوڑو پھر اللہ نے ہی بنایا ہے نا۔“

”ترب، تو ارج اور لومیرج سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”جی بالکل، لیکن لومیرج میں بھی والدین کی مرضی ضرور شامل ہونی چاہیے۔ باقی کامیابی اور ناکامی کے لیے کچھ نہیں کہا جاسکتا جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔“

”شیراز تیار ہے تھے کہ آپ نے پورا گھر سنبھالا ہوا ہے اور کھانا تو آپ بہت اچھا پکاتی ہیں۔“

”آغا شیراز آپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں گھر کے کاموں میں؟“

”میں جب بیاہ کر آئی تو میں نے دیکھا کہ ان کے گھر کے کھاناں اور ہمارے گھر کے کھاناں کے ذائقے میں بہت فرق ہے تو پھر میں نے ان کے کھانے پکانے بھی سکھے اور اپنے بھی بنائے۔ اب میں دونوں طرح کے کھانے پکاتی ہوں۔ جہاں تک شانی کے ہاتھ بٹانے کا

سے۔۔۔ دو الگ الگ خاندان ساحل میں بہت فرق تھا یا کوئی خاص نہیں؟“

”جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہوتی ہے تو اسے اندازہ تو ہوتا ہے کہ اس کے گھر کے ماحول میں اور سسرال کے ماحول میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہو گا۔ قریبی رشتے داروں میں۔۔۔ ابھی گھر کے ماحول میں فرق ہوتا ہے اور میں تو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جا رہی تھی، دو مختلف زبانوں کے لوگ تو مجھے یقین تھا کہ ماحول مختلف ہو گا۔ مگر پوچھیں تو ان کی فیملی اتنی اچھی ہے

کہ مجھے ان کے ماحول میں ایڈجسٹ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔“

”شادی کی ایکسٹنشن تھی یا ایسا ہی تھی؟“

”ایکسٹنشن سے زیادہ ایسا تھی کیونکہ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں اپنے والدین کی اکلین اولاد ہوں تو مجھے یہ سوچ سوچ کر پریشانی ہو رہی تھی کہ وہ اکیلے کیسے رہیں گے میرے والدین جب میری شادی کی بات کرتے تھے تو میں یہی کہتی تھی کہ میں نے شادی نہیں کرنی۔۔۔ مگر والدین اس معاملے میں کب کسی کی باتیں ہیں۔“

”منہ دکھائی میں کیا ملتا تھا؟ اور شادی کے لیے خوب

صورتی کتنی اہمیت رکھتی ہے؟“

”منہ دکھائی میں انہوں نے مجھے انگوٹھی دی تھی یوں تو ساری زندگی سیرت ہی کام آتی ہے مگر ہمارے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ پہلے صورت اور پھر سیرت دیکھی جاتی ہے۔ اس لیے اچھی صورت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ خوب صورتی سب کو بھی لگتی ہے۔“

”ہنی مون منایا تھا؟“

”جی بالکل منایا تھا اور میری نظریں ہنی مون منانا بہت ضروری ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے

جن کی ارج میرج ہوتی ہے کیونکہ جب میاں بیوی کچھ وقت اکیلے گزارتے ہیں تو پھر انہیں ایک دوسرے کے مزاجوں کا اور ایک دوسرے کی اچھی بری عادتوں کا پتا چلتا ہے۔“

”میں لاڈلی تو ضرور ہوں مگر نہ ضدی ہوں اور نہ ہی خود سر بہ شک آپ ان سے میرے بارے میں پوچھ سکتی ہیں۔ میرے والدین نے ایسی اچھی تربیت کی ہے کہ مجھے نہیں ملتا کہ کسی کو مجھ سے کوئی شکایت ہوگی یا ہوئی ہوگی۔“

”شادی کے بعد ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ والدین کے گھر میں تھوڑی آزاد زندگی ہوتی ہے تو کوئی مشکل ہوئی آپ کو؟“

”یہ بات تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ والدین کے گھر میں تھوڑی آزادی ہوتی ہے اس لحاظ سے کہ اگر صبح دیر سے اٹھ جائیں یا کسی کام کو کرنے میں سستی آ رہی ہو تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اور مسئلہ تو سسرال میں بھی نہیں ہوتا بس خود سے اچھا نہیں لگتا کہ ہم دیر سے اٹھیں یا کسی کام میں سستی دکھائیں۔۔۔ ذمہ داری کا احساس خود بخود آ جاتا ہے۔ یہ شاید اللہ نے لڑکیوں کی فطرت میں رکھا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے ماحول میں جلدی ایڈجسٹ کر لیتی ہیں۔“

”آغا شیراز ایک مصروف جانے پہچانے فنکار ہیں۔ جب ان کا رشتہ آیا تو آپ کو اچھا لگا کہ شہر والوں سے

رشتہ جڑنے جا رہا ہے؟“

”صح بات بتاؤں میں نے ان کا نام ضرور سنا ہوا تھا مگر ان کا کوئی ڈرامہ غور سے نہیں دیکھا تھا کیونکہ میں اپنی پریشانی میں مصروف رہتی تھی۔ مجھے تو شادی کے بعد اندازہ ہوا ہے کہ میری شادی ایک معروف شخصیت سے ہوئی ہے۔ جس کے چاہنے والے بہت

ہیں۔“

”فیلڈ خطرناک ہے ڈر لگتا ہے؟“

”نہیں۔۔۔ اگر بیوی اچھی ہے شوہر کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے اپنے آپ کو بھی فٹ رکھتی ہے تو پھر مرد کبھی بھی کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گا اور فیلڈ تو خواہ مخواہ نام ہے اگر مرد کو گھر پر توجہ نہ ملے تو پھر وہ باہر ہی دیکھے گا۔“

”آغا شیراز کا تعلق ایران سے ہے آپ راجہ فیملی



## دستک دستک دستک

شاین رشید



کرلن خان

”کرلن خان! کیسی ہو؟“  
”الحمد للہ۔۔۔ آپ سنائیں۔“  
”بہت زمانہ ہوا تمہارا انٹرویو کیا تھا۔ کچھ یاد ہے؟“  
”جی بالکل یاد ہے۔“  
”تمہارا پروگرام ”جاگو پاکستان جاگو“ بہت اچھا ہوتا ہے اور خاص طور پر تمہاری منی اور تمہاری ڈرننگ بہت عمدہ ہوتی ہے۔“  
”جی بہت شکریہ۔“  
”صبح صبح اٹھنے میں مشکل تو نہیں ہوتی؟“  
”نہیں اللہ کا شکر ہے، جلدی اٹھ جاتی ہوں اور فجر کی نماز کے لیے توجہ نہایت پڑتا ہے۔“

”اچھا گڈ۔۔۔ عمو! نماز کے سوال پر توفکار جواب کو گول مول ہی کر جاتے ہیں؟“  
”الحمد للہ میں پانچوں وقت کی نماز پڑھتی ہوں۔۔۔ کیونکہ یہ ہم پر فرض ہے۔ جب ہم دوسرے کاموں کے لیے وقت نکال سکتے ہیں تو نماز کے لیے کیوں نہیں؟“  
”جاگو پاکستان جاگو“ نے آپ کو زیادہ شہرت دی یا آپ کے خیال میں کوئی اور پروگرام ہے؟“  
”سب سے پہلے تو میری اداکاری کہ جس سے میں نے شہرہ کا آنا دیکھا پھر ایک کوکنگ چینل پر میزبانی کے فرائض انجام دیے اور دے رہی ہوں۔ اس پروگرام نے مجھے بہت شہرت دی۔“  
”اچھا۔۔۔ کوکنگ چینل بھی لوگ شوق سے دیکھتے ہیں؟“

”جی بہت شوق سے“ آپ اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتیں۔ اس کا فوڈ ٹیک بہت اچھا لگتا ہے ہمیں۔“  
”کرلن! آپ خود بھی اچھا پکارتی ہیں؟“  
”ہاں کیوں نہیں۔۔۔ آپ کے حکم میں یہ بات لانا چاہوں گی کہ میں نے کوکنگ ٹینجمنٹ کا کورس کیا ہوا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ جو لوگ بھی کوکنگ شو کی میزبانی کریں انہیں کھانے پکانے کی شدید ضرورت ہوتی چاہیے۔“  
”اداکاری کیوں چھوڑ دی؟“

”اب ٹائم نہیں ملتا۔ پہلے خاصا ٹائم تھا تو میں کر بھی لیتی تھی مگر جب سے کوکنگ شو اور مارننگ شو کرنے لگی ہوں اداکاری کے لیے وقت نہیں ملتا۔“  
”کیا مشکل ہے، شو کرنا یا اداکاری کرنا؟“

”لائو شو کرنا مشکل ہے کیونکہ بہت ایکٹو ہونے پڑتا ہے۔ فٹلی کا کوئی ازالہ نہیں ہوتا سوائے معذرت کے۔ اداکاری زیادہ مشکل نہیں ہے مگر ٹائم بہت لگتا ہے۔ فی الحال تو اداکاری سے بالکل کنزروں کی ہوئی ہے۔“

”ماڈلنگ بھی تو کی ہے آپ نے؟“

”بالکل کی ہے۔ تقریباً 50 سے زیادہ کمرشلز کر چکی ہوں۔ ماڈلنگ میں وقت بھی کم لگتا ہے اور معاوضہ بھی ٹھیک ٹھاک ملتا ہے۔“

”اچھا یہ بتائیں کہ اس فیلڈ میں کیسے آئیں؟“  
”فٹنس اتھلیٹک ہوا یہ کہ انڈس ویشن نے ”فٹنس آف دی ایم“ مقابلے کا اہتمام کیا۔ سب دوستوں کے کہنے پر میں نے بھی اس میں حصہ لے لیا۔ قسمت اچھی لگی میں مقابلہ جیت گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ اسی ٹیبل میزبانی کی اور اداکاری کی آفرز دیں جو کہ میں نے قبول کی اور یوں میں اس فیلڈ کا حصہ بن گئی۔“  
”کتنے سال ہو گئے؟“

”تقریباً“ آٹھ نو سال۔ اس وقت نئے نئے چینلز کھلنا شروع ہوئے تھے لیکن زیادہ کام انڈس کے ساتھ کیا اور ماشاء اللہ سے ان آٹھ نو سالوں میں میں نے کافی کام کیا ہے۔“

”وہ تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔ لیکن مارننگ شو نے تو ایک دم بلندی پہنچا دیا ہے۔“

”جی بالکل اس میں کوئی شک نہیں۔“

”کچھ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بتائیں!“

”میں 25 فروری 1975ء کو دہلی میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم دہلی سے ہی حاصل کی اور جب فیملی کے ساتھ کراچی شفٹ ہوئی تو پھر سٹی اسکول میں داخلہ لیا۔ وہاں سے میٹرک کیا اور گورنمنٹ کامرس کالج سے گریجویشن کیا پھر فوٹو گرافی اور مونیٹسوری ڈائریکٹری کے کورسز کیے اور تقریباً ”سات آٹھ سال پہلے“ بھی کی اور اب آپ کے سامنے ہوں۔“  
”شادی؟“



”جی شادی ہوئی، نباہ نہ ہو سکا۔ اللہ نے ایک بیٹی دیا ہے، جو اب میری تمام تر امیدوں کا مرکز ہے۔ اللہ اسے لمبی عمر دے۔“  
”اسمارٹ رہنے کا راز؟“

”قدرت کی مہربانی ہے۔ کچھ خاص خیال نہیں رکھتی۔ البتہ کھانے میں بہت مرغن غذا استعمال نہیں کرتی۔ دال چاول، قیمہ اور سبزی میرے پسندیدہ کھانے ہیں۔“

”کرلن خان بہت سلیکھ ہوئے اور ٹھہرے انداز میں گفتگو کرتی ہیں تب ہی ان کا شو بہت دیکھا جاتا ہے۔“

\*\*\*

عائشہ عمر

”کیسی ہیں عائشہ عمر صاحبہ!“  
”جی اللہ کا شکر ہے۔“

”آپ ماشاء اللہ کافی عرصے سے اس فیلڈ میں ہیں۔ آپ کا ایک نام ہے لیکن جو شہرت آپ کو ”ملنے“ نے دی وہ کسی پروگرام نے نہیں دی۔ آپ تسلیم کرتی ہیں اس بات کو؟“  
”کیوں نہیں۔۔۔ اس سیریز نے مجھے واقعی بہت شہرت دی ہے۔ بہت پسند کیا جاتا ہے اس سلسلے کو۔“



”لوگ آپ کا اصلی نام تو بھول ہی چکے ہوں گے۔“

(بٹتے ہوئے) ”بالکل جی، جہاں جاؤ، خوبصورت! آپ کیسی ہیں۔ آپ کی رفاہ منس بہت اچھی ہوتی ہے کیا آپ کا اصلی نام بھی یہی ہے۔“

”کیسا لگتا ہے سب کچھ کسی نے تنقید کی؟“

”بہت اچھا لگتا ہے، بہت عزت ملتی ہے۔ بہت تعریف ملتی ہے اور تنقید کا سامنا کم ہی کرنا پڑتا ہے کیونکہ منہ پر تو سب تعریف ہی کرتے ہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ لوگ تنقید کریں تاکہ ہمیں اپنی خامیاں

بھی پتا چلے۔ ہاں وہ تنقید مجھے بہت بری لگتی ہے جو ہماری عدم موجودگی میں ہوتی ہے اور وہ بھی ہماری رفاہ منس یہ نہیں بلکہ ہماری ذاتی زندگی پر ذاتی زندگی پر تنقید کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔“

”لوگ خوب صورت کہہ کر بھلاتے ہیں اس نام نے تمہاری شخصیت پر اثر ڈالا؟“

”یہی اثر ڈالا ہے کہ اگر اللہ نے خوب صورت بنایا ہے تو اس کی حفاظت بھی کرنی چاہیے اور میں اس کی حفاظت کرتی ہوں۔۔۔ دیکھو میرا اپنا نام بہت خوب صورت اور پاکیزہ ہے جو کہ مجھے بہت پسند ہے۔“

”کب سے ہیں اس فیلڈ میں؟“

”بچپن سے۔۔۔ اور اس بات پر کسی کو یقین نہیں آتا، حالانکہ یہ حقیقت ہے۔ آپ کو بتاؤں کہ جب میں آٹھ سال کی تھی تو میں نے منہو ہاشمی کے ساتھ ایک پروگرام ”میرے بچپن کے دن“ کی میزبانی کی تھی۔ اس میں میں مشہور شخصیات سے ان کے بچپن کے حوالے سے انٹرویو کیا کرتی تھی اور بچپن سے ہی ٹھیکر میں کام کرتی چلی آ رہی ہوں۔“

”اب بھی ٹھیکر کرتی ہیں؟“

”نہیں اب نہیں، لیکن کبھی موقع ملا تو ضرور کروں گی۔ ان لوگوں کے ساتھ جو صحیح معنوں میں ٹھیکر کرتے ہیں۔“

”آپ تک کے نمایاں کام کون کون سے ہیں؟“

”میں نے اس فیلڈ میں بہت کام کیا ہے۔ سوشل ورک بھی کیا ہے۔ ایجنٹیل بچوں کے لیے بہت کام کیا ہے اور یہ سب کام میں اسکول کی چھٹیوں میں کرتی تھی اور ڈرامے، لوگک پلے، سوپ، بہت کچھ کیا ہے۔ لٹریچر بہت لکھی ہے۔“

”چلو رہے دو۔۔۔ آج کل گلوکاری کی طرف بھی تو تمہارا رجحان ہے۔“

”جی ہاں۔۔۔ میں نے سوچا کہ اداکاری، ماڈلنگ، میزبانی، فلمائی کام سب کچھ تو کر لیا ہے اب آواز کا جادو بھی جگایا جائے اس لیے اب اس طرف توجہ دے رہی ہوں اور دو گانے آج کل مختلف چینلز (میوزک) سے آنے لگے ہیں اور آج کل ایلم کی تیاریاں بھی جاری ہیں۔“

”تمہارے بارے میں سنا ہے کہ تم ضدی اور مغرور بہت ہو؟“

”آپ بتائیں کیا میں آپ کو ایسی لگ رہی ہوں؟ بس مجھے جھوٹ اور بناوٹ پسند نہیں۔ جرأت منہ پر کہہ دیتی ہوں۔ دل میں کوئی بات نہیں رکھتی اور ہر ایک سے جلدی فرمی بھی نہیں ہوتی اور ضد کس بات کی۔ جائز بات منوانا اگر ضد ہے تو ٹھیک ہے میں ضدی ہوں۔“

”ویسے کس قسم کے لوگ پسند ہیں؟“

”جیسے لمحے میں بات کرنے والے، مذہب اور تعلیم یافتہ لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔“

”میرے بارے میں سب کو پتا ہے کہ میں 12 اکتوبر 1980 کو لاہور میں پیدا ہوئی اور میں نے لاہور کالج آف آرٹ سے ماسٹر ڈگری حاصل کی ہے اور میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو اللہ نے عزت کے ساتھ شہرت کے لیے منتخب کیا اور بس۔۔۔ کافی ہے اتنا۔“

علیشبا یوسف

”کیا حال ہیں۔۔۔ آج کل تو آپ کے دو تین سیریل

”آں ایڑیں سب کچھ کیسا لگ رہا ہے؟“

”جی اللہ کا شکر ہے اور سب کچھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

”یہ بتاؤ کہ ”اک نظر میری طرف“ میں تم نے اتنا بھیانک رول کیوں لیا؟“

(بٹتے ہوئے) ”بھیانک۔۔۔ ہاں کچھ زیادہ ہی تکلیف دہ رول ہے۔ میں کیسا رفاہ کر رہی ہوں؟“

”بہت اچھا رفاہ کر رہی ہیں۔ ابھی آپ کی شادی کو عرصہ ہی گزرا ہوا ہے کہ اس قسم کے رول کر رہی ہیں؟“

”ارے بس مل گیا تو کر لیا۔ آپ یقین کریں کہ میرے میاں صاحب تو اس سیریل کو دیکھتے ہی نہیں ہیں۔ نہ ہی میرے سرال والے اور بہت ڈانٹ بڑی ہے کہ تمہیں کیا ضرورت تھی یہ سیریل کرنے کی، اس قسم کا رول کرنے کی، لیکن چونکہ لے لیا تو بس کر لیا۔“

”تکلیف نہیں ہوتی یہ رول کرتے وقت؟“

”بہت زیادہ۔۔۔ مگر یہ کوئی حقیقت تو نہیں ہے اور اللہ نہ کرے کہ کسی عورت کی زندگی میں یہ وقت آئے۔ ان شاء اللہ آئندہ اس طرح کا کوئی رول نہیں کروں گی۔“

”تمہارے کی آئے گی بارات، میں عبدالقادر ہوں اور میرے چارہ گر، بھی مقبول سیریل ہیں اور اس میں بھی آپ کی رفاہ منس بہترین ہے۔ آپ کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے اس فیلڈ میں؟“

”سولہ سال کی عمر سے اس فیلڈ میں کام کر رہی ہوں میں۔“

”اچھا۔۔۔ مگر شہرت آپ کو اب ملی ہے۔“

”جی ہاں لے کے میں نے ابتدا کر شیل سے کی تھی۔ کمرشل کے حوالے سے مجھے بہت لوگ جانتے ہیں اور اب چونکہ ڈراموں میں کام کر رہی ہوں تو ڈراموں کے حوالے سے جانی پہچانی جاتی ہوں کیونکہ میرا خیال ہے کہ لوگ ڈرامہ زیادہ شوق سے دیکھتے ہیں۔“



”اتنی کم عمری میں اس فیلڈ میں آئیں، گھر والوں نے اعتراض نہیں کیا کیا؟“

”مجھے طالب علمی کے دور میں ہی کمرشل کی پیشکش ہوئی تھی۔ مجھے پوری امید تھی کہ مجھے اس کام کی اجازت نہیں ملے گی مگر پھر بھی میں نے اپنے والد سے اس بات کا ذکر کیا۔ میں ان کے خیالات جاننا چاہتی تھی۔ لیکن جناب میری توقع سے بڑھ کر مجھے جواب ملا کہ اگر تمہیں شوق ہے تو ضرور کرو، مگر اس کو مستقل بنیادوں پر مت اپنانا اور میں نے وعدہ کر لیا۔“

”مگر اب تو آپ نے اسے مستقل بنیادوں پر اپنایا ہوا ہے۔“

”دیکھیں! میری تاریخ پیدائش 16 ستمبر 1985ء کی ہے اور سولہ سال کی عمر میں میں نے پہلا کمرشل کیا۔ اس سے آپ خود اندازہ لگائیں کہ تیرہ چودہ سال پہلے نہ تو اتنے چینلز تھے اور نہ ہی لڑکیوں کو اس فیلڈ میں آنے کی اجازت آرام سے ملتی تھی مگر اب ماحول کافی بدل چکا ہے۔ اب شو بیا قاعدہ پروڈکشن بن چکا ہے



اس لیے اب اس فیلڈ میں آنے والوں کو بیکار یا برا نہیں سمجھا جائے۔  
”دل چاہتا ہے کہ جس طرح آج کل ہر وقت اسکرین پہ نظر آتی ہوں ہمیشہ ایسی ہی نظر آتی رہوں۔“

”نہیں بالکل نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر وقت اسکرین پہ رہنے والوں کو لوگ پسند نہیں کرتے۔ میرا نظریہ تو یہ ہے کہ کبھی کبھار اوگر اچھے کردار میں اچھا اور پاور فل کردار میری پہلی ترجیح ہے۔“  
”اپنے آپ کو صرف چھوٹی اسکرین تک محدود رکھنے کا ارادہ ہے؟“

”فی الحال تو ایسا ہی ہے۔ لیکن اگر ”خدا کے لیے بھول اور رام چند پاکستانی“ جیسی اعلا معیار کی فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا تو انکار نہیں کروں گی۔“  
”پیشا کمائے کا شوق ہے؟“

”پیشا کمائے کا شوق ہے مگر بھوس نہیں ہے۔ کمرشل میں کافی پیسا ہے مگر کمرشل میں بھی کم کام کرتی ہوں، کیونکہ میں معیار کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔“

”بچپن میں انسان بہت خواب دیکھتا ہے۔ بڑے ہو

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

کوئی ایسا اٹل دل ہو

فیصلہ عین

قیمت --- 250/- روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔

کر یہ کریں گے، وہ کریں گے۔ یہ نہیں گے وغیرہ وغیرہ۔  
”آپ نے کیا خواب دیکھے تھے؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ خواہشات تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ میرے والد قوی ایرلائن میں رہے ان کے ساتھ کھونا پھرنا رہتا تھا تو دل چاہتا تھا کہ میں بھی پائلٹ بن جاؤں اور جہاز اڑا کر ادھر ادھر لے جاؤں پھر بڑی ہوتی تو ارادہ بدل دیا اور جب چھوٹی عمر میں بی وی اسکرین پہ نظر آنے لگی تو اپنا آپ اچھا لگا۔ پھر سی سوچا کہ کبھی مکمل کراچیت ملی تو اسی میں نام کمائوں گی اور اللہ کا شکر ہے کافی حد تک اللہ نے یہ خواہش پوری کر دی ہے۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔“  
”میں 16 ستمبر 1985ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ والدہ کا تعلق افغانستان سے ہے جبکہ والد کا تعلق کوئٹہ سے ہے۔ والد کافی عرصہ قوی ایرلائن سے وابستہ رہے۔ ہم تین بہنیں ہیں۔ بھائی کوئی نہیں ہے اور ہم تینوں ہی اس فیلڈ سے وابستہ ہیں۔ میں نے گریجویٹیشن کیا ہوا ہے۔“

”شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟“  
”شادی کو ایک سال ہو گیا ہے اور میری پسند کی شادی ہے۔ بہت خوش ہوں اپنی گھریلو لائف سے۔ میں نے جیسا چاہا ویسا ہی ہوا ہے۔“  
”شادی کے بعد زندگی تبدیل ہو جاتی ہے، کچھ فرق آیا آپ کی لائف میں؟“

”کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ میں جیسی پہلے تھی ویسی ہی اب بھی ہوں۔ مجھے صبح دیر تک سونے کی عادت نہیں ہے اس لیے شادی کے بعد بھی ایسی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔“  
”فاسخ اوقات میں کیا کرتی ہیں۔“  
”اپنے ادھورے کام مکمل کرتی ہوں اور میوزک سے دل بہلاتی ہوں۔“

☆

کیوں روانہ ہے ہر گھڑی دنیا  
زندگی مستقل سفر کیوں ہے

زندگی کو کون جان پایا ہے۔ لاتعداد سوالات ہیں اور جواب نامعلوم۔ 2011ء کا سورج بھی کچھ سوال چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ حالات و واقعات کے دھارے میں بہتی زندگی، اختیار و بے اختیاری کی کشمکش، وقت ماضی کی صورت، ذہن و دل میں جا بجا۔

لجائے گزشتہ کا احوال، خوش گوار اور ناگوار یادیں، زندگی کی رنگارنگی کا حصہ ہیں۔ ان ہی گزرے واقعات کی روشنی میں ہمیں آگے بڑھنا ہے اور نئی راہیں تلاش کرنا ہے۔

سال گزشتہ کے حوالے سے ہم نے اپنی قارئین سے کچھ جاننا چاہا اور یہ سوالات کے۔  
(1) اس سال نیوز چینل، سیاست، تکمیل، شوہر اور تحریر و تخلیق کے میدان میں مختلف شخصیات نمایاں رہیں، آپ کو کس شخصیت نے متاثر کیا اور کیوں؟

(2) گزرے سال کا کوئی اہم واقعہ یا خوشی قومی سطح پر یا ذاتی سطح پر؟  
آئیے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

## کیا ہولہ سال بھر میں

ادارہ

حرمت روا اگر کم۔ ڈالوال

نیا سال جہاں نئی خوشیوں نئی آرزوؤں، انگلیوں اور جذلوں کی نوید ہوتی ہے وہیں جاتا سال کچھ کچھ دل کو اداس کر جاتا ہے۔ و سیر کی ٹھنڈی ٹھارہ سے پر اور فک اور صبحیں جہاں جدائی کی پیامبر ہوتی ہیں وہیں جنوری کی نیم گرم دھیریں ٹھنڈے ٹھٹھے جذلوں کی امین ہوتی ہیں۔

دسمبر تو دسمبر ہے  
سب ہی کو رلاتا ہے  
ہمیشہ دیر کرتا ہے  
شتم کے طور رکھتا ہے  
سدا آخر میں آتا ہے

مگر جنوری بھی جنوری ہے ناں!

وہی گلیاں وہی کوچے وہی سردی کا موسم ہے  
اسی انداز سے اپنا نظام زیست برہم ہے

میری آنکھوں میں وہ اک لمحہ موجود اب بھی ہے  
وہ زندہ رات کی تنہائی میں سرگوشیاں کی ٹھیں  
کسی کی نرم گفتاری نے دل کو لوریاں دی تھیں  
وہ جس کے ہونے سے زندگی نغمہ سرانی ہے  
اسے کہنا! کہ بیٹگی جنوری پھر لوٹ آئی ہے  
اب ذرا رخ کرتے ہیں جناب سوالنامہ کی طرف!  
1۔ جی ہاں! بالکل بجا فرمایا آپ نے اس سال نیوز چینل سے لے کر تھیل کے میدان تک سب نے بے پناہ ترقی کی ماشاء اللہ۔

نیوز مجھے حالات حاضرہ سے باخبر رہنے تک ہی پسند ہیں۔ سیاست سے کچھ خاص دلچسپی نہیں ہے۔ شوہر بھی بس ٹھیک ہے مگر تحریر و تخلیق تو ہماری رگ و جان میں بہتی ہے۔ تحریریں تو اس سال بہت سی پڑھیں مگر ایک آدھ ہی ایسی ہوتی ہے جو آنکھوں کے رستے دل اور دل کے راستے خون کے ذریعے پورے وجود میں سرایت کر جاتا ہے۔

27 جنوری 2012

ماہنامہ شعاع 26 جنوری 2012





اس سال بہت سی رائٹرز کو پڑھا اور سب نے ہی ماشاء اللہ سے لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ مگر جو بہت اچھی تخلیقات تھیں وہ نیلے آبی (نیلہ عزیز) کا ”کردار“ اور فائزہ افتخار کا ”ماں جاو“ تھیں۔

فائزہ جی کا ناول تو بہت ہی اچھا تھا۔ پہلی قسط کچھ خاص نہیں لگی مگر دوسری قسط میں تو ہنس ہنس کر برا حال تھا میرا۔

2- سب سے پہلے میں نے ایسا نام دسمبر کے ”کرن“ میں پڑھا۔ اس سال 14 دسمبر کی ایک بیماری سی صبح میں مجھے اللہ پاک نے وہ عطا کیا جو میری خواہش بھی۔ نیلے آبی نے رابطہ کیا تھا مجھ سے! اور قومی سطح پر کرکٹ کے میدان میں پاکستان کی شان دار کارکردگی نے دل غم بایں کر دیا اور کوئی ایسی بات یا واقعہ قابل ذکر نہیں ہے۔ بس دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کی زندگیوں کو آنے والے سال میں لاتعداد خوشیوں سے بھر دے۔

شائلہ تاج۔ خان پور

1- آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے کوئی ایسا نہیں ملا جس کی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہو۔  
2- 2011ء کے شروع کے بس تین چار ماہ ہی میں نے بہت فراغت میں گزارے ہیں اور بہت انجوائے بھی کیا کیونکہ بعد میں میں نے ٹیچنگ شروع کر دی تو

مصروف ہو گئی۔ بہر حال جو بھی فارغ وقت ہوتا ہے یا تھا اس میں میں نے ڈرامے بھی دیکھے اور بہت سے میگزین بھی پڑھے۔ دوستوں سے SMS میں گپ شپ بھی رہی اور گھوٹی پھری بھی خوب۔ ارے آپ کہیں گی کہ آپ نے جو جو پوچھا میں نے وہ سب کیا یعنی میگزین بھی خوب پڑھے دوستوں سے گپ شپ بھی رہی ٹی وی ڈرامے بھی دیکھے اور گھوٹی پھری بھی جی ہاں میں نے یہ سب کیا 2011ء مری کی سیر کی میں ایوبیہ بھی ایک ساتھ ہی گئے۔ ایوبیہ بہت خوب صورت جگہ ہے مگر وہاں کاراستہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ خطرناک بھی ہے۔ راستے میں ہم سب لوگ دو جگہوں پر رے۔ ایک جگہ پر دو ہوٹل تھے ہم لوگوں نے وہاں چائے پی اتنی زیادہ اونچائی پر، ایک طرف اونچے اونچے پہاڑ اور دوسری طرف گہری کھائیاں اور بادل ہر طرف اڑتے پھر رہے تھے وہاں بیٹھ کر چائے پینے کا تو مزہ ہی آگیا۔ ایوبیہ میں ابھی ہم لوگ چیئر لفٹ پر انجوائے کر کے اتر کے شاپنگ کر رہے تھے کہ بوند باندی شروع ہو گئی اور ڈرامہ ہونے والی کی جلدی چا دی اور ساتھ دھمکی بھی دی کہ اگر نہ آئے تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ مجبوراً ہم وین کی طرف بھاگے۔ خیر جیسے تیسے وہاں سے نکلے بارش زوروں پر تھی اور راستہ آہستہ آہستہ خطرناک

اور اندر رکھائی کے بالکل ساتھ ساتھ وین چلا رہا تھا اور ہمارے دل ہول رہے تھے۔ پھر ہم نھتیا چلی گئے۔ وہاں کی خوب صورتی اپنی مثال آپ ہے۔ مری سے واپسی پر ہم راولپنڈی اور اسلام آباد بھی گئے۔ مری میں جتنی ٹھنڈ تھی وہاں اتنی ہی گرمی۔ بہر حال ایک بہت اچھا ٹرپ انجوائے کر کے ہم لوگ اپنے گھر ”خان پور“ واپس آ گئے۔

فارغ وقت میں میری بہترین تفریح رسالے پڑھنا ہے۔ گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں اور سردیوں کی لمبی اور ٹھنڈی راتوں میں مجھے رسالے پڑھنا بہت پسند ہے۔

مجھے چھوٹی چھوٹی باتیں اکثر بہت خوشی دیتی ہیں۔ کسی دوست سے کٹنی عرصے بعد بات ہو تب میں بہت خوش ہوتی ہوں جیسے کچھ دن پہلے میں ایک شادی میں گئی۔ وہاں اچانک کسی نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، میں مڑی تو وہ میری بہت اچھی دوست کلاشم تھی، میری خوشی کے مارے چیخ نکلی گئی کیونکہ میں اس سے بہت دنوں بعد مل رہی تھی بس پھر کیا تھا۔ ہم دونوں نے وہاں کھڑے کھڑے اتنی باتیں کہیں کہ ہمیں بیٹھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ایک گھنٹے سے بھی زیادہ ہم وہاں کھڑے باتیں کرتے رہے اور

خوش ہوتے رہے کہ ہم کیسے آج مل گئے۔ کوئی بہت اچھا ڈرامہ دیکھ لوں، کوئی بہت اچھی کہانی پڑھ لوں، جب میری تینوں شادی شدہ بہنیں اور بچے ایک ساتھ آجائیں، بس ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہی میں خوش رہتی ہوں۔

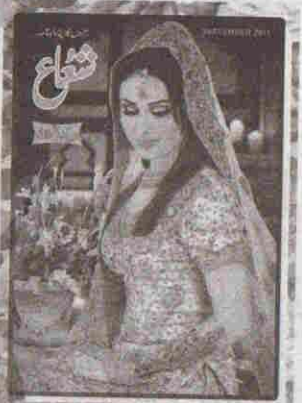
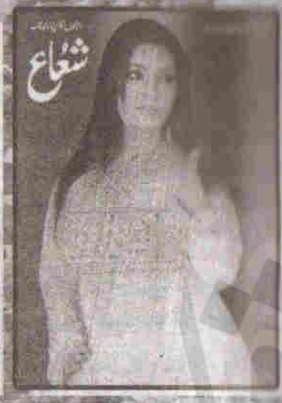
ڈاکٹر کول ستار آرائیں۔ لیاقت میڈیکل کالج جانشورو

لواک سال اور گیا عمر رواں کا پھر کبھی نہ آنے کے لیے۔

دسمبر کی تنگ راتیں اور اداس شامیں ہیں۔ ہلکی پھلکی پہلی دھوپ میں شعاع ملا اور حسب روایت سروے شامل تھا۔ بہت عرصے کے بعد کسی سروے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ جب تک یہ جوابات شائع ہوں گے۔ (اگر ہو گئے تو سہ)۔ جو رے نگار رہی ہوگی تو سب کو سال نو کی ڈھیر ساری مبارک باد اس دعا کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ سب کی جائز خواہشات کو پایہ تکمیل تک پہنچائے آمین۔

1- بہت سارے لوگ اس سال اس جیون کے سفر میں پھنسنے مگر معین اختر کی شادی ہی کوئی پوری کر سکے گا۔ ذوالفقار علی مرزا کے بیانات بھی کافی مزہ دیتے رہے۔ شاید آفریدی کا جانا اور شان دار طریقے





ملوث تھیں۔ لیکن اب اللہ نے ظالم کی رسی کھینچ لی تو  
نتیجہ ظاہر ہے۔

عروسہ شہوار۔۔۔ جہلم

1- ہمیں الیکٹرانک اور پریس میڈیا جو کہ تیز ترین اور مستند ذرائع ہے، اس کی افادیت اہمیت سے انکار نہیں۔ مگر ہمیں تو باخبر رکھتے ہیں ہمارے بھائی جو آتے جاتے نیوز چینل آن کرتے ہیں۔ نیوز سنتے ہیں اور ہمارے کان کھلتے ہیں۔ آج یہ خبر آئی۔ آج یہ ہوا آج فلاں واقعہ پیش آیا۔ گزشتہ سال کئی کتابیں پڑھنے کو ملیں مگر پیشہ متاثر کیا بشری سعید کے ناول لفظ لفظ خوشبودن سفاک کرنے۔ سچ ہم تو گرویدہ ہو گئے بشری سعید کے اتنا اچھا اتنا خوب صورت دل موہ لینے والا انداز مائٹڈ بلوننگ الفاظ کے فسوں سے نکلنا مشکل ہو رہا ہے۔ ایسی حرمزہ کر دیتے والی خبریں ان کو تمہ دل سے مبارک، مبارک، مبارک۔ قلم پر گرفت مضبوط کہیں بھی کسی بھول کا احساس نہیں ہونے دیا یہ بشری سعید کے قلم کا ہی اعجاز و کمال ہے۔ میرے نزدیک گزشتہ سال کی بہترین تخلیق کار یقیناً ”بشری سعید“ ہیں۔

2- گزشتہ سال بھی خوشی کے حوالے سے مٹا رہا۔ جب ملکی حالات دگرگوں ہوں۔ قوم مصائب اور

فرسٹ پوزیشن والے اسٹوڈنٹ کے مارکس 449 تھے۔ اس اسٹوڈنٹ نے بھی اور میں نے بھی کچھ سیمینکشن میں ری مارکنگ کے لیے اپلائی کیا۔ تو اس اسٹوڈنٹ کے 5 نمبر بڑھ گئے اور میرے 6 نمبر یوں ہم دونوں کے مارکس 454 ہو گئے۔

خاندان بھر۔۔۔ سے میں نے خوب شاباشیں سیکیں۔ (اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے وہ خوب نوازنے والا ہے)

علاقائی سطح پر اہم ترین واقعہ یوں ہے کہ ہمارے شہر جوہلی لکھائے ہمسائے میں ایک گاؤں وساوی والا (wasavay wala) ہے۔ چھ سال قبل سے یہاں بچوں کے اغوا ہونے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ جو بڑھتے بڑھتے ہمارے شہر تک آ گیا۔ چند سال کے عرصے میں سے زائد کم عمر بچے اغوا ہو گئے۔

ابھی تین چار ماہ قبل ایک کوچوان کا بچہ اغوا ہو گیا۔ دو ماہ کے بعد اس بچے کی کئی سڑی لاش ملی لیکن اس کی جیب میں اغوا کاروں میں سے ایک کا شناختی کارڈ نکلا بعد ازاں تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ وہ اغوا کار کا ہی شناختی کارڈ ہے۔ اغوا کاروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ انتہائی دکھ ہوا یہ جان کر کہ وہ اغوا کاروں کا گروہ گاؤں کی ایک چالی پچالی قبیل تھی جو عرصہ دراز سے یہاں کے مکین تھے۔ انھوں نے کام میں ان کے گھر کی عورتیں تک

جاگتی آنکھوں کے خواب اور سننے۔

بس اللہ سائیں ان خوابوں کی اچھی سی تعبیر دے کر محبتوں کی زندگی میں امر کر دے آمین۔!

فرخ فاطمہ۔۔۔ جوہلی لکھا

1- بلاشبہ اس سال زندگی کے بہت سے شعبوں میں بہت سی شخصیات نمایاں رہیں۔ لیکن مجھے تو پیارے رسالوں خواتین و ناچسٹ اور شعل کی رائٹرز نے متاثر کیا۔ یہ وناچسٹ چلچلاتی دھوپ میں گھنیری چھاؤں اور کمرزہ ٹھنڈ میں نرم گرم دھوپ کا احساس دلاتے ہیں تو ان ہی عظیم رائٹرز کی وجہ سے۔

نمو احمد جنہوں نے ”مصحف“ لکھا اور دلوں کو جیت لیا۔ اس مکمل ناول کو پڑھ کر بہت سی قارئین کو قرآن مجید فرقان حمید کو ترجمے سے پڑھنے کا جو شغف ہوا۔

سایا سطح پر تو کوئی پسند کرنے کے لائق ہی نہیں ہے لیکن میں عمران خان سے کچھ کچھ متاثر ہوں۔ اب دلوں کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔

2- گزشتہ سال کا ایک بے حد اہم واقعہ میرے لیے یہ ہے کہ 9th کلاس کے بورڈ کے انکیزام میں اللہ کے فضل و کرم سے میں نے 480 میں سے 448 نمبر لے کر شہر بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

سے آتا۔۔۔ جاوید چودھری کا مران شاہد اور حامد میر کے ٹاک شوز۔۔۔ عمیرہ احمد کے ڈرامے اور اب فرحت اشتیاق اور افسانہ نگار عدنان کو دیکھ کر اچھا لگا۔۔۔ اعتصام الحق جہاں جہاں ہمیں پاکستانی ہونے پر فخر میں جلتا کرتے رہے۔ وہاں عامر اور آصف نے جیل جا کر کسر پوری کی۔ لیکن ان سب میں عمران خان کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ خان صاحب سے متاثر تو نہیں کہہ سکتے مگر وہ مجھے اچھے لگتے ہیں

2- قومی سطح پر پاکستان کا کسی فاسٹ میں ہارنا وہ بھی انڈیا سے ہارنا آج تین سال تک نہیں بھولے گا۔۔۔ گلی محلوں میں جو میگا اسکرین لگی تھیں۔۔۔ اور جو جوش و خروش تھا اور ہارنے کے باوجود قوم نے وسیع دل کا مظاہرہ کیا تھا۔ واقعی متاثر کیا۔ ڈھیر ساری باریشیں اور ہم اندرون شدہ کی شامت۔۔۔ کھروں تک پانی تھا اور ہم سب نے تیرنا سیکھا اک بہت ہی مشکل وقت تھا۔ مگر گزر گیا۔ شکر اللہ! ذاتی سطح

اہم اہم۔۔۔ آج کل ہم جنہوں کے دیکھ جاتے ہیں اور تیلیوں کے رنگوں کو انگلیوں پر محسوس کرتے ہیں۔۔۔ کچھ دھوپ چھاؤں کا سفر ہے۔ خزاں کے سوئے پتوں پر چلنے میں بھی مزا ہے اور بارش میں بھیگنے میں بھی۔ یہ سب کچھ سیکھ رہے ہیں۔ خواب، سپنے







مگر اب ایسے لگتا ہے کہ یہ ہمارے رگ رگ میں سرایت کر چکا ہے۔ نیسی فاضل کا ہارنا شاید آفریدی کا ٹیم سے جدا ہونا بہت دکھ دے کر گیا پھر ہم سب نے بہت دعائیں کیں کہ شاید آفریدی دوبارہ ٹیم میں واپس آئے اور ٹیم کو بلندہوں پر لے جائے اور اب گزرے سال پاکستان مسلسل چھ دن کے سیریز جیت کر اپنا لوہا منوا چکا ہے۔ سعید اہمل ون ڈے سیریز کے فرسٹ نمبر باؤلر بن گئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسے ہی انہیں سرفرو کرے آمین!

2- گزرے سال کا اہم واقعہ اور خوشی میری اپنی ہے اور وہ ہے پاکستان کے خاموش شہر اسلام آباد جانا جو کہ اللہ تعالیٰ نے میری خواہش پوری کی یہ میری زندگی کی بہت بڑی خوشی ہے۔ مجھ جیسی تباہی پسند لڑکی کو اسلام آباد ہی سوٹ کرنا ہے۔ میری زندگی کی وہ خوب صورت شام جو کہ اسلام آباد میں اپنی چھوٹی خالہ محکم اور خالہ نجمہ کے ساتھ گزاری، میرے لیے بہت خوشی کی بات ہے۔ (ہوں نا ایک سادہ سی لڑکی)

اُم کلثوم رائے۔ اختر آباد (اوکاڑہ)

1- پہلے سوال کو پڑھتے ہوئے اس کے حصے بنا کر جواب دینا چاہوں گی، نیوز جھیل کی تو کیا بات کرنی چاہیے میرے پسند ہیں ہر لحاظ سے سیاست میں پہلے کچھ نہ تھا لیکن لگتا ہے عمران خان بہت سوں کی طرح ہمارے دل میں بھی گھر کر لیں گے (لیکن ان کی باتیں کہاں تک سچائی کی حامل ہیں یہ تو وقت ہی بتائے گا) شوہر میں جہاں تک میرا خیال ہے کہ کچھ برائے لوگ ہی ہیں جن میں کچھ اپنے فن کی وجہ سے مشہور ہوئے اور کچھ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے مجھے عاطف اسلم پسند ہے ظاہر ہے اور علی ظفر ہر لحاظ سے پسند ہے اس کی ایکٹنگ بہت زبردست ہوتی ہے۔ کھیل میں نیو میں کرکٹ اعزاز چیمپ نے اور عصام الحق نے (ویسے عصام کی شکل میرے بھیا سے بہت ملتی ہے) متاثر کیا

ہے۔ بھی یہ کیا کوئی کیوں اچھا لگا؟ بعض لوگ بغیر کسی ریزن کے اچھے لگتے ہیں ویسے ہی جیسے کچھ لوگ بغیر کسی ریزن کے برے لگتے ہیں (انتہائی برے)

2- گزرے سال کا پسندیدہ واقعہ آہم ہے تو جناب پسندیدہ بھی کوئی نہیں۔ اہم بھی کوئی نہیں لیکن چلو ایک چھوٹا سا واقعہ بتاتی ہوں واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک دفعہ میری فرینڈز سے میری لڑائی ہو گئی تھی اور میں تباہی کر رہا تھا پڑھ رہی تھی تب ہی رسالہ پڑھتے ہیروئن کے ساتھ ناروا سلوک کو دیکھ کر میں رو دی تھی اور میری فرینڈز نے نہ صرف مجھے چپ کروایا بلکہ سوری بھی کی (وہ سمجھیں میں ان کی وجہ سے) جہاں تک ذاتی خوشی کی بات ہے میری زندگی میں خوشیاں بہت کم ہیں یا پھر مجھے سیلیبیٹی ہی نہیں کرنی آتیں ویسے میں جب جب سمیٹا کے ساتھ ہوتی ہوں خوشی محسوس کرتی ہوں (سمیٹا اقبال) قومی سطح پر غم کے ساتھ ساتھ خوشیاں بھی بہت ہیں۔

مجھے تب خوشی ہوئی جب آفریدی کو ٹیم میں شامل کیا گیا اور تب خوشی ہوئی جب عصام جیت کے لوٹا اور تب خوشی ہوئی جب زرداری کو ہسپتال سے باہر خیر چھوڑیں ہم کیا اور ہماری خوشیاں کیا جاتے ہوئے ایک بات کہوں گی۔

وقت کا کام تو گزرتا ہے سو گزر جاتا ہے سو پلیز ہو سکتا ہے یہ گھڑی قبولیت ہو تو آپ میرے لیے ہو لے سے دعا کرویں کیا پتا میرا۔۔۔ کل بدل جائے۔





# دلدار

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سویتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خارا اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے مدنا و نعم کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبدہ خاطر ہے۔ جتنی کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو تلے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا کلراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو بدلو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلے ہوئے خیام رحمہ کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پیشانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڑتے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا دیر جہاں ان سے شہر اکریسے کوئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بالو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ لکٹی آدلی چوڑیل دیکھ کر خیام کو شہر دھچکا لگتا ہے اور یہی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھر ورا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

رمیدہ کا تعلق مفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری حکم کے ایمان دار بڑا کلک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل آبا کا پرتو فانی کا ملن ہیں وہ ہر چیز بخوبی رکھتا ہے۔ جتنی کمائی بڑھاتی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور رمیدہ کے طے دھاگو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور بیسے کو سب کچھ سمجھتی ہیں۔ سرکاری حکم میں کلک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصہ لکھا پکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی اطاعت کی دھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت رمیدہ جبکہ جوا کی بات معاذ سے سنے ہوتی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر غماز ڈال دیے۔ چنانچہ سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زویر کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ رمیدہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جوا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موانعت نہیں ہیں۔





زندان بچنے کے جنگ کو شہر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ جینے کی پہلی جھلک کو یہاں سے غریب عورتوں کو امید دی جاتی ہے۔ خالہ افروز، سعیدہ اور بنوں جی کتنی ہی عورتوں کے گھر اس امید کے سہارے بن رہے ہیں۔ بوا عظمت، زندان بچنے کی خاص ملازمہ ہے جو غصہ دراز سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

مسلمان رفتہ رفتہ زبیدی کی مارت سے متاثر ہو کر اس کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ مذہبی باپن میں ماہیوں سے ہر جائزہ ناجائز ہر طرح کی خواہشات نواہی ہے۔ انہیں جی، شاکر، بچم اور باگل کی سولہ تلپانے کے کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی تمام امیدیں زبیدی کو ملنے والے جنگے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔ اسکول کے بچے سید کے معاملے پر معاذ پر قائلانہ حملہ ہوتا ہے جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فلی شہریدہ کوفت اور بریشائی کا شکار ہو جاتی ہے۔ بعد اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی پاجاتی ہے۔ انہا بچا خاندان مع سولے جویا اور زبیدی کے اس حادثے سے خوب خطا اٹھاتا ہے۔ جو با جاتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ نہیں پاتی۔

دلدار نانی کے جو اسکول رولوں دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جس پر نگینہ آئے دن جتنی کڑھتی رہتی ہے۔ شام ہر موقع پر اس کی انگلی ٹوٹی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی مندل سے وابستہ ہیں۔ گیتی زیادہ تر بڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی داد اس کے خالوں کی دنیا کو یاد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمد و رفت اسے قد سے بے چین کر رہی تھی۔ خیام کو پورے بعد میں ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دھوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر گیتی کی پوری اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بڑائی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا صرف باور شوکت سے اس کی اچھی دُعا سلام ہے کہ راجا بچم تمام تر اعتبار کے باوجود گھر سے لائے دیورات کی پوری ہوجاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھیں۔ اس کے بعد مستقل پر ایک سولہ نشان لگ جاتا ہے۔

زندان بچنے کے لیے اس کی دیکھو رولوں کی طرح خود غامی اور خود ستانی کا شکار ہیں۔ بیٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سکرٹ پر بندنے کی عادت ہے۔ حالیہ سکرٹ پر بیٹل سے ان کا تعلق ”ہر کسی کی نظر میں ہے۔ بیٹل سے ڈرا ہو کر ان کی مدر سے یہ نوکری ملی ہے۔ زندان بچم کی دی مہارات سے بھر پور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا جزیں ہوتا ہے۔ زندان بچم کے بھائی یوسف کمال، بیٹل کی عیاض فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زندان بچم بھینچوں میں ڈال دیتی ہے۔

زیورات کی پوری کے بعد سے خیام کے بُرے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ بیسے بے گھر ہونے لگتا ہے۔ باور شوکت کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں باور شوکت اس کی بہت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی داد سے بے چہرہ رہتی ہے۔ خاص طور پر گیتی کی چوڑیاں اسے یاد کی دود سے باز رہے ہوئے ہیں۔

گھر میں جو بچے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آباگل سے بحث کرتی ہے۔ آباگل کی لالچی باتوں پر وہ براہ راست اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی تنجائی کا پتہ لگتا ہے۔ دوسری طرف آباگل کے شوہر اکبر اپنے انزور و روح سے معاذ کو مطمئن والی نوکری کسی اور کو دلا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے معاذ کا ہم بھتیجہ ہیں۔ سلمان، زبیدی کے گھر میں شفٹ ہو چکا ہے اور شاہ زوداد ہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاہ زبیدی بچم اور انہا ہر صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جو با کا رشتہ آنا فانا ہے جو با ملے جس میں انہا بچا، آباگل اور شاہ زبیدی کی کوششیں شامل ہیں۔ شاکر بچم کو طلاق کی دھمکی اپنا کام دکھاتی ہے۔ درجہ بیا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خرابیک ساتھ ملتی ہے۔ وہ کم ختم سا ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر دلدی، بچا انہا کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زبیدی، جویا کو اس کی سے کراڑہ چاہے تو دشت ختم کرنے میں مدد کر سکتی ہے۔ زبیدی، آباگل اور شاہ زبیدی کو بچا دکھانا چاہتی ہے تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے۔ مندل کو مالی صواب کی فلم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا جاتی ہے۔ ایسے ہی اسے سماں نگینہ کے طور پر لے لکھتے ہیں۔ وہ اسے ساتھ لے جاتے ہیں انکار کر دیتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

۴۷

سینا السیول قیظ

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ سالار تشویش سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اے اے ایسے ہی شاید کچھ جگر سا آگیا تھا؟“ وہ ان سب کو مطمئن کرنے کے لیے ہلکے سے مسکرائے بھی ہنجر کا پکا کاڑھا اور تک اب تک بحال نہیں ہوا تھا۔

”کنا ہے۔“ آج کل کام کا زیادہ پریشاں ہوا ہے آپ نے میری مائیں تو چند دنوں کے لیے چھٹی پر چلے جائیں،

”کمال صاحب کو اس کی اپنے لیے فکر مند کی اچھی لگی تھی۔

”مشورہ تو اچھا ہے، مگر سب کچھ دوسروں پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ کاش! کوئی ایسا ہوتا جس پر میں مکمل بھروسہ کر

وہ خود کو سنبھال چکے تھے لیکن لہجے کی ہلکی سی افرنگی کو سب ہی نے نوٹ کیا۔ مسز کمال نے بے چین ہو کر پہلو

”شاید اب اس عمر میں یوسف کو بیٹے کی کمی کا احساس ہونے ہی لگا ہے۔“

”تھوڑا سا اعتبار چھ پر کریں تو میں آکر دیکھ لوں گا، آپ کی غیر موجودگی میں آپ کا آفس۔“ سالار مسکراتے

”یہ تو میرے لیے خوش قسمتی کی بات ہوگی کہ تم اپنا قیمتی وقت مجھے دے سکو، مگر تم تو اب کراچی میں زیادہ دن

”اب ہمیں رہوں گا۔ بے فکر ہیں۔“ سالار نے اک مسکراتی ہوئی نظر گیتی پر ڈالی تھی ”وہاں لاہور میں جو

بیٹے کے چہرے پر اس کی بات کے ساتھ ہی شرمیلا سا تاثر پھیلا۔

یوسف کمال کی نگاہ پھر اس پر جا کر رہی تھی۔ وہی دل ریا سا انداز جو انہیں کبھی دنیا جہاں سے بیگانہ کرنا تھا اور

”ہیکم ستارہ جان تو ہمارے کلاسیکل میوزک کا بہت بڑا نام ہیں۔ مگر کیا وجہ ہے جو وہ اب بہت سالوں سے‘

گیتی سے بہت سنبھل کر پوچھا گیان کا سوال کسی گم گشتہ کڑی کی تلاش کا ہی حصہ تھا۔ کھانا لگوانے کے لیے

”نالی کی صحت بہت عرصے سے زیادہ اچھی نہیں ہے انکل! ابھی پچھلے سال پی ٹی وی کے لیے انہوں نے چند

”شاید سالار کا دیا ہوا اعتماد تھا جو وہ اتنے اطمینان سے اپنے گھرانے کے بارے میں بات کر رہی تھی۔

”میں نے مدت ہوئی ٹی وی فلم، تقریباً سب ہی کچھ چھوڑ دیا ہے، مگر بچم ستارہ میری بہت فیورٹ رہی ہیں۔

”آپ نے شکر ادا کیا کہ اس کی ماں باہر جا چکی تھی، ورنہ ایک بڑا بھگڑا اس خوشگوار رُز کے بعد اٹھنا لازمی ہوتا۔



”آپ کو کیسے بتا کہ میں جب پیدا ہو گئی تھی یا نہیں؟ کیا آپ ہمارے گھر آئے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“  
”تم بہت چھوٹی ہو گیتی!“ انہوں نے نرمی سے اس کی بات کاٹی اور تمہاری عمر کا اندازہ لگانے کے لیے مجھے  
تمہاری تاریخ پیدائش جاننے کی ضرورت نہیں ہے“ اسی لیے میں نے کہا کہ یہ تمہارے پیدا ہونے سے پہلے کی  
بات ہے۔“

اس بار اس نے صرف ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔  
اور وہ بھی تو اسی طرح بات کرتے کرتے خاموش ہو جایا کرتی تھی۔ کوئی بحث نہیں!  
کوئی یاد بھی، جو آج نکلنے کے لیے تیار نہیں تھی، ایک مستقل ہونی دستک!  
”اس بار ہم لاہور جائیں گے“ تو آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔ ثانی بہت خوش ہوں گی آپ سے مل کر۔  
انہیں بڑا گلہ ہے کہ اب اچھے میوزک کی قدر کرنے والے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔“  
سالار کو بہت اچھا لگا تھا، ان کا گیتی کے ساتھ اس طرح اپنائیت سے بات کرنا۔

کمال صاحب کا روزیہ روزہ روز اسے حیران کر رہا تھا اور قریب لارہا تھا۔ مسز کمال سامنے وسیع ڈائننگ ہال میں  
کچھ بدایت دیتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔  
ایک وقت تھا، جب وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لوگ اسے اتنے تباہ سے اپنے گھر پر انوائٹ کریں  
گے۔ وقت، لوگ شاید ہر چیز سے بدلنے کے لیے ہی ہے۔ عادتاً وہ کہیں سے کہیں پچھتے لگا تھا، تب ہی کچھ اور  
بہت ضروری یاد آیا۔

”مجھے کچھ ضروری بات کرنی تھی آپ سے انکل!“ انہی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے کمال صاحب کو اشارہ کیا،  
تو انہیں بھی یاد آیا کہ سالار کو کچھ بہت ضروری بات کرنی تھی اور جسے سننے کے لیے وہ بے چین بھی تھے۔  
مگر یہ لڑکی۔

گیتی اب زویہ کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔  
وہ سالار کے ساتھ ڈرائنگ روم کے دوسرے حصے کی طرف بڑھ گئے۔  
”روزی کا سراغ ملنے کی امید ہو رہی ہے انکل! اس بے چاری کے زندہ ہونے کا امکان تو نہ ہونے کے برابر ہی  
ہے، لیکن کم از کم انصاف تو ہو جائے۔ میری بات ہو چکی ہے۔ کیس تیزی سے آگے بڑھا ہے۔“  
”مجھے پورا یقین ہے کہ جو کچھ بھی ہوا ہے، اس میں نیل پوری طرح ایوانو اہے اور میں اس کے لیے زرتاج کو  
کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔“ یوسف کمال کے لہجے میں بڑی درد مندی تھی۔  
”ان پر تو خیر اور بھی قرض نکلے ہیں، مگر جانے دیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ تلخ ہونے لگا تھا، پھر فوراً ہی  
سنجھل گیا۔ ”سوری!“

ماضی میں جو کچھ بھی تھا اب، ہر حال یوسف کمال اس کے لیے خلوص بھرا حوالہ تھے۔  
”نیل کا تعلق لوڑ کلاس سے ہے انکل! راجو اسے یہاں لایا تھا۔ راجو وہی ڈرائیور جس سے روزی کی شادی  
ہونے والی تھی۔“

”میں سمجھ رہا ہوں، لیکن سالار۔۔۔“ کمال صاحب کے لہجے میں ہلکی سی الجھن اتری۔ ”میری نیل سے نفرت  
میں اس کی کلاس کا دخل نہیں۔ غربت انسان کا عیب نہیں، مجبوری ہوتی ہے۔ مجھے اس کی خراب فطرت اور  
کینگی نے پریشان کر رکھا ہے۔ ناقابل برواشت ہے وہ شخص، پتا نہیں زرتاج کو اس میں کیا دکھائی دیا۔“  
”وہ آپ کی بہن ہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ سالار کی آواز دھیمی تھی۔ ”لیکن نیل، میری اور آپ کی سوچ  
سے بھی زیادہ گھٹیا شخص ہے۔ میں راجو کے ساتھ گیا تھا اس کے پرانے محلے میں، بہت ہی خستہ حالت تھی ان کا

ہاؤس اور بسن کی۔ سنا ہے اس نے ان کی کبھی خبر تک نہیں لی اور نہ ہی لینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ محلے والے تو نیل  
کا نام تک فحاشی سے لیتے ہیں۔ راجو تیار رہا تھا کہ کئی سال پہلے کوئی لڑکی بھاگ کر۔۔۔“  
راجو کے اتنے دن کے ساتھ میں سالار کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا اور اس سارے پیرا گراف کو  
مسلک کمال کے لیے بھی خاصا صبر آزما رہا۔

”دل تو چاہتا ہے کہ ساری عمر زرتاج کی شکل بھی نہ دیکھوں۔ کسی اور کی نہ سہی، اپنے بیٹے کی ہی شرم کر لیتی، جو  
سالوں سے یو کے میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ نہیں چاہتیں کہ مانی بھی واپس آئے، اس لیے کہ نیل ایسا نہیں  
چاہتا۔“

چند لمحوں کے لیے وہ کسی سوچ میں ڈوبے۔ ”سالار!“  
”جی!“  
”ہمیں نیل کی بسن اور بھابھی سے ملنا ہو گا۔ کیا یہ ممکن ہو گا؟“  
”وہ یہاں نہیں ہیں انکل! لیکن پتا چل جائے گا ان شاء اللہ! میں کو شش کرتا ہوں۔“  
انہیں کھانے کے لیے بلایا جا رہا تھا۔

”سالار!“ جب وہ اٹھ رہے تھے تب یوسف کمال کچھ کہنے کے لیے رکے۔ دھنپا کچھ کے ان کی طرف مڑا۔  
”تمہاری بیوی بہت اچھی ہے، بچ بچھو تو مجھے تمہاری مضبوطی پر بڑا خرسا ہوا ہے۔ خدا کرے کہ یہ محبت ہمیشہ  
 قائم رہے۔“ گیتی کو زبانی کی سفارشی کی نذر مت ہونے دینا۔

ان کے لمحے میں کچھ عجیب سا احساس تھا، مگر سالار بڑی لاپرواہی سے ہنس پڑا۔ ”مجھے ایسا سمجھتے ہیں کیا؟“  
”نہیں، لیکن لوگ آج بھی اس بات کو آسانی سے ہضم نہیں کریں گے، زندگی جنم ہنادیں گے تمہاری بھی اور  
گیتی کی بھی۔“

یوسف کمال کے ساتھ تلخ ترین یادیں تھیں۔ سالار کے چہرے کی مسکراہٹ دھیمی بڑی تھی۔  
”سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے انکل! بہت سے ایسے بھی ہیں جو انسان کی عزت کرنا جانتے ہیں۔ آپ خود  
اس کی مثال ہیں، گیتی محبت سے ملے ہیں آپ گیتی سے۔“

”میں تو یوں ہی کمزور سا انسان ہوں، پتا دینا کی بہت زیادہ پروا کرنے والا، دنیا کے ڈر سے راہ بدل لینے والا، تمہیں  
بارے میں یوں ہی خوش گمانی ہے۔“ ان کی آواز بتدریج نرم پڑی ہوئی۔  
سالار نے ان کی افسردگی کو بجھا طور محسوس کیا تھا۔ وہ تھوڑا سا حیرت زدہ بھی ہوا۔

”آجائیں بھی کھانا لگ چکا ہے۔ سب آپ کے انتظار میں ہیں۔“ زویہ نے کچھ فاصلے سے آواز دی تھی۔  
”چلو!“ وہ اسے کچھ کہنے کا موقع دے بغیر آگے بڑھ گئے۔  
سالار کی آنکھوں میں الجھن باقی تھی۔ رات کی کچھ گھڑیاں یکساں رفتار سے گزریں۔

”تمہیں کیسے لگے کمال صاحب اور ان کی فیملی؟“  
”بہت اچھا، واپس آ رہے تھے تو اس نے ساتھ بیٹھی گیتی سے مسکرا کر پوچھا تھا۔ آج وہ اسے ہمیشہ سے زیادہ پر اعتماد  
ہو رہی تھی۔

”سب ہی لوگ اچھے ہیں، خاص طور پر کمال انکل کا تو جواب نہیں ہے۔ انہوں نے ثانی کے بارے میں جان کر  
میں ہمارا پاس دیا تھا، ہے نا۔“ وہ اتنی خوش تھی کہ آنکھوں میں نمی سی آ رہی تھی۔  
”اوں ہوں!“ سالار نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھاما تو اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑا کر اپنی آنکھیں خشک کیں۔

”سب آپ کی بدولت ہے سالار! یہ سارا خیر سارا مان، سب ہی کچھ تو۔۔۔“



”اچھا بس! اسے شوہر کی زیادہ تعریف مت کرو ورنہ مجھے بھی جواباً اپنی بیوی کے لیے کوئی قصیدہ وغیرہ پڑھنا پڑے گا۔“ وہ گاڑی کی رفتار پھساتے ہوئے بات کو گھما گیا۔  
اسے گیتی کی محبت و رکار بھی، لیکن اس کا احسان مند ہونا قطعی نامنظور تھا۔  
وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ باہر دیکھنے لگی۔ رات خاصی ہو چکی تھی اور ٹریفک اب نسبتاً بہت کم رہ گئی تھی۔

”مجھے آپ کو ایک بات بتانی تھی!“ وہ اس کی طرف مڑی۔  
”ہوں!“ سالار کی نگاہ سامنے سڑک پر بھی، سووہ گیتی کے چہرے پر پھیلی کشمکش کو نہ دیکھ سکا۔  
”انکل نے مجھ سے میری فیملی کے بارے میں کافی پوچھا تھا، کچھ عجیب سا لگا۔“  
”ارے عجیب سا کیا، بتایا تو تھا انہوں نے کہ وہ تانی ستارہ کے کتنے بڑے قین ہیں، اسی لیے جانا چاہ رہے ہوں گے۔“ سالار نے لاپرواہی سے ہاتھ ہلایا۔ گیتی کے چہرے پر اب بھی الجھن باقی تھی۔  
”انہوں نے تانی کے بارے میں نہیں سالار! فیروزہ خالہ کے بارے میں جانا چاہا تھا شاید۔“  
”اچھا!“ سالار نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔  
”ہو سکتا ہے وہ انہیں بھی جانتے ہوں۔ اس لیے پوچھ رہے ہوں۔“  
”انہوں نے خاص طور پر نام نہیں لیا تھا، لیکن انہوں نے تانی ستارہ کی بیٹیوں کے بارے میں سوال کیا تھا ایک تو میری امی اور دوسری۔ ظاہر ہے وہ خالہ فیروزہ ہی تو ہیں۔“  
”تم نے کیا کہا؟“

”میں نے کہہ دیا کہ وہ بہت پہلے انتقال کر گئی تھیں اور یہ کہ مجھے ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں یاد اور یہ حقیقت بھی ہے۔“  
”اور!“

”اور کچھ بھی نہیں پھر زویہ آگئی تھیں تو بات آئی گئی ہو گئی۔“  
”چلو اچھا ہوا، بہر حال تمہیں کسی بات سے ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں نا۔“  
”تحفظ اور سکون کا وہی گہرا دل کو چھوٹا احساس۔ گیتی کو اپنی آنکھوں میں آتے تشر کے آنسو چھپانے کے لیے ایک بار پھر گردن موڑ کر خود کو بیاہر کے منظر میں محو کرنا پڑا تھا۔“



گھر کے ماحول میں بڑی نمایاں سی تبدیلی آئی تھی۔ سب ہی ایک دوسرے سے کترائے ہوئے رہتے۔ اپنے اپنے کمروں میں بند اور اب اور معاذ کا زیادہ سے زیادہ وقت گھر سے باہر۔  
گھانا بھی آج کل سب الگ الگ اپنی سولت کے حساب سے کھا رہے تھے۔ ربیعہ اپنا اور وادی کا کھانا نکال کر ان کے کمرے میں لے آتی، زری بھی چپ چاپ وہیں آکر بیٹھ جاتی۔  
آج کل خلاف معمول اس کی بھی زبان بند رہنے لگی تھی اور ساری سرگرمیاں تقریباً ختم تھیں۔ وادی کا دل اس سنائے میں اور بھی گہرا لگتا تو وہ زری پر ہی خفا ہو جاتی۔

”تجھے آخر کس غم میں چپ لگ گئی ہے، کتنوں سوچے جانی ہے جانے کیا کیا۔“  
وہ کب سے چپ چاپ ان کے پیر دیاری تھی، نہ ہوں نہ ہاں۔ وادی کی ناراضی بڑھنے لگی۔  
”کیا پوچھ رہی ہوں، بتائی کیوں نہیں ہے، کسی نے کچھ کہہ دیا ہے، طبیعت خراب ہے؟ اس طرح تو کبھی

خاموش نہیں رہتی تھی۔“ زری نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر ان کی طرف دیکھا۔  
”آپ سب بھی تو خاموش رہنے لگے ہیں وادی! لیکن کوئی کسی سے وجہ نہیں پوچھ رہا تو پھر مجھ سے کیوں؟“  
وادی کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر پڑا۔ ”ہم تو اپنے دکھ کے حصار میں ہیں بیٹا! معاذ کو چپ دیکھتی ہوں تو دل کھٹکتا ہے۔ کتنا تبدیل کیا ہے، پہلے ہی کون سی خوشی تھی اس کے پاس جو شائستہ نے اس روز خواہ مخواہ کی ضد باندھ لی۔ یہ جان کر بھی کہ وہ اپنی بات کا کتنا پکا ہے۔“

”انہوں نے منع تو نہیں کیا شادی کرنے سے، صرف یہی تو کہا ہے کہ ابھی نہیں کریں گے۔“ وادی نے کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
”تو تو کمرے میں نہیں تھی، تجھے کس نے بتایا؟“  
”میں یہیں برآمدے میں کھڑی تھی وادی! میں نے خود سنا تھا، معاذ کو کہتے ہوئے کہ وہ جو یا کا نام بھی نہیں لیں گے۔“

اپنی چوری پکڑی جانے پر وہ ذرا بھی نہیں بوکھلائی تھی اور آج کل وادی بات بات کو پکڑنے کے موڈ میں بھی نہیں تھیں۔  
”جو یا کا نام نہیں لے گا، یا پھر کسی کا بھی نام نہیں لے گا زندگی بھر۔ میں جانتی ہوں اسے اچھی طرح۔ اب نہیں کرنے والا وہ شادی۔ شائستہ کتنا بھی زور لگا لے۔“  
زری نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔ وادی کی آنکھوں سے چند آنسو ٹوٹ کر گرے تھے۔ زری نے جلدی سے اٹھ کر انہیں پانی کا گلاس تنھایا۔

”آپ اتنا دل پر مت لیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں دعا مانگ رہی ہوں سب کے لیے۔“  
پانی کا گلاس واپس رکھ کر وہ پھر سے ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ وادی نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔  
”اللہ تجھے بھی خوش رکھے، قسمت اچھی ہو تیری!“ وہ اداسی سے مسکرا دی۔

”پتا نہیں وادی! قسمت کا بھی کیا چکر ہے، آپ لوگ سہارا نہ دیتے تو میرا تو ٹھکانا بھی نہیں تھا کبھی، خیر میری بات چھوڑیں۔“  
ذرا رک کر اس نے شاید خود کو کپور کیا۔

”وادی! کبھی ہم دونوں جو یا کے گھر چلیں، چپکے سے امی کو بتائے بغیر۔“  
”یا گل ہوئی ہے کیا!“ وادی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”معاذ کی ماں ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی کی پروا انہیں کی اس نے۔ اتنی نفرت کرنے لگی ہے وہ جو یا سے کہ اسے کسی پر رحم تک نہیں آتا۔“

ان کا لہجہ قطعی تھا، زری پھر بھی اصرار کیے گئی۔  
”صرف ایک بار، کسی اور طریقے سے، میں ایک بار جو یا کو دیکھنا چاہتی ہوں وادی! آخر کیا بات ہے اس میں جو معاذ کو کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیتی۔“ زری کی آواز دھیمی تھی اور کچھ میں بڑی ٹوٹی سی کیفیت!  
وادی نے بس ایک ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں بند کی تھیں۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے ان کے پیر دیائے گئی کتنی ہی درگزر گئی۔

”وادی سو گئی ہیں کیا زری؟“  
ربیعہ نے دھیمی آواز میں کمرے میں جھانک کر پوچھا تو اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ربیعہ کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب تھی۔ آج کل اس کے پیپر زور رہے تھے۔



زری کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے ربیعہ نے پھر سے سوال دہرایا تھا۔ زری نے دھیرے سے سر ہلایا۔  
 ”تم بھی کچھ دیر آرام کرو زری!“ ربیعہ نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔  
 ”میں آرام سے ہی ہوں، آپ فکر مت کریں!“  
 باہر سے گاڑی اشارٹ ہونے کی آواز آرہی تھی، شاید معاذ کہیں جا رہا تھا۔ زری نے ربیعہ کو واپس پلٹتے دیکھا،  
 مگر آج معاذ کو محض ایک نظر دیکھنے کی خواہش نے اسے نہیں دوڑایا تھا۔ وہ یوں ہی اپنا کام کیے گئی۔



جویا نے ہاپوسی سے سامنے بیٹھے اس شخص کی طرف دیکھا۔  
 ”میں نے کہا تھا فی الحال کچھ عرصہ اسی طرح چلے گا یہ کیس۔ یہی بہتر ہے۔“ وہ رٹے رٹائے انداز میں بات کر رہا  
 تھا اس لیے کہ یہ سب اس کے روزمرہ معمول کا حصہ تھا۔  
 ”مگر یہ تو چل ہی نہیں رہا، کتنے دن ہو گئے، صرف تاریخ پر تاریخ چلی جا رہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ پچھلی بار کم از  
 کم ضمانت تو ہو گئی تھی، مگر اس بار تو۔۔۔“  
 باوجود کوشش اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے، جنہیں اس نے فوراً ہی ہتھیلی سے رگڑ ڈالا تھا۔  
 ”پچھلی دفعہ کچھ اور بات تھی، جرمانہ بھریا گیا تھا اس لیے رعایت بھی مل گئی، مگر اب مہلت ختم ہو گئی تھی اور  
 کیس کی تفتیش آگے بڑھ چکی ہے۔ چند اور لوگوں کے نام بھی شامل ہو گئے ہیں کیس میں اور ہر حال کروڑوں کا  
 معاملہ ہے۔“

اس کے سامنے اب کسی دوسرے کیس کی فائل کھلی تھی اور اس کی پوری توجہ اب اسی پر ہی تھی۔  
 جویا کو پورا یقین تھا کہ اب وہ اس کی بات ٹھیک سے سنے گا بھی نہیں، مگر خود اس کے پاس بھی اس کے علاوہ کوئی  
 اور چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کے پاس سے کم از کم کوئی حرف تسلی تو لے کر اٹھے۔  
 ”دیکھیں عارف صاحب!“ اس نے اپنے خشک ہوتے ہوئے منوں پر زبان پھیری۔ ”آپ کو پتا ہے کہ میرے ابو وہ  
 ساری رقم بھر چکے ہیں اور انہیں۔۔۔“

”دیکھیں مس جویا!“ اس نے سرولہجے میں بات کاٹی۔ ”یہ بات بار بار دہرائی جا چکی ہے، آپ کیوں نہیں سمجھ  
 رہیں کہ چند لاکھ جمع کرا دینے سے اظہار صاحب کے جرم کی سنگینی کم نہیں ہو سکتی۔ یہ معاملات مہینوں سالوں  
 میں جا کر حل ہوتے ہیں آپ کو جلدی ہے تو بہتر ہے کہ کوئی دوسرا وکیل کر لیں۔ ویسے بھی جو فیس میں نے آپ  
 سے لی ہے اس میں اتنا ہی کیا جاسکتا تھا، آگے کی ٹرمز اور کنڈیشنز مختلف ہیں اس حساب سے۔“

جویا کی ہاپوسی اور بھی زیادہ بڑھی۔  
 پچھلے سارے عرصے میں وہ فیس بہ فیس وصول کرتے آئے تھے، اور جس طرح وہ یہ ادائیگی کر رہی تھی، اس کے  
 بعد بھی وہ اب پچھلے ریٹ پر کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

”آپ ہمارے حالات سے واقف ہیں عارف صاحب! میں وعدہ کرتی ہوں، جیسے ہی ہمیں کچھ آسانی ہوئی اور ابو  
 کا یہ کیس ختم ہو گیا، ہم اس سے بھی زیادہ آپ کو پے کر سکیں گے، مگر اس وقت تو بڑا مشکل ہے، بلکہ۔۔۔“  
 بے چارگی سے اپنی درخواست ان کے حضور پیش کرتے ہوئے وہ خود اپنی نگاہوں میں گری جا رہی تھی۔

”ہم یہاں امکانات پر بات کرنے کے لیے نہیں بیٹھے ہیں اور ویسے بھی یہ کوٹ ہے اس طرح کے پروفیشنل  
 معاملات میں شام کو اپنے چیمبر میں نمٹتا ہوں، وہاں اگر بات کیجئے گا۔ اگر آپ کو میری کنسلٹیشن فیس منظور  
 ہے۔“



اس بار انہوں نے۔۔۔ اپنے سامنے رکھی اظہار صاحب کے کیس کی فائل بھی اٹھا کر جويا کے آگے کر دی تھی۔ ان کے پاس کچھ اور لوگ آکر بیٹھ چکے تھے۔  
جويا نے کانپتے ہاتھوں سے وہ فائل نکالی تھی۔ موسم بدل چکا تھا، پر اس پر ہجوم شہر میں دن کا یہ سرگرمی کی یاد دلاتا تھا۔

سیڑھیوں سے کمپاؤنڈ تک آتے ہوئے اسے کتنی ہی بار لگا جیسے وہ ہمیں کہیں گر جائے گی۔  
میاویسی کی آخری حد کو بھی پار کر لینے کے بعد کب سے پچھا کرتے اس سوال کا جواب مکمل کمرے میں تھا۔  
اس کے پیراچاک ہی بری طرح کانپے، قریب ہی پڑی ایک بیچ کو وہ نہ تھا متی تو لوگوں سے بھرے اس مقام پر ضرور ہی گر پڑتی۔

معاذ نے اسے دھوپ بھرے پرانے بیچ پر اکیلے سر جھکائے بیٹھا دیکھا تھا۔  
اپنے ارد گرد سے گزرتے لوگوں کی پروا کیے بغیر وہ اتنی تھکی تھکی اور خستہ حال نظر آ رہی تھی کہ معاذ نے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس کیا۔ اس پاس رش بڑھتا ہی جا رہا تھا، مگر پھر بھی۔  
”جويا!“ دھوپ سے بھرے اس پل میں ایک مہمان سا یہ اس پر آکر ٹھہرا۔  
جويا کو یوں ہی لگا سا ہوا تھا۔

”جويا! میں ہوں معاذ۔“ اور دیکھو میری طرف!“ وہ بہت نرمی سے اس کی طرف تھوڑا سا جھک کر پھر پکارا۔  
اس بار اس کا جھکا ہوا سر اٹھا تھا۔  
معاذ نے دیکھا اس کے لب بالکل خشک اور آنکھوں میں اتنی ویرانی کہ۔۔۔  
”تھو! یہاں کیوں بیٹھ گئی ہو؟ چلو میرے ساتھ۔“

وہ اب بھی اتنی بے یقینی سے معاذ کے چہرے کو تنک رہی تھی کہ اسے لگا جیسے وہ اس کی بات سن ہی نہیں سکی ہے۔  
”سوا سے بات دہرائی پڑی۔“  
”تھو! کہیں بیٹھ کر کھلی سے بات کرتے ہیں“ آج تو کیس چلنا تھا نا اظہار چچا کا؟ ابھی کتنی ویر ہے؟ عارف صاحب کہاں ہیں؟ وہی وکیل ہیں نا؟“  
جويا کو حیرت ہوئی کہ وہ اتنا باخبر تھا۔

”آج نہیں چلا کیس۔ پندرہ دن آگے کی ڈیٹ لے لی ہے انہوں نے۔“ آہستہ سے کہتی ہوئی وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔  
”کیوں نہیں چلا؟ کیا کہہ رہے ہیں یہ عارف صاحب۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ جان بوجھ کر پریشان کر رہے ہیں۔“  
ورنہ اتنا عرصہ۔۔۔

اس کے ساتھ ہلکے ہلکے چلتا ہوا وہ اس طرح تبصرہ کر رہا تھا جیسے خاموشی کا ایک لمبا ذورانیہ ان کے بیچ آیا ہی نہیں تھا۔

اس کیس کی ساری اونچ نیچ سے وہ پوری طرح باخبر تھا۔  
ایک تلخی مسکراہٹ جويا کے لبوں پر آئی۔

”سارے خاندان کی طرح تم نے بھی بھرپور دلچسپی لی ہے ابو کے کیس میں۔“  
”میری دلچسپی کی وجہ اتنی دل دکھانے والی ہے کہ ہم اس پر بات کرنے کی شاید ہمت بھی کھو چکے ہیں۔“  
جويا کے منظر خلاف عادت برآمدنے کے بجائے اس نے بہت جیسے لہجے میں کہا تھا۔ وہ کہہ کر بیچھتا لی۔  
خاموشی سے ست رفتاری کے ساتھ معاذ کے ساتھ چلتے ہوئے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ اسے کس

طرف لے جا رہا ہے۔

سخت پر ہجوم پارکنگ میں سے گزرتے ہوئے وہ اس مہارت سے اس کے لیے راستہ بنا تا جا رہا تھا کہ جويا کو ایک بار بھی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ورنہ وہ اس وقت اتنی منتشر تھی کہ شاید ابھی تک وہیں اس بیچ پر بیٹھی ہوتی۔  
چند منٹوں کا یہ ساتھ بڑی عافیت بھرا تھا۔

معاذ کی پشت پر نگاہ جمائے اس نے کتنی ہی بار گلی ہوتی آنکھوں کو گرد کر خشک کیا۔  
وہ مستقل عارف صاحب کی کار کو گلی پر تنقید کیے گیا، بنا جويا کی طرف دیکھے۔  
”ان کی رپوٹیشن سخت خراب ہے۔ نہ تو وہ اتنے قابل ہیں اور نہ ہی مخلص۔ بری طرح پیسہ لیتے ہیں اور کلائنٹ کو آخری وقت تک جھانسنے میں رکھتے ہیں۔“

”اس جھانسنے کا بھی آج آخری دن تھا۔“ جويا کی آواز نیچی تھی، مگر اس شور و غل میں بھی آگے چلتے ہوئے وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔  
”کیا مطلب؟“ معاذ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہی کہ اب وہ یہ کیس نہیں لڑنا چاہ رہے اور یہ کہ۔۔۔“  
بات کا دوسرا حصہ اس کی کہا نیکی کا قصہ بیان کرتا تھا، سو وہ بات اور دھوری چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔  
”کوئی بات نہیں۔ اچھا ہی ہے۔ ہم ویسے بھی ان کا مزید ساتھ نہیں چاہ رہے تھے۔“  
”ہم!“ جويا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں اور کیا؟ شہر میں مخلص اور قابل وکلاء کی کمی تھوڑی ہے۔ اظہار چچا کا کیس اب ہم کسی اور کے سپرد کر رہے ہیں اور دیکھنا! کتنی جلدی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ تم بالکل فکر مت کرو۔“  
جويا کی آنکھوں میں پھیلی حیرت کی ذرا بھی پروا کیے بغیر وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔  
”اور اب تمہیں یہاں آنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ یہ جگہ اکیلے آئے والی ہے بھی نہیں ویسے بھی۔ میں خود دیکھ لوں گا سب کچھ۔“

جويا نے مچلا لب سختی سے دانتوں نے دبایا۔  
معاذ اتنی بڑی دنیا میں آج بھی وہی تھا جو اس کے حصے کی دھوپ اپنے سر لینے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ دل نے شدت سے اس ایک پل میں جی لینے کی تمنا کی تھی۔

”دیکھو معاذ!“ خود کو بمشکل کمزور کرتے ہوئے وہ ان مہمان ساعتوں کے سحر سے نکلی۔ ”تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے اس حد تک ہمارا خیال کیا، لیکن اس کی ضرورت نہیں، کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے ہم لوگ۔“  
”ہم لوگ۔“ معاذ نے دل میں ہی دہرایا۔

”اور کون تھا اس کے ساتھ بھلا۔“ یوں ہی بلا مقصد اس کی نگاہ نے اطراف میں کسی جانے پہچانے چہرے کو تلاشا۔

”کوئی بھی تو نہیں۔“  
کوچنگ سینٹر کی طویل نہ ختم ہونے والی گلی سے لے کر بھانت بھانت کے لوگوں سے بھرے اس احاطے تک وہ پیش آگئی ہی نظر آئی تھی اور وہ سب جو اس کے سب سے زیادہ اپنے ہونے کے دعوے دار تھے ان میں سے کبھی کوئی ساتھ دکھائی نہ دیتا تھا، مگر وہ پھر بھی مٹھتی تھی۔

”آپاگل، مسلمان بھائی وغیرہ کسی دوسرے وکیل کا انتظام کریں گے جو زیادہ بہتر ہو گا۔“  
معاذ نرمی سے مسکرا دیا۔



”بہتر ہو گا یہ صفائی تم ان کے سامنے پیش کرو جو میرے ساتھ آئے ہیں۔“

جویا نے چونک کر اس کے ہاتھ کی سمت دیکھا۔

”اسلام چچا!“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ گاڑی کے قریب ابا کھڑے تھے ایک گہری سانس جویا کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔

\*\*\*

رات کا نامعلوم کون سا پر تھا۔

بڑی دیر سے انہوں نے گھڑی دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔

ایش ٹریے میں بجتے سگاروں کا دھیرا آہستہ آہستہ اونچا ہو رہا تھا، مگر اب دیرینہ عادت بھی سکون کا باعث بننے سے قاصر تھی۔ برسوں سے لگے بندھے معمول پر گزرتی محفوظ و مامون، خوش حال زندگی کو جیسے اچانک ہی کچھتاؤ اور سوسوں کی دیمک آن لگی تھی۔

جو قصہ برسوں پہلے اپنی طرف سے انہوں نے خوش اسلوبی سے منشا دیا تھا، سوہیا ج کے ساتھ وہ پھر سے ادائیگی کا تقاضا کر رہا تھا۔ نئی ہی بار وہ حالات اور واقعات کے تسلسل کو ذہن میں دہراتے، مگر کنفیوژن سا کنفیوژن۔ وہ سب کچھ جس پر بہت پہلے صبر کر لیا گیا تھا اور مرکز نہ دیکھنے کا ارادہ بھی مصمم تھا، ان کی ہر کوشش کو مفر کرتا ہوا خود ہی سامنے آکھڑا ہوا تھا اور وہ بھی ایک جگہ سا پزل کی مانند۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے انہوں نے نیا سا رینگا لیا۔ کھوئے ہوئے حصے دھونڈنے کی ایک اور کوشش کی۔ کھڑکی تھوڑی سی کھلی تھی شاید۔ وہ اٹھ کر بند کرنے لگے تو باہر کی ہلکی ہلکی آواز کا احساس اور بھی نمایاں ہوا۔

ان کے اس نرم گرم کمرے کے باہر کی دنیا اتنی آرام دہ نہیں تھی۔

ایک لمحے کے لیے انہیں شدت سے سڑکوں، فٹ پاتھوں، برج کے نیچے زندگی گزارتے لوگوں کا خیال آیا۔ خدا کی بے محابا پھیلی مخلوق نہ جانے کس کس طرح زندگی گانے پر مجبور ہوگی۔

ان کے وہم و گمان سے بھی زیادہ تکلیف دہ شاید۔ اور ان ہی میں کہیں وہ بھی تھا۔

گاڑیوں کے ہجوم میں اپنی جگہ بنانا ہوا، گلے میں وہ بھاری سا خواتین کا لٹکائے دو وقت کی روٹی کے لیے لوگوں کی حقارت آمیز نگاہوں اور جھڑکیوں کا مقابلہ کرتا ہوا۔

اور اس غضب کی ٹھنڈ میں بھی نہ جانے کہاں سکڑا سمیٹا۔

پتا نہیں اس کے پاس کوئی گرم کپڑا بھی ہو گا یا نہیں۔

دل بڑے ناگوار انداز میں دھڑک رہا تھا وہ بنا گھڑکی بند کیے واپس صوفے پر بیٹھے۔

وہی تھا جو انہیں اس گورکھ دھندے میں پھنسا کر غائب ہو چکا تھا اور عجیب بات تھی کہ دن رات نگاہوں سے گزرنے والے سیکڑوں لوگوں کی طرح وہ اسے بھلانا تو ایک طرف نظر انداز تک نہیں کرائے تھے۔

گیتی آرا کی طرف سے کی گئی تردید بھی جیسے رسمی کارروائی رہی تھی۔ شاید انہیں گیتی سے کھل کر بات کرنی چاہیے تھی یا پھر۔

”یوسف!“ دروازہ کھول کر ان کی بیوی اندر آگئی تھیں۔ بڑی بے وقت مداخلت تھی۔

انہوں نے کچھ بے زاری سے اس عورت کی طرف دیکھا جس کے ساتھ وہ ایک عمر بسر کر چکے تھے۔

”ساڑھے تین بج رہے ہیں رات کے آج سوؤ گے نہیں کیا؟ میں بھی دُشرب ہو رہی ہوں۔“ ان کے لمبے تین ان کے خیال سے زیادہ اپنی نیند خراب ہونے کی کوفت تھی۔

وہ تلخی سے مسکرایے۔

”مجھے جب سونا ہو گا سو جاؤں گا۔ تم آرام سے سو جاؤ جا کر۔“ وہ شاید یہی سننا چاہ رہی تھیں، بنا دوسرا سوال کیے واپس مڑ گئیں۔

یوسف کمال کی نظر چند لمحے اس ادھ کھلے دروازے پر جمی رہی۔

زندگیوں پر مسلط ہونے والا تعلق رشتے بے جان جسموں کی مانند۔

اور جنہیں دفنانے میں جلدی بھی نہیں کی جاتی، ساری عمر کے لیے گلے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جھوٹے کامضبوط دھکن لگا کر تاکہ ارد گرد لعفن بھی نہ پھیلے۔

اور ان گنت لوگ اس عذاب کو جھیلتے ہوں گے اور جیتے جیتے ہوں گے۔

بہت مدت بعد یوسف کمال کو خود اپنے آپ پر شدت سے رحم آ رہا تھا۔

\*\*\*

سامنے کے آرائشی برآمدے میں دن چڑھے کی چمکی دھوپ پھیل رہی تھی۔

استاد فراغت بیگ اپنی کرسی اور بیاض اٹھائے وہیں آ بیٹھے تھے۔ شامانے گرم گرم چائے کا کپ لا کر دیا تو مسکرا دیے۔

”جیتی رہو، ویسے آج کل چائے کچھ زیادہ ہی نہیں بناتی ہو؟ صبح سے شاید چوتھا کپ ہے۔“

”مٹھے بھی تو آپ پانچ بجے ہیں اور استاد جی! اب گھر میں ویسے بھی کون سے لمبے چوڑے کام رہ گئے ہیں۔ آپ،“

نانی، باجی، نگینہ، اب ان کی بھی خدمت منہ نہ کروں تو پھر کیا کروں۔ دن کا لے نہیں کھتا۔“

وہ واپس جاتے جاتے رک سی گئی۔

”یہ تو ہے، اور گیتی کے جانے کے بعد تو بالکل ہی سیانا چھا گیا ہے۔ اتنے دن ہو گئے مگر اس کی غیر موجودگی کی عادت نہیں بڑھ رہی۔ دن میں تلخی بار آ کر پاس بیٹھ جاتی تھی۔“

وہ اسے یاد کر کے او اس ہوئے شامانے محبت سے ان کی طرف دیکھا۔

”آپ کی تو ہمیشہ سے لاڈلی رہی ہے، حالانکہ اس نے کچھ سیکھ کر نہیں دیا آپ سے۔ باجی، نگینہ کو تو اس کی نالا لیتی سے ہمیشہ شکایت ہی رہی، کہتی تھیں کہ چراغ تلے اندھیرا، اس کو کہتے ہیں گھر میں اتنے بڑے دو سکھانے والے، مگر گیتی نے کچھ سیکھ کر ہی نہیں دیا۔ کچھ بھی حاصل نہیں کیا اپنے بنوں سے۔“

استاد فراغت بیگ نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔

”غلط سوچتی تھی نگینہ، گیتی نے تو وہ کچھ سیکھا اپنے بزرگوں سے، جو نہ فیروزہ سیکھ پائی اور نہ ہی صندل، بہت مختلف ہے وہ اور اپنے ساتھ سب سے قیمتی چیز لے گئی ہے اس گھر سے۔ دل کی گہرائیوں سے نقلی دعائیں ہیں اس کے ساتھ سمجھیں۔“

شاما کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ اندر سے نگینہ آواز دے رہی تھی۔

”آئی باجی جی۔“

استاد فراغت بیگ نے مسکرا کر چائے کا کپ منہ سے لگایا۔

چھ بازار میں ابھی ساری دکانیں بھی نہیں کھلی تھیں۔ انہیں اپنا ہی پر سکون اور مانوس ماحول دل و جان سے پسند تھا۔

اندر نگینہ آج اپنے کپڑوں کی الماری کھولے بیٹھی تھی اور حسب عادت سخت کوفت میں مبتلا ہو چکی تھی۔



سستی والی جار جٹ میڈی کریپ اور سے رنگ برنگی چمکیلی بلیں۔  
 ”یہ سب بہنتی تھی میں اور کسی کو بھی یہ توفیق نہیں ہوئی تھی کہ ٹوک ہی دے مجھے خالہ ولدہ والے اگر میری  
 ہنسی اڑاتے تھے تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔“  
 وہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں ایک طرف ڈھیر لگائے جا رہی تھی۔ پتا نہیں ایسے کتنے کپڑے تھے اس کے پاس  
 جواتی یا ریانٹ دینے کے بعد بھی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔  
 شاما کوئی تبصرہ کیے بچے بیٹھ کر ان سب کو تکر کے ایک طرف رکھنے لگی۔  
 نگینہ کا تبصرہ جاری تھا۔  
 ”صندل ابو نگینہ لے۔ تو ابھی صحن میں رکھو اگر آگ لگا دے ان کپڑوں کو۔ اس کا تو اسٹینڈرڈ اب اتنا ہائی ہے کہ  
 کوئی سستی شے برداشت ہی نہیں کرتی ہے، بھی شروع سے نازک مزاج اور اب تو اس کا وہ عروج ہے کہ۔“  
 شاما نے بشکل ہی اپنی بے چینی کو کنٹرول کیا، مگر نگینہ کا ”صندل نامہ“ ایک بار شروع ہو جاتا تو پھر جلدی ختم  
 نہیں ہوتا تھا۔  
 وہ چپ چاپ سارے فضول کپڑے الگ کیے گئے۔  
 ”ویسے باجی، اب صندل نے اپنے ہاں آنا بہت کم کر دیا ہے۔“ جب نگینہ ذرا خاموش ہوئی تو شاما کو کہنا ہی پڑا۔  
 ”ہاں تو مصروف بھی تو کتنی ہے دن رات شوٹ پر ہوتی ہے، کبھی اس ملک، کبھی اس ملک۔ اب آدمی یا تو کام  
 کرے یا پھر گھروالوں کی خبر گیری کرتا پھرے۔ میں نے تو خود اسے کہہ رکھا ہے کہ اپنی ساری توجہ کام پر رکھے،  
 ہماری فکر نہ کرے بالکل۔“  
 نگینہ کی آواز قدرے اونچی ہو رہی تھی۔  
 ”پتا نہیں باجی نگینہ کس کو مطمئن کر رہی ہیں، مجھے یاد خود کو۔“ سر جھکائے بیٹھی شاما نے تکلیف سی محسوس کی  
 تھی۔  
 ”حاسدوں کی بڑی نظر ہے صندل کی کامیابیوں پر۔ پتا نہیں کتنے ٹوٹے ٹوٹے کروار کھے ہیں، جب ہی تو وہ فلمیں  
 ہلکی گئی ہیں اس کی پچھلے جمعہ والی مجھے تو فکری ہو رہی ہے۔“  
 وہ بولتے بولتے تھک چکی تھی یا واقعی فکر مند تھی۔  
 ”اللہ مالک ہے، آپ فکر نہ کریں۔“ شاما کی محبت خالص اور اجلی تھی۔  
 نگینہ نے مایوسی سے ہلکے سے سر کو جھٹکا۔  
 ”پتا نہیں۔ اماں تو کہہ رہی ہیں کہ بنا سوچے سمجھے اندھا دھند دوڑنے کا نتیجہ ہے۔ اب بازار اوہ بابی صاحب کی  
 کسی بھی فلم کو کیسے منع کر سکتی ہے۔ کتنے احسان ہیں ان کے، مگر اماں کو کون سمجھائے، انہیں تو بابی سے چڑھتی  
 جا رہی ہے۔“  
 ”بات تو غلط نہیں ہے نا ان کی بابی صاحب بھی صندل کی شہرت کو کیش کر رہے ہیں۔ اب یہ اتنے لو بحث والی  
 فلمیں بناتی تھیں تو ان میں خالی صندل کیا کر لیتی نتیجہ خراب ہی نکلتا تھا نا۔“  
 شاما کا تجزیہ غلط نہیں تھا۔  
 ”مگر ناکامی تو بیرونیوں کے سر ہی آتی ہے نا۔ سارے کیٹ ویلیو تو ان کی گرتی ہے۔“ نگینہ کا انداز تھکا تھکا سا تھا اور  
 دل ایک دم ہی اس چاروں طرف پھیلے مینا بازار سے اچاٹ سا ہوا تھا۔  
 ”تو یہ سب سمیٹ کر نکال دے شاما، میرا تو اب ہاتھ لگانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا۔“  
 وہ بے زار سی ہو کر برآمدے میں نکل آئی۔ تب ہی اس نے سیڑھیوں پر سے صندل کو اوپر آتے دیکھا۔ وہ



سیدھی اس کی طرف آنے کے بجائے پہلے استاد کی کو سلام کرنے کے لیے رکی تھی۔  
گنیمت کے چہرے پر پھٹکی سی مسکراہٹ آئی۔

اپنی ساری تنگ مزاجی کے باوجود صندل میں کم از کم گھر کے بچوں کا لحاظ تو تھا۔  
”بہت دن بعد آئیں خیر۔“ وہ اسے لیے نانی ستارہ کے کمرے میں آئی تھی۔

صندل کوئی جواب دینے کے بجائے نانی سے ملنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ آج خلاف معمول فوراً ہی الگ ہو جانے کے بجائے وہ چند لمحے ان کے گلے سے لگی رہی۔

گنیمت نے ان چند لمحوں میں صندل میں آئی اس تبدیلی کو نوٹ کیا تھا۔

بڑے عرصے بعد آج وہ سادہ سا شلوار قمیض اور دوپٹہ پہنے ہوئے تھی۔ چہرہ میک اپ سے عاری اور بال سادہ سے ہیہنڈ کی قید میں تھے۔

اپنے نمبروں، بیرونی کے پورٹ فولیو سے قطعی مختلف، لیکن اس سادہ سے حیلے میں وہ شاید اور بھی زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

گنیمت کو اس پروسیا ہی فخر تھا جیسا کسی زمانے میں نانی ستارہ کو فیروزہ پر۔  
”گنتی کیسی ہے؟ کوئی خیر؟“

اپنے بارے میں کچھ گئے سارے سوالوں کو صفائی سے نظر انداز کر کے وہ ہنس پٹائی کی مسہری پر نیم دراز ہوئی۔  
”گنتی ماشاء اللہ ٹھیک ہے۔ روزانہ فون پر بات ہو جاتی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ تمہیں بھی کیا تھا مگر نمبر نہیں ملا۔

شاید ہند تھا تمہارا فون۔“ گنیمت کے لہجے میں گنتی کے لیے بات کرتے ہوئے اب خود بخود اطمینان آتا تھا اور ایک چھوٹا مونا سا ہیرا گراف وہ سالار کی تعریف میں ادا کرنا نہیں بھولتی تھی۔

صندل کی پیشانی پر ہلکا سا نل آیا۔

”پتا نہیں کیا جاوے گیو یا ہے اس نے آپ پر ذرا بھی گنتی کے مقابل نہیں تھا جب اصلیت کھلے گی تب۔“ تلخ لہجے میں وہ جو کہہ رہی تھی گنیمت سے پہلے آج نانی ستارہ کو برا لگا۔

”اصلیت بھی کھل گئی اس کی۔ بالی جیسے دس کو نہیں پانچ کو تو خرید سکتا ہے۔ کو بھی نام کوئی ہے اس نے گنتی کے اور ماشاء اللہ لاکھوں کا زیور ہے اور سب سے بڑی بات کہ مخلص اور سادہ حل۔ گنتی کی فکر مت کرو وہ ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہے۔“

صندل نانی کی بات کے دوران ہی سیدھی ہو کر بیٹھ چکی تھی گو گنیمت پہلے بھی بتا چکی تھی مگر اسے یقین نہیں آیا تھا۔

”سچ کہہ رہی ہیں؟“ اس نے باری باری گنیمت اور نانی دونوں ہی کو دیکھا۔

جواباً ”وہ دونوں ہی مسکرائی تھیں۔“

”کمال ہے، گنتی نے چپ چاپ کتنا پڑا ہاتھ مار لیا۔ گنتی تو بہت سیدھی تھی مگر اندر ہی اندر سالار کے ساتھ پوری سہنشی کر رہی تھی۔“ وہ اور بھی تلخ ہوئی۔

”کیسی باتیں کرتی ہے صندل! اپنی بہن کو جانتی نہیں کیا؟ گنتی کے سیدھے پن سے تو ہم سب عاجز تھے بھول گئی؟“

گنیمت کو اس کی بات سے برا ہی رنج ہوا تھا، مگر صندل اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھی۔  
”کوئی سیدھا نہیں ہے آج کے زمانے میں۔ سب اپنا بھلا دیکھتے ہیں۔ گنتی نے بھی بیشہ سیف (محفوظ) راستہ

چنا۔ پہلے پڑھائی کے نام پر کام سے جان چھڑائی رہی، پھر مزے سے اپنی مرضی کی شادی رچائی۔ مصیبت تو میرے

اسی سردی۔ کام، کام، کام ایک ساتھ کتنی شفتوں میں کام کر رہی ہوں۔ کسی کو اندازہ بھی نہیں ہے۔“  
اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے سو غصے کے باوجود بھی نالی یا گنیمت کو نرمی برتی پڑ رہی تھی۔

”تو کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ منع کیا تھا تاکہ ایک ساتھ اتنی فلمیں مت کرو۔ معیار خراب ہوتا ہے۔ لوگ بھی بے زار ہونے لگتے ہیں۔ پیسے کے پیچھے دوڑتے رہنا بھلا کس کو اس آتا ہے مگر تمہیں تو ہماری کئی کوئی

ایک بات بھی سمجھ میں نہیں آتی آج تک۔“  
نانی ستارہ کالجیہ نرم سہی، نکمبات کچی تھی، سو کڑوی بھی لگی۔

صندل آج بہت دکھے ہوئے دل کے ساتھ آئی تھی، مگر یہاں دستیاب کندھے سر رکھ کر رونے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

”کسی کو کچھ سے ہمدردی نہیں۔ وہ بالی ادھر باتیں سنا رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ فلمیں فلاپ ہونے میں میری کوتاہی ہے۔ میں نے دل لگا کر کام ہی نہیں کیا۔ اپنی غلطیاں نہیں دیکھا اب اگر اگلی فلم بھی۔“

اس نے ایک برے امکان کا اظہار کرنا چاہا مگر آنکھوں میں آنے آنسوؤں نے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔  
سو وہ تکیہ میں منہ دے کر واپس بستر پر دراز ہوئی۔

وہ بری طرح اب سیٹ تھی۔ اب اس بات میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔  
نانی اور گنیمت دونوں ہی تشویش میں گھری تھیں۔

”بالی صاحب کہاں ہیں؟ انہیں پتا ہے کہ تم یہاں ہو؟“ گنیمت نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھا تھا، مگر وہ بری طرح بھڑک اٹھی۔

”بھاؤ میں گیا بالی۔ ایک فلم دے کر جو احسان کیا تھا وہ سو سمیت اتار دیا ہے میں نے پھر بھی۔ دیکھ لیجیے گاب نی لڑکی بڑائی کرے گا۔“

گنیمت نے بے اختیار ہی ہاتھ کو چھوا۔

”کیا ہو گیا ہے تیری عقل کو صندل! مجھے تو لگ رہا ہے کہ بالی سے کوئی بڑا جھگڑا مول لے لیا تو نے، ارے شوہر میں کون سی کاہو تے، بلکہ اس دنیا میں ہی کس کو فاطمی ہے، سب منہ دیکھے کے ہوتے ہیں، وقتی کام نکالنے والے لوگ۔ تیری طرح جذباتی نہیں ہوتے، عقل پکڑ، کیوں نوبت لا رہی ہے کہ بالی صاحب کسی اور لڑکی کو سائن

کر س۔“  
گنیمت کی دانش مندی سے کی جانے والی بات اس نے شاید ڈھنگ سے سنی بھی نہیں تھی، یوں ہی تکیہ میں منہ دے کر بیٹھ رہی۔

مباہل بریلی کا فون آ رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے صندل کی خشتہ حالی سے سب ہی کی توجہ ہٹ گئی۔  
شامانانی گنیمت تینوں ہی کے لہجے سے خوشی چھلک رہی تھی۔

ہر ایک اس سے بات کرنے کا خواہش مند تھا۔ سب کے لیے وہ راتوں رات اہمیت اختیار کر چکی تھی، بڑے ہی غیر محسوس انداز میں۔

”ہاں۔ صندل بھی آئی ہے گویات کر لو۔“ گنیمت نے بہت خوش گوار انداز میں کہتے ہوئے صندل کا کندھا ہلا دیا۔  
”مجھے نہیں کرنی کسی سے بات و ات، چھوڑو میں میرا پیچھا۔“

دور بیٹھی گنتی نے صندل کو صاف کہتے ہوئے سنا۔

\*\*\*

شاہد امی کا بلڈ پریشر نیچے آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آپاگل عیادت کے بہانے صبح سے آئی بیٹھی تھیں اور



زویا کو پورا یقین تھا کہ ڈاکٹر کی دوا کے بے اثر ہونے کی سب سے بڑی وجہ ان ہی کی موجودگی ہے۔  
جویا دانستہ کمرے میں نہیں جا رہی تھی، پتا تھا کہ اسے دیکھ کر وہ بھی زیادہ مشکل گفتگو فرمائیں گی، ایسی باتیں جو ایک ساتھ کئی مہینے کی اور سارے ہی مطلب یعنی ایک سے ایک دل بٹھانے والے۔

اندر سے ان کی اور زویا کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔  
”اب نہیں ہوتی ابو کی ضمانت، لمبے عرصے کے لیے گئے ہیں، جب ہی تو وکیل نے بھی کیس چھوڑ دیا، اب تو بس سرکاری وکیل ہی کا آسرا ہے، ویسے کو تو اکبر کے ایک جاننے والے ہیں، وکالت کرتے ہیں، فیس بھی بہت کم لیں گے۔“  
”فیس کا تو کوئی مسئلہ نہ ہو، اگر آپ ہی ہمارے پیسے دے دیں، بلکہ اب تو آپ کو دے دینے ہی چاہئیں، سال ہونے کو رہا ہے۔“

”کون سے پیسے؟“ آپاگل کی آواز میں بڑی حیرت تھی۔  
جویا نے نچلا لب و انتہا تلے دیا۔  
غضب کی یادداشت تھی آپاگل کی، جویا در کھنا چاہتیں یا درہ جانا اور جو نہیں رکھنا چاہتیں، کتنا بھی ضروری ہوتا یا آسانی بھلا دیا جاتا۔

”جویا کے جیز کا جو سارا سامان آپ نے اوپر کے گھر میں سیٹ کیا ہے، اس کے پیسے تو دس گنا آپ وعدہ کیا تھا آپ نے۔“  
”ہاں تو کم منع کیا ہے، دے دیں گے جب ہوں گے، بھاگے تھوڑی جا رہے ہیں۔ ویسے تو سب لوگوں کو میں نے یہی بتایا ہے کہ میرے میکے والوں نے سارا گھر سیٹ کروا کر دیا ہے، تمہاری ہی عزت ہو گئی ہے، سب کے سامنے۔“

انہوں نے مخصوص انداز میں ایک بات کے ایک سے زائد مطلب نکالے، مگر زویا ان کے سامنے جویا کی طرح خاموش نہیں رہ پاتی تھی۔

”آپ ہماری عزت کی فکر مت کریں اور آپ تو ویسے بھی خود ہی کہتی ہیں کہ اب ہمارے گھرانے کی کوئی عزت نہیں رہی، سو کہہ دیجئے گا کہ آپ نے یہ سامان ہم سے خریدا ہے، بات ختم۔“  
جویا نے اضطراب سے پسلبودلا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ شاید زویا کے انداز پر ضرور مسکراتی، مگر اب ہر بات دل پر چوٹ کی طرح لگتی تھی۔

”بڑی سخت دل ہے، پاپ بے چارے جیل میں پڑے ہیں، تمہیں سامان کی خرید و فروخت کی پڑی ہے، اس وقت ان کے لیے وکیل کا بندوبست کرنا ضروری ہے سب سے زیادہ۔“  
”وکیل کا بندوبست ہو گیا ہے، امید ہے کہ اگلی پیشی پر ضمانت بھی ہو جائے گی، ان شاء اللہ۔“ انہیں زویا کے پر یقین انداز نے ایک دم چونکا دیا۔

”ایسا کون سا وکیل مل گیا جو اتنا پر یقین ہو رہا ہے تمہیں۔“  
تب ہی سلمان اپنے کمرے سے موبائل آف کرنا ہوا اس طرف تیزی سے گیا تھا۔  
جویا نے اسے اپنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے میں سے دیکھا، اس کے انداز میں کچھ غیر معمولی پن تھا۔  
”الٹی خبر،“ زبیر لب کہہ کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔

”عارف صاحب کا فون آیا تھا۔“ وہ کمرے کے وسط میں کھڑا اعلان کرنے والوں کے انداز میں اطلاع دے رہا تھا۔

آپاگل اور زویا کی بحث کو وقتی طور پر قفل اسٹاپ لگا تھا۔  
”آپا کایس، اب اسلام چچا اور معاذ لوں گے، کل وہی دونوں کسی وکیل کو لے کر آئے ہیں کورٹ میں۔“  
”کیا؟“ آپاگل کا منہ حیرت سے کھلا اور شاکرہ امی طبیعت کی خرابی میں بھی سیدھی اٹھ کر بیٹھیں۔  
”اور اس نے“ سلمان نے حقارت سے جویا کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس لڑکی نے ہمیں بتانے کی بھی زحمت نہیں کی، باہر ہی باہر سب کچھ طے کر لیا۔“

آپاگل نے تیزی سے قریب آکر جویا کے کندھے کو جھنجھوڑا۔  
”گروا دیا نازیل ہمیں، مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ اس کی چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہوتی ہیں اس کیسے سے۔ اسی طرح کسی دن جا کر نکاح بھی پڑھوائے گی کورٹ میں۔ لکھ کر رکھ لیں میری بات، بے حیا، بے شرم۔“  
اس سے پہلے کہ زویا انہیں الگ کرتی، وہ پھپھو جویا کے چہرے پر بار چلی تھیں۔

”کیا کرتی ہیں آپاگل، بتایا تھا اس نے مجھے، میں نے منع کیا تھا کہ کسی کو نہ بتائے، معاذ اکیلا نہیں تھا، اسلام چچا آئے تھے کورٹ میں، اتنے عرصے سے وہ اکیلا جا رہی ہے، تب آپ میں سے کسی کی بے عزتی نہیں ہوئی اور اگر کوئی رحم کھا کر تھوڑی سی مدد کو لیا تو آپ کو برداشت نہیں ہو رہا، شرم سے ڈوب مریں آپ لوگ۔“  
زویا کی آواز میں لرزش سی آئی۔ آپاگل نے طنزیہ نظروں سے سلمان کی طرف دیکھا۔

”اب چندہ سے ابو کایس لڑا جا رہا ہے اور چندہ دینے والے بھی کون، وہی جو ہماری بربادی پر سب سے زیادہ خوش ہیں، عزت لینے کے لیے آئے ہیں دونوں باپ، بیٹے۔“  
”آپ ابھی اکبر بھائی کے وکیل سے بات کریں، ان لوگوں کو تو میں دیکھ لوں گا اور اب آئندہ یہ کورٹ نہیں جائے گی۔ سب لوگ کان کھول کر سن لیں۔“

سلمان کا چہرہ سن ہو رہا تھا۔ آپاگل کے چہرے پر بڑی فاتحانہ مسکراہٹ ابھری تھی۔  
”اتنے عرصے سے کیوں نہیں ہوش آیا تھا آپ کو؟ اور یہ آپاگل کا وکیل پہلے کیوں نہیں آیا؟ جواب آپ۔“  
”کیو اس بند کرو زویا!“ وہ بہت زور سے چلایا۔

ساکت کھڑی جویا نے ایک جھٹکے سے زویا کا ہاتھ تھاما اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔  
کمرے میں ان تینوں کی پاس اب کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔



وہ کسی کام سے اپنے کمرے سے نکل کر کچن تک آئی تھی، سناہ کپڑے، میک اپ سے صاف چہرہ۔  
مگر غضب کی آوا۔  
سامنے اخبار پھیلانے بیٹھے نیل کی نگاہ اس پر سے ایک لمبے کے لیے بھی نہیں ہٹی تھی۔  
شروع شروع میں وہ کمرے سے بہت کم نکل رہی تھی، نیل کو یقین تھا کہ ایسا اس نے سالار کے کمنے پر ہی کیا

”اب دو بھائی بنتے زرنے کے بعد اس کا رویہ نارمل ہوتا جا رہا تھا، وہ کچن کے دن بھر میں دو چار چکر لگاتی، کبھی اپنے اور سالار کے لیے چائے وغیرہ بھی بناتی یا پھریوں ہی چھوٹے موٹے دو سرے کام، دو چار بار اس کے اور سالار کے کچھ مہمان بھی آئے تھے۔

خود نیل اس سارے عرصے میں اس طرح لا تعلق رہنے کی کوشش میں رہا تھا، جیسے وہاں سالار یا گیتی کا کوئی



وجود ہی نہیں ہو۔

ایسا کرنے میں زرتاج کی ہدایت سے زیادہ خود اس کی اپنی سوچ کا عمل دخل تھا۔  
سالار کی پہلے دن کی وارننگ اسے یاد تھی اور جانتا تھا کہ وہ محض وارننگ نہیں تھی۔  
”مگر یہ لڑکی۔۔۔“ اس نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

اتنے دن میں کون سا لمحہ تھا جب اس نے سالار کی قسمت پر رشک نہیں کیا تھا۔  
”کم بخت معلوم نہیں کہاں سے اڑا کر لایا ہے۔“ سامنے لگے شیشے میں لپٹی کے دکھائی دیتے عکس پر نگاہ جماتے  
ہوئے وہ پورا پورا اس میں گم تھا۔ اس لڑکی پر اس کا دل بری طرح آچکھا تھا۔  
”کیا کر رہے ہو یہاں؟“ زرتاج کی سرد آواز قریب سے ہی گونجی تھی۔  
وہ بری طرح چونکا۔

زرتاج قریب ہی کھڑی تھیں اور وہ شاید لپٹی کے جلووں میں اتنا تھو کہ اس پاس کا دھیان تک نہیں۔ زرتاج  
جیسی خطرناک عورت کی ہمہ وقت نگرانی کا بھی خوف نہیں۔  
”کچھ بھی نہیں“ اخبار پڑھ رہا تھا۔ ”خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے ایک چورنگہ شیشے پر ڈالی اب وہاں لپٹی نظر  
نہیں آ رہی تھی سو پکڑے جانے کا خطرہ بھی معدوم ہوا۔  
”تمہیں کچھ کام تھا کیا مجھ سے؟“ وہ اب ذرا پر اعتماد ہو کر زرتاج سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں چلنا تھا کہیں تیار ہو جاؤ۔“  
”کم ہو جاؤ پہلے“ مجھے تو پانچ منٹ لگتے ہیں۔“ اس نے مزید لا پرواہی دکھائی چاہی مگر یہ ہی غلطی تھی۔  
”کیا مطلب ہے تمہارا تیار ہو جاؤ؟ میں پہلے ہی تیار ہو چکی ہوں دکھائی نہیں دے رہا تمہیں؟“  
”سوری میں نے غور نہیں کیا تھا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا مگر زرتاج کو برا لگ چکا تھا۔  
”تم بہت بدل چکے ہو نیل اب تمہیں میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں ہوتا“ دل بھر چکا ہے تمہارا مجھ سے۔“  
ان کی چھٹی ہوئی نگاہ نیل کے چہرے پر جمی اور وہی ٹھوک بجا کر بات کرنے کا مخصوص انداز جس کے بعد  
صفائی دینے کی رعایت بھی نہیں رہتی تھی۔

”ایسا نہیں ہے زرتاج!“ وہ بجا طور پر گڑگڑایا ”میں کچھ سوچ رہا تھا بہت پریشان ہوں آج کل پتا تو ہے نا  
تمہیں سالار کے ساتھ میرا کنزرا مشکل تر ہوتا جا رہا ہے اس گھر میں قیدیوں کی طرح رہ رہا ہوں“ دماغ ٹھکانے پر  
کہاں ہے میرا روز پولیس انکوائری کا سامنا ہے۔“  
بات کے اختتام تک وہ جتنا ممکن تھا اتنا آواز اس بھی ہو چکا تھا اور وہ یقیناً ”کمال کا ایکٹر تھا“ زرتاج نے ہمدردی  
سے اس کی طرف دیکھا۔

”انتی شین مت لو“ میں بات کر رہی ہوں نا ہائی آفیشلز سے کچھ نہیں ہوگا ایک معمولی ملازمہ کی گمشدگی  
اتنا بڑا ایٹو نہیں جس پر کوئی بھی زرتاج بیگم کے شوہر پر ہاتھ ڈال سکے ”کاش میں ان دونوں ملک سے باہر نہ ہوتی  
جب وہ کم بخت روزی یہاں سے بھاگی تھی تو یہ جواب دہی تمہارے حصے میں بھی نہ آتی میں خود ہی نمٹ لیتی۔“  
”اب بھی تم ہی تو نمٹ رہی ہو میری جان!“ وہ دانستہ اس کے قریب تر ہوا ”میری ساری پریشانیوں ساری  
مشکلات کا حل تم ہی نکالتی ہو“ میں تمہارا احسان مند ہوں زرتاج! اور نہ یہ سالار اور وہ تمہارا بھائی یوسف کمالی  
دونوں جان کے دشمن بنے ہیں میرے دیکھنا نہیں چاہتے ہیں مجھے ایک بل بھی یہاں وہ لوگ۔“

”ان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے اور وہ بھی جانتے ہیں کہ میں کوئی معمولی عورت نہیں۔“ نیل کے ہاتھ اپنے  
کندھوں سے ہٹاتے ہوئے وہ غور سے مسکرائیں ”چلو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ وہ واپس بیڈروم کی طرف مڑ گئیں



اور ان کے پیچھے نبیل بھی۔  
تب ہی اس نے گیٹ سے اندر آتی پولیس وین کو گلاس والے کے دوسری طرف سے دیکھا تھا۔ جب سے سالار نے روزی کا کس کھلایا تھا اس طرح کی آمدورفت بڑھنے لگی تھی۔  
کھل کر ابھی تک کسی نے اس پر شک کا اظہار نہیں کیا تھا مگر جس طرح اسے چاروں طرف سے گھیر کر سوال کیے جاتے تھے دل بیٹھا جاتا تھا۔  
”کیا ہو گیا ہے تمہیں نبیل! کیوں خود کو تماشا بنا رہے ہو۔“ زرتاج نے مڑ کر اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

”کہا ہے نا میں نے کچھ نہیں ہوگا۔ سالار کے ذاتی دوست ہیں پولیس میں۔ وہ لوگ ملنے بھی آتے ہیں۔“  
ان کے لہجے میں بڑی تسلی سی تھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نبیل کے چہرے پر پھینکی سی مسکراہٹ آئی۔  
”ایسے ہی بس یوں ہی۔“  
اس بار وہ زرتاج کے پیچھے نہیں ساتھ ہی آگے بڑھا تھا۔ فی الحال زرتاج کے سائے تلے ہی عافیت تھی۔  
”اور جو یہ روزی کا قصہ منٹ جائے تو پھر ضرور کچھ سوچا جاسکتا ہے۔“  
گیتی کے چہرے کو تصور میں لاتے ہوئے اس نے پوری نیکبختی کے ساتھ آگے کا پروگرام ترتیب دیا۔  
زرتاج اسے مسکراتا دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرائیں۔ ”میرے شوہر کو بہت عذر اور مضبوط شخص ہونا چاہیے نبیل۔“  
”فکرم ت کرو میں خود کو ایسا ہی ثابت۔“ اپنے ظلم اور درندگی کو یاد کر کے جس غرور سے اس نے دعو کرنا چاہا تھا اور اہورارہ گیا۔

”ذرا رک جائیں آپ لوگ بہت ضروری بات ہے۔“ سالار تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آ رہا تھا۔  
”ہم لوگ باہر جا رہے ہیں سالار! اور ضروری نہیں کہ ہمارا ہم تمہاری بات سننے کے لیے رک جائیں دیر ہو رہی ہے ہمیں پہلے ہی۔“ بیگم زرتاج کا لہجہ سرد تھا۔  
سالار نرمی سے مسکرایا۔  
”چلیں، میری بات سننے کے لیے نہ سہی، کسی اور کی ہی سننے کے لیے رک جائیں۔“ ذرا رکتے ہوئے اس نے لاؤنج میں کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھا۔  
”آئیے مشہدی صاحب!“

زرتاج اور نبیل دونوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا تھا۔  
دو ٹیک پولیس آفیسرز اندر داخل ہو رہے تھے۔  
سنبیدہ باوقار چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ۔  
زرتاج نے غور سے انہیں دیکھا وہ ان میں سے کسی کو نہیں جانتی تھیں، لیکن ان سے اوپر بہت بیوں تک اس کی آسانی رسائی تھی۔

”کیا بات کرنا ہے آپ لوگوں کو؟“ بنا کسی تمہید کے زرتاج نے سرد لہجے میں ان لوگوں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی براہ راست سوال کیا تھا۔ کسی کو بھی دباؤ میں لانے کا ان کا اپنا مخصوص انداز تھا مگر نئے آنے والے متاثر ہونے کے موڈ میں نہیں تھے۔

”آپ کے ہاں جو لڑکی کام کرتی تھی اس کی گمشدگی کے۔“  
”کتنی بار اور کیا کیا پوچھا ہے آپ لوگوں کو آخر ایک معمولی ملازمہ جو اتفاق سے ہمارے گھر کام کرتی تھی“

فی غیر موجودگی میں کام چھوڑ کر چلی گئی گناہاں گئی کیوں گئی۔ ہمارا درود سر نہیں تھا اور اب تو کتنا عرصہ گزر گیا ہے لگتا ہے کہ پولیس ڈپارٹمنٹ کیس اس اب یہ ہی ایک کام رہ گیا ہے کہ وہ شریف لوگوں کو پریشان کریں۔“  
زرتاج کی آواز تدریج اونچی ہوئی چلی گئی۔  
ان لوگوں نے سکون کے ساتھ ان کی بات ختم ہونے کا انتظار کیا۔  
”آپ کی پریشانی اب ختم ہونے کو ہے میڈم زرتاج! اس لڑکی کی گمشدگی کا معاملہ ہو گیا ہے، آج یہ ہی بتانے لے، ہم آئے ہیں۔“

نبیل اور زرتاج دونوں ہی قطعی مختلف احساس کے زیر اثر چوٹے تھے۔  
”تو مل ہی گئی وہ مکار آوارہ لڑکی تم لوگوں کو اور اب میں کروں گی پولیس ڈپارٹمنٹ پر مقدمہ مجھے اور میرے شوہر کو ذہنی ٹارچر کرنے کا اور ہنگ عزت کا، سمجھ تم؟“ وہ دو قدم اور آگے آئیں اور ان دونوں کے چروں پر نگاہ ڈالتے ہوئے ان کے لہجے کی تپش اور بھی بڑھی۔

”آپ ایسا نہیں کریں گی میڈم زرتاج! ان میں سے ایک نے پورے تحمل سے کہا۔  
”اس لیے کہ قصہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے، روزی کی موت کی تصدیق ہوئی ہے اور پرانے ریکارڈ سے اس کی ش کی تصویر اور لاش تھانے لائے جانے کی انٹری بھی ثابت ہو رہی ہے۔“  
راجو خاموشی سے لاؤنج کے دروازہ میں اکھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ رہا تھا۔ سالار نے بہت ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، ہم نے معلومات کی تھیں اس وقت تھانے سے مگر وہاں کوئی ایسی اطلاع نہیں تھی۔“  
سے خود اپنی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔  
”اطلاع بھی نبیل صاحب! لیکن اس کیس کو بند کروا دیا گیا تھا اور جو ایس ایچ او اس وقت وہاں ڈیوٹی پر تھا وہ اب چھوڑ کر جا چکا ہے۔ بہر حال ہم اسے ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جلد ہی کامیابی ہو جائے گی، ہمیں یقین ہے۔“

لاؤنج میں چند لمحوں کے لیے بڑا گہرا سناٹا چھایا۔  
”یہ رہی اس کی موت کے بعد لی گئی تصویر، لاش، سمندر کے کنارے سے ملی تھی اور پہلی رپورٹ کے مطابق اس کی کارپ بھی۔“  
ہاتھ میں تھامی تصویر پولیس افسر نے زرتاج اور نبیل کی طرف بڑھائی تھی۔ مگر فوری طور پر کوئی بھی اسے لینے کی ہمت نہیں کر سکا۔

پچھلے سے آتے راجو نے کانٹے ہاتھوں سے وہ چھوٹی سی تصویر تھامی۔  
چہرے پر موت کی ویرانی لیے روزی کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں، یہ تھا اس رنگوں بھری لڑکی کا شاید انجام۔ اس نے آخری مل تک انتظار کیا تھا۔ راجو کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر اس تصویر پر ٹپکے، دوسرے ہی لمحے وہ اس کو قائلین پر گر ا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





# کوئی تیرا لڑکھم

”تین بچوں کی ماں اپنے آشنا کے ساتھ فرار۔  
خبر پڑھ کر داوی اماں نے دانتوں تلے زبان دبالی۔  
”اوئی اللہ! مولے شیشوں کی پرانی عینک تلے ان کے  
دیدے چوٹ کھل گئے۔ نہ نہ کرتے کرتے بھی منہ  
سے نکل ہی گیا۔“

”اے نوجوان کیا زمانہ آگیا ہے دنیا سے شرم و حیا ہی  
اٹھ گئی ہے۔ لوگوں نے شرافت، اخلاق و کردار بیچ  
کھائے۔ اے عزت و وقار، نام و ناموس کا پاس بھی  
کسی چڑیا کا نام ہے کہ نہیں۔ رکھ رکھاؤ و صبح داری  
نیک نامی اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی ہے۔“  
انہیں جوان بچوں کی موجودگی کا خیال تھا۔ ورنہ  
جلنے کیا کچھ اور نہیں۔ اوہ راہ گل نے جھٹ ان کی  
بات اچھی تھی اور شاید زندگی میں پہلی بار ان کی کسی  
بات سے اتفاق کیا۔

”سچ کہتی ہیں داوی اماں! ہمارے کالج کی ایک لڑکی کا  
پوائنٹ کے ڈرائیور سے چکر چل رہا ہے۔ سارا راستہ  
بونٹ پر بیٹھ کر ڈرائیور سے باتیں کرتی جاتی ہے۔ لوگ  
کیا کہیں گے۔ خاک پروا نہیں ہے دونوں کو۔“ ماہ گل  
کا کہنا تھا اور داوی اماں اس پر چڑھ دوئیں۔

”چکی رہ اور شکل غرق کرے یہاں سے نامرادا بے حیا  
نہ ہو تو ایسے منہ پھاڑ کے عشق و عاشقی کی بات کر رہی  
ہے۔ اے! دوسروں کو کتنے تب اچھے لگیں، جب  
ہمارے اپنے گھر میں موٹی دیدہ ہوائی پھپھن چھری موجود  
نہ ہو۔ اک ہمارا زمانہ تھا! لڑکیوں کی زبان میں دانتوں  
کے بیچ رہتی تھی۔ اور ایک لڑکیاں ہیں۔“  
انہیں نئے زمانے سے ہزار ہا شکوے تھے اور بات

بے بات اپنے زمانے کو یاد کرنے کا عارضہ بھی۔  
”خدا جھوٹ نہ بلوائے تو چار روز کی دلہن تھی میں  
ڈولی میں بیٹھتے ہوئے پیر کا جو ماگر گیا تو منہ سے پھوسا  
کے نہ دی۔ مارے شرم کے منہ میں گھنگھنیاں ڈال  
بیٹھی رہی۔ رنگ روپ بھی ایسا تھا کہ اندھیرے میں  
بٹھا دو تو اجالا پھیل جائے۔“  
”پھر تو آپ کے ہاں بجلی کا بل بھی کم آتا ہو گا دادا  
اماں!“

ماہ گل کی زبان کو بھلا کہاں قرار تھا۔ داوی اماں کے  
تلوؤں سے لگی سر پر بھیجی۔  
”اوری دفع ہو یہاں سے۔ موٹی گڑبھری زبان ہے  
ہزار بار کہا ہے کہ تالو سے چپکا کر رکھا کر نکال کر ہٹا  
پر دھروں کی کسی دن سیسے منہ چلاتی ہے۔ اف  
توبہ! قیامت کے آثار ہیں قیامت کے۔“

انہیں اپنی اس منہ پھٹ پوتی کا قہقہی کی طرح کتہ  
کتر زبان چلانا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ سوا کثرتا لڑکے رکھ  
دیتیں مگر یہ بھی تھا کہ بن باپ کی بچپوں کو کچھ کہہ کر  
ان کا بھی دھکتا تھا۔ اوہ راہ گل کو انہیں چڑا کے مڑا  
تھا۔

صبح آنکھ کھلتے ہی ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی۔ دادا  
اماں چینی ہی رہ جاتیں۔  
”ارے میں کہتی ہوں یہ موٹائی وی بند ہو گا کہ  
نہیں۔ صبح ہی صبح یہ ناس بیٹیاں ایسے کھلے ڈالے لباس  
پن کے کس بے شری سے ناچتی ہیں۔“  
ماہ گل نہ سنتی تو ان کی توپوں کا رخ اسی کی جانب  
ہو جاتا۔

”اے! لے کتا تھا مرا النساء! لڑکیوں کو کالج کا منہ نہ  
لگا کر تم سنی ہو میری؟“ اور حسب بات اولاد پر آ جاتی  
اے! اسی خاموش رہنے والوں میں سے نہ تھیں۔  
”اماں! اب تعلیم کو تو برا نہ کہیں، تعلیم شخصیت  
کے گھاسا رہی ہے، شعور دیتی ہے۔ اور خدا خواستہ کوئی  
نہ نہ جائے تو کام بھی آتی ہے۔ اب رہی کالج کی  
لڑکیاں شاہ گل نے بھی تو آخر بارہ جماعتیں کالج ہی  
پڑھی ہیں نا۔“

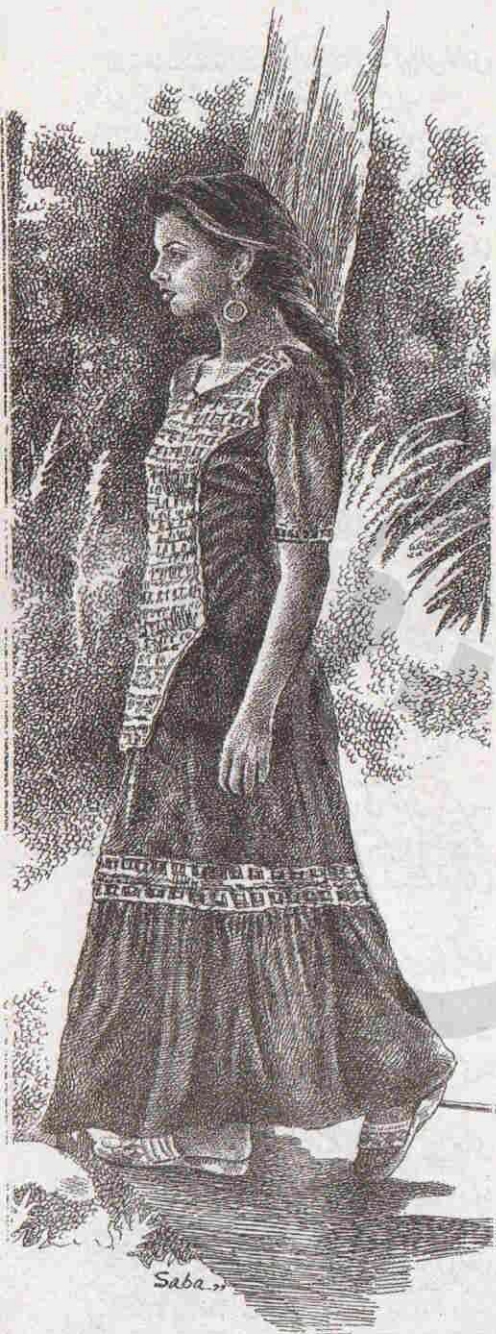
اور یہاں اگر داوی اماں مات کھا جاتیں۔ پھر کیا کر  
تھیں۔  
”شاہ گل تو میری سب سے اچھی بیٹی ہے۔“ ان کی  
برسات اسی طے سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی  
اور میرا خون سیروں نہیں تو پھٹنا تک۔ بھرتو بڑھ ہی جاتا  
تھا۔

\*\*\*

”آپا موم۔ ارے آپا موم!“ خالہ بتول کی بانک پر  
مل کی عدم موجودگی کے سبب دست پکھا جھلتی وادی  
ماں کے چہرے پر دنیا جہان کی کوفت سمٹ آئی۔  
”اے اللہ! یہ پھر جلی آئی؟ اب پیٹ کا جسم بھر کے  
سے ہمارے گی۔“ جن میں جن کی دیوار تلے بیٹھے  
تھیں۔ مکمل۔ کا نم دوپٹہ تن کر وہ بظاہر سو تی بن گئی  
تھیں اور خالہ بتول کا رخ بچن کی جانب ہو گیا۔

”ایک رہا ہے؟ بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔“  
اور بظاہر سو تی بنی داوی اماں جی ہی جی میں کلس  
تھیں۔ انہیں خالہ بتول کی ان ہی حرکتوں سے چڑ  
کی۔ کمر میں گھستے ہی بچن میں جھانکی مارتیں اور جو  
رہا ہوا ناس بریدے جمائے بیٹھی رہتیں، اور اسی  
موت و لحاظ کے تقاضے مارے ڈالتے۔ پڑوسیوں  
کے حقوق ہر وقت یاد رہتے تھے۔

”دیوار سے دیوار ملی ہے ہماری۔ پڑوسیوں کا برا حق  
نہ ہے۔“ خالہ بتول اسی صرورت و لحاظ اور رعایت کا  
لہجے سے فائدہ اٹھاتیں۔ اسی ملی ہوئی دیوار کے  
انہی سے ہر خوشبو ان تک پہنچ جاتی اور وہ





عین کھانے کے وقت دھاوا بول دیتیں۔ آج امی، وادی  
اماں کی فرمائش پر میوں کا حلوہ بنا رہی تھیں۔  
”اے آپا! کچھ سنا تم نے۔ رشیدہ کے بیٹے نے  
رشیدہ کے بیٹے کو چوری کے الزام میں پکڑا دیا۔ آج  
پولیس آئی تھی۔“

وہ یوں ہی محلہ بھر کے معاملات پر کڑی نظر رکھا  
کرتیں اور اُدھر اُدھر نشر کرتی پھرتیں اور یہ کہاں  
ممکن تھا کہ جو خبر کل سے محلہ بھر میں گردش کر رہی  
تھی وہ امی کے کانوں تک نہ پہنچتی مگر انہوں نے بالکل  
کان نہ دھرے۔ شہود سے کڑا ہی میں پیچہ ہلاتی رہیں  
اور خالہ بتول کے نصیب کھولے تھے جو وادی کو جاتے  
دیکھ کر ان کے گھٹنے سے جا لگیں اور منہ کھول بیٹھیں۔  
”کیا خیال ہے اماں! اس چوری میں کس کا ہاتھ  
ہو سکتا ہے؟“

اور وادی اماں جو اب ناچار اٹھ بیٹھی تھیں، منہ  
کھول کر آٹا ہٹ سے جمائیاں لے رہی تھیں، جھٹ  
برامان گئیں۔

”اے لو! مجھے کیا پتا؟ میں کیا چوروں کے کھونٹے  
سے لگی بیٹھی تھی؟“

وادی اماں عزاز کی تیز زبان کی کڑوی تھیں۔  
منٹوں میں لے لے ڈالتیں اور مزے کی بات یہ کہ  
خالہ بتول سن بھی لیتیں۔ اب بھی وہ کچھ کھنے کو تھیں  
کہ محلے کا پتہ پیغام لے چلا آیا۔

”آپ کے گھر کے دروازے پر ایک عورت کھڑی  
ہے بوٹی سی آپ کو بلارہی ہے۔“

اور یہ ہم سب ہی جانتے تھے کہ وہ بوٹی سی عورت  
کون ہے؟ زینت! جو خالہ بتول کی جان کا جبال تھی۔  
اب بھی وہ بال نوٹتے بیٹھ گئیں۔

”ہائے میں مرنے لے نہائی پھر چلی آئی؟ خیر اچھا ہی  
ہوا، پانچ کلو ساگ منگوا یا تھا وہ ہی بنواؤں گی اس  
سے مفت خور نہ ہو تو جان کا عذاب۔“ زینت کو  
غائبانہ بکتی جھکتی وہ اٹھ کر چل دیں اور وادی اماں  
بیزدانے لگیں۔

”ہونہ! مفت کی نوکرانی ہاتھ لگی ہے۔ اب  
سے خوب مٹھی چچی کروائے گی۔ اللہ کسی پر ایسا  
وقت نہ لائے کہ اس موٹی بتول جیسی اوچھی کے آنے  
پیچھے پھرنا پڑے۔“

\*\*\*

جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہ ہوئے تھے ہمیں اس  
میں سکونت اختیار کیے ہوئے۔ اماں کی طویل بیماری  
ناگہانی وفات کے بعد زندگی حقیقی معنوں میں تنگ  
تھی۔ گھر کا جیسے شرانہ ہی بکھر کر رہ گیا۔ بیویوں  
دفاتر کے لگائے تب کہیں جا کر ابائی پیش منظور ہو۔  
امی کے نام منتقل ہو سکی تھی۔

شاہ میر کو اپنا بی کام اودھورا چھوڑ کر نوکری  
حصول کی خاطر دفاتر کی خاک چھانی پڑی تب کہیں  
معقول نوکری میسر آسکی درمیان کے عرصہ میں ہم  
جن مسائل کا منہ دیکھا وہ اللہ جانتا ہے۔ سارا جمع  
تو اماں کی بیماری پر ہی ٹھکانے لگا تھا۔ مزید قرض دار  
امی کا لہو نچوڑے دیتی۔ سو پرانے محلہ کا کشادہ گھر  
ساخوردہ گھر بچ کر ایک شامب علاقے میں بے گھر لے  
گیا تھا۔ قرضہ بھگتا کر قریب بچ رہنے والی رقم سے شاہ  
کو موبائل شاپ کھلوادی گئی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

امی اور وادی کو بیٹیوں کے اچھے رشتوں کی فکر  
لاحق تھی۔ نئے گھر سے ان کی بہت سی امیدیں وابستہ  
تھیں۔ سفر وسیلہ ظفر اور یہ بھی کہ علاقہ بہتر ہو تو رشتے  
بھی اچھے میسر آتے ہیں۔ یہ اور بات کہ رشتے  
معاملے میں ابھی تک کوئی چیز بھی پر نہ مار سکی تھی  
مگر ان کی امیدوں کا آفتاب پوری آفتاب و تاب  
دیک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ گھر کے اخراجات قابو میں آتے  
تھے۔

نیا محلہ، نئے لوگ، ابھی کسی سے ڈھنگ  
شنا سائی بھی نہ ہو پائی تھی۔ جوان بچیوں کا خیال کہ  
وادی اماں سب کو محدود رکھیں، اور ہمیں اگر ہم  
خالہ بتول ٹکرائی تھیں۔ اورچی، لمبی گوری، چٹی

والی! وادی اماں کو نری جان کا جبال نظر آتی تھیں۔  
انگلے ہی چند منٹوں میں وہ بول کے جن کی طرح  
حاضر تھیں۔ ”میں نے ساگ کا گھڑا اس کے سر پر لاد  
دیا ہے، ایک دو روز میں بنا کے لے آئے گی۔ لاکھ  
ہائے کیے، تب کہیں جا کر ٹلی ہے، ورنہ جان کو  
آجاتی۔“

”ہاں تو اور کیا! جان تو تمہاری حلوے میں انکی  
تھی۔“ وادی اماں بد مزگی سے بیزدانی تھیں۔ خالہ بتول  
شوگر کی مریضہ تھیں مگر بیٹھان کی کمزوری۔ ہمارے  
گھر میں اکثر ویشتر بیٹھا پکٹا اور وہ کھتی چلی آتیں۔ اب  
بھی حلوہ تیار تھا۔ امی ہلپٹوں میں نکال رہی تھیں اور  
بچ بچ ان کے دیدے بوہنے لگے تھے۔

”اے آپا! مجھے بھی پکھانا یہ میوں کا حلوہ۔“  
وادی اماں سے رہانہ گیا اور ٹوک بیٹھیں۔  
”اے بی بی! شوگر کی مریضہ ہو، پرہیز نہیں ہے  
تمہارا؟“

مگر پرہیز کرتی تھی خالہ بتول کی جوتی۔ اب بھی ڈٹ  
کے کھایا اور رفتار میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ امی کو ان  
کی ازلی نرم دلی مارے ڈالتی تھی۔ ان کی نظر میں خالہ  
بتول مستحق تھیں، جبکہ اسی عذر پر وادی اماں بدک  
اٹھتیں۔

”بیٹیوں میں تھیلے بھر بھر کے کھاتے کھلوا رکھے  
ہیں۔ مکان کرائے پر اٹھا رکھا ہے۔ بیٹا دینی سے  
بڑا روں بھیجتا ہے۔ کاہے کی مستحق ہے؟“

ان تمام حقائق سے انکار تو خیر کسی کو نہ تھا مگر امی  
کے نزدیک وہ مستحق ان معنوں میں تھیں کہ کوئی  
سان حال جو نہ تھا۔ بیٹیاں دور دراز بنیائیں گئیں، بیٹیوں  
کو بیویوں لے اڑیں جو پلٹ کر کبھی حال تک نہ  
پوچھتے۔ بے دے گئے اک مانی تھا جو ماں کا کچھ خیال  
کرتا تھا تو وہ بھی کچھ دن پرے پردیس سدھار گیا تھا اور  
ہائے کہاں کہاں کے آسمرے پکڑا کے زینت جیسی بلا  
ان کے سر چھو پ گیا تھا۔

گندی رنگت، دلکش نین نقش اور چھوٹے سے قد

کی اوچھڑ عمر زینت جو آئے روز خالہ بتول کے لیے  
سوغاتیں یا مختلف پکوان پکا کر لیے چلی آتی۔ ان کی مٹھی  
چھپی کرتی، گھر کے سودھندے بھگتائی اور ہر بار ایک ہی  
سوال پوچھتی۔

”نانی کی کوئی خبر آئی؟ آیا۔ آپا! مانی کا نمبر دے دو  
خالہ بتول، زینت سے رنج کے خدمت لیتیں، سر  
میں تیل کی مالش سے لے کر ناخن کٹوانے تک اور  
موبائل نمبر دینے پر آنے ہمارے کر کے ٹال جاتیں۔  
بعد ازاں معلوم ہوا کہ زینت جو ان بیٹی کی ماں ہے،  
جس کے لیے مانی صاحب یہاں انہیں اس کی ڈور  
تھما کے خود مزے سے پردیس سدھار گئے۔ اب بھی  
خالہ بتول امی اور وادی اماں کے سامنے دکھڑے روئے  
بیٹھ گئیں۔

”لاکھ ہمارے کے، ٹالا، مگر نہ جی! مانی کی تصویر لینے  
آئی تھی، لے کر بی ٹی۔“

”اور تم نے دے بھی دی؟“ وادی اماں نے انہیں  
ملامت بھری نظروں سے ٹکا۔ ”اے بی بی! کہیں اپنا  
اور اس کا وقت کھوٹا کرنا ہو۔ کوئی ہمارے کر کے چٹا  
کرد۔“

”ہزار ہمارے کیے۔“ خالہ بتول ایک بار پھر مال  
نوٹتے بیٹھ گئیں۔ ”جی ہار کہا کہ امید نہ رکھے، ہم  
مکان بچ کر دوسرے شہر جائیں گے، مگر وہ ایک ہی رٹ  
پکڑ کر بیٹھی ہے۔ اللہ مالک ہے جو ہوگا، دیکھا جائے  
گا۔ ہائے او میرے رہا! میں کدھر جاؤں۔ یہ نہائی تو  
میری جان کو ہی آئی ہے۔“

انہوں نے منہ پر پلو لے کر دونا شروع کر دیا۔  
انہیں مگر کچھ کے آنسو ہمارے دوسروں سے  
ہمدردی بونے کا شوق تھا۔ امی ازل کی نرم خود مقہور  
بھر تسلی سے توازیں، مگر وادی اماں ایک کائیاں! ابھی  
ان کے لبوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ منہ پر نہ سہی تو  
پیچھے ضرور بیزدانی تھیں۔

”اے یہ اپنی بتول کون سی کم ہے، ایسی بھی کوئی  
نور کی نہائی، دودھ کی دھلی نہیں ہے۔ اپنی خاطر  
خدمت جاری رکھنے کو زینت کو صاف کورا جواب



نہیں دیتی ہے۔

یہ دواوی اماں ہی نہیں ہم سب ہی جانتے تھے کہ خالہ بتول کو غرض مارے ڈال رہی ہے۔ نہنت کی امیدوں کے چراغ روشن رکھ کر اپنا اوسیدھا کرنے میں لگی ہیں۔ وگرنہ ایسی بھی مروت کی ماری نہیں کہ ایک بے ضرر سی عورت کو باہر کا رستہ نہ دکھاسکیں۔ اسی کا نرم و نازک دل نہنت کی مجبوریوں کی جانب بھی جھٹکتا تھا۔

”آج کل اچھے رشتوں کا کال ہے۔ ہر گھر میں لڑکیاں بیچی ہیں وگرنہ کاپے کو بے چاری نہنت اتنی علت پیتی۔“

”سچ کہتی ہو۔“ دواوی اماں نے سرو آہ کھینچی۔

”اچھے لڑکے ساتھ لگ جائیں تو لوگ یوں ہی جان کو آجاتے ہیں۔ بتول کے گھر میں پیسے کی ریل پیل ہے۔ نہنت سوہتی ہوگی، سسرال کا بھجوت نہیں، لڑکا کماتا کھاتا ہے، اس بتول تاس بیٹی کا کیا ہے۔ نرمی بیاریوں کی پوت، آج مری کل دوسرا دن لڑکی والوں کو اور کیا چاہیے۔“

اودھریاں کا فون آتا تو وہ رستہ تروا، جھنجھلا تاسائی دیتا۔

”ارے اماں! کچھ دے دلا کر چلا کر س۔ آپ نے کیوں اپنی جان مصیبت میں ڈال رکھی ہے۔ کہہ دیں کہ مانی نے اودھری شادی کرلی ہے۔ اور خالہ بتول آنا کالی کرنے لگتیں۔“

”ہزار خیالے بہانے کیے مگر نہیں مانتی، میری بات پر کہاں یقین ہے اسے۔“ وہ یہ بات کہتے ذرا نہ شرماتیں۔

مانی نے تنگ آکر شاہ میر کو فون کیا۔

”کسی طرح اس پرنسپل سے میری ماں کا پیچھا چھڑاؤ شاہی بھائی! اللہ کے بعد آپ لوگوں کے سوارے ہی اکیلا چھوڑ کر گیا ہوں انہیں مجھے معلوم ہے نہنت ان کی جان کھا جاتی ہوگی۔“

شاہی بے چارہ مروت کا مارا ہوں ہاں، تم فکر نہ کرو۔ کتنا رہ گیا اب مانی بے چارے کو کون بتانا کہ نہنت تو

کابل کو چھوڑ بھی دے، مگر کابل۔

”قصور مانی کا بھی ہے، کاپے کو اتنی امید پر پکڑا نہیں، نہ جلتے کون کون سے آسے تھماتے اور منہ چھپا کر دیتی نکل گیا۔“

بعد ازاں شاہی نے کہا۔ ان کے ایک مشترکہ دوست، جس نے مانی کو نہنت اور اس کی بیٹی سے متعارف کروایا تھا۔ اسی نے بتایا کہ نہنت اور ان کی بیٹی بے سارا ہیں۔ باپ ناشنی تھا۔ مرکھپ گیا۔ محنت مزدوری کر کے گزارا کرتی ہیں۔ مانی آئے روز ان کے گھر ڈارتا تھا۔ نہنت کی بیٹی سے محبت کی پیٹنگیں برصا کر وقت گزارتا اور دونوں ماں بیٹی کی خاطر خند تیز دونوں ہاتھوں سے بھڑاتا تھا۔ قیمت مٹھی اور دینی چائیں لگا تو کسی طرح نہنت کو خبر ہو گئی۔ ناچار اسے کارستہ دکھانا پڑا۔ بتول سے جانے کیا کچھ کہہ سن۔ متعارف کروایا۔

نہنت کی امیدوں کو آسرا ملا، اب اس کی امیدوں رخ خالہ بتول کی طرف ہو گیا، یوں آئے روز کی خاطر خدمت خالہ کا نصیب ٹھہری۔

نہنت بے چاری انتظار کی سولی پر لٹکی اس کی وہابی کی گھڑیاں گن رہی تھیں ویسے تو سب ہی جانتے تھے کہ خالہ بتول کا مزاج دس پر بھاری ہے اور ان کے ساتھ گزارا ناممکن سی بات ہے۔ محلہ بھر میں کسی ان کی ایک پل نہ بنتی۔ گریہ دار دو چار روز سے زیادہ نکلتے۔ کئی مایاں ان کے ہاتھوں درگت بنوا کر نکل چکی تھیں۔ ان کو چھینڑا بھڑکے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے برابر ہوتا۔ اپنی بد زبانی اور بد دماغی کے طفیل، معمولی باتوں پر وہ بچے جھاڑ کے پیچھے بڑھتیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ محلہ کے من چلے ان کی اسی طبیعت مزالینے کو آتے جاتے آوازے کتے، پھر تو جیسے طیار جنگ بچ اٹھتا تھا۔ وہ وہیں کشتوں کے نشے اکھاڑ کھڑی ہو جاتیں۔ جو ہاتھ لگتا اسے رگیدر چھوڑ دیتیں اور اپنی خطا کبھی نہ مانتیں۔ بعد ازاں ہمارے گھر آ آٹھ آٹھ آنسو روٹی نظر آتیں۔

”یہ منیر کل کا کچھ۔ مجھ پر آوازیں کستا ہے۔ اس

کابل میں رہا تھا تو میں نے پانچ ہزار دیے تھے۔ داردار کھانا ہاں اچھا بییتی تھی اور یہ اشتہام بھول کر مانی ماں کے میرے احسان کو لیس پکڑ کر لے گئی۔ میں نے نہنت دی تھی۔“

ان کا کردار ہلکا تھا۔ یوں ہی دوسروں پر کیے اسامات بنا مروت کے گنوا کی جلی جاتی تھیں۔ مزاج کے آٹھ آٹھ مانتے پر رکھ لیتیں اور ان ہی خواص سب محلہ بھر سے منہ پھیر کے چلتی تھیں۔ اگر بیٹی اس ہمارے گھر سے۔ اسی تھیں کہ مروت و لحاظ میں سی جائیں، مگر دواوی اماں ان سے خوب واقف تھیں۔

”محلہ بھر کے لیے ان کا کردار ناپسندیدہ تھا۔ سب معاملات پر نظر رکھتیں۔“

”کاخر چاکیے پورا ہوتا ہے۔ شاہی کے ابا کتنا چھوڑے مرے ہیں۔“

”میں نے اسے کیا کچھ جوڑ رکھا ہے۔“ اسی ساوگی و توکل بھرے جوابات سے نواز تیں مگر دواوی اماں بات کا رخ ان ہی کی جانب گھماتیں۔

”تم بتاؤ تمہاری بہو تمہیں چھوڑ کے کیوں بھاگی؟“ اور بات سچ سچ گھوم جاتی۔ دواوی اماں مزاج کی تیز تھیں۔ ہر بات منہ پر بر ملا کہنے کی عادت تھی اور غلط بات پر تار تار کر دیتیں۔

”موتے کی بات یہ کہ خالہ بتول ان کی گڑوی کسبیلی سن ہی لیا کرتی تھیں۔“ اگرچہ دواوی اماں کو میرا یوں بڑھ چڑھ کے ان کا کام لگتا تھا کہ نہ بھاتا تھا، مگر امی کا فرماں تھا کہ جانے کس کے دل سے نفلی دعا شاہ گل کا نصیب کھول دے اور کیا تاہ بتول ہی ہو اور ہمیں اگر دواوی اماں بھی مات کھا جائیں۔ خیر یہاں تک بھی ٹھیک ہی تھا مگر جب وہ دل کی شیشی یا ہمندی کی مریا اٹھائے چلی آئیں تو دواوی اماں نے صاف گوراجواب پکڑا دیا تھا۔

”اے بتول! بچی کو ہزار دھندے ہوتے ہیں اس کے اس اتنی فرصت کہاں کہ گھنٹہ بھر بیٹھ کر تمہارے

سر میں تیل ٹھونکے یا ہمندی تھوپے۔ جاؤ بی بی! اپنا رستہ ناپو محلہ بھر پڑا ہے، کسی اور سے لگوا لو۔“

خالہ بتول چپ کی چپ رہ جاتیں۔ اور ایسے ہی وقتوں میں خالہ بتول کو نہنت کی یاد ستاتی جب گھر کا کوئی کھینڑا پھیلا رہ جاتا یا انہیں اضافی مشقت کی ضرورت پڑتی وہ از خود نہنت کو فون کھڑکا دیتیں اور شاہی اش تھی نہنت پر کہ ایک ہی پکار پر بلیک کہتی آن موجود ہوتی۔ گھر کے بیسیوں دھندے ٹھانے کے ساتھ خالہ بتول کے سر میں تیل ڈالنا ناخن کھڑنا یہاں تک کہ پیر داہنا۔ اور یہیں اگر شاہی درست ثابت ہو جاتا کہ خالہ بتول کو غرض مارے ڈال رہی ہے۔

دواوی اماں یا امی مقدور بھران کی اعتبارات کا خیال رکھتی تھیں، مگر خالہ بتول کو دوسروں کو ستانے کی عادت تھی۔

اور ہمارے سامنے کہتیں کہ وہ عاجز ہیں نہنت سے۔ اس بار بھی دواوی اماں کو گھرے قلق نے آن گھیرا۔

”حق باہ! لڑکیوں کے رشتے کی پریشانی گھر گھر میں ہے، مگر ایسے ہی والدین بیٹیوں کی قدر و قیمت گرا دیتے ہیں۔ اے پھٹ بڑے وہ سونا جس سے نوٹیں کالن۔“

دواوی اماں کا فرماں بجا تھا۔ جانے کیوں نہنت خالہ بتول کا واسن پکڑے بیٹھی تھی۔ میرا اندازہ تھا ان کی بیٹی ایسی لگی گزری بھی نہ ہوگی۔ خود میں نے اسے پہلی بار دیکھ کر دل ہی دل اسے سراہا تھا۔ چمپن رنگت، موٹی موٹی غلانی آنکھوں والی عورت کسی دور میں واقعی باکمال رہی ہوگی۔ میں بے ساختہ تصور میں مانی اور نہنت کی بیٹی کا موازنہ کرنے لگی۔

قد وے عام ناقشہ، مناسب قد و قامت تھی مانی کی۔ اچھل اچھل کر تیز تیز چلتا۔ عمر یہی کوئی بائیس چوبیس برس ہوگی۔ مگر مانی کی شہرت اچھی نہ تھی۔ بلکہ سناو یہ بھی تھا کہ وہ ملک سے باہر بھی کسی عیس سے بچنے کی خاطر ہی گیا ہے۔

شاہی کتنا مانی کا کردار ٹھیک نہیں ہے، بلکہ وہ منہ لگانے قابل لڑکا ہی نہیں ہے، مگر ہر حال میں تنبیہ کرنا



# لڑکی کا شادی

”ہاں! ہاں! ہماری شکایتیں بھی لکھو۔“ باقی سب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔



شعلع کے ہیرو ہیروئوں اور دوسرے کئی ”گان“ پر تو کافی کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے ہماری نظر ایک نئی کٹیگوری شعلع کے ”شکایت گان“ پر پڑی۔ ان شکوے شکایات سے بھرے خواتین و حضرات کی اس جونی کے لیے ہم فوراً ”کافذ قلم“ لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد نظر اٹھا کر دیکھا ہی تھا کہ ڈر گئے ہمارے اردوں طرف خوشخوار سے مرد حضرات جمع تھے۔

”ارے لکھو لکھو! رک کیوں لکھیں؟ ایک جلالی سے والے ابا حضور ٹائپ حضرت آگے بڑھے۔

لیتے تھے اور وہی سویا جاگا سا وقت تھا جب خالہ بتول کے گھر سے چیم کار کی آواز بلند ہوئی۔ یوں ہی ذرا سر کن لینے کو جھاگی ماری تو پتا چلا کہ زینت بیگم کی شامت آئی ہوئی ہے۔ شور مچا اور زینت خالہ بتول کے گھر سے نکل ہی رہی تھی کہ اپنی اذنی منجھرس فطرت سے مجبور ہو کر وادی اماں نے نہ صرف زینت جالیا بلکہ اندر بھی کھیت لائیں۔ زینت چمکوں پہنکوں رو رہی تھی۔

خالہ بتول نے اس کے بال پھاڑ دیے تھے۔ چہرے پر جا بجا خراشوں کے نشانات لباس بے ترتیب تھا۔ ماجر کیا ہوا۔ عقل دنگ تھی۔

”میں نے تو بس تپا بتول کو اتنا بتایا تھا کہ میری بیٹی رشتہ لگ بھی گیا۔“

”چلو گل نکلی“ ماہ گل بیڑی والی اور میری گھوری لب داب لیے وہ کتنی رہی۔

”مالی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ بیٹی کا کالنا نکل جائے تو وہ میرا ہاتھ تھام لے گا“ اس بڑھیا کو ہزار بار اشاروں کنایوں میں سمجھایا، مگر یہ نمالی سمجھتی ہی نہیں آج منہ پھوڑ کے کہتا رہا۔

اس کے رونے کا سلسلہ وہیں سے جاری ہو گیا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔

”مالی نے مڑ کے خبر ہی نہ لی اور یہ بڑھیا اس کا ہاتھ ٹھکانا مگر سب دبائے بیٹھی ہے۔“

وہ روئی جا رہی تھی۔

”کوئی اللہ!“ ماہ گل نے خالصتاً ”واہی اماں کے انداز میں کہہ کر دانتوں تلے انگلی دبائی اور کمرے سے نکلتی چلی گئی تھی۔

ای کامنہ کھلا کھلا رہ گیا اور وادی اماں ساکت بیٹھ اسے سنتی جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

وہ چاہے کچھ بھی سوچیں مگر میں یہ سوچ رہی ہوں کہ وادی اماں کا فرمان بجایا ہے۔

دنیا سے شرم و حیا اٹھ گئی ہے سو قار و عزت، نیک نامی کا بھرم اور اخلاق و کردار سب بچ کھائے۔

پہلی بار مجھے خالہ بتول اپنے کسی عمل میں بحال محسوس ہوئی تھیں۔

نہ بھولنا کہ خردوار میرا نمبر زینت کو نہ دینا اس دن بھی وہ ہمارے گھر اشار پس دیکھ رہی تھیں جب مالی کا فون آگیا اور وہ چند اور گھر کی باتیں کرنے کے بعد حسب عادت دکھڑے رونے بیٹھ گئیں۔

”مالی بیٹا! کیا بلا تھوپ گئے ہو میرے سر، آئے روز آن و گھنٹی ہے، تمہارا پوچھتی ہے۔“

”وہ ماں جی! کیوں آپ نے اسے منہ لگا رکھا ہے، کہہ دیں کہ میں نے پانچ سال کا کنٹرک ٹکرایا ہے وہیں شادی بھی کر لوں گا۔“

”میں نے یہ بھی دس بار کہہ کے دیکھ لیا، وہ نہیں مانتی۔“ انہوں نے کہا۔ دوسری طرف سے مالی نے جالے کیا کہا کہ وہ نرم پڑ گئیں۔

”بیٹا! ایسے نہیں کہتے بے چاری غریب عورت ہے، مجھے غریب کی بددعا سے بڑا ڈر لگتا ہے۔“

”اماں جی! میں نے کوئی آسروے نہیں تھمائے۔“ اس بار مالی چیخا تھا، سب ہی نے سننا۔ ”بس کچھ وقت اچھا گزار لیا، یہ خواب دیکھنے بیٹھ گئیں، مجھے شادی کرنی ہوگی تو مجھے لڑکیوں کی بڑی ہے؟ صاف پاہر کا رستہ دکھا کر چلا کریں اسے۔ کہہ دیں کہ اب مالی آنے والا نہیں وہ امید چھوڑے، بلا وجہ جان کو آگئی ہیں اور میرا ہاتھ کانا ہرگز نہ پٹانا، ورنہ کیوں اور چلا جاؤں گا، آپ کو خبر بھی نہ دوں گا۔“

مالی کے لہجے میں نہانے بھری آکٹا ہٹ کے ساتھ ساتھ دھمکی بھی تھی۔ میرا نازک سا حس دل سمٹ کر پھیلا تھا۔ بے اختیار بیٹیوں کے والدین کا دکھ طبیعت بوجھل کر گیا تھا اور خالہ بتول جیسے مطلب پرستوں پر تاء آیا، جو دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا کرتے ہیں اور مالی کے یہ مکالمات اگر زینت سن لے تو۔ تو۔ تو۔ شاید اسی لیے کہا گیا ہے کہ دکھ انسان کب دیتے ہیں، دکھ تو انسان سے وابستہ امیدیں دیا کرتی ہیں۔

آخر ایک روز اس ڈرامے کا ڈراب سین بھی ہو ہی گیا۔ ہم سب ٹھہرے فارغ ہو کر ذرا سی دیر کی اونگھ

آکر ایک روز اس ڈرامے کا ڈراب سین بھی ہو ہی گیا۔ ہم سب ٹھہرے فارغ ہو کر ذرا سی دیر کی اونگھ

آکر ایک روز اس ڈرامے کا ڈراب سین بھی ہو ہی گیا۔ ہم سب ٹھہرے فارغ ہو کر ذرا سی دیر کی اونگھ

آکر ایک روز اس ڈرامے کا ڈراب سین بھی ہو ہی گیا۔ ہم سب ٹھہرے فارغ ہو کر ذرا سی دیر کی اونگھ

آکر ایک روز اس ڈرامے کا ڈراب سین بھی ہو ہی گیا۔ ہم سب ٹھہرے فارغ ہو کر ذرا سی دیر کی اونگھ



”ارے ان کمائیوں میں سارا سیپاہی ہمارا ہوتا ہے۔ ہم بے چارے ہر طرح سے ظالم ثابت ہوتے ہیں جی۔“ ایک صاحب موچیس موڑتے ہوئے بچوں کی طرح منہ بسور کر بولے۔ ہماری ہنسی چھوٹ گئی۔

”اب بتاؤ جی! میں نے ایک کمائی پڑھی کہ ظالم سنگدل بیٹا بیوہ ماں اور بہن سے لاپرواہ جو روکا غلام بن گیا۔ نہ پوچھیں جی! کیا گزری میرے دل پر۔“ ایک چٹے والے حضرت آگے بڑھ کر باقاعدہ آنکھوں میں آنسو لاکر بولے۔

”بس پھر اس دن سے میں نے امی باجی کا پچھالے لیا۔ پھر ایک دن میں نے ایک اور اسٹوری پڑھی جسے کھور شوہر کی بیوی کو ایک تھپڑ صبح ایک تھپڑ شام مارنے والا لکھ کے کاموں میں کبھی بیوی اور ماں بہنوں کے اشارے پر چلنے والا بے عقلا۔ مت پوچھیں باجی۔“

ہم جوان کی باتوں پر ہنسی دیا ہی رہے تھے کہ ”باجی“ پر بری طرح بد مزہ ہو گئے۔ کھور کراہیں دیکھا کم از کم بھی پندرہ سال بڑے ہوں گے حضرت۔ ہو سکتا ہے احترام میں کہا ہو۔ آخر ہم ان کی شکایتیں لکھ رہے ہیں ہم کچھ مطمئن ہو کر پھر سے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

”میری تو مت ہی ماری گئی یاں بہنوں کو خوش رکھوں تو بے حس میاں اور بیوی کی سنوں تو جی جو روکا غلام۔“

ان کے باقاعدہ آنسو بہنے لگے۔ ہم کافی متاثر ہو گئے۔ مگر اب حضور ٹائپ حضرت شاید زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ سے انہیں دھکا دے کر پیچھے کیا اور گھن گرن کر بولے۔

”بس! بس! اب مجھے یہ بتاؤ کہ ہر شادی رکوانے میں میرا ہاتھ کیوں دکھایا جاتا ہے؟ اور میں نے کون سے سخت پیرے بٹھائے ہیں اس کم بخت ہیروئن پر؟“ وہ باقاعدہ دہائی دے کر بولے۔

”اور اب میری سُنیں۔“ ایک جوشیلا سا جوان آگے بڑھا۔

میں نے متکئی توڑ کر ایک امیر لڑکی سے شادی کر لی میں بے وفا اور جانے کیا کیا۔ اور وہ جودل میں لڑی ڈال رہی تھی وہ کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ تو خوش تھی جتنا کہ گھر میں مجھ سے زیادہ بہتر اور مہربان سا اس کے دوست کا بیٹا بس اس کے آنسو پوچھنے کا منتظر ہے وہ ہی جو اس کے گھر رہنے آیا تھا۔“ وہ ہمیں دلا دلاتے ہوئے بولا۔

”اور بس لکھ ڈالی اسٹوری اس پر؟ اب یہ تو میری مہربانی ہے کہ میں راستے سے ہٹ گیا ورنہ ان کی کیسے پار لگتی۔ یہ راسخز بھی جس کو چاہے اچھا بنا دیتا جس کو چاہے برا۔“ وہ عجب منہ بنائے کہہ رہا تھا۔ اب پیچھے منتظر ”شکایت گان“ انتظار کرتے کرتے اپنی اپنی شکایتیں با آواز بلند ساتھ ساتھ سنانے لگے ہم گھبرا گئے۔

”اچھا اچھا ہم نے سب کی سب لی ہم لکھ لیں گے۔“ بڑی مشکل سے وہ سب رخصت ہوئے۔ اب نے ابھی سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ ایک زوردار دھبہ ہمارے کندھے پر دی اور ہم گرتے گرتے نیچے پڑے۔ کروکھناؤ ایک دھان پان سی تانی اماں ٹائپ خاتون کھڑی تھیں۔ ہمیں یقین نہ آیا کہ انتاجان وار کام ان کا ہو گا۔ مگر وہ ایلی ہی تھیں۔

”ارے کیا گھور رہی ہو؟“ وہ تیز لہجے میں پان چھالیہ چباتے ہوئے بولیں۔

ہم نے ان کے منہ میں جھانکا مگر دانت نامی کوئی شے دور دور تک نہ تھی۔ جانے کیسے چارہ ہی تھیں۔ یہ بھی ہماری تانیوں وادوں کا ہی کمال ہے۔ ”اے ہاں کچھ کھاؤ گی نہیں تو یہی ہو گا۔“ یہ نگواں ماری ڈانٹنگ ناس پٹی۔ ایک ہمارا زمانہ تھا اصلی کچھ مکھن ڈٹ کر کھاتے اور سر پر دو دو گھوڑیاں لاد لیتے تھے۔

ہم نے اس وجود پر ان کا دعوا ملاحظہ کیا پھر کندھے میں ٹپس اٹھی تو اس پر یقین بھی کر لیا اور اس سے پوچھا کہ وہ مکمل اپنے زمانے میں کھو جاتیں ان سے ان کی شکایت پوچھی۔

”اے ہاں اچھا یاد دلایا۔ یہ بتاؤ گویا ماری لکھنا نہیں ہے ہر کمائی میں ظالم انکار ہے چنانچہ ساس کیوں بنا دیتی ہیں؟ ان کم بخت برووں کو نہیں دیکھتیں گھنہوں سنہیوں کو۔ ذرا جو لحاظ کریں۔ اب ہم اس عمر میں کسی دو لفظ نہ بول سکیں تو یہ سفید بال گئے چوٹھے ہیں۔“

وہ کافی جلال میں آچکی تھیں۔ ”مگر نانی جی! سنا ہے کہ آپ بیٹیوں کی سائڈ۔“ ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا ہی تھا کہ انہوں نے درمیان سے تاج چکی۔

”ہاں تو بیٹیاں ہیں میری۔ کیا چوٹھے میں جھونک اس انہیں۔“ چوٹھا شاید ان کو بہت پسند تھا۔ ”دو گھڑی میرے پاس آجائیں تو ان حد کی ماریوں کو آگ لگ جاتی ہے۔“

وہ ہاتھ تھپکا کر بولیں۔ ہر حال ہم نے ان کی شکایت لکھنے کا وعدہ کر کے ان کا کافی غصہ ٹھنڈا کیا اور وہ کافی دیر ہو کر گئیں جس کا ثبوت چھالیہ کے وہ دو دانے تھے جو وہ جاتے ہوئے ہمارے منہ میں ڈال گئی تھیں۔ ایسے بھی اس عمر میں ہر بندے سے کچھ نہ کچھ شکایت نکالنی ہوتی جاتی ہے۔

ہم ابھی کٹر کٹر کر کے چھالیہ چپائی رہے تھے کہ ایک ادارت سا شوخ و شنگ نو جوان ریکٹ گھماتے ہوئے سامنے اکھڑا ہوا۔ جو گرز، جینز پر ریڈی شرت، گرنٹ کسائے بال اور آنکھوں پر گلاسز۔ ارے یاد آیا۔ یہ تو سائڈ ہیرو ہیں۔ ہیرو کے چھوٹے بھائی یا دوست یا راکٹ کیلی کی صورت میں گرنٹ ”ہیلو مس!“ وہ ہاتھ اڑھائی سے بولا۔

”آپ میری بھی شکایت لکھیے“ وہ اپنے بال پھر ہاتھ سے میٹ کرنے لگا۔ ”حال میرے دل کا تمام لکھ لکھنا چاہتا ہوں۔“

”ہر کمائی میں گھر کی رونق میرے دم سے ہے۔“ ہر کمائی میں گھر کی رونق میرے دم سے ہے۔ ”میں شوہاں بکھیرنا گنگنا نامی کو ہنسنا تمب کو مینشن میں لانا ہوں اور وہ ہیروئن صاحبہ تو میری باتوں پر

منہ پر ہاتھ رکھے ہنس ہنس کر ٹیڑھی میڑھی ہو جاتی ہیں اور ہمبر سارے لے اڑتے ہیں یہ یو رگ۔“ آدم بیزار عینکو بڑے بھابھو مینے میں ایک بار مسکراتے بھی ہیں تو چھپ چھپا کے مگر جانے کیسے ہیروئن یہ مسکرا ہٹ دیکھ لیتی ہے اور اس پر دل و جان سب فدا کر بیٹھتی ہے۔“ وہ آخر میں کچھ جل کر بولا۔

”دیے ایک آدھ سائڈ ہیروئن تو آپ کو بھی مل جاتی ہے۔“ ہم نے یاد دلایا۔

”بس رہے دیں۔ زیادہ خوبصورت والی تو بھیا کو ملتی ہے نا۔“ وہ بولا پھر ایک دم سے ہمارے پاس بیٹھ کر بولا۔ ”وہ لے اچھی تو آپ بھی بہت ہیں۔“

اور ہم اس بات پر شرمیلے کا ارادہ کر رہے تھے کہ یاد آیا کہ یہ تو اس کا تکیہ کلام ہے جو ہر لڑکی کو دلکھ کر منہ سے پھسل پڑتا ہے۔ ہم نے فوراً ”ارادہ ترک کر کے اسے گھورا تو وہ ہنستا گنگنا تا ہوا ریکٹ گھماتا چل پڑا۔

”میری شکایت ضرور لکھیے گا۔“ وہ جاتے جاتے بھی ہانک لگاتا نہیں بھولا تھا ابھی ہم لکھ لکھ کر دوڑ کر نہ والا ہاتھ جھٹک ہی رہے تھے کہ ایک مسکراتی ہوئی ہیروئن ہمارے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

”آپ کو کیا شکایت ہو سکتی ہے بھلا؟“ ہم نے حیران ہو کر کہا۔

”میرا نام فتمینہ، مجھ سے چھوٹی کا سرش، اس سے چھوٹی کا زونہ، اس سے چھوٹی کا شرار بھالی کا ابارق۔“

”ارے ارے رکیں۔ ہمارا تو دماغ چکر ا گیا ان خدائی ناموں سے،“ ہم نے سر پکڑا۔

”یہ تو شکایت ہے۔“ وہ منہ بسور کر بولی۔ یہ راسخز ہمارے ایسے ایسے جتنا نام رکھ دیتی ہیں۔ آپ کو بتا ہے ہمارے بڑوس کا بچہ تو مجھے کبھی فیتہ اور کبھی فتنہ کہتا ہے۔ شرار کو کھٹار اور۔“

”بس بس ہم آپ کی شکایتیں پختا دیں گے۔“ ہم نے گھبرا کر کہا تو وہ شکر یہ کہہ کر رخصت ہو گئی۔



ہم نے ذرا سکون کا سانس لیا اور کانڈر جھٹکے ہی تھے کہ اچانک کچھ کرنے کی آواز آئی۔ ہم نے ہڑبکا کر سر اٹھایا تو ایک زخمی خاتون اٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہم نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ ان کے دائیں گال پر نیل بڑا تھلہ پائیں گال پر چار جناق انگلیاں چھپی تھیں تو ان کا چہرہ تو کچھ سمجھ میں ہی نہ آیا۔ بال اچھے ہوئے اور کپڑے ملجھ سے تھے۔

ارے ہاں یہ تو ہماری مظلوم ہیروئن ہیں۔

”جی فرمائیے۔“ ہم ہمہ تن گوش ہوئے۔

”بس کیا بتاؤں! صبح سے دعوت کی تیاری کر رہی تھی۔ شامی کباب کا سلا پيسا، بریانی، بانی ساتھ ساتھ دوسرے ہاتھ سے چکن کڑائی بھی بنائی۔ بیچ میں جو وقت ملا اس میں سلاؤ، رائیہ اور تین طرح کی چٹنیاں بنائیں۔ چکن روست تو تھا ہی، مٹر بلاؤ بھی بنا ڈالا۔ آخر میں، میں کسٹور اور لب شیریں بنا کر فارغ ہوئی تھی کہ شوہر نثار آگئے۔ ان کے کپڑے استری کرنا بھول گئی تھی۔ بس پھر کیا تھا، پیچھے کے پھپھروے مارا۔ میرا جی تو چاہا لعنت بیچ کر کپڑے سمیٹ کر میکے چلی جاؤں اور ہاں سارا کھانا بھی لے جاؤں۔ آخر میری اتنی محنت تھی مگر نہ۔ میں تو مشرقی بیوی، نیک پروین ہیروئن۔ آپ کی رائیہ نے مجھے رونے پر لگا دیا۔ وہیں بیٹھ کر ان کی ہاتھ میں پکڑی شرٹ گلی کر دی۔ ہاتھ روم سے باہر نکلے تو اور غصہ ہوئے کہ روکھا دے دیا بس پھر میں آپ کے پاس آئی۔“

وہ آنسو بہاتے ہوئے بولیں تو ہماری ساری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہو گئیں۔

”شادی سے پہلے بھی آپ کی رائیہ نے مجھے تیزو طرار تائی پھوپھی، مای زادوں سے خوب باتیں سنوائیں مگر مجھے چپ رہنا پڑا جبکہ جی تو چاہتا تھا کہ ایک کی دس سناؤں اور ساتھ ایک لگا بھی دوں مگر میں تو مظلوم ہیروئن تھی نا۔ لاپاکو آپ کی رائیہ نے گزار دیا تھا اور پیسے کی تنگی تو نہ پوچھیں۔ شادی کے بعد بھی ساس نہیں۔“

ان کی بات ادھوری رہ گئی اور ہچکچاہٹ کی آواز آنے

گئی۔

”جی! میں آپ کی شکایت پہنچا دوں گی کہ آپ کو بھی دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع دیا جائے۔“

ہم نے انہیں تسلی دی۔ وہ شکر گزار نظروں سے ہمیں دیکھتی، آنسو پوچھتی ذرا لنگراتی ہوئی روانہ ہوئیں۔ ہم نے بھی نشوونما کر اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کئے۔

دھیمی دھیمی گنگناہٹ پر ہم نے سر اٹھایا تو ایک کم عمری دھینڑ صاحبہ ہمیں بڑی شوخ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”آپ کو بھی رائیہ سے کوئی شکایت ہے؟“ ہم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”ارے تو بہ کریں جی! مجھے سب رائیہ زاتی پسند ہیں کہ کوئی حد نہیں۔ فائزہ افتخار، حمیدہ احمد، نمرہ احمد، ثروت نذیر، مریم عزیز، راحت جنہیں، اسماء قادری، نیہہ ناز، نمرہ بخاری، راشدہ رفعت، نگہت سیماء، صائمہ اکرم وغیرہ وغیرہ سب کی سب مجھے اتنی پسند ہیں، اتنی پسند۔“

”لب بتا بھی دیں کتنی پسند ہیں؟“ ہم نے بات اس ڈر سے کاٹ دی کہ بغیر سانس لیے بولتے بولتے بے ہوش ہی نہ ہو جائیں۔

”بہت بہت زیادہ۔ میں تو ان سب کے ایک ایک ناول پانچ پانچ بار پڑھتی ہوں۔“ انہوں نے ہاتھ سے پانچ کا اشارہ کیا۔ ”بس مجھے شکایت ایڈیٹر آپنی سے ہے۔ میں اپنی اتنی بڑی لائف (ہر ناول پانچ بار جو پڑھتی ہیں بھئی) میں سے ٹائم نکال کر اور بھائی کی شفتیں کر کے خطا پوسٹ کرواتی ہوں اور وہ اپنی پیاری رومی کی باسکٹ کو کھلا دیتی ہیں۔“

انہوں نے منہ بسورہ۔ ہم سمجھ گئے یہ قاری صاحبہ ہیں۔

”اور آپ!۔۔۔“ انہوں نے بولا ہی تھا کہ ہمیں چھٹا لگا۔ اپنے سے چند سال بڑے انکل کا باجی تو برواشت ہو گیا تھا مگر صنف نازک کے ناممکن۔

”ایک منہ یہ آپنی کے کہا؟ آپ سے تو دو سال

نے ہی ہوں گے۔“ ہم غضب ناک ہو گئے۔

”اوہ سوری! غلطی ہو گئی۔“ وہ جلدی سے بولیں کہ بات بھی تو نوٹ کروانی تھی۔

”ویسے ہمیں پتا ہے یہ آپ کی عادت ہے، ہر رائیہ اپنی باجی بنا دینا چاہے وہ بے چاری کتنی ہی کم عمر ہوں۔ ہم نے ہوں اور دل میں کتنا ہی تملائیں۔“ ہم نے پُر سکون ہوتے ہوئے بولے۔

”ارے جناب! ہم ان کا بہت احترام جو کرتے۔“ وہ شوخی سے چوٹی جھلاتے ہوئے بولیں۔ ”اور میرا کوئی شعر شائع ہوتا ہے نہ لطیفہ، بس چند گھنٹے نام آتے ہیں۔“ انہوں نے دوسرا پارا کھولا اور پھر ہمارے قریب لاتے ہوئے بولیں۔

”ویسے آپس کی بات ہے، یہ ان کے رشتے دار تو ہوتے؟“ ہم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی کہ دوسرا موضوع شروع کر چکی تھیں۔

”اور ہاں! سب رائیہ کو بول دیجیے کہ ہیرو ہیروئن الگ مت کیا کریں، پلیز پلیز اور ہیروئن کے کہ تو بالکل برا مت کیا کریں، پلیز۔“ انہوں نے پیش جھاڑیں۔

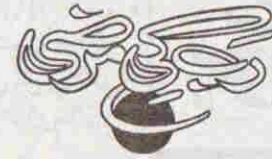
”چاہے ہیروئن صاحبہ جتنا بھی ستم ڈھا چکی۔“ ہم بڑبڑاے۔

”ارے بھئی! ہیروئن ہونے کا کچھ تو پروٹوکول ملنا۔“ وہ بڑے آرام سے بولیں۔

”اس میں جلتی ہوں۔ سب شکایتیں یاد سے لکھ کر پلیز۔“

چوٹی ہلاتے ہوئے رخصت ہو گئیں۔ ہم اگلے سر کے ساتھ سب نوٹ کرنے لگے تھے کہ الٹی آنکھوں سے کچھ خواتین دکھائی دیں جو ہماری





عکس اس کی آنکھیں جلانے لگے تھے۔



جگن آفریدی، ملی آفریدی کی سب سے چھوٹی اور تین بھائیوں کی اکلوتی بہن، ہمیشہ سے قسمت کی بددعا رہی تھی۔ اسے وہ سب کچھ ملا تھا، جو اس نے نہ مانگا تھا۔ کبھی سوچا تھا، لوگ اس کے حسن اور قسم پر رشک کیا کرتے تھے۔

باپ اور بھائیوں کے لاڈ پیار نے اسے لگاڑنے بجائے اسے محبت سی خوب سیرنی نوازدی تھی۔ وہ بھی کرتی۔ فرمائش بھی کرتی، مگر وہ جس سے کسی تکلیف نہ ہو۔ باپ بھائی بھی اس کی کوئی فرمائش کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ بھی تو جب کا میں رضا سے اس کی دوستی اور پھر دوستی سے بات آگے بڑھی، تو بڑی خوشی سے اس کے باپ اور بھائیوں نے رضا سے اس کی شادی کر دی تھی۔

رضا بھی اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ سو اس بھی قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور اس کی زندگی رنگوں سے آشنا ہوئی۔ رضا ایک بہت ہی اچھا اور مخلص شوہر ثابت ہوا۔ خوشی اور پیار سے بھرپور جگن کو کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ بغیر مانگے اسے کچھ مل رہا ہے، تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرے اور اس سے مانگتی رہے۔

وہ اپنی خوشیوں میں اس قدر مگن رہی کہ مانگنا اس کے آگے گر کر انا بھول ہی گئی۔ اس رب کے آگے جو بلا ہے نیاز ہے۔

اسے ہمیشہ سے نئے سال کی پہلی رات نیویارک میں گزارنا پسند تھی۔ بہت چھوٹی سی عمر میں وہ اس موقع پر ہر ضروری کام چھوڑ کے نیویارک پہنچ جاتی تھی۔ چاہے اس کے پیچڑی کیوں نہ ہوتے گوئی اہم تہوار ہی کیوں نہ ہو تیا پھر اس کے جان سے پیارے پیارے کیوں نہ ہوتے۔ وہ یہ رات بھی نہیں چھوڑتی تھی۔ حتیٰ کہ شادی کے بعد بھی اس نے اپنی یہ عادت برقرار رکھی تھی۔

پہلے دو سال تو رضائے بھی اس کا ساتھ دیتا تھا، مگر اگلے پانچ سال تک اسے اکیلے ہی یہاں آنا پڑا تھا۔ ہمیشہ وہ دس، پندرہ دن پہلے ہی نیویارک پہنچ جاتی تھی اور ہمیشہ ہی اس کا دل پھر بھی پاکستان نہ جانے کو کھینچتا تھا۔ بھائی زبردستی اسے واپس بھیجا کرتے تھے۔ پہلے پاپا کے خیال سے اور اب رضا کے خیال سے۔

مگر اس بار جب وہ خود سارے رشتے توڑ کر نیویارک آئی تھی اور پھر بھی پاکستان نہ جانے کا عہد بھی کر رکھا تھا تو نہ جانے کیوں اس دفعہ دل اس کا ساتھ دینے سے انکاری ہو رہا تھا۔ بار بار پاکستان جانے کے لیے ہمت کرتا تھا۔

وہ چائے لے کر کمرے میں آئی۔ موبائل چیک کیا تو رضا کی پندرہ کالز اور نہ جانے کتنے ہی ایس ایم ایس اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ اس نے پڑھے بغیر ہی سارے ایس ایم ایس ڈیلیٹ کر دیے اور بے دلی سے موبائل بیڈ پر اچھال دیا۔

چائے کا کپ سائڈ ٹیبل پر دھر کے اس نے تکیے سے پشت ٹکا دی اور آنکھیں موند لیں۔ بیتے دنوں کے

”اماں! آپ۔ مجھے بلالیا ہوتا۔“ ساس کو دیکھ کر وہ یکدم ہی بیڈ پر سیدھی ہو بیٹھی۔

”جسے سوال کرنا ہوتا ہے ناں بیٹا! وہی چل کر جاتا ہے ہمیشہ۔“ اماں کا بلا بلا سا لہجہ اسے چونکا گیا۔

”کیا مطلب اماں!“ اس کی آنکھوں میں تشویش نمایاں تھی۔

”دیکھ بیٹا! اللہ نے تجھے ہر نعمت سے نوازا، بنانا گئے سب کچھ تیری جھولی میں ڈال دیا۔ تو نے وہ سب خوشی سے قبول کیا ناں؟“

جگن نے نا بھیجی میں سر ہلا دیا۔





”تو بس پھر رب نے زندگی میں ایک چیز تجھے نہیں دی تو اسے بھی مان لے سچو دل سے۔“

”پر اماں! زندگی کی یہی خوشی تو سب سے بڑی خوشی ہے۔“

اس کی آواز شکستہ تھی۔ اماں نے او اس آنکھوں سے اس کا زرد چہرہ دیکھا۔ جب سے اسے ڈاکٹر نے یہ خبر سنائی تھی کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ اس کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔

”پرینا! اللہ نے یہ آزمائش دی ہے تجھے۔ پھر اس کا حل بھی تو ہے ناں۔“ جگن نے فوراً سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

”تو ماں نہیں بن سکتی۔ پر رضا تو الحمد للہ ٹھیک ٹھاک ہے ناں، پھر سوچ ڈرا۔ اس کے بچے تیرے بچے نہیں ہوں گے کیا؟ بلکہ بڑی ماں تو ٹوٹتی ہوگی ان کی۔“

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اماں کی باتوں میں خوشامد ہے یا بچہ بچکی ٹکلی۔

”ماں جا بیٹا! سوچ لے اچھی طرح رضا تو ماں ہی چکا ہے، مگر اچھا ہو گا اگر اس میں تیری رضامندی بھی شامل ہو جائے۔“ اماں تو چلی گئیں، مگر جگن تو جیسے انگاروں پہ لوٹنے لگی۔ رضامان کیا۔

اماں کے الفاظ مسلسل اس کا دماغ لباتے رہے تھے۔ شام کو رضا کے آتے ہی اس نے بات واضح کر لی چاہی تھی۔

”ہاں، جگن! دیکھو! ماں ابانے میرے لیے کیا نہیں کیا، اور میں ان کو اتنی سی بھی خوشی نہیں دے سکتا؟ پھر اماں نے مجھے اپنے سر کی قسم بھی دی ہے۔“ وہ نظریں چرا کے بولا تھا۔

”تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟“ وہ لوکھڑائی تھی۔

”تم سے محبت کیوں نہیں ہے پاگل! مگر قدرت کے فیصلوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ اولاد کے بغیر ہم کتنی زندگی جی لیں گے۔“ رضائے قریب ہو کے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تھا۔ وہ جھٹکے سے دور ہو گئی۔

”کتنے لوگ ہیں جو اولاد کے بغیر بھی جی رہے

ہیں۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی تھی۔

”ہاں۔ مگر میں اتنا سخت جاں نہیں ہوں جگن! اپنے تمہارے ساتھ اماں لایا کو بھی اس خوشی محروم رکھوں پھر میں تمہارا حق تو نہیں مار رہا۔ تمہارا جگہ تو ہمیشہ وہی رہے گی۔ جہاں تھی۔“

رضائے قریب نے زبردستی اسے خود سے لگا لیا تھا۔ جگن آنکھوں سے نکلے آنسو اس کی شرٹ بھگوئے تھے۔ جگن کو اس وقت وہ دنیا کا ظالم ترین انسان لگا تھا وہ ایک دم ہی اس سے الگ ہو کے کمرے سے باہر گئی تھی۔

اس رات اس نے اماں کو رضا کی شادی کے بار کر دی تھی کہ جب وہ ہی راضی تھا، تو اس کی ن معنی رہتی تھی۔ پھر۔۔۔

زریں جو گاؤں کی سیاہ سی لڑکی تھی اور اماں جاننے والی کی نوایں بھی تھی رضا کی دلہن بن کر ماؤں میں چلی آئی تھی۔

گنتی ہی راتیں اس نے انگاروں پہ لوٹ لوٹ گزیری تھیں۔ غصے اور بے بسی سے اس نے ہاں دی تھی۔ مگر اب رضا محمود کو زریں کے ساتھ شہر سے دینا کا مشکل ترین کام لگتا تھا۔

رضا ہمیشہ کی طرح اب بھی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ مگر اب آج وقت زریں کے لیے ہوتا۔ صرف وہ کے اندر ہی اس کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔

”میں اس طرح نہیں جی سکتی رضا! مجھے یہ بڑا منظور نہیں۔“ اس کی آنکھوں کے ساتھ اس کا بھی غم تھا۔

”اگر تم چاہو تو میں تمہیں الگ گھر لے کے دے سکتا ہوں۔“ رضا کا لہجہ بے حد صاف تھا۔

”نہیں۔ مجھے یہی گھر چاہیے۔ وہ بھی مکمل چلائی تھی۔“

”کم آن جگن!“ رضائے قریب نے اس کی جانب پیش قدمی کی تھی۔

”پلیز رضا! اب تم اسے طلاق دے دو۔ میں مزے ڈرامہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لڑکی میں آخر

کیا۔ عام سی صورت، مثل تک تعلیم اور ڈفرسی تو ہے۔“

جگن کے لہجے میں نفرت، مست واضح تھی زریں کے لیے۔ رضائے قریب نے ان کی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ڈونٹ بی سلی جگن! ایسا سوچنا بھی مت۔“ رضا کے لہجے میں ناگواری واضح تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ جگن ہانپنے لگی تھی۔ ”تو پھر تم مجھے طلاق دے دو۔“

اس نے بہت غصے سے کہا تھا اور رضا خود پہ کنٹرول نہ کر سکا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھ گیا تھا۔ جگن چہرے پہ ہاتھ رکھے جیسے سکتے میں آگئی تھی اور پھر اس کے لاکھ منانے اور روکنے کے باوجود اگلے چند ہی دن میں وہ بڑے بھائی اور بیلا کے پاس امریکہ چلی آئی تھی ہمیشہ کے لیے اس گھر کو خیر باد کہہ کر۔

☆ ☆ ☆

ٹھیک باجی دن بعد نوایں رات تھی۔ وہ بونٹی چپل قدمی کرتے نکلی تھی۔ سیاہ اور کوٹ پہ گرم اونٹنی اس کا رخ لینے کے باوجود اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ راستے میں اسے مسز رحمان مل گئیں۔

مسز رحمان اس کی بھابھی بہت قریبی دوست تھیں اور قریب ہی رہتی تھیں۔ پینتیس سال کی عمر میں بھی ان کے چہرے پہ عجیب نو خیزی اور معصومیت دکھائی دیتی تھی۔ وہ چار سال پہلے رحمان احمد سے محبت کی وجہ سے مسلمان ہوئی تھیں، مگر آہستہ آہستہ انہوں نے اسلام کے سارے رنگ ڈھنگ اپنا لیے تھے۔

اس وقت بھی حسب معمول انہوں نے جینز پہ لائٹ شرٹ کے ساتھ اس کا رخ لیا تھا۔

جگن کو وہ ہمیشہ بہت پیاری لگتی تھیں۔ ان کی باتوں میں عجیب سا خلوص اور مروت چمکتی تھی۔ انہوں نے اسے کافی کی دعوت دی تو وہ فوراً ”ان کے ساتھ ان کے گھر چل دی۔“

”آپ اکیلی رہتی ہیں؟“ وہ پہلی بار ان کے گھر آئی تھی۔

”فی الحال تو اکیلی رہ رہی ہوں، مگر ایک دو ہفتے بعد نہیں رہوں گی۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کافی کا گلاسے اٹھایا تھا۔

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ رحمان ایک ماہ کے لیے پاکستان گئے تھے۔ دو ہفتے رہ گئے ہیں۔ ان کے لوٹنے میں۔“ ان کی اردو زیادہ اچھی نہیں تھی۔ سو وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتی تھیں۔ جگن کو یہ بھی بہت اچھا لگتا تھا۔

”اوہ۔ ایک ماہ کیا بہت ضروری کام سے گئے ہیں۔ آئی مین آپ تو بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں گی ناں؟“ جگن کو وہ اپنی طرح او اس سی محسوس ہونے لگیں۔

”ہاں! اصل میں کئی سالوں سے ان کے گھر والوں کا اصرار تھا۔ اب شادی کرنے گئے ہیں۔“ جگن کے ہاتھوں سے کافی کا گلاسے گرتے گرتے بجلا اس نے مسز رحمان کی طرف دیکھا۔ وہ اسے بے حد مطمئن لگیں۔

”دوسری شادی آپ نے انہیں اجازت دے دی؟“ اس کی آواز میں تیر تھا۔

”ہاں! کیوں؟ اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟“ انہوں نے کم میز پر رکھا دیا تھا۔

”اوہ! اب میں سمجھی وہ اسے وہیں پاکستان میں رکھیں گے۔“

جگن نے اپنے تئیں ان کے اطمینان کی وجہ بتائی۔

”مسز رحمان! ہنس پڑیں۔“

”نہیں۔ اس کے کاغذات تیار ہیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی آئے گی۔“

”تو کیا آپ اس کے ساتھ ایڈجسٹ کریں گی؟“ وہ سخت حیران تھی۔

”کیوں نہیں جگن! وہ ان کی بچپن کی منگیت ہے۔ ابھی تک صرف ان کے نام سے بیٹھی ہے۔ مجھ سے شادی رحمان نے کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں کی۔ میں خود ہی اس کے پیار میں باؤلی تھی۔“ وہ ہنس۔

”پھر بھی جب رحمان نے مجھ سے شادی کی تو میرے رشتہ داروں نے اسے گرین کارڈ کالاج کہا، مگر



بچ جتاؤں ایک سال پہلے جب مجھے فالج کا ٹیکہ ہوا تھا، تب مجھے بتایا کہ ریحان بھی مجھے اسی قدر چاہتے ہیں۔ جتنا میں ان کو پھر انہوں نے مجھے شادی سے پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ تو اب اس میں اعتراض کرنے یا پریشان ہونے کی مجھے کیا ضرورت ہے؟ ان کے ہونٹوں پہ ایک دلکش مسکراہٹ تھی، جو ہرگز بنا دینی نہیں لگ رہی تھی۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر بتا چلتا ہے جب شوہر کو دوسری عورت کے ساتھ شیر کرنا پڑتا ہے۔“ اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

”یہ صرف ہماری سوچ ہوتی ہے ڈیر! ورنہ تو ہمارا مذہب بھی مرد کو چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔ خود ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔“ انہوں نے احتراماً انگلیاں آنکھوں سے لگا لی تھیں۔

”ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ مردنا انصافی نہ کرے۔ دونوں کو بلکہ سب کو برابر کا درجہ دے۔ ان کی تمام جائز خواہشات کی تکمیل کرے۔ کسی کو دوسرے سے کمتر جان کر اس کی ہنگ نہ کرے۔“

جگن کو ایسا لگا جیسے مسز ریحان پیدائشی مسلمان ہوں اور وہ ابھی ابھی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئی ہو۔ مسز ریحان کی باتیں اس کے دل میں گڑ رہی تھیں۔

”اللہ کی مرضی میں ہی مصلحت ہوتی ہے۔ پھر دنیا کا ہر کام تو ویسا نہیں ہو سکتا، جیسا ہم چاہتے ہیں، بلکہ ہوتا تو وہی ہے جو ہمارا پروردگار چاہتا ہے، تو کیوں نہ ہم اپنے رب کی مرضی کو اپنی مرضی مان لیں۔ یقین کرو ڈیر! اس سے زندگی آسان ہو جاتی ہے۔“

اس دن وہ شام تک بیٹھی مسز ریحان سے باتیں کرتی رہی تھی۔ اس نے انہیں اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا اور ان کے پاس سے اٹھنے تک ان کے قیمتی مشوروں کی روشنی میں وہ نہایت اہم فیصلہ کر چکی تھی۔



گھر آ کے اس نے فوراً اپنا موبائل چیک کیا۔ رضا

کی آکس مسسڈ کالز تھیں اور ان گنت میسجز بھی۔ اس نے آرام سے بیٹھ کے سارے پیغامات پڑھے۔ پیغامات اور تمام مسسڈ کالز اسی وقت دی گئی تھیں، جب رضا زریں کے پاس سے ہو کر اس کے پاس آتا تھا۔ مطلب... اس کے نہ ہونے کے باوجود رضا نے تمام وقت زریں کو دینا گوارا نہ کیا تھا بلکہ بل بل اسے ہی یاد کیا تھا۔ کیا کیا جذبات نہیں تھے اس کے پیغامات میں۔ کتنی فتنیں تھیں۔ کتنا مان تھا، رضا کے لکھے گئے ایک ایک لفظ میں۔ اس کی آنکھیں نمکین پانی سے بھرنے لگیں۔

اس نے آنکھیں صاف کر کے فوراً ہی رضا کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری ٹیل پہ ہی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ ”جگن!“ اس کی آواز سے بے تاب چھلک رہی تھی۔

”میں آ رہی ہوں۔۔۔ میں واپس آ رہی ہوں رضا!“ اس نے پچھلے لہجے میں کہا تھا اور دوسری طرف تو جیسے ہمارا آگئی تھی۔ رضا بہت پر جوش ہوا تھا۔

”میں خود آتا ہوں تمہیں لینے۔ بلکہ کل کی فلائٹ سے ہی آ رہا ہوں۔ ہم یہ نیو ایرنائٹ وہیں منا میں گئے۔ اس کے لہجے میں جوش تھا۔

”اور بتا ہے جگن! ہم دونوں ماں باپ بننے والے ہیں۔“ جگن نے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ وہ یہ پیغام اس کے بھیجے ہوئے ایس ایم ایس میں پڑھ چکی ہے۔ اسے خوشی محسوس ہوئی تھی۔

”نہیں رضا! تم زریں کا خیال کرو۔ میں خود ہی واپس آ جاؤں گی۔ ہم اس دفعہ یہ نیا سال پاکستان میں ہی منا میں گئے۔“ اس کی آواز جوش و جذبات سے کپکپا سی گئی۔ رضا نے اسے بہت سی تائیدیں کرتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔ اس نے فون سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور وضو کرنے یا تھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

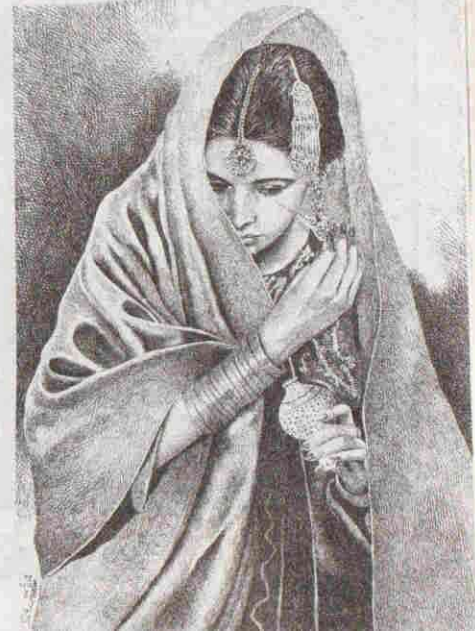
اسے اپنے رب کا شکر بھی تو ادا کرنا تھا کہ اسے دیر نہیں ہوئی اور وہ قانون قدرت کو سمجھ گئی۔ اس نے اللہ کی مرضی کو اپنی مرضی مان لیا تھا۔ سو اس کی تمام مشکلات آسان ہوئی ہی تھیں۔



## درد کی لہریں

اٹھ جاؤ سلوی اور کتنا سوؤ گی۔  
عنوی نے پردے ہٹاتے ہوئے کشن اس کی جانب  
اجھلا جو اس کے سر سے ٹکرا کر زمین پوس ہو چکا تھا۔  
کھڑکی سے چھن کر آتی سورج کی تیز شعاعیں اس کی  
نمار آلود آنکھوں میں جیسے لگی تھیں۔  
”کیا تکلیف ہے تمہیں؟“ چادر منہ سے ہٹا کر وہ  
نرا اٹھی۔  
”جیسے...؟ شکر ہے اللہ کا کس کوئی تکلیف نہیں

نکالوٹ



ہے۔“ عنوی نے ہر جانب سے خود کو ٹٹولنے کے بعد  
انتہائی لشکر آمیز لہجے میں جواب دیا تھا۔  
”تو یہ آفتاب کی مانند صبح سویرے میرے سر پر  
نازل ہونا ضروری تھا کیا؟ اس کم بخت کو بھی اتنے  
سویرے ہی اپنا دیدار کروانا ہوتا ہے۔“ اس نے قہقار  
نظروں سے جھکتے سورج کو دیکھا جو اس کے بیڈروم کے  
بالکل سامنے کھڑکی کے وسط سے طلوع ہو کر ابھرتا تھا۔  
آفتاب نے اس بیزاری پر برا سامنہ بناتے ہوئے  
بادلوں کی چادر اوڑھ لی۔

”صبح سویرے۔“ عنوی کی آنکھیں پھیل گئیں۔  
”آٹھ گھنٹے پورے ہونے سے قبل تو ہرگز نہیں  
اٹھوں گی۔“ اعلانیہ انداز میں کہتے ہوئے وہ دوبارہ چادر  
میں غروب ہو گئی۔  
”ایک تو یہ بیویشن کے مشورے۔۔۔ کس کم بخت  
نے بتا دیا اسے کہ آٹھ گھنٹے نیند لینے سے آپ کی بیوی  
پر کوئی آج نہیں آتی۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے پھر سے اس  
کے سر پر آن کھڑی ہوئی تھی۔  
”سلوی۔“ اس نے جھک کر اسے جھنجھوڑا۔

”پھوپھو آ رہی ہیں دس بجے کی فلائیٹ سے۔ تم  
ایر پورٹ ریسیو کرنے نہیں جاؤ گی؟“  
”کھر ہی آئیں گی نا۔! تو مل لوں گی۔“ وہ آنکھیں  
بند کیے ہوئے بولی۔

”تم کو کتنا برا لگے گا اگر تم نہیں جاؤ گی تو۔“ اس  
نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری تھی وہ اصل میں ماما کے  
موڈ سے خائف تھی۔  
”ہاں تو اسے برا لگے گا۔ تمہیں کیا مسئلہ ہے؟“





اس نے پھر سے کروش بدلی اور کانوں پر تکیہ رکھ لیا۔  
”موتم“ وہ پاؤں جتنے ہوئے یا پھٹی گئی۔  
لاؤنج میں مہاجرانے کو بالکل تیار کھڑی نہیں کیا  
ہاتھ میں ٹائی لیے اپنے بیڈروم سے برآمد ہوئے۔  
”سلوی نہیں اٹھی؟“ مہمانے اسے اکیلا آتے دیکھ  
کر استفسار کیا تو اس نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلا  
دی۔

”اس لڑکی کو بھی موقع کی نزاکت کا کبھی خیال  
نہیں آتا۔ رات کو میں نے کہا بھی تھا کہ صبح وقت پر  
تیار ہو جانا۔“ مہما کو حسب معمول تپ چڑھی تھی۔  
”جب وہ سو رہی ہے تو اس کی نیند خراب کرنے کی  
کیا ضرورت ہے۔“ بابا نے ٹائی مہما کو تھماتے ہوئے  
فورا اپنی لاڈلی کی سیٹی ڈی، جس پر مہما کا پارہ آسمان کو  
چھوٹے لگا تھا۔

”سب آپ کا قصور ہے۔ آپ کی اس ڈھیل نے ہی  
لگاڑا ہے اسے۔“ ٹائی کی گرہ لگاتے ہوئے مہمانے  
انہیں مورد الزام ٹھہرایا تو وہ ذرا سانس کی جانب جھکتے  
ہوئے شرارت سے بولے۔

”اور تمہیں کس نے لگاڑا ہے؟“ بس اتنے میں ہی  
مہما کا چہرہ خجالت سے سرخ پڑ گیا تھا۔ انہوں نے جھپٹتے  
ہوئے رخ موڑ لیا تھا۔

عنوی اور فاروق حسن اس اوپر تہمت لگا کر ہنس  
پڑے۔

آج بھی ان کی مہما بابا کے کسی بھی ذمہ جملے یا پھر  
شرارتی نگاہوں پر ہنسی ہو جاتی تھیں۔ بابا ان کے  
رخساروں کی یہ سرخی دیکھنے کے شوق میں ان دونوں کا  
بھی لحاظ نہیں کرتے تھے اور جب مہما ان کی موجودگی کا  
احساس دلاتیں تو وہ معصومیت سے دریافت کرتے۔

”کیوں بھو! آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“  
”نو بابا! آپ اپنے ڈانٹلا گز جاری رکھیے۔“  
سلوی فرخ دی سے اجازت دیتی تو کبھی مہما سے جھاڑ  
دیتیں یا پھر اٹھ کر بی چلی جاتیں۔



گیارہ بجے کے قریب جب وہ اٹھ کر بیچے آئی تو

پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

ناشتے کرنے کے بعد وہ دونوں کی کانٹ جھانٹ  
کرنے لان میں چلی آئی۔ سی ڈے ہلٹیر پر ممدی  
حسن کی غزل ”زندگی میں تو کبھی پیار کیا کرتے ہیں“  
اس کی اور امن کی آل ناٹم فورٹ گونج رہی تھی۔  
کچھ ہی وقت گزرا ہو گا جب اس نے بابا کی گاڑی کو  
پورچ میں رکھتے دیکھا۔ شمن نے گاڑی سے نکلے ہی  
اس کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔

”بہت تمیز ہو تم! اتنا سوٹ کیا تھا تمہارا۔ امن تو  
جماڑے نکلے ہی سب سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہتا تھا  
اور تم سنگدل، مغرور، بے عزت لڑکی۔“ والہانہ انداز  
میں اسے ساتھ لپٹانے اس کے رخسار چومنے کے بعد  
اب وہ باقاعدہ صلواتوں پر اتر آئی تھی۔

وہ کان لپیٹتے ہوئے پھوپھو سے ملنے لگی، مگر نظرس  
ان کے عقب میں سرگرداں تھیں۔ مہما بابا اور عنوی  
بھی گاڑی سے نکل آئے تھے اور پیچھے تو کوئی بھی نہیں  
تھا۔

”امن نہیں آیا؟“ اس کے لبوں سے بے ساختہ  
پھسلا۔

”وہ کہہ رہا تھا، سلوی ہمیں لینے نہیں آئی تو میں بھی  
بن بلائے مہمان کی طرح ان کے گھر نہیں جاؤں گا۔“  
شمن کی شرارت وہ خوب سمجھتی تھی مگر اس وقت اس  
کے چہرے پر سنجیدگی کی جو گہری چھاپ نمایاں تھی  
اس پر اسے ایمان لانا پڑا۔

”بھلا کیا بات ہوئی؟ آپ کے استقبال کے لیے  
کسی کو گھر میں بھی تو رہنا تھا۔“

”نہیں بیٹا! وہ خفا تو نہیں ہوا، بس کہہ رہا تھا، پہلے  
اپنا گھر دیکھوں گا۔ تھوڑی دیر ریسٹ کروں گا۔ ملنے  
ملانے کا سلسلہ بعد میں دیکھا جائے گا۔“ پھوپھو نے  
جلدی سے بیٹی کی صفائی پیش کی۔

”ریسٹ تو اک ہمانہ تھا، ورنہ وہ کیا رخ سے آیا  
ہے۔“ شمن پھر اس کے کان میں کھسی۔

”ہاں تو مجھے کیا۔“ وہ بے نیازی سے شانے اچکا کر  
واش روم میں چلی آئی۔

منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کیے مگر اس کا دھیان  
ہنوز امن میں الجھا ہوا تھا۔ جس بندے نے اس سے  
زندگی میں کبھی حال احوال سے زیادہ بات نہ کی تھی وہ  
مض اس کے نہ آنے پر اتنا خفا کیوں ہوا تھا۔  
”تو کیا اس کے لیے بھی میں اتنی ہی خاص ہوں جتنا  
وہ۔۔۔“ عنوی نے آکر اس کے خیالوں کا تسلسل توڑ  
دیا۔

”سلوی کی بیٹی! اگر بناؤ سنگھار سے فرصت مل گئی  
ہو تو کچن میں آ جاؤ۔ بہت کام ہے۔“ وہ کہہ کر اگلے  
قدموں واپس مڑ گئی تھی۔

اس نے مسکرا کر شانوں پر دوپٹہ پھیلا یا اور بیچ چلی  
آئی۔

بیچ خوشگوار ماحول میں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد پھوپھو  
اور شمن چلی گئیں۔ مہمانے امن کے لیے کھانا ساتھ  
ہی بھیج دیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد وہ کتابیں اٹھا کر  
اسٹڈی روم میں چلی آئی۔ وہ پری میڈیکل کی  
اسٹوڈنٹ تھی اور اسے ڈاکٹر بنانا مہما اور بابا دونوں کا  
خواب تھا۔ جس کے لیے وہ خوب محنت کر رہی تھی۔

شام میں اسے اکیڈمی جانا تھا وہاں سے واپسی پر آٹھ  
بجے گئے تھے۔ گاڑی سے اتر کر وہ اپنے گیٹ کی جانب  
بڑھنے والی تھی جب اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر ساتھ  
والوں کے ٹیس کی جانب اٹھ گئی۔

وہ ریٹنگ پر دونوں کنڈیاں ٹکائے اسے ہی دیکھ رہا  
تھا۔ نظریوں کے تصادم پر وہ ہکا بکا سا مسکرائی تھی جس پر  
وہ اب جھپٹتے ہوئے رخ موڑ گیا تھا۔

”لگتا ہے موصوف کافی روٹھے ہوئے ہیں۔“ وہ خود  
کلامی کرتی، کبھی ہونٹی کھٹے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔  
”امن تو جماڑے نکلے ہی سب سے پہلے تمہیں  
دیکھنا چاہتا تھا۔“ رات سونے سے قبل شمن کی بات یاد  
آنے پر وہ عجیب الجھن میں پڑ گئی تھی۔

یہ بات تو اس سے ایک روز قبل چیپٹنگ کے  
دوران شمن نے کہی تھی، پھر یہ امن کہاں سے آ گیا بیچ

اس نے اٹھ کر کمپیوٹر آن کر لیا۔ وہاں شمن کی

ایک میل بھی آئی ہوئی تھی اس نے لفظوں کو غور سے  
پڑھا۔

”اے رپورٹ لینے ضرور آتا۔ میں چاہتی ہوں سب  
سے پہلے تمہیں دیکھوں۔“ اس نے کوئی دس بار اس  
میل کو پڑھا تھا، لیکن ”چاہتی“ کو ”چاہتا“ میں بدلتے نہ  
دیکھا تو دوبارہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ کچھ بھی تھا، لیکن  
امن جیسے لیے دیے رہنے والے بندے کی زندگی میں  
اپنی اہمیت کا اتنا احساس اس کے دل کی تمام کلیاں جھلا  
گیا تھا۔



اگلے روز عنوی نے کھیر بنائی تھی۔ مہمانے ڈونگا بھر  
کر اسے تمنا دیا۔

”جاؤ! اپنی پھوپھو کو دے آؤ۔“  
وہ تو پہلے سے ہی ”امن لاج“ جانے کا سوچ رہی  
تھی۔ یہ اچھا بہانہ مل گیا تھا، ورنہ شمن تو اس کا ناک  
میں دم کر دیتی کہ وہ خاص طور پر امن سے ملنے آئی  
ہے۔

”سلو خالہ آ گئیں۔“ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی  
نہیب اور ایمان چمکتے ہوئے اس کی ٹانگوں سے چٹ  
گئے تھے۔

”شکر ہے بار! تم آ گئی ہو ورنہ تو ان بچوں نے  
خوب اور ہم چار کھا تھا کہ سلو خالہ کے پاس چھوڑ کر  
آؤ۔“ شمن نے دونوں بچوں کو گھورتے ہوئے سلوی  
سے کہا۔ وہ بچوں کی سکی خالہ تھی اور بچے اسے ذرا بھی  
لفٹ نہیں کروا رہے تھے۔ اس بات نے اسے اچھا  
خاص تیار کیا تھا۔

”شمنی بار! منع کیا ہے کہ خالہ کے ساتھ یہ ”سلو“ کا  
دم چھلا مت لگایا کرو۔“ توبہ لگتا ہے جیسے ہو مل میں  
کسی ویٹر کو بلا رہے ہو ”سلو“ وہ ان کی نقل اتارتے  
ہوئے جھلا کر بولی جس پر شمن اور امن کا تہمتہ بے  
ساختہ تھا۔

”شمن بی بی آئی ہیں؟“ صوفے پر بیٹھے ہوئے اس  
نے شمن سے استفسار کیا۔ امن کو وہ چہر نظر انداز کر گئی



تھی، جس پر وہ لا تعلق سا ہو کر منہ کے سامنے اخبار پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اسے بھی شاید یاد آچکا تھا کہ وہ اس سے خفا ہے۔ سلوی دل میں اس کی حالت پر اچھا خاصا محفوظ ہوئی تھی۔

”ہاں۔ وہ اور ای بازار گئی ہیں۔ تم تو جانتی ہو ثمرین بابی کی شاپنگ۔ اب شام ڈھلے ہی واپسی ہوگی۔“ وہ باؤل اٹھا کر انگلی سے گھیر چکے ہوئے بولی۔

”ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ ثمرین بابی پہلے ہمارے گھر آنے کے بجائے تم لوگوں کے گھر آئی ہیں۔“ اسے ثمرین بابی سے اس قدر طوطا چشی کی توقع نہیں تھی کہ اپنے بہن بھائی کے آتے ہی وہ انہیں بھول جائیں گی۔

”اور اب تو ایسا ہر بار ہی ہوگا۔“ وہ اسے چرانے کو بولی۔ بچوں نے اب کھیر کھانے کا شور مچا دیا تھا۔ وہ انہیں لے کر کچن میں چلی گئی تو سلوی نے روئے سخن امن کی جانب موڑا۔

”تم کیسے ہو امن؟“ وہ اس سے پانچ سال بڑا تھا لیکن سلوی نے آپ جتنا کہنے کی زحمت کبھی نہیں کی تھی۔

”آپ کو خیال آیا؟“ وہ طنز بولا۔

”خیالوں میں ہی تو جی رہی تھی اب تک۔“ وہ محض سوچ ہی سہی۔ کہنے کی جرات نہیں تھی۔

”خفا ہو؟“ اسے دوبارہ چہرے پر اخبار پھیلاتے دیکھ کر وہ دیکھنے لہجے میں بولی تو وہ اخبار رکھ کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”ہاں ہوں۔“

”تو مجھے منانے کا ہنر نہیں آتا۔ تم میری سزا بتا دو۔“ وہ انگلیاں پچھالتے ہوئے گویا ہوئی۔

”اچھا۔“ وہ سر کے پیچھے ہاتھ لے جا کر سوچتے ہوئے بولا۔

”تمہاری سزایہ ہے کہ تم آج ڈنر ہمارے ساتھ کرو گی۔“

”ارے واہ! یہ تو بڑی خوب صورت سزا ہے۔“ وہ اطمینان سے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گئی۔

”کیا پاؤں آج؟“ ثمرین نے دونوں کی جانب رائے

طلب نظروں سے دیکھا۔

”سلوی کو بریانی اور چکن شاشلیک بہت پسند ہے۔“ ویلا آتس کریم کے بغیر اسے کھانے کی میز مکمل نہیں لگتی اور سیٹلنگ میں ہری مرچیں ضرور ہونی چاہئیں اور۔۔۔“ وہ بولے جا رہا تھا اور سلوی منہ کھولے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”بھئی! آج یہ ہماری مہمان ہیں تو مینو بھی ان کی پسند کا جوٹا چاہیے۔“ ثمرین اپنا دامن کا سرہلا کر کچن میں سدھار چلی گئی۔ سلوی اٹھ کر اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔

”امن کو یہ ساری باتیں تم نے بتائی ہیں؟“ اس کا انداز نقشہ کشی تھا۔

”میں نے نہیں تم نے۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

”میں نے؟“ اس نے انگلی سے اپنی جانب اشارہ کیا۔

”جی! وہ ٹیکسٹ پر چیٹنگ میں نہیں امن کیا کرتا تھا۔“ بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے اس نے گویا اس کے سر پر ہم لاسٹ کیا تھا۔

”میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔“ اس کھلی دغا بازی پر وہ تن فن کرتی اپنے کھڑے چلی آئی تھی اور پھر رات دیر تک اس کا دل غ کھولتا رہا تھا۔



”کتنا سکون تھا زندگی میں۔۔۔ میری تنہائی! کیلا پن! اور یہ خالی پارٹمنٹ میرے ہم سفر تھے۔ اور میں ان سب کے ساتھ آسودہ تھا۔ مگر تم نے دھڑکنوں میں ہانچل مچا کر میری ذات کو طوفان کی نذر کر دیا ہے۔“ وہ ٹیرس پر کھڑا تصویر سے باتیں کر رہا تھا۔

کیا تھی وہ؟

چاندنی میں ڈھلا پیکر

سبک روال ندی۔۔۔

باد نسیم کا کوئی معطر جھونکا

سنگ مرمر کی صورت۔۔۔

یا پھر کوئی شوخ دھنک۔

اس تصویر میں اس نے سندھی کڑھائی اور شیشوں کے کام سے مزین میروں رنگ کا کھیر دار فرائک پہن رکھا تھا۔ سر پر شیشوں والی ٹوپی تھی۔ کانوں میں میروں گلوں والے بڑے بڑے آؤبزے، پازوؤں میں بھری بھری چوڑیاں، گود میں سفید ادنی پالوں والا مینا اٹھا رکھا تھا۔ ہنستے ہوئے اس کے سرخ گالوں میں بڑنے والے کڑھے بے حد واضح تھے۔ سیاہ کلی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

اس تصویر کو دیکھتے ہی وہ سلونی شام اپنے تمام تر رنگوں سمیت اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی اور وہ دور کیس وادی کی تلاش میں کھوسا جاتا تھا۔

چھ ماہ قبل کی بات تھی۔ وہ دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کو گیا تھا۔ اس کے دوست کیبل کار میں بیٹھے جھولالے رہے تھے اور وہ وادیوں کا حسن متقید کرنے کے لیے آبادی سے بہت دور نکل آیا تھا۔ بھی اس نے اس حسین و شیزہ کو ایک مہینے کے پیچھے بھگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے مدد کرنے کا سوچا اور مہینے پکڑ کر اس کے قریب چلا آیا۔ لڑکی کی سانسیں ابھی تک پھولی ہوئی تھیں۔

”یہ سارا ریوڑ تمہارا ہے؟“ اس نے گھاس چرتی خوب صورت پہاڑی بکریوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ جس پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تھی اور ارسل کو اس کے ساتھ بلبل، مہاڑ، جھڑنے، پھول، ہوا، رنگ، بادل، قنبل، ہر شے کھلکھلاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”میں کوئی پہاڑن تو نہیں ہوں۔ یہ لباس تو میں نے پورٹریٹ بنوانے کے لیے پہنا ہے۔“ اسے جیلے کی وضاحت کرنے کے بعد اس نے مینا اس کے گود سے لے لیا۔

ارسل کو دور کھڑی وہ مصورہ دکھائی دے گئی تھی جو اس کا پورٹریٹ بنا رہی تھی۔

”لگتا ہے آپ فوٹو گرافر ہیں۔ اس گیٹ اپ میں میری تصویر اچھی تو بن جائے گی نا۔“ وہ اس کے ہاتھ



میں کیمرو دیکھ کر معصومیت سے بولی اور اس کا دل اس بھولنے پر تار ہونے کو چاہا تھا۔  
وہ لنتی حسین تھی۔ کیا اسے کبھی کسی نے نہیں بتایا تھا۔ آئینے نے بھی نہیں۔  
”اتنی اچھی کہ اب تو میرا دل بھی چاہنے لگا ہے کہ میں تمہاری ایک تصویر اتار لوں۔ تم قدرتی حسن کا شاہکار ہو۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”سنو مسٹر! تم کیا مجھ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ وہ خوش ہونے کی بجائے فوراً متحفظ ہو گئی تھی۔  
”نہیں، میں نے تو بس اللہ کی قدرت کا اعتراف کیا ہے۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔

اس پر ایک خفگی بھری نگاہ ڈال کر واپس پلٹ گئی۔  
”جانتی ہو پہلی نظر میں تم مجھے اتنی خاص نہیں لگی تھیں، پھر تمہاری بچکانہ سی معصومیت اور سیاہ کالی آنکھوں نے میرا دل لوٹ لیا تھا۔ آج بھی مجھے اس نہی سے میٹھی کوئی دھن نہیں لگتی۔ تمہاری ریشمی زلفیں مجھے پریشان کرتی ہیں اور تمہارے ہونٹوں کا سیاہ مل میرا قرار لوٹ لیتا ہے۔ میں تمہیں اب مجسم دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس کا ایک ایک نقش کھوجتے ہوئے وہ بے خود سا ہو چلا تھا۔

\*\*\*

”تم اپنے خرگوش بنجرے میں بند کر کے نہیں رکھ سکتیں۔“ اندر کی کھولیں کہیں پر تو نکلتی تھی۔ لان میں دندناتے خرگوشوں کو دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔  
”ہائیں! یہ ظلم میں کیوں کروں؟ تمہارا کیا گناہ ہے؟“ عروسی نے محبت پاش نظروں سے اچھلتے کودتے خرگوشوں کو دیکھا۔ ایمان اور زیب ان کے پیچھے بھاگتے بے حد خوش ہو رہے تھے۔

”میرے لان کا بیڑا غرق کر دیا ہے ان منحوسوں نے۔“ اس نے غصے میں کپ اٹھا کر خرگوش کی جانب اچھالا تھا جو منی پلانٹ کی بیلوں سے الجھ رہا تھا۔  
”خالہ! مت مارو مجھے اچھے لگتے ہیں۔“ ایمان نے

منہ بسورا۔

”اتنے ہی اچھے لگتے ہیں تو اپنے گھر لے جاؤ۔“ اس قدر فضا پر عروسی نے کھا جانے والی نظروں سے سلوی کو دیکھا تھا جبکہ بچوں کی آنکھوں میں مارے اشتیاق کے جگنو چمکنے لگے تھے۔  
”جی عمو خالہ؟“ ایمان اس کا ہاتھ تھامے پوچھ رہی تھی۔

”میں ان کا بہت خیال رکھوں گا۔ اپنی چاکلیٹ اور آئس کریم بھی کھاؤں گا۔“ زیب نے پلکیں جھپکاتے ہوئے مکمل اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی۔

”آپ جب اداس ہو جائیں گی تو ہم بابا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر آپ سے ملوانے بھی لایا کریں گے۔“ ایمان نے اس کی رنجیدگی محسوس کر کے وعدہ کیا تو بے اختیار سلوی کی ہنسی نکل گئی، جسے شمن کو آتے دیکھ کر اس نے نہ صرف سمیٹ لیا تھا بلکہ کھٹ کھٹ کرتی سیڑھیاں بھی چڑھ گئی تھی۔ وہ کچھ دیر عروسی کے پاس بیٹھ کر اس کے پیچھے چلی آئی۔  
”اب تک منہ بھلائے رکھو؟“ کھڑکی میں کھڑی سلوی کے گلے میں اس نے بازو ڈال دیا تھا۔  
”جب تک میرا دل چاہے گا۔“ وہ اس کا بازو شانے سے ہٹا کر شان بے نیازی سے بستری آئی تھی۔  
”کیا بات ہے محترمہ کے دل کی۔ ایسا کر دل سے دن تاریخ مہینہ سال اور وقت پوچھ کر بتاؤ پھر میں اس روز تشریف لاؤں گی۔“

”شرم تو نہیں آتی تمہیں۔“ وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔  
”بہت آتی ہے لیکن صرف ہادی کے سامنے۔“ اس نے سادگی سے بتایا۔ ہادی اس کا سنگیت تھا۔ سلوی نے دانت پیٹتے ہوئے رخ موڑ لیا۔

”دن رات تو تم نے میرا نطقہ بند کر رکھا تھا۔ ہر وقت تمہاری سوئی بس امن کے گرد گھومنا کرتی تھی۔ امن نے آج کیا کھایا ہے۔ اس نے کس رنگ کی شرٹ پہنی ہے۔ وہ کیسا لگ رہا ہے اس کے کتنے فریڈ زیں۔ اس کی کیا ایکٹیو ٹیز ہیں اور۔۔۔“

”اور تم نے اسے سب بتا دیا؟“ وہ اس کی بات کاٹ کر غرائی ورنہ یہ فہرست تو ابھی بہت طویل تھی۔  
”نہیں میں نے اسے اپنا آئی ڈی ویس کر کا تھا۔“ پلیز بھائی! میری اس مصیبت سے جان چھڑا دو۔“ وہ شرارتی انداز میں کہتی بیٹھے اسے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور حفظ مقدم کے طور پر دونوں تکیے اپنی تحویل میں لے لیے تھے۔

\*\*\*

”جانے کیا کیوں اس کرتی رہی ہوں میں امن سے۔“ دل بنا کر پیشہ اپنا اور اس کا نام لگھتی تھی۔ انہیں اس قدر احتقانہ حرکتیں کی ہیں میں نے۔ کھلا ڈھلا اظہار محبت۔ کوئی ایک جذبہ بھی تو اس سے پوشیدہ نہیں رہا۔“ پوڈوں کو پانی دیتے ہوئے وہ مسلسل خود کو ملامت کر رہی تھی۔ جب وہ اچانک اس کے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔

”کیا تمہیں میرا تمہارے بارے میں جاننا اچھا نہیں لگا؟“

وہ کوئی جواب دے بغیر پوڈوں کو نسلانے میں لگی ہوئی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے جواب دینے کے لیے بھی وقت نہ ہو یا پھر اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ اسے امن پر بھی غصہ تھا۔ کم از کم اسے تو یہ حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بندے کی کوئی اپنی ذاتیات بھی ہونی ہیں۔

”دور تھا تو ہریل میرا خیال تھا۔ اب پاس ہوں تو کوئی لفٹ ہی نہیں۔“ اب کی بار اس کی آواز میں ہلکی سی برہمی بھی جھلکنے لگی تھی۔ اپنا نظر انداز کیا جانا اسے شاید بہت ناگوار گزر رہا تھا۔

مگر سلوی ہنوز اپنے کام میں مگن رہی تو اس نے گلاب کا وہ ٹھنڈا پودا جس کے تپتے کو وہ بڑی ملامت سے دھو رہی تھی، جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ اس کوشش میں کتنے ہی کانٹے اس کی ہتھیلی کو فگار کرتے گزر گئے تھے اور اب وہاں خون کی تھیں منی بوندیں دمک رہی تھیں۔ سلوی اس قدر شدید رد عمل پر

ششدر سی رہ گئی تھی۔  
”یہ کیا حماقت ہے؟“ اس نے تاسف بھری نظروں سے گھورا۔  
”یہ حماقت نہیں محبت ہے۔ مجھ پر اگر تم کسی شے کو اہمیت دو گی تو وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہو گی۔“ ہتھیلی سے کانٹے نکالتے ہوئے وہ اطمینان سے بولا۔

”تم پوڈوں سے جیلمس ہو رہے ہو؟“ وہ حیرت زدہ سی گویا ہوئی۔  
”میں تو تمہیں چھو کر گزرنے والی ہوا سے بھی جیلمس ہو جاتا ہوں۔“  
”اور اگر میرا کوئی بوائے فرینڈ ہوا تو؟“ وہ شرارت سے بولی۔

”تو میں اس کی جان نکال دوں گا۔“ اب وہ ہاتھ پر رومال باندھ رہا تھا مگر اس کے لہجے کی ہولناکی سلوی کا دل دہلا گئی تھی۔

”ہائے! امن! پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔“  
”پہلے کب؟“ اس نے الٹا سوال پوچھا تو وہ سوچنے لگی۔

”پچھو پچھو فیملی اس کے بچپن سے ہی۔ جدہ میں مقیم تھی البتہ گرمیوں کی چھٹیاں وہ لوگ لاہور میں ان کے گھر گزارا کرتے تھے پھر وہ اس کا بچپن کا ”منہ بولا“ منگیتر بھی تھا۔

”ممانے بتایا تھا کہ ”جب تم چھوٹی تھی تو امن بس ایک ہی خند کیا کرتا تھا کہ میں سلوی سے شادی کروں گا اور تمہاری پھوپھو نے ہنسی ہنسی میں تمہیں امن کے لیے مانگ لیا تھا۔“ یہ قصہ تو وہ بچپن سے سنتی آرہی تھی، لیکن وہ امن کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی وہ ہمیشہ اپنی دنیا میں مگن رہتا۔ ہمیشہ اسے اپنی پڑھائی اور اسپورٹس میں دلچسپی رہی تھی۔

”سب سے پہلے جب ممانے تمہیں میرے لیے مانگا تھا اس وقت تم دو ماہ کی تھیں۔ اب میں پانچ سال کی عمر میں ایک دو ماہ کی بچی کے ساتھ کیا اظہار محبت کرتا۔“ وہ کہہ کر خود ہی ہنسا تھا سلوی نے مصنوعی خفگی



سے اسے گھورا تو وہ مزید گویا ہوا۔  
 ”سترہ سال کی عمر میں مجھے تم سے دوسرا بیار ہوا تھا۔ بات کے اختتام پر اس نے سلوی کے تاثرات جانچنے چاہے جو کہ خاصے خطرناک تھے۔“  
 ”بھئی پہلا بھی تم سے ہی ہوا تھا پانچ سال میں اور پھر دو سترہ سال کی عمر میں اور اس وقت جب میں نے تمہیں بتانے کا سوچا تو پتا چلا تم ابھی محض بارہ سال کی ہو۔“

”امن! تم جیٹ جاؤ گے میرے ہاتھوں۔“ وہ اس کے پیچھے لپکی تھی اور امن لان کی جانب آتی شمن کی اوٹ میں چھپ گیا لیکن اس کی ہر اشتائیاں اب بھی جاری تھیں۔  
 ”اف خدا! کسی کو اتنی چھوٹی منگیت بھی نہ دے کہ بندہ۔“ سلوی نے اب پاپ کا رخ اس کی جانب موڑ دیا تھا اور اگلے ہی بل تینوں لان میں بری طرح سے ہیک رہ گئے۔

”بھائی صاحب! میں چاہتی ہوں کہ سلوی کو انگوٹھی پہنا کر اس منہ زبانی بات پر رشتے کا ٹیک لگا دوں۔“  
 پھوپھو نے ہنستے ہوئے کہا تھا جس پر بابا چوتکتے ہوئے بولے۔

”کون سا رشتہ؟“ ممانے اس اداکاری پر قدرے ترجیحی نظروں سے انہیں گھورا تھا جس کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

”دیکھو رفعت! وہ بچپن میں ہماری ہماری بات جو بھی تھی میں نے اس پر بھی غور نہیں کیا۔ اب سلوی کی مرضی جاننے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔“  
 ”تو ٹھیک ہے، ابھی سلوی کی مرضی دریافت کر کے آئیں۔ میں یہیں بیٹھی ہوں اور انگوٹھی پہنا کر ہی جاؤں گی۔“ ان کا اطمینان بھی قابل دید تھا۔

”اب بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ اس میں سلوی کی مرضی کیا معلوم کرنی۔ ہم موجود ہیں ابھی اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کے لیے۔“ ممانا بابا سے اچھے

لگی تھیں۔ وہ بیٹھیوں سے ہی واپس پلٹ گئی۔ یہ سب اسی کا کھارہ تھا۔  
 کل وہ پھوپھو کے گھر جاری تھی جب گیٹ پر اسے امن کسی دوست کے ساتھ کھڑا نظر آیا۔ وہ اس کی جانب دھیان دیے بغیر اندر چلی آئی تھی اور پھر اگلے ہی بل وہ دندنا ناہوا اس کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔  
 ”تمہارے پاس کوئی فل سلیو شرت نہیں ہے۔“  
 ”کیا؟“ وہ غیر متوقع بات پر ہلکا کر رہ گئی۔

”میں نے فارسی میں نہیں پوچھا۔“ اس نے دانت کچکا پئے۔  
 ”ہاں تو تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔ میں کچھ بھی پہنوں۔“ اس کا جارجانہ انداز سلوی کو بھی تبا گیا تھا۔  
 ”تم میری منگیت رہو۔“ اس نے اپنے اشتقاق کی وضاحت کر دی تو سلوی نے مزے سے اپنی خروطی انگلیاں اس کے سامنے لہرائیں۔

”ایسے کسی بندہ من کی ڈوری میرے ہاتھوں میں نہیں ہے۔“ اس پر اپنا حق خٹانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔  
 ”تم۔۔۔“ وہ کچھ کتے کتے رک گیا۔ ”یہ جو دو بیٹے ہوں یہ سر اوڑھنے کے لیے ہوتا ہے۔ آئندہ یہ مجھے تمہارے گلے میں جھوٹا نظر نہ آئے۔“

”اچھا تو موصوف مجھ پر رعب بھانے کے لیے انگوٹھی پہنا رہے ہیں۔“ بالوں میں برش کرتے ہوئے وہ دل ہی دل میں مسکرائی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

آنے والی ماما تھیں اور ابے پتا تھا وہ کیا پوچھنے آئی ہیں۔

”ماما آپ کی اور بابا کی خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔“ وہ فانی انداز میں کہتی ان سے لیٹ گئی تھی۔  
 ممانے اس کی مرضی جان کر بابا کو گرین سگنل دیا اور پھوپھو نے وہ نازک سی ڈانمڈ رنگ اس کی انگلی میں سجادی تھی۔ جسے پہن کر اسے ایک عجیب سے تحفظ کا احساس ہوا تھا جیسے وہ کسی حصار میں مقید ہو چکی ہو۔  
 ”کیسا لگ رہا ہے نئے رشتے میں منسوب ہونا؟“  
 شام میں اس کی کال آئی تھی۔

”نیا کہاں سے ہو گیا۔ یہ تو سالوں پرانا ہے۔“ وہ تنگ کرنے کو بولی۔  
 ”ہاں! انا تو ہے پر سالوں نہیں صدیوں پرانا۔“ ازل سے آسمانوں پر لکھا گیا تھا اور میں بہت خوش نصیب ہوں کہ جو چاہا اسے بغیر کسی رکاوٹ کے پا بھی لیا۔ تھینک گاؤ کہ ہمارے درمیان کوئی ظالم سماج نہیں تھا۔“ وہ شاید بہت خوش تھا اور سلوی سرشار سی تاروں بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”اچھا! اگر ظالم سماج ہوتا تو؟“  
 ”تو پھر لوگ ایک سو صدی کا مجنوں مجھے کہتے۔“

دقت سے نکلتے ہی اس نے عادل کو حوا نظر پایا تھا۔  
 ”اب مجھے دوست ہو تم! اتنے دنوں سے شکل ہی نہیں دکھائی۔ اماں ہی بھی تمہیں یاد کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا آج تو تم سے اٹھا کر لاؤں گا۔“ محترم تو اپنے اپارٹمنٹ میں بھی نہیں ملتے۔ بس مجنوں ہو گئے ہیں۔  
 اب آوارہ گردی سے فرصت کہاں۔“ ارسل کو دیکھتے ہی اس کی زبان فر فر جلنے لگی تھی وہ ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھا۔  
 ”طے تو تم عورتوں کی مانند دیتے ہو۔“

”کیا کروں یا رہی ہو پر تو زور چلتا نہیں کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کاش خدا نے تمہیں لڑکی بنایا ہو یا اور پھر تم میری دوسری بیوی ہوتے۔ کتنے محل سے سب سن لیتے ہو۔“ ارسل کی اس بے تکی حسرت پر بے ساختہ اچھل کر رہ گیا۔

”لڑکی ہوتا بھی تو تمہاری زوجیت میں آنا قطعاً گوارا نہ کرتا۔“  
 ”کیوں؟ کیا کمی ہے مجھ میں؟“ وہ سوک کے عین وسط میں بریک لگاتے ہوئے بولا۔ جناب کو اپنی وجاہت پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا۔

”مجھے بھابھی کے ساتھ بھرپور ہمدردی ہے۔“ اس نے صاف آنکھیں پیل لیں۔  
 ”بڑے طوطا چم ہو۔ کیا وہ تمہیں بریانی بنا کر کھلاتی

ہیں؟“  
 ”نہیں یا رہا نہاری بہت اچھی بناتی ہیں۔“ وہ قہقہہ لگا کر بولا تو عادل نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورتے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی۔  
 ”نہاری کے لیے دوست سے دعا بازی۔“  
 ”یار! میں کوئی لڑکی نہیں ہوں ارسل ہوں۔ اب چھوڑ بھی دو جان۔“ اس نے عاجزی سے ہاتھ جوڑے۔

”اچھا بتاؤ! بھابھی اور بچے آگے ہیں؟“ وہ بات بدل گیا اور نہ عادل کو یونہی شوق تھا بلکہ بس ہانکنے کا، حالانکہ اسے شمن سے قطعاً کوئی شکایت نہیں تھی۔  
 ”ہاں! وہ تو کل شام ہی آگئے تھے۔ یار مجھے تمہاری بے فکری اور آزادی پر شک آتا ہے۔“ وہ پھر پڑی سے اترنے لگا تھا ارسل نے گاڑی روک کر بچوں کے لیے آکس کریم پیک کروائی۔

”اس کی کیا ضرورت تھی؟“  
 ”تمہارے لیے نہیں ہے۔“ بچوں کے معاملے میں وہ اس کی کوئی بات نہیں سنتا تھا۔ کبھی ویک اینڈ پر انہیں گھمانے لے جاتا تھا تو کبھی ڈھیروں کے حباب سے شاپنگ کروا دیتا۔ دونوں کی دوستی مثالی تھی۔  
 اسکول کالج کے زمانے سے ساتھ تھے۔ بچے بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ انہیں لان میں کھیلا دیکھ کر وہ بھی اسی جانب چلا آیا۔ عادل لباس تبدیل کرنے کی غرض سے اندر چلا گیا تھا۔

”سلو چاچا! ایمان کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تھا پھر اس نے گھبرا کر لب بھینچ لیے۔

”کیا ہوا؟“ ارسل نے عجب سے پوچھا۔  
 ”وہ سلوی خالہ ہیں نا وہ سلو کہنے پر بہت خفا ہو جاتی ہیں۔ آپ کو برا تو نہیں لگا؟“ آنکھیں پھیلا کر اس نے معصومیت سے پوچھا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔  
 سلو کے قصہ و اکثر بچوں کے منہ سے سنا کرتا تھا۔ زیب کہتا تھا وہ بڑا ہوا کر سلو خالہ جیسی سائیکل چلائے گا اور ایمان کہتی تھی وہ سلو خالہ جیسے بال لیے کرے گی۔



”چاچو! میرے خرگوش۔“ زیب دونوں خرگوش سنبھالے اس کے پاس چلا آیا تھا۔  
”واؤ! یہ کہاں سے لیے؟“ اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

”یہ عنو خالہ کے تھے۔ سلو خالہ نے چوری سے اٹھا کر ہمیں دے دیے۔“ ایمان نے مزے سے بتایا۔  
”یہ سلو خالہ کے پلائش خراب کر دیتے تھے۔“ زیب نے معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ تب ہی ثمرین ہاتھ میں ٹرے اٹھائے چلی آئی تھی۔ پیچھے پیچھے عادل بھی تھا۔ اس کی توجہ بٹ گئی۔

”چلو بھاگو اپنے خرگوش لے کر۔“ ثمرین نے دونوں کو گھورا تو وہ دوبارہ سے لان میں جا کر کھیلنے لگے۔  
”بھابھی! آج مٹھائی کس خوشی میں؟“ وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”میرے بھائی کی انجمن جمنٹ ہو گئی ہے۔“ اس نے خوش ہو کر وہ بتائی توارسل مبارکباد دینے کے بعد خاموش سا ہو گیا تھا۔  
جانے کیوں وہ آج پھر بہت یاد آئی تھی۔

\*\*\*

”تمہارے ایگزومز تو ختم ہو چکے ہیں پھر اکیڈمی کیوں آرہی ہو؟“ بابا نے آج ڈرائیور نہیں بھیجا تھا تو امن اسے لینے آیا تھا۔ گاڑی موڑتے ہوئے اس نے سرسری سا دریافت کیا لیکن سلوی کے جواب نے اسے چونکا دیا تھا۔

”میں انٹری ٹیسٹ کی تیاری کر رہی ہوں۔“  
”انٹری ٹیسٹ؟“ اس نے بھنوس اچکائیں۔  
”ہاں بھئی! مجھے ڈاکٹر جو بننا ہے۔“ اس نے فخریہ کالر کھڑے کیے۔ امن کچھ لمحوں کے لیے بالکل خاموش سا ہو گیا تھا۔ وہ اس کے موڈ سے خائف ہو کر بولی۔

”کیا ہوا؟“  
”میں اتنا لبا انتظار نہیں کر سکتا اور پھر تمہیں ایملی بی ایس کی ڈگری لے کر کیا کرنا ہے؟“ جب کرنے کی

اجازت تو میں ہرگز نہیں دوں گا۔“  
”امن!“ وہ اس سے ایسی کسی پابندی کی توقع نہیں کر رہی تھی سو افسردہ ہونا پڑی تھا۔

”یار کل کو ہماری اپنی فیملی ہوگی۔ مجھے گھر اور بچوں کو تمہاری ضرورت ہوگی اور تم ہمیں نظر انداز کر کے غیروں کی میچائی کرو عین اس کے خلاف ہوں۔“  
”بابا کو بہت شوق ہے کہ میں ڈاکٹر بنوں۔“ وہ لب کٹتے ہوئے بولی۔

”اور مجھے بہت شوق ہے کہ تم بس میرے گھر میں رہو۔“  
”گھر۔۔۔ تمہارا بس چلے تو تم مجھے صرف ایک کمرے تک محدود کر دو۔“ اپنے جواب پر نظر پڑتے ہی اس کا پیش عود کر آیا تھا۔

چند روز قبل امن نے اسے زندگی میں پہلی بار گفت دیا تھا۔ وہ بھی عیاں۔ ساتھ ہی کارڈر لکھا تھا۔  
”دوبیہ تم سے سنبھالا نہیں جانا اس لیے عیاں بھیج رہا ہوں۔“ اور وہ کتنی ہی دیر سائیکل نظروں سے اس کو دیکھتی رہی تھی۔

”مگر وہ بھی بہت بڑا ہے۔ میرا بس چلے تو میں تمہیں ایک الماری میں بند کر دوں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔  
”ہاں! جیسے میں موسم کی گھڑیا ہوں۔“ وہ منہ پھلا کر رہ گئی۔  
”اتنا مشکل لگتا ہے تمہیں میری بات ماننا؟“ اب وہ جذباتیت پر اتر آیا تھا۔

”مذاق کر رہی تھی۔ اچھا آؤں کریم کھائیں؟“ وہ اس کا موڈ بحال کرنے کو بولی۔  
”ہاں! لیکن گاڑی میں۔“ یہ بھی ایک پابندی تھی۔  
گھر آتے ہی پہلا سامنا عنوی سے ہوا جو لان کے چکر کاٹتی اس کا انتظار کر رہی تھی۔  
”میرے خرگوش کہاں ہیں؟“

”جسم میں جاؤ! تم اور تمہارے خرگوش۔“ وہ دانت پیستے ہوئے اندر چلی آئی۔

”مما! دیکھ لیں اس نے میرے خرگوش۔“ بال ڈائی کرتی ممما کو اس نے درمیان میں گھسیٹا تو وہ عاجزی

”پھر بھی۔۔۔“ وہ پلٹ کر واپس اس کے پاس چلی آئی۔  
”تمہاری تعلیم، دلچسپیاں، مشاغل۔“ اس نے انگلیوں پر گنوائی۔  
”تعلیم تو ٹھیک ہے، لیکن دلچسپیاں اور مشاغل۔“ وہ ان پر آکر انگ گئی۔

”خدارا! اب خرگوشوں کا نام نہ لے بیٹھنا۔“ سلوی نے بے ساختہ ہاتھ جوڑے تو اس نے ابرو اچکا کر گھورا۔  
”تو کیا تمہاری طرح یہ کہوں کہ فارغ وقت میں میں سائیکل چلاتی ہوں، پننگ اڑاتی ہوں، گارڈننگ کرتی ہوں اور۔۔۔“

”میوزک سنتی ہوں، کتابیں پڑھتی ہوں اور خواب دیکھتی ہوں۔“ اسے اٹھتے دیکھ کر سلوی نے مزے سے جملہ ملل کیا۔  
”عنوی! اب بھی جاؤ۔“ ممما سے بلانے آئی تھیں۔  
ان کے جانے کے بعد اس نے سر تپا خود کو جانچا۔

”میں کتاب بدل گئی ہوں۔ اب کہاں کی دلچسپیاں ہوں؟“ اس نے مشاغل۔ اب تو ہر سلسلہ ان محترم سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہوتا ہے۔ وہ اک گھر اسانس بھرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اپنی کتابیں دیکھتے ہی سوسا ہوا اور پھر سے جاگ اٹھا تھا۔  
اس نے کہا تھا کہ انٹری ٹیسٹ میں فیل ہو جاؤ اور وہ فیل ہو گئی تھی جبکہ اس کے برعکس رزلٹ بہت شاندار آیا تھا۔

”یہ کیسے ممکن ہے کہ تم ایگزومز میں اے پلس لو اور ٹیسٹ میں فیل ہو جاؤ۔“ بابا آج پہلی بار اس پر برس رہے تھے۔ سب سے زیادہ صدمہ بھی انہیں ہی ہوا تھا۔

وہ خاموش مہرے لب بچرموں کی مانند سر جھکائے بیٹھی تھی جبکہ دل چاہ رہا تھا، خوب دباؤیں مار مار کر روئے۔

”ایک تو اس کی اتنی محنت ضائع ہوئی ہے اوپر سے آپ ڈانٹے جا رہے ہیں۔ کیا ہوا اگر فیل ہو گئی ہے تو

سے بولیں۔“  
”پلیز عنو! تم کوئی بچی نہیں ہو۔ جا کر اپنا حلیہ درست کرو۔ آج تمہیں کچھ لوگ دیکھنے آ رہے ہیں۔“ ممما نے گویا ان کے سر پر دھماکا ہی کیا تھا۔ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھتی سلوی اٹنے قدموں واپس آ گئی۔

”ہیں سچ ممما؟ پوری تفصیل بتائیں۔“  
”تمہارے بابا کے دوست ہیں نا احمد صاحب۔۔۔ ان کے کوئی عزیز ہیں اور سنو! تم سامنے مت آنا۔“ مختصر اہ بتاتے ہوئے آخر میں انہوں نے سلوی کو ہدایت کی تو وہ خفا ہو کر بولی۔

”اف ممما! اب مجھ پر تو یہ پابندی عائد نہ کریں۔ ایسا کون ہے جو عنوی کو چھوڑ کر مجھے پسند کرے گا۔“ اس نے لاڈ سے عنوی کے گلے میں بازو ڈالا۔  
”ہٹو برے! میں تم سے کوئی بات نہیں کروں گی۔“ وہ ہنوز خفا تھی۔

\*\*\*

”میرے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔“  
عنوی بری طرح گھبرا رہی تھی۔  
”کچھ نہیں ہوتا یار! میری اور تمہاری طرح عام انسان ہیں وہ بھی۔“ سلوی نے گھبراہٹ سے اس کی پیشہ ٹھونکی۔

”کتنی لکی ہو تم کہ اس خواستگاہ کے جھنجھٹ سے بچ گئیں۔“ کچھ دور جا کر وہ پھر رک گئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں خاص مہمان آئے بیٹھے تھے۔  
”جاؤ بھی اب۔“ سلوی نے گھورا۔  
”وہ مجھ سے کیا کیا پوچھیں گے؟“

”لی اے کی ڈگری کے متعلق تو ضرور پوچھیں گے۔ تمہیں انہوں نے قومی اسمبلی میں جو بیٹھانا ہے۔“ وہ چڑ گئی۔

”سلوی پلیز۔۔۔“ اس نے منت کی۔  
”سواری! میں اس تجربے سے نہیں گزری۔“ اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔



اگلے سال پھر ڈرائی کر لے گی۔" مہمان نے پہلی بار بابا کے مقابلے میں اس کی طرف داری کی تھی۔ شاید اس کی روپائی صورت پر رحم آگیا تھا مگر وہ اگلے سال کی بات پر اپنی سابقہ خاموشی برقرار نہ رکھ سکی۔  
 "بابا! مجھے ڈاکٹر نہیں بننا میں اتنے کمزور دل کی مالک ہوں کہ سرجن تو کسی صورت نہیں بن سکتی پھر کیا فائدہ اتنی محنت کرنے کا۔ ویسے بھی اس فیلڈ میں میرا انٹرسٹ نہیں ہے۔" وہ نظریں چراتے ہوئے دنگر فٹی سے بول رہی تھی۔  
 "چلو! پھر دیکھتے ہیں۔" وہ افسردگی سے کہتے اٹھ کر چلے گئے اور اس کا دل کتنے ہی دن بابا کی آزر دگی کا سوچ کر سو گوار رہا تھا۔

\*\*\*

"تم انٹری ٹیسٹ میں فیل کیسے ہو گئیں۔" کالج میں پہلے دن روا تفتیشی انداز میں استفسار کرتی اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ جس پر وہ چڑ گئی۔  
 "کیوں میں فیل نہیں ہو سکتی کیا؟ جسے دیکھو انویسٹمنٹ کیشن کرنے چلا آ رہا ہے۔" وہ تنگ آ چکی تھی۔ مہمان اور بابا سے جان چھوٹی تھی تو عموئی اور شمن اس کے سر ہو گئی تھیں اور اب روا بھی زخموں پر نمک چھڑکنے چلی آئی تھی۔  
 "ہاں! تم فیل نہیں ہو سکتیں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اتنے یقین سے بولی کہ سلوی کے دل کا چور اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگا۔  
 وہ اس کی بچپن کی دوست تھی دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی تھا۔ شمن آپا اس کی بھانجی تھیں اور یہ رشتہ بھی سلوی کے توسط سے ہی طے ہوا تھا۔

"اور اب ہونا پڑا۔" اس نے کہتے ہوئے منہ لٹکالیا۔  
 وہ اس سے کچھ نہیں چھپا سکتی تھی۔  
 "کیوں؟ کس کے لیے؟" اس کی ڈارک براؤن آنکھوں میں تخیر سمٹ آیا۔  
 "امن کے لیے۔" وہ سابقہ لہجے میں بولی تو روانے

پہلے تو سر تھام لیا پھر یاد آنے پر چیخی۔  
 "تمہاری اس کے ساتھ انگلی جھنٹ ہو گئی اور تم نے مجھے انوائٹ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا؟ اس کی اطلاع مجھے بھانجی سے ملی ہے۔ شرم کرو بلکہ ڈوب مو۔"  
 "کوئی فنکشن نہیں ہوا تھا یار! بس پھوپھو نے آکر انگوٹھی پہنا دی۔"  
 "پھر بھی تمہیں ٹیٹ تو دینی پڑے گی۔"  
 "تو وہ کوئی ناکہ کچھ ٹھونسنے کو دل چاہ رہا ہے۔" وہ اپنا والٹ چیک کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو ردائے اپنے گروپ کی فائزہ اور مایاں کو بھی آواز دے ڈالی تھی۔

چھٹی سے کچھ دیر قبل وہ چاروں قریبی ریستورنٹ میں چلی آئی تھیں اور وہاں سے نکلے ہوئے اس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ گھبرا گئی تھی کہ اب جانے کیا ہونے والا تھا۔ اس روز اس نے سوچ لیا کہ اگر اسے نہیں پسند تو وہ دوبارہ نہیں آئے گی۔

\*\*\*

"ارسل! اب تم بھی شادی کرو۔" چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے شمن نے مشورہ دیا تو روا بھی پر جوش ہو گئی۔  
 "ہاں ارسل بھائی! آپ کو بتاؤں ہمارے کالج میں اتنی باری لڑکیاں ہیں اور میں نے تو تین چار کو اس سلسلے میں پسند بھی کر رکھا ہے۔"  
 "تین بچار؟" اس نے کانوں کو ماتھ لگائے۔  
 "زیادہ تین مت اور بتائیں کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟" وہ ٹھٹھک کر بولی۔  
 "میرے دل میں چار خانے ہیں۔" وہ ایک گھونٹ لیتے ہوئے مسکرایا۔  
 "اور ان خانوں میں کسے بند کر رکھا ہے؟" وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔  
 "دل میں تو نہیں بٹوے میں اس نے ضرور کسی کو بند کر کے رکھا ہے۔" عادل کی پیش گوئی پر اسے اچھو

کہا تھا۔ شمن نے اسے پانی کا گلاس تھمایا۔  
 "وہ دونوں بہن بھائی خاصی مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔"  
 "یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے دوبارہ ہائے کا پ اٹھالیا۔  
 "کیسی بات؟" عادل نے کان سمجھاتے ہوئے انجان کر پوچھا تو وہ زچ ہوا تھا۔  
 "ارسل! بیٹا! تمہارے بہن بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہی مناسب عمر ہے۔ اب اپنا گھر بسنے کی سوچو۔" اماں نے ان کی نوک جھونک سے محفوظ ہوتے ہوئے نصیحت کی تو اس نے تابعداری سے سر ہلا دیا۔  
 "گھر بنانے کی خواہش کے نہیں ہے اماں! بیکروہ طے بھی تو۔" اس کی سوچ گہری ہو چکی تھی۔ دل کے طاق پر رکھا امید کا وہ جل اٹھا تو اس کی آنکھوں میں وہ سی سی بھر گئی۔ وہ اس سلسلے میں بھی مایوس نہیں مانا جاتا تھا۔

\*\*\*

شمن کے سارے نیم دروازہ کوئی ٹاک شو دیکھنے میں ملن تھی جب مہمان نے آکر بیوی آف کر دیا۔  
 "چھوڑو! یہ سب فضول باتیں۔ کچھ گھرداری میں کی وچپی لو۔ پھوپھو کے گھر جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم پھوپھو اور بد سلیقہ بیروہ اور ویسے بھی وہاں ان سامان زمین کی قطاریں لگی ہیں جو تمہیں مہارانی کر رہیں گے۔ شمن اور عموئی کو ہی دیکھ لو! دونوں نے سارا گھر سنبھالا ہوا ہے۔" خوب کھری کھری لڑنے کے بعد مثال بھی کن بگھڑ بیسیوں کی دی تھی۔  
 "ابھا خاصا برا لگا۔"  
 "ہاں! تو وہ میری طرح کالج بھی تو نہیں جانتیں نا۔"  
 "اب تمہاری پڑھائی کا کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔" رات کا کھانا تم بنایا کرو گی۔" ساتھ ہی ایک لڑکی لگا دی گئی جس پر وہ بلبلاتا بھی تھی۔  
 "مہم! یز! ابھی تو عموئی کی شخص نسبت طے ہوئی ہے اور آپ نے ساری ڈیوٹیاں مجھے سونپ دیں۔"

اس روز جو لوگ دیکھتے آئے تھے وہیں بات طے پا گئی تھی۔  
 "ساری نہیں! بس ایک۔" وہ اس کے احتجاج کی پروانہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے اپنی تمام تر سستی اور بیزاری کو الوداع کہتے ہوئے بریانی بنانا پڑی تھی جو اتفاق سے اچھی بن گئی تو وہ سسرال میں اپنی دھاک بٹھانے کی خاطر ٹرے سجا کر پھوپھو کے گھر چلی آئی۔  
 سامنے ہی وہ بیٹھالینے لپ ٹاپ کے ساتھ کھڑ پڑ کر رہا تھا۔ پھوپھو تخت پوش پر نماز ادا کر رہی تھیں اور شمن یگن میں تھی۔ امن اسے دیکھتے ہی اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔  
 "اسے کیا ہوا؟" اسے حیرت ہوئی۔  
 "گھر میں دیے نہ جلاؤں کہ محترمہ تشریف لائی ہیں۔" شمن نے یگن سے جھانکتے ہوئے طنز کیا۔ وہ کافی دنوں بعد جو آئی تھی۔  
 "نہیں اب اتنا تکلف بھی نہ کرو۔ کھی پہلے ہی بہت مزگا ہے۔" ڈھٹائی سے کہتے ہوئے اس نے ٹرے میز پر رکھی اور خود فریج سے پانی نکال کر پینے لگی۔  
 "اس میں کیا ہے؟" کہتے ہوئے اس نے ڈش کا ڈسکن اٹھالیا۔ "واؤ! بریانی۔" شکل تو کافی اچھی ہے۔ عموئی نے بنائی ہو گی۔  
 "میں نے بنائی ہے۔" اس نے چرے سے گلاس ہٹا کر گھورتے ہوئے بتایا۔  
 "تم نے؟" شمن کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔  
 "اب ساری ٹھونس مت لیتا۔ امن کے لیے بھی رکھنا۔ میں ذرا ان موصوف کی خبر گیری کر لوں کہ کس بات پر مزاج برہم ہیں۔" وہ دوپٹہ درست کرتی اوپر چلی آئی۔ دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔  
 دوبارہ۔ تین بار۔ بالآخر وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر چلی آئی۔ بیڈ روم خالی تھا اور وہ ٹیرس پر بے چینی سے تھل رہا تھا۔ وہ ست قدموں سے چلتی اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔



”خفا ہو؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

جواب میں خاموشی۔

”میری فریڈز بہت اصرار کر رہی تھیں کہ اپنی انجیجمنٹ کی خوشی میں ہمیں پارٹی دو اس لیے ہم ریستورنٹ چلے گئے تھے لیکن آج کے بعد کبھی نہیں جاؤں گی، پراس۔“ بہت ہی غور و خوض کرنے کے بعد اسے ناراضی کی وجہ سمجھ میں آئی تھی اسی کے مطابق وضاحت دیتے ہوئے اس نے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ آئندہ کے لیے وعدہ بھی کر لیا تھا مگر وہ غراتے ہوئے بولا۔

”تم عنوی کے سسرال کیوں گئی تھیں؟“ ماتھے پر شکنوں کا حال بچھا تھا۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اس ایک بات کی وجہ سے وہ رات بھر سو نہ سکا ہو۔

”میں تم سے پوچھ کر گئی تھی۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے یاد دلایا۔

”میں نے کہا تھا اپنی مرضی کرو جبکہ تمہیں میری مرضی معلوم تھی۔ اس کے باوجود تم نے اپنی من مانی کی۔“ اس کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

”عنوی میری اکلوتی بہن ہے۔“ اس کے لہجے میں مبہم سا احتجاج تھا۔

”اس کا یہ مطلب ہے کہ تم اس کے لیے لڑ کے دیکھتی پھو؟“

”مما اور بابا کے فائنل کرنے کے بعد میں گئی تھی اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہم وہاں عنوی کی نسبت طے کر چکے ہیں۔“ اس کی بات نے اس کی جان جلا کر رکھ دی تھی۔

”اس اوکے! لیکن اس کے ساتھ زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جانتی ہو کوئی اور تمہیں دیکھے تو میرا دل الٹ جاتا ہے اور پھر میں تم سے اچھے پڑتا ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے اب کس قدر محبت سے بول رہا تھا۔

سلوی نے اس کا موڈ خوشگوار ہونے پر ایک

اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔

وہ سب ہر بات کر سکتی تھی لیکن امن کی ناراضی نہیں۔ شاید اسے بھی سلوی کی کمزوری کا اندازہ ہو چکا تھا اسی لیے تو ہر بات پر خفا ہو کر مزے لیتا تھا۔



”بابا نے ابھی تک گاڑی نہیں بھیجی۔ میں نے ابھی دلا دیا تھا۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے صوفے پر آ بیٹھ لیکن نظریں ہنوز وال کلاک کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

آج ردا کی سالگرہ تھی۔ وہ تو صبح سویرے فون مبارک باد دے کر اپنے فرض سے گویا سبکدوش ہو چکا تھا مگر ردا نے صاف کہہ دیا تھا کہ۔

”تم یقیناً اپنا گفٹ بچانے کے چکروں میں ہواؤ۔ میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ تمہیں آنا ہی پڑے گا۔“ اور کھٹ سے فون رکھ دیا تھا۔ اب وہ کب تیار ہو کر بیٹھی تھی مگر گاڑی کا دور دور تک کوئی نام نشان نہیں تھا۔

”تو امن کے ساتھ چلی جاؤ۔“ ممما کے مشورے وہ بدک اٹھی تھی۔

”وہ تو کبھی نہیں لے کر جائے گا۔ اسے میرا فریڈ کر کے گھر جانا پسند نہیں ہے۔“

”یہ امن اپنی روک ٹوک کیوں کرتا ہے۔ میری کو لے کر برقعہ اوڑھا دیا۔“

”مما! میں اس میں کمفر ٹیبل محسوس کر رہی ہوں۔“ اس نے فوراً امن کا دفاع کیا تھا۔ وہ خود اپنے کچھ بھی کہتی رہے لیکن کسی اور سے اس کی برا نہیں سن سکتی تھی۔ کچھ دیر مزید انتظار کرنے کے بعد اس نے گیٹ سے باہر جھانکا تو امن کی گاڑی دکھائی دے گئی۔ اب چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بھی اٹھ کر دیکھ چکا تھا۔

”کیس جارہی ہو؟“

”وہ مجھے مار کھٹ جانا تھا۔ بابا سے کہا بھی تھا کہ گاڑی بھیج دیں۔ جانے ڈرائیور کہاں رہ گیا ہے۔“ ردا کو ل کی بل کھاتی سڑک پر کسی ذی روح کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

”اچھا آؤ! میں لے جاتا ہوں۔“ وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا تو وہ ممما کو بتا کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ گاڑی اب سال روڈ کی سڑکوں پر رواں دواں تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ ردا کے لیے عنوی جیسا سوٹ خریدے گی جو عنوی دو روز قبل ہی لے کر آئی تھی اور اسے بہت پسند آیا تھا مگر سوٹ پر لگا چار ہزار کا ٹیکس ویکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ عنوی نے تو تین میں لیا تھا۔

”دو روز میں آپ نے ایک سوٹ کچھ ہزار روپیہ دام بڑھا دیا ہے۔“

”نہیں میم! یہ سوٹ ہم نے چار میں ہی سیل کیے ہیں۔“

”ابھی دو روز قبل میری ممما یہی سوٹ اسی بوتھیک سے تین میں لے کر گئی ہیں۔“

”ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ وہ پتا اٹھی۔

”مجھے کیا پتا۔“ اس نے لاعلمی سے شانے اٹھائے۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ؟“ خاموش کھڑے امن کو اس اندازے حد برا لگا تھا۔

”یہ ٹکسڈ برا تڑپ ہے۔“

”اوکے! تم ٹیک کر دو۔“ وہ پے منٹ کر کے پارکنگ الٹ سے گاڑی لینے چلا گیا تھا اور وہ عجلت میں باہر نکلتے ہوئے اندر داخل ہوتے ایک شخص سے بری طرح لڑائی مچ گئی۔

”الیکسی کیوزی! پیشانی پر ہاتھ رکھے وہ اسے ہال کی مانند راستے میں ابستادہ دیکھ کر خٹ سے بولی تو وہ عذرت کرتا ایک طرف کو ہو گیا تھا۔

”صد شکر کہ امن نے یہ تصادم نہیں دیکھا تھا ورنہ اس کی مزید شامت آ جانی تھی اور کچھ تو آتی چکی تھی۔ وہ گاڑی میں آ کر بیٹھی تو امن اپنے والٹ سے

سارے نوٹ ڈیش بورڈ پر رکھ کر بیٹھا ہوا تھا جس میں ہزار ہزار کے چند نوٹ کے علاوہ کچھ ریال اور ڈالر بھی تھے۔

”تم ان پیسوں کی وجہ سے اس دو ٹکے کے سیلز بین کے ساتھ بات کر رہی تھیں؟“ اس نے نوٹ ہاتھوں میں لے کر اس کی جانب دیکھا اور پھر ان نوٹوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھڑکی سے باہر اچھال دیے۔ وہ اس کی اس حرکت پر کچھ نہیں بولی تھی۔

وہ اس معاملے میں کتنا جنفی اور پاگل تھا، اسے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا اور پہلی بار اس کا دل اتنی چاہت پر مغرور ہونے لگا۔ بجائے ملال سے بھر گیا تھا۔

”گاڑی خریدیں کیا کے گھر کی جانب موڑ لو۔“ وہ اسے گھر واپس جانا دیکھ کر قدرے رکھائی سے بولی تو وہ رخ موڑ کر اس کے بگڑے بگڑے تیور دیکھنے لگا۔

”وہاں کیا کام ہے؟“ اس کی بھنوس تن گئیں۔

”ردا کی برقعہ ڈالے ہے اور مجھے اسے وٹ کرنا ہے۔“ وہ سابقہ لہجے میں گویا ہوئی۔

”چلو تم اسے وٹ کر کے آجانا، پھر ہم کہیں گھومنے چلیں گے۔“ اس کا موڈ قدرے بحال ہوا تھا۔

”گاڑی میں بیٹھ کر؟“ وہ طنز کرنے سے باز نہ آئی۔

”کاش! اس دنیا کا کوئی ایسا مگر ہوتا، جہاں سے کوئی تمہیں دیکھ نہ سکتا تو پھر میں تمہیں خوب سیر کرواتا۔“ اس کی اپنی مجبوری تھی۔

”تو پھر ایسا کرو، کسی جنگل ویرانے میں گھر بنا لو۔“ وہ چڑ گئی۔ اتنے میں ردا کا کھڑا آچکا تھا۔

”تمہارے پاس اونٹنی فائیو منٹس ہیں۔ جلدی وٹ کر کے واپس آؤ۔“ اترنے سے قبل وہ باور کروانا نہیں بھولا تھا۔

”امن۔۔۔“ اس نے کچھ کہنے کو لب واپس مگر اس نے ٹوک دیا۔

”نامم از اشارت ناؤ۔“

”بہت کہتے ہو تم۔“ وہ ناراضی سے کتنی کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔





آتا تھا۔



”جائے ہیں ماما اور بابا۔ اب تم مصنوعی بیماری کی ایک ٹنگ کرنا بند کرو۔“ عسوی نے آکر ایک بھٹکے سے چادر کھینچی۔

آج اس کے سرال والوں نے ان لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس نے سرور کا مہمان بنا کر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ ماما تو اس کا انکار سنتے ہی تھا ہو گئی تھیں۔

”لوگو! بہن ہے تمہاری۔ کیا سوچیں گے اس کے سرال والے جب تم نہیں جاؤ گی۔“

”بھئی وہ کچھ بھی سوچیں لیکن جب اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے تو زبردستی کا کیا جواز۔“ حسب معمول بابائے فوراً اس کی حمایت کی تھی۔

”سلوی! اٹھ رہی ہو کیہ نہیں؟“ ممانے آنکھیں دکھائیں مگر اسے پروا کب تھی۔

”ماما پلیر! سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ چہرے پر زبردستی تکلیف کے آثار نمودار کر لیے گئے تھے۔

”اچھا! ٹھیک ہے۔ تم کوئی پین کھلے کر آرام کرو۔“ اس سے پہلے کہ ماما ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھائیں بابائے اسے آرام کا مشورہ دے کر کمرے میں بھیج دیا تھا۔ تب سے وہ یونہی لیٹی تھی۔ اگر چلی جاتی تو پھر امین کی ناراضی کو کون بھیتا۔ بعد میں پچھتانے سے اچھا لگا کہ پہلے ہی نتائج پر غور کر لیا جائے۔

”یار چرخ میں میرے سر میں درد ہے۔“ وہ کسلندی سے بولی۔

”میں پکڑے اور چائے بنا کر لائی ہوں۔ کھانے اور تو تیس پر آ جاؤ۔“

”پکڑے۔“ اس کے من میں پانی بھر آیا۔ وہ فوراً اٹھ کر اس پیچھے بھاگی تھی۔

بادلوں سے ڈھکا آسمان سبک روی سے چلتی جاتی خوشگوار ہوا اور چھم چھم برستی بوندیں موسم کے کوٹ کیا بدلی تھی ہر شے میں ماز کی اور نکھار

”پھر کسی روز۔“ وہ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا

”میں نے ایک بھی منگوا کر رکھا تھا۔ تمہارا فیورٹ پائن ایل۔“ اس نے ایک اور لالچ دینا چاہا۔

”ہائے! کیا کروں مجبوری ہے۔“ وہ اس کے گلے مل کر پیار کرتے ہوئے لٹھ حافظ کہہ کر گیٹ عبور کر گئی۔

”ارسل بھائی! اب کب آئے؟“ واپس پلٹنے پر ارسل کو دیکھ کر کھل اٹھی تھی جس کی آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک تھی اور چہرے پر ریوڑ خنیاں پھوس رہی تھیں اسے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جسے راستہ بھر ڈھونڈتا ہوا آیا تھا وہ سفر کے اختتام پر ملی تھی۔

”بھئی پر تھو ڈے۔“ وہ اسے وش کرنے کے بعد اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا ان راہوں پر جس پر اب اس کے قدموں کے نشان باقی تھے اور اسے اپنے پاؤں زمین پر نہیں لکھنا پڑے پڑتے محسوس ہو رہے تھے دل خوشگوار لے پر دھڑک رہا تھا۔ برسوں بد آنکھوں میں جیسے ٹھنڈک سی آ رہی تھی۔

”واؤ! بہت پیارا! اسکارف ہے اور لی روز تو میرا فیورٹ خوشبو ہے۔“ وہ اس کا گتھ کھولنے کے بعد کھلے دل سے سراہ رہی تھی۔

”روا! یہ لڑکی کون تھی؟“ اس نے گیٹ کی جانب یوں اشارہ کیا جیسے وہ ابھی تک وہیں کھڑی ہو۔

”وہ سلوی تھی شمرین بھائی کی کزن میری دوست۔“ گلچ میں ہم ساتھ پڑھتے ہیں۔“

”سلو خالہ۔“ اچانک اس کی سماعتوں میں ایمان اور زیب کی آواز گونجی۔ وہ چونکہ عادل کی شادی شریک نہیں ہوا تھا اس لیے عالم تھا ورنہ وہ چہرہ سا قبل مل چکی ہوتی۔ وہ اپنے خیال پر خود ہی ہنسا۔

ان دنوں وہ انگلینڈ میں زیر تعلیم تھا اس کی ماما انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو چکا تھا اور والد انگلستان میں دوسری شادی کر چکے تھے۔ وہ پاکستان میں بالکل تنہا پھر عادل اور اس کی فیملی تھی جہاں وہ بھی کبھار

وہ بہت افسردہ اور ملول سا گاڑی ڈرائیور کر رہا تھا حالانکہ اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ آج تین سال بعد وہ اسے نظر آئی تھی۔ وہ روٹے لیے گتھ لینے مار گیٹ آیا تھا۔ رفیوم خریدنے کے بعد اس کی نگاہ گلاس وال سے نظر آتے خوش رنگ پھولوں والے ریشمی اسکارف سے لگرائی تو اسے یاد آیا کہ روا کو اسکارف بہت پسند تھے۔ وہ لینے کے ارادے سے اس بوتیک کی جانب بڑھا تو پھر نفقے ایک لڑکی اچانک اس سے ٹکرا گئی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی نظروں میں زمین و آسمان گھوم گئے تھے۔ وہ مسحور ہو کر رہ گیا تھا۔

”ایکسکیوز می۔“ شمرین آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ ہوش میں آیا۔ وہ راستہ بانگ رہی تھی۔ وہ معذرت کرنا ٹیک طرف ہو گیا اور وہ کسی خوشبو دار جھونکے کی مانند گزرتی چلی گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد اس کا بچہا کرنے کا خیال آیا تو اسے خود پر غصہ آئے لگا جس کی جگہ اب اداسی نے لے لی تھی۔ وہ بے دلی سے روا کا گتھ اٹھا کر گھر کے اندر داخل ہوا تھا جب اسے ایک بار پھر سناکت ہوتا پڑا۔

بجری کی طویل روش پر دونوں باتیں کرتی گیٹ کی سمت ہی آ رہی تھیں۔ روا بہت خفا تھی۔

”تم کیا بس اپنی شکل دکھانے آئی تھیں۔ اس زحمت کی بھی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو میں کل کالج میں دیکھ ہی لی۔“

”پلیز یار! تم تو جانتی ہو امین کو۔ جانے کہاں سے اچانک نمودار ہو گیا ورنہ میں تو ڈرائیور کے ساتھ ہی آنے والی تھی۔ اب پھر کسی روز میں اور عسوی پورے دن کے لیے آئیں گے پکار امین۔“ محض اسے منانے کی خاطر اس نے وعدہ بھی کر دیا تھا جس کے ایفا ہونے کا روا کو ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا اس لیے ہنوز منہ پھلائے رکھا۔

”اماں اور شمرین بھائی سے تو ملتی جاؤ۔“ وہ اسے جانے کو پر تو لے دیکھ کر چلائی۔

سمٹ آیا تھا۔ ساری کائنات تاریخی رنگ میں ڈھل چکی تھی۔

”تمہیں عجیب نہیں لگتا سلوی! یہ کیا پیار ہے؟ اتنا کھٹن زدہ کہ جس میں سانس لینا بھی دشوار ہو جائے؟“ اس کا اشارہ امین کی جانب تھا۔ پھٹکی کی اوک میں جمع کرتی بوندوں کو سپرد ہوا کرتے ہوئے سلوی نے چونک کر اسے دیکھا۔

”نہیں! مجھے کبھی کھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی چاہت تو میرا غور ہے۔ اپنے معاملے میں مجھے اس کا بوزیو ہونا اچھا لگتا ہے۔ اس کا مجھ پر رعب جانا حق جتنا اس میں اپنائیت کا ۴۲ تحقیق کا آگ بان بھرا احساس ہے۔ مجھے اس کی ہر بات مان کر خوشی ہوتی ہے۔“

”لیکن مجھے لگتا ہے کہ جیسے امین کو پا کر تم ہم سے بہت دور ہو جاؤ گی۔ اگر اس نے کبھی ہم سے ملنے سے روکا تو تم اس کی یہ بات بھی مان لو گی۔“ عسوی کو امین کی وجہ سے اس کا عسوی کے سرال نہ جانا کچھ زیادہ ہی برا لگا تھا۔

”ارے! وہ ایسا کیوں چاہے گا۔“ وہ برامانے ہوئے بولی۔

”کیونکہ وہ تمہاری توجہ ہر مل صرف خود پر مرکوز چاہتا ہے۔ تم نے تو اگر اپنے بچوں سے بھی اس سے زیادہ محبت کی تو وہ ان سے بھی نفرت کرنے لگے گا۔“

”انہنہ کرے۔“ اس نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے عسوی کو گھورا۔

”تو پھر اس کی ہر بات مت مانا کرو۔“

”میں نہ بھی مانوں تو اسے منوانے کا ہنر آتا ہے۔ تمہیں نہیں پتا وہ اگر دن کو بھی رات کہہ دے تو میں انکار نہیں کر سکتی۔“

”لیلی فون کی چٹکھاؤنی تیل پر وہ دو تین پکڑے ایک ساتھ اٹھا کر بچہ بھاگی۔

”ہیلو! سائیس بے ترتیب ہو رہی تھیں۔“

”السلام علیکم! دوسری جانب شائستگی سے سلام کیا گیا تھا جبکہ کبیر مردانہ اجنبی آواز پر وہ سلام کا



جواب دیتے ہوئے بھی ہچکچاتی تھی۔  
 ”آپ سلوی ہیں؟“ کچھ لمحوں کی خاشی کے بعد  
 استفسار کیا گیا۔  
 ”جی۔“ وہ محض یہی بول سکی تھی۔  
 ”میں ارسل ہوں۔“ اپنا تعارف کروایا گیا۔  
 ”میں کسی ارسل صاحب کو نہیں جانتی۔“ ساتھ  
 ہی اس نے کھٹ سے ریسیور رکھ دیا اور غائب دماغی  
 سے سوچنے لگی۔ ”یہ ارسل کون ہے؟“  
 ماما اور بابا شام ڈھٹے واپس آئے تھے۔ بابا نے بتایا  
 کہ وہ اگلے ہفتے شادی کی تاریخ مقرر کرنے آئیں گے  
 بس عنویٰ بھی اب چند دنوں کی مہمان تھی۔



وہ ریسیور ہاتھوں میں لیے گم صم سا بیشارہ گیا تھا  
 اس نے سوچا اس سلسلے میں ردا سے مدد لینا چاہیے  
 لیکن آفس میں اتنا کام تھا کہ پورا ہفتہ اسے فرصت ہی  
 نہ مل سکی تھی۔ آخر ویک اینڈ پر وہ ان کے گھر آیا تھا۔  
 ”ارے! آج تم خود سے کیسے چلے آئے؟ راستہ تو  
 یاد رہا تھا نا؟“ عادل مصنوعی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے  
 قدرے تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ”ورنہ آج سے  
 پہلے تو وہی زبردستی اسے کھینچ کر لانا تھا۔“  
 ”یکومت“ گھر والے سب کہاں ہیں۔“ اس نے  
 محسوس کیا تھا سارے گھر میں ہی سناٹا چھایا ہوا تھا۔  
 ”اماں لی تو اس وقت قیلولہ فرما رہی ہیں۔“ شمرین  
 بچے اور ردا آن فاروق اکل کی جانب گئے ہیں۔ ان کی  
 بیٹی کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو رہی ہے نا۔“

”ان کی کون سی بیٹی؟“ ارسل کا دم سینے میں ہی  
 اٹک گیا تھا۔ فاروق تو سلوی کے بابا کا نام تھا۔  
 ”بڑی بیٹی۔“ وہ بھی اپنے نام کا غیث تھا۔ اب  
 اسے بھلا کیا بتا کہ بڑی بیٹی کون سی ہے۔  
 ”وہ جسے بچے سلو خالہ کہتے ہیں؟“ وہ سر کھجاتے  
 ہوئے سوچنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا تو عادل نے  
 خاصی مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”تمہیں اس کا نام اتنا کیوں یاد ہے؟“ تفتیشی انداز  
 میں پوچھا۔  
 ”نام کی مماثلت کی وجہ سے“ کیونکہ ایمان مجھے بھی  
 ”سلو چاچا“ کہتی ہے۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے  
 بتایا تو وہ ہنسنے لگا کر منس پڑا۔  
 ”نہیں اس کی بڑی بہن ہے عنویٰ۔“ ارسل کی  
 کب کی رکی سانس بحال ہوئی تو دوسرے کونوں نے اعتراض  
 پکڑا تھا۔

”میں چائے لے آؤں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔  
 ”شادی کب تک ہے؟“ وہ چائے بنا کر واپس آیا تو  
 اس کے لبوں پر پھوہی سوال تھا۔  
 ”ایک ہفتہ بعد۔“ اس نے پورا بسکٹ منہ میں  
 رکھتے ہوئے بتایا۔

”مجھے تو مدت ہوئی ہے کوئی فنکشن اینڈز کے  
 ہوئے۔“ کھینچ تان کر چرے پر مسکینیت اور آواز  
 میں بے چارگی طاری کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔  
 ”تو اس میں اتنا افسرہ ہونے کی کیا بات ہے۔“  
 ہمارے ساتھ چلنا۔ تمہاری وجہ سے مجھے بھی کینچی  
 رہے گی۔“ عادل نے فوراً اس کے حسب منشا  
 جواب دیا تھا اور اس نے مروتاً بھی انکار نہ کیا۔ عادل کا  
 کیا بھروسہ اگر وہ مزید اصرار نہ کرتا تو۔۔۔

گھر آنے کے بعد وہ از سر نو اپنے اپارٹمنٹ کی  
 سپیشنگ کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ بڑے فرنیچر  
 کا بہت سب کچھ تبدیل کروایا تھا۔ گھر کے ہر حصے کی  
 سجاوٹ وہ بول کر رہا تھا جیسے وہ کوئی نئی نوکی دلہن ہو  
 پھر عنویٰ کے بجائے ایک ہفتہ بعد اس کی اپنی شادی  
 ہونے والی ہو۔

”ایک ہفتہ۔“ اس نے انگلیوں پر دن گنے۔ بہت  
 طویل انتظار لگا تھا۔



گھر میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ ایک ہفتہ  
 اور اتنے ڈھیر سارے کام۔ وہ تو کھن چکر بن کر رہ گئی

تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ تو شاپنگ کا تھا۔ ہر سوٹ  
 اس کی بار مسترد کر چکا تھا۔ پہلے اسے ساڑھی پر  
 اعتراض ہوا تھا، پھر وہ لنگالے کر آئی تو اس نے کہا کہ یہ  
 اریس اپنی شادی پر پہننا۔ اب وہ فراق لائی تھی تو اس  
 کے رنگ پر اعتراض تھا۔

”تمہیں پتا ہے، ریڈ کلر میں تم اتنی حسین لگتی ہو  
 کہ میں چاہتا ہوں جب بھی تم یہ رنگ پہنو تو اس  
 نگار پر صرف میرا حق ہو۔“

اب تو ممانے بھی اس کے ساتھ جانے سے انکار کر  
 دیا تھا سو وہ شمن کے ساتھ جا کر ایک ہی بار ساری  
 شاپنگ کر آئی تھی۔ اب کی بار اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ  
 ان چیزوں کی اس کو بھینک بھی نہیں لگے دے گی، لیکن  
 وہ دونوں ابھی بازار سے آکر بیٹھی ہی تھیں کہ اس کی  
 آمد ہو گئی۔

”ماموں کہاں ہیں؟“ کرسی سنبھالتے ہوئے اس  
 نے تھکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ شمن اس دوران  
 سارے شاپنگ بیگجو اٹھا کر غیر محسوس انداز میں اٹھ  
 کر اندر چاچی تھی۔

”بابا تو گھر میں نہیں ہیں۔ تمہیں کیا کام تھا؟“ شام  
 کی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ دونوں اس وقت  
 لالہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہی  
 اورنج جوس کا گلاس تھا جو آدھا وہ اس کی آمد سے قبل  
 خالی کر چکی تھی۔ باقی کا آدھا اس نے امن کی جانب  
 بڑھادیا۔

”میں نہیں چاہتا کہ لیڈز کو کھانا میسر ہو کریں۔“  
 اس نے ایک کھوٹ لیتے ہوئے اپنی آمد کی وجہ بتائی تو  
 سلوی کا داغ ہلکے سے اڑ گیا۔

”امن! تم پابل ہو؟“ وہ جانتی تھی کہ ایسا وہ محض  
 اس کی وجہ سے کہہ رہا ہے۔

”مجھے جو بات نہیں پسند میں اس پر کچھو وائز  
 نہیں کر سکتا اور کھانا میں سرو کروں گا۔ بس ماموں جان  
 اجازت لینا تھی۔“

”ایسا تو اب تم میرے لیے میٹرنو گے؟“ وہ تپ ہی

تواٹھی تھی۔ وہ خاموش رہا۔  
 ”امن پلیر میں اس دوران برائینڈل روم میں چلی  
 جاؤں گی۔ تم اس فکر میں خود کو بلیکان مت کرو کہ مجھے  
 کوئی دیکھ لے گا۔“ اس کی یقین دہانی پر وہ قدرے  
 رسلون سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ سلوی نے بے ساختہ  
 شکر ادا کیا۔

تین روز قبل عنویٰ کو ماما بٹھایا گیا تھا۔ ساتھ ہی  
 ڈھولک بھی رکھ لی گئی تھی۔ خالہ کی قبلی ماما و بابا کے  
 کزن، عنویٰ کی فرینڈز سب نے مل جل کر خوب ہنگامہ  
 مچائے رکھا۔

منہدی کی تقریب میں بھی اپنی قبلی اور چند قریبی  
 دوست احباب ہی مدعو تھے۔ تقریب رات ایک بجے  
 تک چلی تھی۔ اس کے بعد وہ اور عنویٰ جاگ کر باتیں  
 کرتی رہی تھیں پھر سلوی نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ  
 رکھ دیا۔

”سو جاؤ اب صبح تمہیں دولہن بننا ہے۔“



رات سونے سے قبل اس کی آنکھوں میں جیسے  
 رنگوں کی بارات اتر آئی تھی۔ وہ اس کی ایک جھلک  
 دیکھ کر بے خود سا ہو چکا تھا۔

قرمزی رنگ کی فراق میں ملبوس پھولوں کا زیور  
 پہنے وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اسے اپنے دل پر قابو  
 رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ کچھ آنکھوں کی چوری کا خدشہ  
 تھا کہ وہ تقریب اور صوری چھوڑ کر گھر چلا آیا۔

اور اب اس کی انگلیاں اک جانا پہچانا نمبر ڈائل  
 کرنے میں مصروف تھیں۔ دوسری جانب تیل جاری  
 تھی۔ وہ سانس روک کر جیسے اس کی ”میلو“ کا منتظر تھا۔  
 پھر کچھ سوچ کر ریسیور واپس رکھ دیا۔ جانتا تھا وہ فون پر  
 کوئی بات نہیں سنے گی۔ اب اسے کل کا انتظار تھا مگر  
 اس کا انتظار لا حاصل ہی رہا۔

پوری تقریب میں وہ اس کی ایک جھلک بھی نہیں  
 دیکھ پایا تھا۔ نہ تو وہ داخلی راستے پر بارات کا استقبال  
 کرتے آئی تھی نہ ہی اس پر فوٹوشوٹ کروایا تھا نہ ہی



کسی رسم میں شرکت کی تھی۔ رخصتی کے ساتھ ہی وہ مایوس سا اٹھ کر گھر چلا آیا تھا۔

پھر کچھ روز خواب سنانے میں گزرے، لیکن اب خوابوں سے من نہیں رہتا تھا اسی لیے وہ ایک فیصلہ کر کے عادل کی جانب چلا آیا تھا۔

”ہاں ارسل! آؤ۔“ ہمیشہ کی طرح پر جوش استقبال مگر انداز میں گریجوئی مفقود تھی۔ فضا میں عجیب سی اداسی رہی ہوئی تھی۔

بچن سے رشتوں کے پٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ دونوں اٹھ کر لان میں چلے آئے۔

”خیریت۔“ ارسل نے بیٹھتے ہی کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”وہ شمرین کا بھائی ہے نا امن اس کی منگنی ٹوٹ گئی ہے۔“

”اوہ۔“ اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

”لیکن یہ کوئی بہت بڑی بات تو نہیں ہے۔“

ارسل کو اس کا اتنا فکر مند ہونا عجیب سا لگا تھا۔

”ہاں! لیکن خاندان میں ایسی بات ہو جائے تو دوسرے بھی کئی رشتے اس کی زد میں آجاتے ہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ اس نے سرسری سی تائید کردی ورنہ اسے اس موضوع میں کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی۔

”اچھا تم سناؤ۔“ وہ چہرے پر بشارت طاری کرتے ہوئے بولا۔

”میں تم سے ایک فیور کے سلسلے میں آیا تھا۔“ اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے تمہید باندھی تو عادل نے اسے مصنوعی خنک سے گھورا۔

”بلا جھک کو بیار۔“

”وہ بھانجی کی کزن ہے نا سلوی! میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ لمحے کی مضبوطی بتا رہی تھی کہ ان میں پوشیدہ جذبے سطحی اور معمولی نہیں تھے۔

ردا اور عادل نے قدرے حیران نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ ابھی ابھی چائے لے کر وہاں آئی تھی۔

”امن کی نسبت بچپن سے ہی سلوی سے ملے تھے اور اب سلوی نے اچانک اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“ اس نے گویا اپنی جانب سے دھماکا مارتا تھا۔ ارسل ایک پل کے لیے چونکا پھر اطمینان سے چائے کا کپ لبوں سے لگا کر بولا۔

”اب تم میرا پروپوزل لے کر جاؤ گے۔“

”ارسل بھائی! سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ اس لڑکی کا ایک ماضی ہے۔“ ردا کو ان کے اس فیصلے پر جھل مسرت ہوئی تھی وہیں وہ یہ بھی چاہ رہی تھی کہ وہ جذبات کے ساتھ ساتھ دماغ سے بھی کام لیں۔

”ماضی پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔“

اس کے جواب نے دونوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عادل نے اپنے تعاون کا بھرپور یقین دلایا تھا۔ شمرین تو کسی بھی صورت اپنے بھائی کی مخالفت کرنے کو تیار نہیں تھی مگر اماں بی اور ردا کا وٹ اس کے ساتھ تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ٹیرس پر کھڑی خالی آنکھوں سے لان کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ درختوں کے پتے جھڑ جھکے تھے۔ منڈ شاخیں کس قدر اجڑی اور پران لگ رہی تھیں۔ کسی بھی شاخ پر کوئی پھول نہیں کھلا تھا۔ اداسی تھی اس کے وجود کے ساتھ ساتھ زرد موسم سے بھی بھری ہوئی تھی۔

”بابی! آپ کے لیے پھول آئے ہیں۔“ تب ہی ملازمہ ایک خوش رنگ پھولوں کا گلدستہ لیے چلی آئی تھی۔ اس نے پلٹ کر حیرت سے ان پھولوں کو دیکھا۔

”بھلا اس موسم میں کون پھول بھیجے گا۔“ اس کا رد اٹھا کر دیکھا اس پر ایک لطم تحریر تھی۔

کچھ نئی منڈلیں، کچھ نئے راستے کچھ نئے مرحلے، کچھ نئے ضابطے اک نئے آسمان کی تلاش میں کچھ نئے پروں کو سنوار لیں اک نئی پھر سے اڑان بھریں

نی زندگی کے واسطے  
سب غموں کو بھلا کر  
اک نئے آسمان کی تلاش میں  
چلاؤ!

نئے سرے سے سجاتے ہیں زندگی  
۔۔۔ ارسل۔۔۔

”یہ ارسل کون ہے؟“ ساتھ ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ماما اس وقت واش روم میں تھیں سو مجبوراً اسے ہی کال ریسیو کرنا پڑی تھی۔

”پلو! وہ بے زاری سے بولی تو دوسری جانب انتہائی شوخ لہجے میں فرمایا گیا۔

”جتنے پھول آپ کو بھیجے ہیں نا! آئندہ برسوں کی رد و تول میں آپ کو ایک ایک کر کے سارے پھول دلاتے ہوں گے۔ میں ہر سال منتظر رہوں گا۔“

پوری بات سنے بغیر اس نے کھٹ سے ریسیور رکھ دیا۔

اسے یاد تھا کہ ماما دو روز قبل اس پر اس رشتے کے لیے زور دے رہی تھیں۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔

وہ سب جو ہوا تھا وہ ابھی بھلا نہیں پائی تھی۔ امن نے اس سے ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ پھر اس کے بعد سب ختم ہو گیا۔

اسے سونے کی ضرورت نہیں تھی وہ بات تو ہر پل اس کے دماغ میں گردش کرتی تھی۔

عنوی اپنی شادی کے بعد پہلی بار رہنے کے لیے آئی تھی۔ ایک ہفتے بعد عمارتے لینے آیا تھا۔

سب لان میں بیٹھے چائے اور پکوانوں کے ساتھ ساتھ باتوں سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تب ہی ماما ان کال ریسیو کرنے اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ عنوی کو ایک ہینک کرنی تھی۔ پیچھے وہ اور عمری رہ گئے تھے۔ وہ ”مکراتے ہوئے اسے کچھ دیر کے لیے کہنی پر بھروسہ کر رہی تھی جب اچانک امن چلا آیا تھا۔ اس نے بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ کر اندر چلی آئی تھی۔ کچھ دیر بعد عنوی کو رخصت کرنے کے بعد ماما

پھوپھو کی جانب چلی گئی تھیں۔ وہ ٹیرس پر رکھے گملوں کو پانی دینے میں مگن تھی جب وہ بڑے تیوروں سمیت اس کے سر پر آن کھڑا ہوا۔

”میں نے تمہیں عمر کے ساتھ زیادہ فریک ہونے سے منع کیا تھا اور تم لان میں اس کے ساتھ تنہا بیٹھی قہقہے لگا رہی تھیں۔“ اس کا لہجہ اس قدر ہنک آمیز تھا کہ سلوی کو اپنے کانوں کی لو میں سلگتی محسوس ہوئیں۔

”امن! مائینڈ یور لیٹنگو تچ۔“ وہ خنک سے بولی۔

”تم جیسی لڑکیاں اسی طرح ادا میں دکھا کر دوسروں کے دل میں امید پیدا کرتی ہو۔“ امن نے اس کی جانب انگلی اٹھائی تھی اور سلوی کو پورے کا پورا آسمان اپنے سر پر گرا کر محسوس ہوا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”امن۔“ اداس دیکھا کر دل میں امید بد کرنے کا الزام۔ وہ بھی کس کے دل میں۔؟ عمر جو اس کا بہنوئی تھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجیج شہر۔

اسے لگا جیسے منوں کے حساب سے غلاظت اٹھا کر کسی نے اس کے وجود پر مل دی ہو۔ اس کا پانا وجود ہی اس کے لیے لعن زدہ ہو گیا تھا۔ وہ رات بھر ایک ہی زاویے پر سپاٹ سی بیٹھی رہی تھی۔

ٹیرس پر کے بعد موبائل کی بپ بجی۔ اس نے اٹھا کر دیکھا۔ اس ایم ایس تھا۔

”سوری! میں شاید کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔“ اس نے موبائل اٹھا کر سامنے دیوار پر روے مارا اور اگلے ہی دن اس نے انکو بھی اتار کر پھوپھو کو دے دی تھی۔

اس کے بعد دونوں گھروں میں بھونچال سا آگیا تھا۔ ہر کوئی اسے منانے اور سمجھانے آیا تھا مگر اس کا انکار اقرار میں نہیں بدلا تھا۔ بابا تو باقاعدہ اس سے خفا تھے، والدین ماما کو اس نے سب بتا دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ تھیں مگر اس لیے اب ارسل کے رشتے کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔

امن اس روز کے بعد کئی بار آیا تھا مگر اس نے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ بات اگر اس نے کسی اور کے



ساتھ منسوب کی ہوتی تو وہ روتی غمنا ہوتی، لیکن پھر اس کے منانے پر مان جاتی مگر اس نے رشتوں کا تقدس پامال کیا تھا اور اسے اپنا دل اپنی عزت نفس اور پارسانی سے زیادہ عزیز نہیں تھا۔  
بل میں فیصلہ ہوا تھا اور اس نے ارسل کے لیے ہاں کر دی تھی۔

\*\*\*

وہ آج اس قدر خوش تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو برقی قمقموں کی جگہ اپنے ابار نمٹ کو ستاروں سے سجارتا چاند پر ”خوش آمدید“ لکھ کر اسے دروازے پر ٹانگ دیتا، لیکن اس کی دسترس میں تو محض پھول تھے اور اس نے ان ہی سے سارا اپار نمٹ بھر دیا تھا۔

\*\*\*

سلوی کے نکاح میں صرف ایک روز باقی تھا۔ زیادہ لوگ مدعو نہیں تھے۔ اس نے ساڈی پر اصرار کیا تھا اور بابائے اس کی بات مان لی تھی۔

ممانے اسے جوس پلا کر کچھ دیر آرام کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اٹھ کر صوفے پر نیم دراز ہو گئی تھی اور اب اس کے دماغ میں عجیب سی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ وہ آوازیں جنہیں وہ کل سے جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی مگر شاید وہ اس کی قوت مدافعت سے زیادہ زور آور تھیں۔

اندر کی آوازیں ناقابل برداشت ہوئیں تو وہ باہر لان میں چلی آئی۔ چند گہری سانسیں لے کر اس نے اندر کے غبار کو لان کی فضا میں تحلیل کرنا چاہا، مگر بے سود۔ اس نے لہلہاتے جھومتے پودوں پر نظر ڈالی۔ ڈالی ڈالی پر اس کا لمس شہت تھا۔ اور پتے پتے پر اس کی یادیں رقم تھیں۔ وہ گلاب کے پودے کے پاس چلی آئی۔ اس کے پتوں پر ہاتھ پھیرا تو اسے وہ وقت یاد آگیا، جب امن نے اس کی توجہ کھینچ لینے کے جرم میں اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ بعد میں سلوی نے اسے دوبارہ وہیں لگا دیا تھا۔ اس نے اسے بغور دیکھا۔ وہ اسے اپنی طرح مر جھایا ہوا محسوس ہوا۔ جڑیں ایک بار اپنی مٹی

چھوڑ جائیں تو پھر پہلے کی طرح کہاں پنپ سکتی ہیں بھلا! امن اس کی یادوں سے نکل کر اچانک اس کی سماعتوں میں بولا تھا۔  
”سوری پلیر! مجھے معاف کر دو۔ بس غصے میں میرا دماغ الٹ گیا تھا اور میں وہ سب بول گیا۔“

اس نے مڑ کر دیکھا۔ امن بکھرا بکھرا، لعل سا امن چہرے پر شرمندگی لیے اس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا۔ ملنے کے پڑے، بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اسے پہچاننا مشکل لگا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر سلوی کا دل دھک سے رہ گیا۔

چہرے پر شرمندگی تھی۔ ایک پل کے لیے اس کی دنیا ڈمگائی تھی، مگر اگلے ہی لمحے اس کا فیصلہ ایک چٹان کی صورت اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کل اس کا نکاح ہونے والا تھا۔ اب اسے اپنے والدین کی عزت، اپنی خودداری اور ارسل کی بے لوث محبت کا مان رکھنا تھا۔ وہ امن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے اعتماد سے گویا ہوئی۔

”اعتبار، محبت کا سب سے بڑا سنگسار ہے۔ اعتبار کے زبور سے محبت کی دامن آراستہ ہوتی ہے، مگر جہاں اعتبار نہ ہو، وہاں محبت دامن کے بجائے ”بیوہ“ کا روپ دھار لیتی ہے۔ تمہاری بخشی ہوئی زرد رتوں میں کسی نے خوشی کا پہلا پھول کھلایا ہے۔ میں اسے باؤس نہیں کر سکتی۔ جس نے میرا ماضی فراموش کر مجھے محبت کا اعتماد بخشا ہے۔“

میں اب ارسل سے منسوب ہو چکی ہوں۔ کل میرا نکاح ہے۔ اور ایم سوری! مجھے اس طرح لان میں تنہا کھڑے ہو کر تم سے بات نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ میں اب کسی کی امانت ہوں۔“

وہ یہ کہہ کر وہاں رکی نہیں۔ اس نے اس پر نگاہ ڈالے بغیر اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔  
امن اپنی ”بیوہ محبت“ کے ساتھ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گیا۔

\*\*\*



## حسرتِ دل

”عابدہ!“ چھوٹی بھابھی نے اندر جھانکا۔

”جی بھابھی!“ عابدہ نے جلدی سے ہاتھ دھو کر بھابھی کے حضور حاضری دی۔ چھوٹی بھابھی بڑی بھابھی کے مقابلے میں تنگ مزاج تھیں۔ ایک منٹ میں ہی ان کا بارہ بانی ہو جاتا تھا۔ اس لیے عابدہ نے اسی میں خیریت سمجھی کہ ہر کام کو ادھور اچھوڑ کر پہلے بھابھی کی فرمائش سن لی جائے۔

”بچن میں اتنا اندھیرا کر رکھا ہے کہ نظری نہیں آ رہا کہ کہاں پر کھڑی ہو۔“

”سامنے سامنے ہی تو تھی اور اندھیرا اس لیے ہے کہ بڑے بھیا کا حکم ہے بجلی کا بل بہت آ رہا ہے۔ لائٹ مغرب کے بعد ہی کھلے گی۔“ عابدہ نے جلدی سے صفائی دی۔ جسے چھوٹی بھابھی نے توجہ سے سنا بھی

نہیں۔

”ہاں ہاں پتا ہے۔“ انہوں نے بیزاری سے کہا۔ ”یہاں تو بھئی انوکھا اصول ہے کہ جو گھر میں زیادہ پیسے دے رہا ہو۔ اسی کی بات سنی جائے گی۔“

”یہ تو گھر ہے۔“ عابدہ نے چپکے سے سوچا۔ یہاں تو ملک بھی اسی اصول پر چل رہا ہے امریکا، پاکستان یوں جیسے دونوں جڑواں بھائی ہوں۔“

اپنے خیالات پر عابدہ کو خود ہی ہنسی آ گئی۔ ”پنس کس لیے رہی ہو۔“ چھوٹی بھابھی کے تلووں سے لگی سر پر بھی۔

”کسی پر نہیں بھابھی! کسی پر نہیں۔“ عابدہ کے چہرے پر پسینے کے قطرے چھلنے لگے۔

”نہیں! آتم مجھ پر پنس رہی تھیں، ہماری غربت پر

مکمل ٹاؤن





ہنس رہی تھیں۔“  
 ”غرت۔“ عابدہ کے حلق میں آنسو اور قبضے ایک ساتھ جمع ہو گئے۔ چھوٹی بھابی نے جو سوٹ پہنا ہوا تھا، وہ کچھ نہیں تو دو ہزار کاٹو تھا ہی اور وہ پھر بھی سستا تھا کیونکہ بڑی بھابی ڈیرافنڈو کی تیار کردہ لان پہنتی تھیں۔ جو چارپانچ ہزار سے شروع ہوا کرتی تھی۔ اس لیے چھوٹی بھابی اکثر ہی درودالم میں ڈوبی ہوئی ملتی تھیں۔

”میں معظم کو بتاؤں گی، تم نے جو کچھ ابھی میرے ساتھ کیا ہے۔“  
 ”میں نے کیا کیا ہے۔“ عابدہ رو دینے کے قریب ہو گئی۔ وہ جانتی تھی۔ معظم زبان کا کتنا تیز ہے عابدہ کا تو شاید پھر لحاظ کرنا مگر فائز کی شامت آجانی۔ سارا غصہ اسی اٹا رہا تھا۔  
 عابدہ کی آنکھیں بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

”بس میرے اللہ اور نہیں اب اس دل میں طاقت نہیں ہے۔“  
 ایک کا دل تھا اور دوسرے کی زبان۔ زبان کے پیانے میں کوئی کمی نہیں تھی اور دل وہ پیانا کہ بھرنا ہی رہا۔

\*\*\*

”اور خود۔ خود جو ابھی کسی لڑکی سے ملنے چلا گیا۔ وہ کس حساب میں۔“  
 گھر آگیا تھا۔ فائز نے اتر کر گاڑی لاک کی اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے شینا سے کوئی بات ہی نہیں کی اور وہ جو سوچ رہی تھی کہ ابھی فائز کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی کہے گا وہ صرف پیچ و تاب کھا کر گئی۔ وہ فطرتاً آزاد خیال لڑکی تھی اور خوب صورت بھی۔ اس کے دوستوں میں لڑکے بھی شامل تھے اور صرف اسی بات پر فائز پیچ و تاب کھا کر جاتا تھا۔ بہت شروع میں اس نے ایک دو دفعہ شینا کو اس

طرح کی حرکتیں کرنے سے منع کیا تھا۔ بس اس دن سے شینا نے اس سے ضد باندھ لی تھی۔ وہ باتیں سنانے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتی تھی اسے مزا آتا تھا۔ جب اس کی بہت ساری غلط باتوں کے جواب میں بھی فائز خاموش رہتا تھا۔

ان دنوں وہ بہت خاموش رہتا تھا اور شینا کے خیال میں ایسا اس لیے تھا کہ اس بے چارے کو اب ان کے گھر رہنا ضرور تھا اور بقول پھوپھو کے ان کے بیٹے کا مزاج برا تھا۔ لہذا ہر چیز اس کی مرضی کے مطابق ہوتی یہ اور بات کہ شینا کو کبھی یقین نہیں آیا۔ ”جھلایہ انتا چپ چاپ رہنے والا لڑکا کیا اس کی بھی کوئی مرضی ہو سکتی ہے؟“

رات کو اس نے یہ قصہ سب کو سنایا تھا۔ ”پھوپھو بھی تاباں چلتا پھرتا لطیف ہیں۔“  
 ”بڑی بات ہے۔ اس طرح نہیں کہتے۔“ سامع نے ڈانٹا۔

مگر اس طرح کی باتیں گپ شب میں کون سنتا ہے اس وقت تو زندگی صرف جنگاے پیچھے ہنسی کا دوسرا نام لگتی ہے پتائی نہیں لگتا۔ کہ یہی زندگی، اسی گھر میں رہنے والے کسی فرد کے لیے بہت تلخ بھی ہے عابدہ بی بی فائز کو دیکھ دیکھ کر ہولتیں۔  
 ”فائز بیٹا! ہنس بول لیا کر ایسے جیسے پہلے سب کچھ کرتا تھا۔“

”کس طرح امی؟“ وہ ہونٹوں پر پھینکی مسکراہٹ لیے کہتا۔ ”ہم کچھ بھی کر لیں امی! اب پہلے کی طرح کچھ بھی نہیں ہو سکتا اس لیے اب بات تو چھوڑ دیں

”پاگل ہے جو غم تیرا ہے۔ وہ غم میرا بھی ہے۔ پھر بھی جینا تو پڑتا ہے۔“  
 ”یہ بات نہیں ہے امی! میں مرد ہوں منہ چھپا کر نہیں سر اٹھا کر جینا چاہتا ہوں اور وہ وقت بھی آئے گا۔ ابھی نہیں کچھ سال بعد۔“

”ان شاء اللہ۔“ عابدہ بی بی نے دل کی گہرائیوں سے

کہا۔ ”مگر ابھی سے ابھی سے کیوں نہیں۔“  
 ”اس لیے کہ ابھی ہاتھ بھی خالی ہے اور دل بھی۔“  
 لڑائی بات کہہ کر وہاں رکا نہیں تھا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

\*\*\*

”دیکھو عابدہ! میں یہ کہہ رہی تھی کہ رات کے کھانے پر میری کپا آ رہی ہیں دو تین ڈشز زیادہ ہالیتا۔“  
 ”دو تین چھوٹی بھابی! اگر ہی بہت ہو رہی ہے۔ آپ کو بتا بھی ہے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“  
 ابھی تین دن پہلے ہی عابدہ کا بخار اترتا تھا۔ لیکن چکر اور کمزوری ابھی بھی باقی تھی۔

عابدہ کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ بیٹے سے کوئی کام کہے، پہلے ہی فائز گھر کے چکروں میں ہلکان ہو جاتا تھا لیکن سر کا درد اتنا بڑھ گیا تھا کہ اسے فائز سے کہنا پڑا کہ وہ تھوڑی دیر اس کا سر دیا کرے۔

اور وہ بھی انتا سعادت مند تھا کہ اس نے اپنی ڈوبتی حالت میں ہی کہ جب مال رات کو تھک کر کمرے میں آئی تو آدھا گھنٹہ تو ضرور ہی سر دیا دیتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے اختیار میں اور تھا بھی کیا۔

کہانی بڑی عجیب اور پرانی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لیکن بے رحم وقت نے اسے سکھایا تھا کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

\*\*\*

ہال کی زندگی تک وہ بہت کھلندرا سا تھا۔ پھر یہ کہ آٹا بھی۔ وہ دونوں ہی کالا ڈالتا تھا۔ بابا کی تنخواہ کو کہہ لیا وہ نہیں تھی۔ مگر پھر بھی وہ اس کی ساری فرمائشیں پوری کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسے مدراس اسکول میں پڑھایا اور وہی پڑھائی آج اس کے سر پر آ رہی تھی۔

ان کے انتقال کے بعد امی اسے لے کر ماموں کے پاس آئیں۔ اور زندگی اتنی نامہراں بھی ہو سکتی

ہے۔ یہ اسے ہمیں آکر پتا چلا تھا۔  
 اور یہ بھی پتا چلا تھا کہ ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ گھر کا وہ بچہ جو سب سے مظلوم ہوتا ہے۔ جس کے پاؤں کے نیچے سخت زمین ہوتی ہے اور نامہراں آسمان۔ وہی بچہ سب سے زیادہ کس طرح پڑھ جاتا ہے۔  
 کیونکہ اس کے پاس پڑھنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا۔

اس کے ساتھ کے سارے کزنز میٹ میں گھے رہتے۔ لڑکیوں سے چینگ ہو رہی ہے۔ نت نئے پروگرام بن رہے ہیں اس سے فارغ ہوتے تو ماموں کی گاڑی لے کر نکل جاتے اس کے بعد اتنا ٹائم ہی کہاں بیچ پاتا تھا کہ صحیح طریقے سے پڑھائی ہو پاتی۔

اور یہ سارے کام تو خود فائز بھی کرتا تھا۔ جیسے ہی بابا نے بایک کھڑی کی وہ لے کر نکل جاتا تھا اور بابا جیتنے ہی رہ جاتے کہ فائز جیو نہیں چلانا۔

اور اب کچھ نہیں تھا۔ لے دے کر صرف کتابیں تھیں۔ جو اسے سارا دیتی تھیں۔ اس کی دوست بن گئی تھیں۔ اب امی کو اس کے پیچھے لگنا نہیں پڑتا تھا کہ فائز کچھ پڑھ لو۔

کیونکہ اب اس نے صرف پڑھنا ہی تھا۔ لیکن پڑھائی کے لیے بھی وقت کہاں ملتا تھا۔ سب اسے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے آواز دیتے تھے اور اس میں صرف وہی لمحے اسے سکون کے ملتے تھے۔ جب وہ ڈرائیوری کے فرائض انجام دے رہا ہو۔ پہلے پل تو وہ ہنسنایا ہوا رہتا۔

لڑکیاں شاپنگ کے لیے جاتیں۔ تو ایسا لگتا کہ واپس آتا ہی بھول گئی ہیں۔ دوستوں کے پاس گئی ہوں تو وہیں کی ہو جاتی تھیں اور فائز کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کرے تو کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی راہ بھائی دیتا ہے۔ ایک دن دماغ میں نہ جانے کیا آیا کہ کتابیں اس نے گاڑی میں رکھ لیں۔

اور یہ بہت اچھا رہا۔ وہ گھنٹہ جو گزرنے میں نہیں آتے تھے وہ یوں گزرتے کہ پتائی نہیں چلتی اس نے سکون سے ایک جگہ بیٹھ کر پڑھائی کر لیتا۔



ایک دن وہ اسی طرح پڑھ رہا تھا۔ جب اچانک کسی لڑکی نے کھڑکی کو انگلی سے بجایا۔

فائز ایک دم ڈر گیا۔ شبنم اپنی دوست کے پاس آئی ہوئی تھی۔ پورے گھر میں وہی سب سے زیادہ فساد تھی۔ اگر بات کرتے دیکھ لیتی تو قیامت لے آتی۔

فائز نے دو ایک دفعہ اسے کسی بات پر ٹوکا تھا اس نے تب سے دشمنی باندھ لی تھی۔ اسے باتیں سنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی اس نے لڑکی پر نظر ڈالنے سے پہلے دروازے پر نگاہ کی۔

”پلیز!“ لڑکی نے ملتی لہجے میں کہا۔ ”میری امی کی طبیعت خراب ہے ان کو ہسپتال لے کر جانا ہے اور ابھی کچھ بھی نہیں مل رہا ہے۔“

فائز نے ایک نظر لڑکی کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں رخساروں پر آنسوؤں کے نشان ابھی تک چمک رہے تھے۔ اس کا دل چاہا وہ فوراً سے پیشتر لڑکی کی مدد کرے لیکن ایسا کرنا اپنی شامت کو آواز دے کر بلانا تھا۔ فائز کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ کر لڑکی کو منع کرے۔

کہ وہ مرد ہو کر ایک لڑکی کی زبان سے خوف زدہ ہے یا یہ کہ گاڑی اس کی نہیں ہے وہ ڈرائیور ہے۔

اس نے منہ کھول کر یہ سب کچھ کہنا چاہا تو آواز نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

کیونکہ آج تک ایسا ہوا نہیں تھا کہ کسی نے بھی اسے کام کا کہا ہو، اور اس نے انکار کر دیا ہو اور انکار تو اس نے ابھی بھی نہیں کیا تھا۔

”اللہ مالک ہے۔“ فائز نے دل میں سوچا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔

”آپ کا گھر کہاں ہے میں آپ کی والدہ کو لے کر آ جاتا ہوں۔“ اور وہ لڑکی جو اس کے چپ رہنے پر ماموس ہو کر پلٹ رہی تھی۔ ایک دم اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”بہت بہت شکریہ۔“ وہ اسے لیے ہوئے پچھلی گلی میں واقع اپنے چھوٹے سے گھر میں لے آئی۔

اسے ہسپتال پہنچے ہوئے آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ شبنم کا فون آ گیا۔

”کہاں ہو تم؟“ وہ غرائی۔

”کچھ دیر میں آگرتاؤں گا۔“ اس نے سیل کو آف ہی کر دیا۔

ہسپتال کے سارے کام کرواتے ہوئے بھی اس کے دماغ میں شبنم کی آواز ہی گونجتی رہی۔ غرور اور تحکم میں ڈوبی ہوئی آواز۔

”لڑکیوں کی آواز اس طرح کیسے ہو سکتی ہے۔“ وہ اکثر حیران ہو کر سوچتا تھا۔ یہ اور بات کہ اتنے کام سر پر ہوتے تھے کہ اسے زیادہ حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔

سارے کام کروانے میں دو گھنٹے تو لگ ہی گئے۔ زویا اور اس کی امی کو گھر چھوڑ کر واپس شبنم کے پاس آیا۔ تو وہ بلی کی طرح اس پر بھٹ پڑی۔

”کہاں چلے گئے تھے؟ میں یہاں پرپاگل ہو رہی تھی تمہیں کچھ احساس ہے کہ نہیں؟“

”کیوں؟ میں نے بتا تو دیا تھا کہ تھوڑی دیر لگ جائے گی۔“ فائز نے تحمل سے کہا۔

”تم کوئی نواب کے بچے ہو کہ کسی سے بھی ملنے پہنچ جاؤ گے اور پھر وہاں سے فون کھڑکاؤ گے۔“

وہ خاموش رہا جواب بھی کیا تھا اس کے پاس۔

”اب خاموش کیوں کھڑے ہو؟“

”آپ کے بیٹھے کا انتظار کر رہا ہوں۔“ فائز کے سر پر مزاحیہ سے کئے پر وہ تپتو تاب کھاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

وہ بہت دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ فائز بہت سرب چڑھ گیا ہے۔ ہر بات کو سر جھکا کر سننے والا اب سر اٹھا کر بات کرنے لگا تھا۔ لیکن وہ اس سے زیادہ الجھ نہیں سکتی تھی، کیونکہ بڑے ماموں نے سختی رکھی ہوئی تھی۔ لڑکیوں کو کہیں بھی اکیلے آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

انہیں جہاں بھی جانا ہوتا تھا وہ فائز کے ہمراہ ہی جاتی تھیں۔ فائز سے پہلے یہ کام خان بابا انجام دیتے

تھے جو اب کافی بوڑھے ہو گئے تھے۔ اب یہ ذمہ داری فائز کی تھی۔ اگر وہ اس سے الجھ بیٹھتی تو پھر اسے گھر میں بند ہونا پڑتا جو اسے کسی طور بھی منظور نہ تھا سو فون کے گھونٹ پیتے ہوئے چپ ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

عابدہ نے جلدی جلدی چاولوں کو دم دیا۔ آج ان کی کمر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ کچن میں آنے کی بالکل بھی ہمت نہیں تھی۔ انہوں نے دو گولیاں لیں۔ تب جا کر تھوڑی جان جان آئی۔

ایک تو دو نوں بھابیوں کو اپنے میکے والوں کی دعوت کرنے کا بہت شوق تھا ابھی ایک بلاتی تو کل دوسری کیوں پیچھے رہتی۔

اب عابدہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا تھا کہ انسان کو بالکل بے زبان لگانے بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا اس گھر سے رشتہ تھا۔ لیکن انہوں نے تو خود ہی اپنے آپ کو ملازمہ کے عہدے پر فائز کر لیا تھا۔

بہت دفعہ ان کا دل چاہتا کہ وہ کھانا خراب بنا دے یا لٹک تیز کر دیں۔ لیکن پھر اللہ سے فوراً ”معافی مانگ لیتیں۔“ انہوں نے تو فائز کو بھی یہی سبق دیا تھا کہ بیٹا! کسی بے ایمانی نہیں کرنا۔

پھر وہ خود کس طرح بے ایمانی کر سکتی تھیں۔ بہت ساری باتوں کا تو گھر کے مردوں کو علم نہیں ہوتا۔ بھابھی اپنی نہیں تھی، تو بھائی تو اپنا تھا۔ کم از کم اس سے ہی کبھی بات کر کے دیکھا ہوگا۔

ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اب ان کے اندر اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اکیلے ان سارے کاموں کو دیکھ پاتیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی مدد کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی جائے۔ وہ اس کے لیے بھابیوں سے بات کرنا چاہتی تھیں، مگر وہ جب بھی اس موضوع پر آتا تھا اتنی بڑی بھابھی فوراً ”بڑھتی ہوئی مہنگائی اور اخراجات کے پورے نہ ہونے کا شکوہ لے بیٹھتیں“ لال جیسے کوئی رٹا ہوا مضمون۔ شروع شروع میں تو وہ

واقعی پریشان ہو جاتی تھیں کہ بڑے بھائی کو بزنس میں مسلسل نقصان ہو رہا ہے پھر بینک کے لون ادا کرنے میں۔ گھر کے اخراجات۔ اس کے بعد اتنی گنجائش ہی کہاں پتی تھی کہ ان کے ساتھ کسی کو مدد گار کے طور پر رکھا جائے۔

اس لیے وہ ہر دفعہ خاموش ہو جاتیں۔ پھر بہت عرصے کے بعد عابدہ بیگم کو پتا چلا کہ سب کے سب کام پورے ہو رہے ہوتے تھے صرف ان ہی کے کسی کام میں سب کو اپنے خرچے یاد آجاتے تھے۔

اور جس دن انہیں یہ بات سمجھ میں آئی ان کے دل کو اتنی تکلیف پہنچی کہ انہوں نے پھر بھی پلٹ کر کہا ہی نہیں اور وہاں پرواہ بھی کس کو تھی کہ عابدہ بیگم اب پہلے سے بھی زیادہ کیوں خاموش رہنے لگی ہیں۔



اس وقت بھی بریانی کی اتنی بھاری پتیلی کو اٹھاتے ہوئے ان کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ ”واکٹر کو دکھانا ہی بڑے گا“ انہوں نے دل میں سوچا اور بڑی بھابی سے غم بھی دیا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ انہوں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا ”کسی دن تکلیف گے تو تمہارا چیک اپ کروا دیں گے۔“

اس بات کے بعد وہ کوئی سودفہ تو یا رہ گئی ہوں گی۔ مگر انہیں کبھی یاد ہی نہیں رہا کہ عابدہ نے ان سے اپنی کسی تکلیف کا ذکر کیا تھا۔ پتا نہیں دوسروں کے معاملے میں ہم اتنے بے رحم کیوں ہو جاتے ہیں۔

\*\*\*

”زویا! کتنی دیر سے فرش دھوئے جا رہی ہے۔“ ای نے اندر سے پکارا تو زویا نے پاپ رکھ دیا۔ ”بس دنیا کے جتنے فالٹو کام ہوں۔ وہ کوئی تجھ سے کرا لے۔ اتنی سڑی میں ضرورت کیا ہے۔“

کبھی کبھی بہت سارے فالٹو کاموں کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ صرف اس لیے کہ کچھ وقت گزر جائے۔ کبھی کبھی ہمیں کتنی ضرورت پڑ جاتی ہے کہ وقت ہم پر زیادہ نہیں ٹھوڑا سا مہربان ہو جائے یہ اور بات کہ وقت کی یہ مہربانی راس نہ آئے۔ زویا نے افسردگی سے سوچا۔ صرف ایک ہفتہ پہلے جب ای کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ کس طرح وہ لڑکا رحمت کا فرشتہ بن گیا تھا۔ لیکن ایک بات اتنی خراب صورت حال میں بھی اس کے ذہن میں چبھتی تھی۔

اس نے بہت سارے آتے جاتے لوگوں میں سے صرف اس سے مدد مانگی تھی۔ چہرے دل کا آئینہ ہوتے ہیں اور اس کی آنکھیں اس کا چہرہ برا شفاف تھا مگر اس نے مدد بھی کی اور بہت اچھے طریقے سے سب چیزوں کو مہینج بھی کیا۔ یہ اور بات کہ اس کی آنکھوں سے جھلکتی پریشانی زویا کی آنکھوں سے چھپی نہیں رہ سکی۔ اسے حیرت بھی ہوئی تھی۔

لوگوں کی تو اپنی ہی ایک دنیا ہوتی ہے۔ جہاں، ہنسی، مذاق، ہنسی پلا گلا ہی ہوتا ہے۔

زویا فطرتاً ہی ہمدرد لڑکی تھی۔ لیکن اسے پتا تھا کہ یہ کوئی موقع نہیں ہے کہ وہ اس سے پریشانی کی وجہ پوچھے یا اس سے ہمدردی کرے۔ وہ راہ میں ملنے والے کچھ دیر کے اجنبی شناسا تھے اور انہیں پھر اجنبی راستوں پر ملت جانا تھا پھر ایسے میں کس سے ہمدردی کی جائے۔ کس کی دل جوئی کی جائے۔ اور زویا کو لگتا تھا کہ اب تو سب سے زیادہ اسے ہی دل جوئی کی ضرورت رہ گئی ہے۔ کوئی اسے ہی تسلی دے دے۔ کوئی اسے آ کر ٹھوڑا سا سمجھا دے کہ کسی کے پیچھے یوں اپنے آپ کو برباد نہیں کرتے۔ خوار نہیں کرتے، جانے کس راہ کا مسافر تھا اور کہاں چلا گیا۔ اب کیا زندگی حرام کی جائے۔ لیکن پھر زویا کو پتا چل گیا کہ زندگی حرام کی نہیں جاتی وہ تو پہلے ہی ہو چکی ہوئی ہے۔ پتا نہیں دنیا میں اتنے اچھے لوگ کیوں ہوتے ہیں۔ اور اگر ہوتے ہی ہیں تو پھر انہیں دوبارہ ملنا بھی چاہیے۔ وہ کھو کیوں جاتے ہیں۔

ایسی اور ایسی قسم کی اوٹ پٹانگ سوچیں اس کے ذہن میں آتی رہتیں۔ جن پر بعض اوقات اسے خود ہی ہنسی آ جاتی۔

اس کو اگر یہ پتا چل جائے کہ اس کے متعلق کیا سوچا جا رہا ہے تو آئندہ مگر کبھی کسی کی مدد نہیں کرے گا۔ زویا خود ہی مسکرا دی اور مسکرانے پر اسے یاد آیا۔ کہ اس کے ہونٹوں کو مسکراہٹ نے کتنے دنوں بعد چھوا ہے۔ ای دو تین دفعہ اسے ٹوک چکی تھیں۔ ”بیٹا! اب میں ٹھیک ہوں۔ ہنسنا بولا کرو“ تم تو بالکل ہی گم صم ہو گئی ہو۔“ اور زویا شرمندہ ہو جاتی۔

ماتیں کتنی معصوم ہوتی ہیں۔ ای سمجھ رہی ہیں کہ وہ ان کی وجہ سے پریشان ہے۔

”اس دن پریشانی بھی تو بہت ہو گئی تھی۔“ ای بات کا سرا جڑ نہیں۔ ”مگر میں ایک مرد کا ہونا کتنا ضروری ہے۔“

”ای! علی کو گئے ہوئے تو ایک سال ہو گیا ہے۔“

سب دنیا کے کام چل ہی جاتے ہیں۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ وہ یہ بتا کر خود کو کمزور نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس دن وہاں کتنا یاد آیا تھا۔

”اللہ تعالیٰ! اس لڑکے کو بہت کامیابی دے۔ جو اس دن فرشتہ بن کر آیا تھا۔“ جب سے وہاں باہر گیا تھا۔ ای ہر لڑکے کو یوں ہی دعا دیا کرتی تھیں۔ انہیں ہر لڑکے میں وہاں کا عکس نظر آتا اور وہ چڑھایا کرتی۔ ”ای! اتنی دعائیں نہ دیا کریں۔ لوگ انما مطلب نکال لیتے ہیں۔“ ای ہنس کر اس کی بات ٹال جاتی تھی۔ ”بیٹا! دعاؤں سے غلط مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے۔“

لیکن آج اسے بڑا اچھا لگا۔ خود اس کے دل نے بھی چپکے چپکے کتنی دعائیں کی تھیں۔ اس کی کامیابی کی نہیں اس سے ملنے کی۔

\*\*\*

شینہا آج پھر تیار کھڑی تھی۔ فائز کو اس کی ڈیرنگ دیکھ کر اچھن ہونے لگی۔ ”پتا نہیں دوستوں کے گھر اس قدر تیار ہو کر جانے کی کیا ضرورت ہے۔“ اس نے گڑھ کر دل میں سوچا۔

ایک ہفتے کے بعد اس کے سمسٹر بھی شروع ہو رہے تھے اور گاڑی میں کم از کم دو گھنٹے تو اسے مل ہی جاتے۔ اس نے اپنا بیگ گاڑی میں رکھا اور وہ بٹوہ لینے اندر چلا گیا۔

واپس آیا۔ تو شینہا اس کا بیگ کھولے بیٹھی تھی۔

”یہ کس کا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”میرا۔“ فائز نے مختصر جواب دیا۔

”اچھا!“ شینہا نے بڑی مشکل سے اپنے قمقمے کا گلا کھولنا۔ ”میرا خیال ہے۔ اسے پڑھا بھی جاتا ہے اور میں نے تو تمہیں کبھی پڑھتے نہیں دیکھا۔ تم نے کس کے کمنے میں آکر۔“ شینہا کے لہجے میں دیادبا مسخر تھا۔

فائز کا دل تھا کہ اس سے کہہ دے۔

”آپ اپنی توانائی وہاں خرچ کریں، جہاں اس کی ضرورت ہو۔“ مگر اس نے خود کو روک لیا۔

شینہا نے ایک لمحے اس کے جواب کا انتظار کیا۔ پھر اسے غصہ آنے لگا۔ آج کل تو یوں بھی غصہ کرنے کے لیے اسے کسی وجہ کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے یہ سلسلہ چلتے ہوئے۔

ڈیڑھ سال۔۔۔ اور بات آج بھی وہیں تھی۔ آج بھی شینہا کو لگتا تھا کہ آذر اسے کبھی نہیں مل پائے گا۔ وہ اتنا شان دار لگتا تھا کہ کبھی کبھی تو شینہا کو یقین نہیں آتا کہ اسے آذر کی چاہت اور مہربانی نصیب ہے۔ اس نے کتنی دفعہ اپنے نصیب سے پوچھا کہ ایسا کیونکر ہو گیا۔ وہ تو آذر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ اسے خوب صورت نظر آنے کے لیے پورے

ایک گھنٹے کی محنت درکار ہوتی تھی۔ پھر بھی اسے لگتا، ابھی بھی بہت کمی رہ گئی ہے اور آذر وہ خندہ سے بھی اٹھ کر آ جاتا تھا، تو شینہا کو یوں لگتا کہ ارد گرد کی ساری چیزیں اس کی خوب صورتی کے آگے ماند ہو گئی ہیں۔

آذر اس کی دوست عیبو کا لڑکا تھا۔ وہ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی لاہور سے اپنے کام کے سلسلے میں کراچی آیا تھا۔ آذر سے اس کی ملاقات عیبو کے گھر پر ہوئی تھی۔

وہ اس یونانی محسنے کو دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ خیر ایک اسی پر ہی کیا مختصر وہاں پر آئے ہوئے بہت سے لوگوں نے اسے ایک دفعہ ٹولٹ کر ضرور دیکھا تھا۔

پہلے بھی وہ کم بے باک نہ تھی اور آذر سے ملنے کے بعد تو اس کی سوچوں میں کچھ زیادہ ہی بغاوت کا عنصر آ گیا تھا۔ وہ پہلے بھی گھر کی پابندیوں کو کون سا خاطر میں لاتی تھی اور اس معاملے میں اس کو ماں کی مکمل حمایت بھی حاصل تھی۔ سارے خاندان کا خیال تھا کہ اس کو بگاڑنے میں بہت حد تک ہاتھ اس کی ماں کا تھا۔ جبکہ شینہا اور اس کی ماں کا یہ خیال تھا کہ یہ سارے چھوٹے ذہن کے لوگ ہیں جو پرانے زمانے کی طرح چاہتے ہیں کہ عورتیں بس کیوتروں کی طرح ایک کابک میں بند رہ کر زندگی گزار دیں۔

شینہا کا بس چٹا تو ایسے تمام لوگوں کو اپنے گھر سے باہر نکال دیتی جنہیں ابو نے جمع کیا ہوا تھا اور ان میں



سب سے پہلا نمبر پھو پھو اور فائز کا ہوتا۔ پچھو جو ہر بات میں نصیحت کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں اور دوسرا فائز جو کتنا کچھ نہیں تھا مگر اس کی آنکھوں سے جھلکتی بیزاری اور ناپسندیدگی شہنا کی نظروں سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

فائز کو وہ دو کوڑی کی بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ ابونے اس کے سر پر مسلط کر دیا تھا۔ کہیں آنا جانا ہو، اسے فائز کی خدمات ہی لینا پڑتی تھی اور آذر کی وجہ سے وہ پروا داشت کرنے پر مجبور تھی۔ اس سے ملاقات کی اور کوئی صورت نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ عیبوں کے گھر چلی جائے وہاں کبھی تو آذر موجود ہوتا اور کبھی وہ پچھلے گیٹ سے اس کے لپار منٹ تک چلی جاتی۔ جہاں فون کر کے اسے نیچے بلا لیتی۔ اور پھر دروازہ کھلی شاپ پر چلے جاتے۔

شروع شروع میں شہنا کو ڈر لگتا تھا۔ کوئی دیکھ نہ لے۔ کچھ ہونے جانے ایک غلط ہونے کا احساس ہوتا تھا۔

لیکن برائی میں بڑی کشش ہے۔ بہت لچک ہے جو اندر جلتے ہوئے بہت سے شعلوں کو بجھا دیتی ہے۔ آپ بڑے کام کو تو اتارے ادا کرتے ہیں۔ تو وہ ایک تنہا سا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جو کبھی کبھی اندر ہی اندر بے چین کر دیتا ہے۔

آذر لڑکیوں سے دور تھا۔ گتا تھا وہ شہنا سے کتنا۔ ”مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔ لڑکیوں سے آخر انسان کیا باتیں کرے۔ عموماً“ خوب صورت لڑکیوں کے پاس دماغ نہیں ہوتا۔ ”تو شہنا کو خود اپنے اوپر رشک آنے لگا۔ آذر نے کہا تھا۔

”بہت عرصے کے بعد میں نے ایسی لڑکی دیکھی ہے جس کے پاس صورت کے علاوہ دماغ بھی ہے جو بات کو سمجھ سکتی ہے جس سے باتیں کر کے مزا آتا ہے۔“

پھر شہنا کیوں مغرور نہیں ہوتی۔ پہلے اگر وہ دن میں دس مرتبہ آئینہ دیکھتی تھی۔ تو اب بیس مرتبہ یہ کام کرتی تھی۔ اور جن کتابوں پر گرد کی میس جم چکی تھیں۔ چپا سے وہ کتابیں لے کر صاف کر کے ان کو بھی

بڑھ لیا تھا۔ ایسے قابل بندے سے بات کرنے کے لیے کچھ تو ہونا چاہیے، مگر کتابیں پڑھنی کون سی آسان تھیں۔

دس دن میں ایک کتاب جا کر ختم ہوتی۔ پھر دوسری شروع کرتی۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ جب تک وہ پہلی پھول جاتی۔ دماغ میں اتنے خیالات اور چالاکیاں گھسی ہوتی تھیں کہ کتابیں اور ان کا پڑھا ہوا یاد ہی نہیں رہتا۔ اب انسان محبت کرے یا کتابیں پڑھے۔ آخر شہنا نے تنگ آ کر کتابیں چھوڑ دی تھیں۔ لیکن جو کچھ بھی پڑھا تھا۔ ان سب چیزوں نے کم از کم اتنی عقل ضرور دے دی تھی، کہ اس نے کبھی آذر کے تنہا فلیٹ پر قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ باہر ہی مل لیا کرتی تھی نہ صرف یہ کہ مل لیتی تھی۔ بلکہ شادی پر بھی زور دینے لگی تھی۔

اسے خوف تھا۔ ایک نہ ایک دن کوئی اسے دیکھ لے گا۔ اس سے پہلے ہی وہ چاہتی تھی کہ آذر سے اس کا کوئی ایسا رشتہ قائم ہو جائے۔ جس سے اس کے دل کو تسلی ہو جائے کہ ایسا شاندار بندہ اس کا ہے وہ شدت سے اس دن کی منتظر تھی۔ جب لوگوں کی آنکھیں اس کی طرف اٹھیں گی۔ اور ان آنکھوں میں ستائش کے رنگ ہوں گے اور کچھ آنکھیں جن میں حسد کے رنگ۔

شہنا بیٹھے بیٹھے ہی تصور میں کھو جاتی۔ اس وقت بھی وہ بیٹھے بیٹھے آذر کے پاس پہنچ گئی تھی۔ مگر آنکھ کھلی تو سامنے فائز موجود تھا اور ایسا پہلی دفعہ نہیں تھا۔ عموماً ”یہی ہوتا تھا اور ہمیشہ اس کا حلق اندر تک سے کڑوا ہوا جاتا تھا۔ حالانکہ عیبوں کتنی تھیں۔

”شہنا تمہارا دماغ خراب ہے۔ تمہارا یہ کزن فائز بہت اچھا ہے۔ تمہیں نہ جانے کیوں اس سے اتنی چڑ ہے۔“ اور اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”جلدی آجائے گا۔ مجھے کچھ کام ہے۔“ وہ گاڑی سے اترنے لگی تو فائز نے کہا۔

”میں تمہارے کاموں کی ذمہ دار نہیں ہوں۔“

شہنا کھٹ کھٹ کرتی آگے بڑھ گئی۔ ”عبیہ تو سمجھ دار لڑکی ہے۔ پتا نہیں دو ڈھائی گھنٹے کیسے اس کی باتوں کو برداشت کر لیتی ہے۔“

اس نے بیگ سے پیپر نکالتے ہوئے سوچا۔ پھر سیٹ سیٹ سے خود کو آزاد کرایا۔ سیٹ کو پیچھے کی طرف کیا۔ اور پڑھنے کی تیاری شروع کر ہی رہا تھا کہ ایک دم کھڑکی میں کوئی سایہ آکر ٹھہر گیا۔ خاموشی سے۔

فائز نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ وہ اسی دن والی لڑکی تھی صرف اس فرق کے ساتھ کہ آج اس کے چہرے پر آنسوؤں کے نشان نہیں تھے۔ آج اس کی آنکھوں میں شکر گزاری کے جذبات تھے فائز کو تھوڑی سی حیرت ہوئی وہ گھر میں بہت سارے لوگوں کے کام آتا تھا۔ کہنے پر اور بغیر کے بھی بہت سارے کام کر دیا کرتا تھا۔ مگر نہ کوئی زبان سے کچھ کہتا تھا۔ اور نہ ہی کسی کے چہرے پر شکریہ کے جذبات نظر آتے تھے یہ تو بالکل ایک انوکھی سی بات تھی۔

پھر اس دن فائز کے لیے بہت ساری انوکھی باتیں ایک ساتھ ہوئیں زندگی کے بہت سارے وہ پہلو جن سے وہ اب تک نا آشنا تھا اس نے اس دن ان سب کا ذائقہ چکھا۔

محبت کا احسان مندی کا شکر گزاری کا۔ وہ دن اس کی زندگی میں آنے والے بہت سارے دنوں سے مختلف تھا اور بہت اچھا تھا۔

ایسا ہی گھر اس نے ہمیشہ سوچا تھا۔ جہاں محبت ہو، خوش گمانیاں ہوں۔ جہاں کی دیواروں سے خود غرضی کے سائے نہ لیٹے ہوں۔ وہ تو وقت کی کمی کی وجہ سے کبھی دوست بھی نہیں بنایا تھا۔

زویا کی امی اس سے بہت محبت سے پیش آتی تھیں۔ اس سے بار بار کہا کہ کبھی اپنی امی کو لے کر آنا اور وہ پہلی جگہ تھی۔ جہاں وہ بہت اکتاہٹ سے سر اٹھا کر بیٹھا تھا۔ جہاں کسی کے چہرے پر کڑخی کے سائے نہیں تھے۔ بلکہ کسی کی آنکھوں کی نرم روشنی کا حصار اس کے گرد تھا۔ ایسا اس نے کیا کر دیا تھا۔ کچھ بھی

نہیں۔ اپنے گھر کی لڑکیوں کو تو اس نے کبھی غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ نہ حالات ایسے تھے نہ فرصت تھی اور نہ وہ خود ایسا تھا۔ ہاں جو ذمہ داری اس کے سر پر تھی۔ یہ کوشش اس نے ضرور کی تھی کہ اس کو صحیح طریقے سے نبھائے۔ ایمان داری سے انجام دے سکے یا پھر ایک بڑے بھائی کی طرح ان کا خیال رکھ سکے۔ حالانکہ وہاں کسی کو پروا تھی۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والی لڑکیاں تھیں۔ لیکن زویا ان سب سے مختلف تھی اور اس کی آنکھوں کا تاثر بھی۔ اس میں ہمدردی تھی اور شاید محبت بھی مگر کیوں؟ اس میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ اس سے محبت کی جانی۔

فائز اس پوری رات سو نہیں سکا۔ صبح کو عابدہ اس کی لال آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ ”کیا ہو گیا فائز! طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”جی امی! اس نے مختصر“ کہا۔

”نہیں۔ مجھے تو ٹھیک نہیں لگ رہی۔ تمہارا میٹر ڈو“ میں تمہارا بخار دیکھوں۔“

”اف امی! بخار نہیں ہے، صبح کہہ رہا ہوں۔“

”اچھا تو پھر ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تو رات بھر سو نہیں سکا۔“

”میں آج تک نہیں جان سکا کہ آپ کو ہریات کس طرح پتا چل جاتی ہے۔“ فائز نے حیرانی سے کہا۔

”مجھے نہیں۔“ عابدہ نے مسکرا کر کہا۔ ”ہر ماں کو ہر بات پتا چل جاتی ہے۔ مگر بچے اس بات کو نہیں سمجھتے۔“

”مگر میں تو آپ کی ہریات کو سمجھتا ہوں۔“

عابدہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے جنہیں انہوں نے حلق میں ہی اتار لیا۔

”میں تمہارے سمجھنے کی عمر نہیں تھی۔ تمہارے سوچنے کی عمر بھی نہیں تھی، مگر تمہیں دونوں کام کرنا پڑے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”ایک ماں کے لیے بہت فرق پڑتا ہے۔ میں جب



اپنے بھتیجیوں کو دیکھتی ہوں۔ جو سارا دن گاڑی لے کر گھومتے ہیں۔ چنگ پر جاتے ہیں۔ آئے دن پارٹی کرتے ہیں اور پھر تمہیں دیکھتی ہوں تو میرے دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا ای! کچھ لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے کہ انہیں وقت سے پہلے بڑا بننا پڑے۔ اسے آپ کس طرح روک سکتے ہیں اور آپ بھی اتنا نہ سوچا کریں۔“ فائز نے ماں کے کندھوں کو ہلکا سا ہلکا چھو ڈیا۔ ”بس آپ میرے لیے دعا کیا کریں۔“

پتا نہیں کیوں۔ مگر جب فائز نے لفظ دعا کہا تو زویا کا چہرہ ایک دم سامنے آگیا۔

زندگی کے بہت سارے رنگوں میں ایک رنگ یہ بھی سہی۔ وہ رنگ جو سب سے الگ تھا۔ اور سب سے جدا۔

عابدہ نے غور سے فائز کا چہرہ دیکھا۔ آج تو اس کے چہرے میں کوئی الگ سی بات تھی۔ کوئی الگ سی چمک۔ ”ان کا دل چاہا اس سے پوچھیں۔“

لیکن انہوں نے اپنے آپ کو روک لیا۔ ابھی وہ کیا بتائے گا۔ کتنے زانوں بعد تو اس کی آنکھوں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ ”ہمیشہ خوش رہو اور جو چاہو وہ پالو۔“ انہوں نے دل کی گہرائیوں سے وعادی۔

فائز چلا گیا تو عابدہ لان میں آکر بیٹھ گئیں۔ یہ عیاشی بھی کبھی گھبراہٹ میں آتی تھی۔ آج کل چشیاں تھیں۔ اس لیے سب ہی لوگ دیر سے سو کر اٹھتے تھے۔

اسی وقت ان کی نظر شینا پر پڑی۔ اتنی صبح بھی سیل فون اس کے کانوں سے لگا تھا۔

عابدہ کو اپنی ساری بھتیجیوں سے پیار تھا اور وہ سب ایسی ہی تھیں۔ جیسی آج کل کی لڑکیاں۔ ہر وقت ہنسی مذاق میں رہنا پھر اپنی پڑھائی۔

مگر شینا ان سب سے مختلف تھی۔

اس وقت بھی عابدہ کو نہیں پتا تھا کہ وہ کس سے بات کر رہی ہے۔ لیکن ایک چٹھی جس نے جیسے انہیں بتا دیا کہ اتنی صبح جو وہ بات کر رہی تھی تو دوسری

طرف کوئی لڑکی نہیں تھی۔ یقیناً ”وہ کوئی لڑکا تھا۔ ان کو ایک سروسی لہرنے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان کا دل چاہا۔ وہ اس سے فون چھین کر رکھ دیں اور اسے سمجھائیں کہ لڑکیوں کو بہت احتیاط سے چلنا پڑتا ہے اور عزت ہر ایک کے لیے ہی بہت قیمتی ہوتی ہے لیکن ایک لڑکی کے لیے عزت زندگی کی طرح ہوتی ہے۔ وہ اس کی متاع حیات ہوتی ہے۔

لیکن ظاہر سی بات ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ شینا کوئی چھوٹی نا سمجھ بچی نہیں تھی۔ اور اس کی ماں زندہ تھی۔

ماؤں کو تو آنکھیں بہت کھلی رکھنا پڑتی ہیں۔ پتا نہیں بڑی بھابھی نے اپنی آنکھیں کیوں بند کی ہوتی ہیں۔

اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ سارا کچھ اس صبح کا فریب نظر ہو۔ پڑھا لے کی طرف جاتی نظر بہت کچھ آنکھوں سے اوجھل بھی تو کر دیتی ہے اور میں نے پرانے زمانے کی عورتوں کی طرح ایک لمبی کہانی کڑھ لی۔

”کچھ بھی نہیں ہو گا۔ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ شریف ماں باپ کا خون ہے۔“ عابدہ نے سر جھٹکا اور بچن کی طرف بڑھ گئیں۔ سب لوگوں کے اٹھنے کا وقت ہو رہا تھا اور ابھی بہت سارے کام کرنے تھے۔

شینا نے بھی ان کو آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ مڑ کر کمرے میں چلی گئی۔ اس وقت نہ وہ کسی کی شکل دیکھنا چاہتی تھی اور نہ ہی کسی سے بات کرنا۔ آذر ناراض تھا اور وہ دو دنوں سے اسے منانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شینا نے تو یہی سنا تھا کہ محبت کرنے والے زیادہ دیر تک کسی سے ناراض نہیں رہ سکتے۔ لیکن اب اس کی ناراضی کو ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔

اور اس ایک ہفتے میں شینا نے جتنی اذیت کو سہی تھی۔ اس نے اسے تھکا دیا تھا۔ محبت میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جہاں محبت اور مزاحمت میں سے کسی ایک کو آپ کو چننا پڑتا ہے۔

وہ اب آذر کی ناراضی مزید نہیں سہ سکتی تھی۔ وہ جو

گناہ تھا اور جس طرح اسے اب مان جانا تھا۔



اسکرین پر زویا کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ فائز نے ایک دم کچھ سوچا اور مسکرا دیا۔ اس لڑکی نے پورا ایک ہفتہ اسے پریشان رکھا تھا۔ لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ پریشانی نہیں تھی۔ وہ تو کوئی بڑا خوب صورت بڑا پیارا انصورت تھا۔

اس نے شکایت کی تھی۔ آپ بہت دنوں سے آئے نہیں۔ ابی آپ کو یاد کر رہی تھیں۔

”صرف ای!“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور وہ جو عمر بھر اتنا محتاط رہا تھا کہ یہ جملہ بھی جب بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تو اسے یقین نہیں آیا کہ یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہیں پھر بھی۔ وہ شدت سے اس کے جواب کا منتظر تھا کیونکہ پچھلے دو ہفتوں میں ہی اس پر انکشاف ہوا تھا کہ دنیا خوب صورت بھی ہو سکتی ہے اور دھنک رنگ بھی اگر ذرا سی سوچیں بدل جائیں اور سوچ کوئی نہیں بدل سکتا ایک محبت کے سوا۔ بہت زانوں بعد فائز کو دنیا اور دنیا میں موجود لوگ اچھے لگے تھے۔

ورنہ وقت نے اسے بہت بری طرح روندنا تھا۔ بہت دفعہ اس کا دل چاہتا کہ کسی طرح وہ پچھلا وقت کبھی لوٹ کر آجائے کاش بابا کی طرح اس کا ایک سیلنٹ ہو جائے، کم از کم روز جینے مرنے کا سلسلہ ہی کیس جا کر رک جاتا۔

اپنی اذیت اپنی ماں کی اذیت جو اس نے رشتوں سے بھی اٹھائی تھی اور اپنی صحت اور زندگی کا تالوان بے کر بھی ادا کر رہی تھی اسے اپنی ماں سے بڑی محبت تھی اور اس کی قربانیوں کا احساس بھی تھا۔

اسے پتا تھا ماں نے بہت سی تکلیفیں اس لیے بھی اٹھائی ہیں کیونکہ ماموں نے اس کی پڑھائی کا خرچہ اٹھایا ہوا ہے۔ باقی وہ کیا کرتا ہے۔ کہاں پڑھتا ہے۔ کس اسی بیوٹ میں ہے انہوں نے یہ ساری باتیں کبھی نہیں پوچھیں اور نہ فائز نے بھی بتایا۔

دل کو خوشی ملے تو بہت سارے غم بھی یاد آجاتے ہیں۔ آج زویا کے جواب نے اسے ایسی ہی خوشی دی تھی۔

جب اس کی زویا سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہ شینا کی پریشانی میں مبتلا تھا۔ لیکن تب بھی ایک احساس اسے اچھا لگا تھا کہ آج بھی ایسی لڑکیاں ہیں جو رشتوں کو اور محبتوں کو سمجھتی ہیں۔ اس کی ماں کی طرح کیونکہ اس کی ماں نے بالکل یہی بات اس کے اندر بھی ڈالی تھی۔ رشتوں کی اور محبتوں کی ورنہ جہاں وہ پڑھتا تھا۔ وہاں بھی بہت طرح کی لڑکیاں تھیں۔

مگر وہ ساری لڑکیاں اسے شینا کا پرتو لگتی تھیں۔ ہر چیز میں صرف اپنے آپ کو ہی دیکھنا۔ اپنی خواہشیں اپنے مفادات اور جو بھی اپنے سے کم ہے وہ حقیر ہے۔ زویا نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا اس کی پہلی اس کا بیک گراؤنڈ اور اس کا اسٹیشن جو ابھی کچھ تھا ہی نہیں۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے چمک تھی، ایک روشنی تھی۔

اور فائز کو اب اسی روشنی میں چلنا تھا۔



”تم بہت زیادہ تیار نہیں ہونے لگی ہو۔“ ساریہ نے شینا کو نکلے دیکھ کر تبصرہ کیا۔

”تم فائز نہیں بنو۔“ شینا نے اسے جھڑک دیا۔

”فائز نے تمہیں کچھ کہا؟“ ساریہ نے حیرت سے کہا۔

”اتنی ہمت کسی میں نہیں کہ مجھے کچھ کہہ سکے اور پھر فائز۔“ اس نے گردن جھٹکی۔ ”اس کی اوقات ہی کیا ہے۔“

”بری بات ہے۔“ ساریہ نے اسے ٹوکا۔ ”وہ پھپھو کا بیٹا ہے۔“

”جب پھپھو کو ہی ہمارے گھر میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تو ان کا بیٹا۔ تم بھی کبھی بھی مزاحیہ بات کر لیتی ہو۔“

”اصل میں بات یہ ہے شینا! کہ تمہاری نظریں



ہمیشہ آسمان پر رہتی ہیں تم اب کبھی غور سے فائز کو دیکھنا۔ وہ بالکل وہ والا فائز نہیں رہا جو آج سے آٹھ سال پہلے ہمارے گھر آیا تھا۔

”ابھی مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ میں اسے دیکھوں۔ لیکن حیرت“ آج تم بڑی فور کر رہی ہو۔“

”پتا نہیں کچھ عرصے سے سوچ رہی ہوں کہ فائز کو ہم نے غلط سمجھا ہے حیرت تو مجھے تم پر ہے ایک ہفتے میں تین دفعہ تو تم عیبوں کے گھر جاتی ہو اور فائز کے ساتھ ہی جاتی ہو۔ کبھی غور کیوں نہیں کیا۔“

”ابھی میرا دل اتنا خراب نہیں ہوا۔ ہونہ! اس نے گردن جھٹکی۔

”وہ شخص جو مجھے چاہتا ہے۔ تم کبھی اسے صرف دیکھ لو تو تم اپنے سارے کسے پر نادام اور شرمندہ ہو جاؤ“ شہینا نے تنفر سے دل میں سوچا۔

”مائی امی نے اس کا دل کچھ زیادہ ہی خراب کر دیا ہے۔“ ساری نے دل میں کہا۔ کزن ہونے کے باوجود شہینا سے سب فاصلہ رکھ کر بات کرتے تھے۔ اس کے منہ بھٹ ہونے کی وجہ سے اور اس کا دل خراب ہونے کی وجہ سے ابھی اس وقت بھی ساری نے اپنے حساب سے صحیح بات کہی تھی۔ مگر اس کے چہرے کا بیزار کن رد عمل دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

اس دن آذر سے ہوئی ملاقات میں بھی کوئی بات تھی۔ جو اندر ہی اندر اسے ہرٹ کر رہی تھی۔ وہ بار بار باتوں کو اکٹھا کرتی اور ہر دفعہ باتوں کا سراپا تھ سے پھسل جاتا۔

”کیا ہوا“ آج یہ ہونٹ مسکرا کیوں نہیں رہے؟“

آذر کا فکر مندی سے کہا جملہ شہینا کو ایک دم خوش کر گیا۔ ”تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“

”نہیں“ مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں آذر! میں اتنے دنوں سے کچھ کہہ رہی ہوں۔ کب آئیں گے آخر تمہارے والدین۔“ شہینا پھٹ پڑی۔

”بس یار! تھوڑے سے دن اور صبر۔“ آذر نے دٹا دیا جملہ دہرایا۔

”میں بہت دنوں سے یہ سب کچھ سن رہی ہوں۔“ شہینا نے تیزی سے کہا۔ یہ تیزی جلد بازی اس کی فطرت کا حصہ تھی۔ صرف کچھ عرصہ پہلے تک وہ آذر سے اس انداز میں بات کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن آذر کی محبت اور چاہت نے اسے اتنا جو صلہ مند تو بنایا دیا تھا کہ وہ اس طرح بات کر لیتی تھی۔

”ایک بات بتاؤ شہینا! صرف ایک مسئلہ ہے تاکہ شادی ہوئی ہے۔ وہ آج نہیں توکل ہو جائے گی۔ اس کے لیے اپنا آج کیوں خراب کریں؟“ آذر نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے گہرے آواز میں شہینا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ لہجہ یہ آواز اسے بہت سمجور کیا کرتی تھی۔ وہ خیالوں کی دنیا میں کہیں دور نکل جاتی۔

”تم کہاں کھو جاتی ہو ڈیر؟“ آذر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”نہیں نہیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے چلتی ہوں۔“ وہ اپنا بیگ کاندھے پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

آج تو واقعی دیر ہو گئی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ آج فائز نے ضرور کچھ کہنا ہے۔ وہ ہر معاملے میں خاموش رہتا تھا۔ لیکن اپنی اس عادت پر بڑی مستقل مزاجی سے قائم تھا۔ اور شہینا نے بے شک اسے نوکر کے درجے پر رکھا ہوا تھا لیکن وہ نوکر نہیں تھا۔ وہ اس گھر کا فرد تھا اور چاہے اسے وہ باتیں کتنی ہی زہر لگتی ہوں۔ مگر وہ سننے پر مجبور تھی۔

لیکن اس وقت بالکل خلاف توقع فائز نے اسے کچھ نہیں کہا۔ صرف یہ کہ کچھ کہا نہیں بلکہ اس کے چہرے پر وہ جو ایک بیزار کن سا تاثر ہوتا تھا وہ بھی نہیں تھا۔

شہینا کو حیرت ہوئی۔ اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ فائز کو چلے، بھٹتے، تلملا تے دیکھنا بھی تو ایک بر لطف تجربہ ہوتا تھا۔ اس نے بے خیالی میں دوبارہ اس کی طرف نگاہ کی اور اسے اعتراف کرنا پڑا کہ ساریہ ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھی۔ فائز بہت بدل گیا تھا۔ خوب

صورتی کے لحاظ سے بھی اور پر سالی کے لحاظ سے بھی۔

اس وقت بھی خاموش، لب بھینچے وہ ڈراؤ کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہا اسے کچھ سنائے ایسا کہ جس سے اس کے حلقے ہوئے دل کو قرار آجائے۔ وہ دل جواب آذر سے بدگماں ہو رہا تھا۔ لیکن اسے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی اور یہ بالکل پہلی دفعہ تھا کہ اس نے کچھ سوچا مگر عمل نہیں کر سکی فائز اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ جیسے اس کا وجود عدم وجود دونوں برابر ہوں۔

”ہونہ!“ اس نے بیٹھے بیٹھے تنفر سے گردن جھٹکی۔ ”کیا میرا دل خراب ہو گیا ہے جو میں فالٹو باتیں سوچ رہی ہوں۔“ اس نے اپنا دھیان دوبارہ آذر میں لگانا چاہا۔

آذر گھر آنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت جب گھر میں کوئی نہ ہو۔

”بس یوں ہی۔“ آذر نے بے نیازی سے کہا تھا ”مجھے تمہارا گھر دیکھنا ہے۔ وہ گھر جہاں تم رہتی ہو۔ وہ کرا۔“

اور کوئی برا خیال تو اس کے ذہن میں آتی نہیں سکتا تھا۔ اس بات کی تو وہ قسم کھا سکتی تھی کہ کردار کے لحاظ سے آذر بہت زبردست آدمی تھا۔

\*\*\*

”آ رہی ہوں امی!“

زویا کا سارا کام ختم ہو گیا تھا۔ صرف تھوڑے سے برتن رہ گئے تھے۔ امی کتنے دنوں سے فائز کو کھانے پر آنے کے لیے کہہ رہی تھیں اور پتا نہیں کیا مجبوری تھی کہ وہ ہاں نہیں بھرتا تھا۔ زویا ناراض بھی ہو گئی۔

”فائز! بڑی غلط بات ہے، امی کب سے تمہیں کھانے پر بلا رہی ہیں اور تمہارے خمرے“ زویا روہا لگی ہوئی۔

”یار! میں کوئی خزا نہیں کر رہا ہوں۔ ویسے بھی یہ عورتوں کا شعبہ ہوتا ہے، بلا وجہ اور ہر بات میں خمرے کرنا۔“ فائز نے اسے سمجھانا چاہا۔

”عورتیں نہیں لڑکیاں۔“ اس نے تھج کی۔

”ہاں ہاں وہی۔“ فائز نے سر جھکا کر کہا۔

”تو پھر آ جاؤ فائز! جب سے علی باہر گیا ہے امی اس کے دوستوں کو ہی کھانے پر بلا رہی ہیں اور پھر تمہیں تو وہ کتنی دفعہ کہہ چکی ہیں۔“

”ساری مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں زویا! تمہیں پتا ہے۔ رات کو جب تک میں واپس نہ آ جاؤں میری ماں بھی کھانا نہیں کھاتی۔ ان کی وجہ سے چاہے کچھ ہو جائے میں رات کو جلدی گھر پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”تمہیں اپنی ماں سے بہت محبت ہے فائز!“

”زویا! اولاد کو تو ماں سے محبت ہوتی ہی ہے۔ کم از کم میں نے تو یہی دیکھا ہے لیکن اس محبت کے ساتھ مجھے ان کی قربانیوں کی بھی بڑی قدر ہے۔“

”کون سی قربانی؟“ زویا نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بے انتہا محبت تھی۔ فائز کبھی کھلتا ہی نہیں تھا۔ یہی بہت تھا کہ وہ اب کم از کم بات کر لیتا تھا۔

”بابا کے انتقال کے بعد ہم لوگ ماموں لوگوں کے پاس آ گئے تھے۔ امی کی بہت زیادہ عمر بھی نہیں تھی۔ مائی اماں اور ماموں وغیرہ نے کوشش کی کہ وہ شادی کر لیں۔ لیکن امی میری وجہ سے راضی نہیں ہوئیں۔ حالانکہ آج میں سمجھتا ہوں کہ انہیں کر لینا چاہیے تھی۔ جس طرح کی زندگی انہوں نے یہاں گزاری، اس نے جہاں میری ماں کو صابر بنا دیا، وہاں مجھے بخشنا دیا۔“

”تم تلخ نہیں ہو فائز!“ زویا نے اسے نوک دیا۔

”میری تلخی میرے خون میں گردش کرتی ہے زویا! مجھے جیسے حالات سے گزرا آدمی بخشتی ہو جاتا ہے۔“

”لیکن اس کے باوجود تم بہت اچھے ہو۔ اس میں کوئی دورائے نہیں ہو سکتیں۔“

”اچھا! کبھی میری فیملی کی لڑکیوں کو دیکھ لیتا۔ تمہیں پتا چل جائے گا۔“

”کیوں۔ ان کے نزدیک تم برے شخص ہو؟“ زویا نے حیرت سے کہا۔



”نہیں! اسے برا تو نہیں کہیں گے۔ لیکن شاید اچھا بھی نہیں۔ ان کے نزدیک میں سخت مزاج ہوں۔ اگھر ہوں اور یہ کہ مجھ میں کوئی پرانے زمانے کی روح بھی ہوئی ہے۔ یہ آخری خیال میری کزن شینا کا ہے۔ اس نے مجھے بہت دفعہ۔ یہ الفاظ کہے ہیں۔“ فائز نے وضاحت کی۔

”اس میں فکر کی کوئی بات نہیں۔“ زویا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ ساری خصوصیات تو بہرہ ویکی ہوتی ہیں اور جہاں تک آخری والی بات ہے تو تمہاری کزن شینا پاگل معلوم ہوتی ہے۔“

”اچھا چلو چھوڑو۔“ فائز نے بات پلٹ دی۔ شینا نے اسے یہ الفاظ رسول ہی تو کہے تھے اور اس کی باتوں کو دل پر نہ لینے کے باوجود فائز کو شینا کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ وہ اتنا بھی دقیاؤس نہیں تھا لیکن اس کی اتنی خواہش ضرور تھی کہ انسان کوئی بھی کام کرے۔ اسے اپنی اقدار کا خیال ہونا چاہیے اور اس کے کزنز کے خیال میں ”جن لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ وہ باتیں بھی نہیں کریں تو پھر کیا کریں۔ وہ بہت ساری چیزوں کا پردہ رکھتی ہیں“ جب وہ لوگ اس طرح کی باتیں فائز کے سامنے کرتے تو پھر بولنے کو کچھ نہیں رہ جاتا تھا۔

\*\*\*

”میں نے تم پر بہت احسان کیے ہیں فائز! اس کا بہت اچھا صلہ دیا ہے تم نے۔“ بڑے ماموں کا انداز متنی لے ہوئے تھا۔

”میں ان میں سے کچھ بھی نہیں بھولا ہوں نہ میں خود اس طرح کا ہوں اور نہ میری ماں نے میری تربیت اس طرح کی ہے کہ میں وہ سارے احسان بھول جاؤں جو آپ نے کیے ہیں۔ یہ ایک بالکل الگ معاملہ ہے۔“

”مجھے شینا نے بتایا تھا۔“ بڑے ماموں اس کی طرف مڑے۔ ”تم اس سے بلاوجہ نفرت کرتے ہو۔ سب لوگوں کے سامنے اس کی انسلٹ کرتے ہو اسے

باتیں سناتے ہو اور میری غلطی ہے کہ میں نے اس کی وہ ساری باتیں اس کا جذباتی بن سمجھ کر نظر انداز کر دیں کہ شینا غصے کی تیز ہے لیکن اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ مجھے وہ ساری باتیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تھیں۔“

فائز واپس مڑ گیا۔ اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اولاد اور اولاد کی محبت ہر چیز سے بڑی ہوتی ہے۔

عابدہ اس وقت بچن میں تھیں جب انہوں نے فائز کو سر پر چڑھ لے ہوئے کمرے سے نکلے ہوئے دیکھا۔ ”کیا ہوا فائز؟“ وہ اس کے پیچھے لپکیں۔

”کچھ نہیں امی!“ اس نے اپنی کندھوں کو اگلیوں سے دبایا۔ ”اس دنیا میں بچ بات کرنا جرم کیوں بن جاتا ہے؟“

”جج بڑا بھاری ہوتا ہے فائز! ہر کوئی جج کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا لیکن بات کیا ہے مجھے بتاؤ دوستی۔“

”نہیں امی!“ فائز نے انکار میں سر ہلایا۔ ”میں نے جہاں مناسب سمجھا تھا وہاں بتانا چاہا تھا لیکن شاید میں غلط تھا اس لیے چھوڑ دیں۔“

”فائز! مجھ سے بات چھپاؤ گے؟“

”امی! میں بات نہیں چھپا رہا۔ لیکن آپ نے ہی سمجھا تھا کہ کسی کا پردہ رکھنا اچھی بات ہے۔ تو بس اس لیے رہے جو۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ عابدہ نے مسکرا کر بیٹے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

”اللہ تعالیٰ تمہیں دونوں جہاں کی خوشیاں دکھائے۔“

اس دعا کا اور زویا کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر ہوا یہ کہ ایک دم سے اس کی ہنسی مسکراتی شکل اس کی نظموں کے سامنے آ گئی تھی۔

عابدہ نے اس کے منہ سے ہونے چرے کو روشن دیکھا تو انہیں بڑا اچھا لگا انہیں لگا کہ کوئی تو بات ایسی ضرور تھی کہ جس نے ان کے سینے کا وہ چروہ جو تھوڑی دیر پہلے تک تاریک تھا۔ اس کو ایک دم سے جگمگا دیا تھا۔

”اچھا۔“ انہوں نے فائز کا ہاتھ تھام لیا۔ ”مجھے اس کا نام بتاؤ! جلدی ہے۔“

”کس کا نام امی؟“ فائز ایک دم گڑبڑا گیا۔

”ایک بات تو میں جانتی ہوں کہ میرے بیٹے نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔“ وہ لاڈ سے بولیں۔

”تو اب میری ماں اس چیز کا فائدہ اٹھائے گی۔“

”بالکل!“ عابدہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”دنیا اسی کی ہے جو وقت سے فائدہ اٹھائے۔“

”آپ بالکل خراب ہوتی جا رہی ہیں۔ بھلا نام سے آپ کو کیا پتا چل جائے گا۔“ فائز نے بے بسی سے کہا۔ انہیں بے اختیار ہی ہنسی آ گئی۔ فائز نے بالکل بچپن والی حرکت کی تھی۔ جو بات چھپانی ہوتی تھی وہی بتا دیتا۔

”ہم سے بھی بہت کچھ پتا چل سکتا ہے بیٹا جی! میں تصور میں سب کچھ دیکھ لوں گی۔“

”زویا۔“ اس نے اتنا آہستہ کہا کہ وہ بمشکل ہی سن پائیں۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”کیا ٹھیک ہے؟“ فائز نے چڑکر کہا۔ ”اب میں آپ سے پوچھوں کہ آپ نے تصور میں کیا دیکھا۔“

”تم ضرور پوچھو۔“

”بس! رہے دیں۔ اتنی جلدی آپ اس شخص کے بارے میں کیسے جانتی ہیں جس کو آپ نے دیکھا ہی نہ ہو۔“

”کوئی نہیں بتا سکتا۔ مگر ایک ماں تو بتا سکتی ہے

”چلے بتائیے!“ فائز نے اپنی ناراضی ختم کر دی۔

”ایک ماں کا امتحان شروع اور کچھ غلط نہیں ہونا چاہیے۔“

”آرے بابا! نہیں ہو گا۔“ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کہنا شروع کیا۔

وہ کیسی لگتی ہے۔ کس طرح دکھائی دیتی ہے۔ کیسے ہنسی ہے۔ اس کا مزاج اس کی عادات۔ کیسے بھی کچھ غلط نہیں تھا۔

فائز کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”امی! آپ کو یہ سب کچھ کیسے پتا؟ آپ تو اسے جانتی بھی نہیں۔“

”تو کیا ہوا۔ میں اسے نہیں جانتی، تمہیں تو جانتی ہوں نا۔“ انہوں نے لاڈ سے اس کے سر پر چپٹ لگائی تھی۔

\*\*\*

شینا نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ان دونوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو اس کا دل نفرت سے بھر گیا۔ دنیا میں اتنے لوگ ہیں مگر بتا نہیں یہ شخص کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔

ساری عادتیں تھوڑا سا مڑی ہوئی ہیں۔ اب یہ پچھو کو میرے بارے میں تنگ مچ لگا کر بتا رہا ہو گا اور اس پر ساریہ کہتی ہے کہ اس کو غور سے دیکھنا حالانکہ غور سے کیا، کوئی عام سی بھی نظر ڈالے تو اسے پتا چل جائے کہ یہ رتا تو ہم لوگوں کے ساتھ ہے۔ ایک بڑی اونچی فیلٹی میں مگر اس کی حرکتیں عادتیں سب یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس کا تعلق کسی ملل کلاس گھرانے سے ہے اور اگر اس نے پپا کو بتا دیا۔“ اس کے دل میں خدشہ نہ سراٹھایا۔

”اتنی بہت تو اس میں مرکز بھی نہیں آ سکتی کہ یہ پپا کے سامنے کھڑا ہو سکے۔“ اس نے فوراً ہی خود کو اطمینان دلایا۔

ساریہ کتنی دیر سے شینا کے چہرے کے بدلنے نقوش کو دیکھ رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ شینا! کتنی دیر سے کھڑکی میں کھڑی ہو۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا ”پاپی داوے۔ تم اتنی دیر سے کس کو دیکھ رہی ہو۔“ ساریہ نے کھڑکی سے باہر نظریں دوڑائیں اور فائز کو دیکھ کر گہری سانس لی۔

ساریہ کی ابھی کچھ دنوں پہلے ہی منگنی ہوئی تھی اور اس کی ساری دوستوں کو فائز پسند آتا تھا اور خود ساریہ کو بھی لگتا تھا کہ ان لوگوں سے نہیں غلطی ضرور ہوئی ہے۔ وہ اس غلطی کے ازالے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن



جب نقش گہرے ہو جائیں تو کوئی چیز بھی مٹنا آسان نہیں رہ جاتی۔

جوان سب لوگوں کا سلوک تھا، اس نے فائز کو ان لوگوں سے دور کر دیا تھا۔ وہ شینا کے بارے میں نہیں جانتی تھی کہ فائز کے بارے میں اس کے خیالات بدلے ہیں یا نہیں لیکن اس نے اپنی مفتی میں فائز کو جس طرح ذمہ داری سے ایک ایک کام کرتے دیکھا تھا۔ اس نے ساریہ کو بڑی ندامت میں مبتلا کیا تھا ورنہ کزن تو بہت سارے تھے لیکن وہ سارے ڈانس یا پھر دوسری مصروفیات میں مگن تھے ان کا لائف اسٹائل ہی ایسا تھا کہ کوئی کسی کو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔

لیکن اب وہ کوشش کرتی تھی کہ جو کچھ ان سے ماضی میں ہو چکا ہے اس کو ختم کر دیا جائے۔ اس لیے وہ اکثر ہی اب پچھو کے ساتھ جا کر کچن میں لگ جاتی تھی۔ بہت پیسہ ہونے کے باوجود گھر کے سارے مردوں کو پچھو کے ہاتھ کا ہی کھانا چاہیے ہوتا تھا۔

ساریہ سوچتی نہ جانے وہ وقت اب آئے گا۔ جب ہمارے دل اتنے وسیع ہو جائیں گے کہ ہم رشتوں کو ان کی اصل حیثیت میں قبول کرنا سکھ لیں گے۔ نئی نسل شاید بدل بھی سکتی ہے۔ پرانی نسل کا بدلنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور تالی سب کی طرف سے ناامید تھی لیکن شینا وہ تو آج کی نسل تھی۔ وہ تو اپنا خراب رویہ سچ کر سکتی تھی۔

وہ اٹھ کر کچن میں جا کر عابدہ کا ہاتھ بٹانے لگی۔

”پچھو! آپ تھک جاتی ہوں گی۔“

”تھک تو جاتی ہوں بیٹا! مگر کچھ چیزیں کرنا ہی پڑتی ہیں۔“

”نہیں یہ بات نہیں ہے، آپ نے خود ہی سب کی عادتیں خراب کر دی ہیں۔ آپ اتنا اچھا کیسے بنائیتی ہیں کہ بندہ پھر کسی اور کے ہاتھ کا کھانا نہ سکے۔ تایا ابو کو تو چاہیے ہی صرف آپ کے ہاتھ کا بنا کھانا۔“

ساریہ نے کہا۔

”ہاں!“ انہوں نے گہری سانس لی۔ ”بڑے بھیا کہتے ہیں۔ تم بالکل اماں کی طرح کھانا بناتی ہو۔“

”مجھے کچھ کام بتائیں پچھو؟“

”نہیں بس ہو گیا۔“ انہوں نے محبت سے ساریہ کو دیکھا۔

”جو میری بہو آئے وہ بھی ایسی ہی ہو۔ محبت کرنے والی اور رحم دل۔“ جس وقت انہوں نے یہ دعا مانگی، اس وقت تقدیر کیا لکھ رہی تھی۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

انہوں نے دیوار سے پشت لگا کر گہری گہری سانسیں لیں۔ کمر کا درد اکثر ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ساریہ نے جلدی سے کرسی لا کر رکھی۔

”میں میں ٹھیک ہوں۔“

”نہیں پچھو! آپ تھک نہیں ہیں۔ آپ فائز سے کہیں۔ وہ آپ کو ڈاکٹر کو دکھائے۔“

”تین چار دفعہ لے کر گیا ہے لیکن اس کے پاس بھی اب بالکل ٹائم نہیں ہے۔ اس کا لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ پھر تو سب ہی کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آپ بہت خوش ہوں گی نا پچھو!“

”بہت۔“ عابدہ کا لبہ بیک وقت غم اور خوشی کا تاثر لیے ہوئے تھا۔ ”بہت لمبا سفر تھا۔ اللہ کا بہت احسان ہے کہ سارا سفر اس کی مہربانیوں سے کٹ گیا۔“

ساریہ کو ندامت سی محسوس ہوئی۔ وہ سب کچھ جو ان سب لوگوں نے کیا تھا۔ اس کے بعد یہ جملہ کوئی کیسے کہہ سکتا ہے۔

”چلیں ٹھیک ہے پچھو! پھر تو فائز کے لیے لڑی دیکھیں۔“

”تلاش کرنا آسان کام نہیں ہے۔“ ساریہ نے سوگوار منظر میں خوش گواری کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہی۔

ان کے چہرے پر واپس مسکراہٹ آ گئی۔ آنے والے دن تھے اور خواب تھے۔

”گھر میں اور بھی شادیوں کا ذکر چل رہا ہے۔“

ساریہ نے اطلاع فراہم کی۔

”اچھا؟“ عابدہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”تمہارے

سسرال والے کیا جلدی کر رہے ہیں؟“

”نہیں، نہیں۔“ تایا ابو اب شینا کا سوچ رہے ہیں۔

”بائشاء اللہ۔“ عابدہ کے لمحے میں بھیجی کے لیے محبت تھی۔ ”بڑے بھیا کو شینا کے لیے فکر مند ہونا ہی نہیں چاہیے۔ کوئی کمی نہیں ہے اس میں۔“

”میں پچھو! یہ بات نہیں ہے۔ رشتے تو بہت آئے ہوئے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی نہ تایا ابو کے معیار پر پورا اترتا ہے اور نہ ہی شینا نے کسی کے لیے ہائی بھری ہے۔ کل دیکھا نہیں تھا۔ تالی امی کتنا غصہ کر رہی تھیں؟“

”ہاں سنا تو تھا مگر اتنی باتیں مجھے کہاں پتا ہوتی ہیں؟“

انہوں نے سادگی سے کہا۔ اور دودھ چولے پر رکھ کر شینا نے ان کی تیاری کرنے لگیں۔

شینا نے اپنا ہاتھ آہستہ سے آڈر کے ہاتھوں کے نیچے سے نکالا۔

”کیا ہوا؟ ناراض ہو؟“

”نہیں۔“ شینا نے خفگی سے جواب دیا۔ ”محبت کرنے والے نہ ناراض رہ سکتے ہیں نہ ناراض ہو سکتے ہیں مجھے اب لگتا ہے کہ جو کچھ چھی ہو رہا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ گھر میں میرے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ فائز نے پچھلی دفعہ مجھے دیکھ بھی لیا تھا۔ وہ اندیشے الگ اپنی جگہ پر موجود۔ آنے والے وقت سے ڈراتے ہیں اور شاید کہیں بدنامی بھی۔ میں یہ سب کچھ سوچتی ہوں اور یہاں موجود ہوں۔ محبت کیا پیشہ یوں ہی خوار کرتی ہے؟“

اس کا ٹوٹا ہوا لمحہ جس کے اندر کہیں ایک نامعلوم سی بے بسی تھی۔ اگر کوئی دوسرا فرد سن لیتا تو شاید اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شینا ہے جس کی مغرور اٹھی ہوئی گردن کبھی نیچے نہیں ہوتی جس کے لہجے کا تاؤ کبھی کم نہیں ہوتا۔

وہ کبھی اس طرح بھی بات کر سکتی ہے۔ لیکن سچ تو یہ

ہے کہ شینا اب تھک چکی تھی۔ اسے لگتا کہ وہ ہمیشہ آڈر کے پیچھے بھاگتی رہے گی اور آڈر کبھی اس کے ہاتھ نہیں آئے گا۔

وہ جو دیوتاؤں جیسا حسن رکھتا ہے۔ وہ واقعی دیوتا ہے۔ بے خبر اور انجان وہ جانتا ہی نہیں کہ اس کے پاؤں لبو لبان ہو چکے ہیں۔

”میں نہیں ایک خوش خبری دینا چاہتا تھا لیکن تم اتنا برا منہ بنا کر بیٹھی ہو کہ میرا بھی دل نہیں چاہ رہا کہ وہ خوشی کی خبر تمہیں سناؤں۔“

”بتاؤ۔“ شینا کی آنکھوں میں بہت سارے دیے جل اٹھے۔ اب خوشی کی ساری خبریں تو ایک خبر سے ہی منسوب تھیں۔ ”بتاؤ نا آڈر!“

”میری راضی ہو گئی ہیں۔ پندرہ بیس دنوں میں کراچی آجائیں گی۔“

آڈر! سچ کہہ رہے ہونا؟ اس کی آواز خوشی سے بو جھل ہو گئی۔

”تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟ ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہوں شینا! مگر تم سے نہیں۔ میں خود بہت پریشان ہو گیا تھا۔ ایک طرف تم تھیں دوسری طرف ممی کی ضد کہ نہیں مجھے تو تمہاری شادی خاندان ہی میں کرنی ہے۔ خاندان کی لڑکیاں دیکھی بھالی ہوتی ہیں اور شادی تو بس جان پہچان میں ہی ہونی چاہیے۔ ہمارے پاکستان میں تو اولاد کی ڈیوٹی ہے کہ وہ زندگی کے کسی معاملے میں پیرئش کی بات سیں یا نہیں، مگر شادی تو انہیں ان کی مرضی سے ہی کرنی ہے بڑی ہی عجیب بات ہے۔“

”اچھا! اب تو غصہ نہیں ہونا۔ اب تو تمہاری ممی مان گئی ہیں نا۔“ شینا کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بھاری بوجھ اس کے سینے سے سرک گیا ہو وہ بوجھ جس کی وجہ سے اس کو سانس لینا بھی مشکل ہو گئی تھی۔

”تم نے اتنا کچھ کر لیا آڈر! اور میں بدگمان ہو رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ تم کچھ نہیں کر رہے ہو۔ پتا نہیں محبت میں اتنی جلدی بدگمانی کی دھند کیوں آ جاتی ہے۔“

سسرال والے کیا جلدی کر رہے ہیں؟

”نہیں، نہیں۔“ تایا ابو اب شینا کا سوچ رہے ہیں۔

”بائشاء اللہ۔“ عابدہ کے لمحے میں بھیجی کے لیے محبت تھی۔ ”بڑے بھیا کو شینا کے لیے فکر مند ہونا ہی نہیں چاہیے۔ کوئی کمی نہیں ہے اس میں۔“

”میں پچھو! یہ بات نہیں ہے۔ رشتے تو بہت آئے ہوئے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی نہ تایا ابو کے معیار پر پورا اترتا ہے اور نہ ہی شینا نے کسی کے لیے ہائی بھری ہے۔ کل دیکھا نہیں تھا۔ تالی امی کتنا غصہ کر رہی تھیں؟“

”ہاں سنا تو تھا مگر اتنی باتیں مجھے کہاں پتا ہوتی ہیں؟“

انہوں نے سادگی سے کہا۔ اور دودھ چولے پر رکھ کر شینا نے ان کی تیاری کرنے لگیں۔

شینا نے اپنا ہاتھ آہستہ سے آڈر کے ہاتھوں کے نیچے سے نکالا۔

”کیا ہوا؟ ناراض ہو؟“

”نہیں۔“ شینا نے خفگی سے جواب دیا۔ ”محبت کرنے والے نہ ناراض رہ سکتے ہیں نہ ناراض ہو سکتے ہیں مجھے اب لگتا ہے کہ جو کچھ چھی ہو رہا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ گھر میں میرے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ فائز نے پچھلی دفعہ مجھے دیکھ بھی لیا تھا۔ وہ اندیشے الگ اپنی جگہ پر موجود۔ آنے والے وقت سے ڈراتے ہیں اور شاید کہیں بدنامی بھی۔ میں یہ سب کچھ سوچتی ہوں اور یہاں موجود ہوں۔ محبت کیا پیشہ یوں ہی خوار کرتی ہے؟“

اس کا ٹوٹا ہوا لمحہ جس کے اندر کہیں ایک نامعلوم سی بے بسی تھی۔ اگر کوئی دوسرا فرد سن لیتا تو شاید اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شینا ہے جس کی مغرور اٹھی ہوئی گردن کبھی نیچے نہیں ہوتی جس کے لہجے کا تاؤ کبھی کم نہیں ہوتا۔

وہ کبھی اس طرح بھی بات کر سکتی ہے۔ لیکن سچ تو یہ

ہے کہ شینا اب تھک چکی تھی۔ اسے لگتا کہ وہ ہمیشہ آڈر کے پیچھے بھاگتی رہے گی اور آڈر کبھی اس کے ہاتھ نہیں آئے گا۔

وہ جو دیوتاؤں جیسا حسن رکھتا ہے۔ وہ واقعی دیوتا ہے۔ بے خبر اور انجان وہ جانتا ہی نہیں کہ اس کے پاؤں لبو لبان ہو چکے ہیں۔

”میں نہیں ایک خوش خبری دینا چاہتا تھا لیکن تم اتنا برا منہ بنا کر بیٹھی ہو کہ میرا بھی دل نہیں چاہ رہا کہ وہ خوشی کی خبر تمہیں سناؤں۔“

”بتاؤ۔“ شینا کی آنکھوں میں بہت سارے دیے جل اٹھے۔ اب خوشی کی ساری خبریں تو ایک خبر سے ہی منسوب تھیں۔ ”بتاؤ نا آڈر!“

”میری راضی ہو گئی ہیں۔ پندرہ بیس دنوں میں کراچی آجائیں گی۔“

آڈر! سچ کہہ رہے ہونا؟ اس کی آواز خوشی سے بو جھل ہو گئی۔

”تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟ ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہوں شینا! مگر تم سے نہیں۔ میں خود بہت پریشان ہو گیا تھا۔ ایک طرف تم تھیں دوسری طرف ممی کی ضد کہ نہیں مجھے تو تمہاری شادی خاندان ہی میں کرنی ہے۔ خاندان کی لڑکیاں دیکھی بھالی ہوتی ہیں اور شادی تو بس جان پہچان میں ہی ہونی چاہیے۔ ہمارے پاکستان میں تو اولاد کی ڈیوٹی ہے کہ وہ زندگی کے کسی معاملے میں پیرئش کی بات سیں یا نہیں، مگر شادی تو انہیں ان کی مرضی سے ہی کرنی ہے بڑی ہی عجیب بات ہے۔“

”اچھا! اب تو غصہ نہیں ہونا۔ اب تو تمہاری ممی مان گئی ہیں نا۔“ شینا کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بھاری بوجھ اس کے سینے سے سرک گیا ہو وہ بوجھ جس کی وجہ سے اس کو سانس لینا بھی مشکل ہو گئی تھی۔

”تم نے اتنا کچھ کر لیا آڈر! اور میں بدگمان ہو رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ تم کچھ نہیں کر رہے ہو۔ پتا نہیں محبت میں اتنی جلدی بدگمانی کی دھند کیوں آ جاتی ہے۔“



”اس لیے کہ لڑکیاں بے وقوف ہوتی ہیں۔“ اس نے جڑایا۔  
 ”کوئی بھی نہیں۔“ شبنم نے اپنی چھوٹی سی مغرور ناک سکڑی۔ ”مروزیادہ بے وقوف ہوتا ہے۔“  
 ”نہیں۔“ آذر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب کوئی بھی بے وقوف نہیں رہا۔“ محبت میں بھی لوگ نفع نقصان سمجھنے پہلے طے کر لیتے ہیں۔ ہر چیز طے شدہ ہو گئی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟“ آذر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ شبنم نے نظریں جڑائیں۔ یہ تو حقیقت تھی، جب وہ پہلے پہل اس کی طرف متوجہ ہوتی تھی تو اس کے پیچھے آذر کی وجاہت اور شخصیت تھی۔ اور اس کا اسٹائل جو کسی کو بھی پاگل بنانے کے لیے کافی تھا۔ اور آج آذر کہہ رہا تھا کہ محبت میں بھی ہر چیز طے شدہ ہو گئی ہے۔

”ہوتی ہو گی جی۔“ شبنم نے کاندھے اچکا کر دل میں سوچا۔ ”مگر مجھے تو سب ہی کچھ مل رہا ہے۔ ایک لڑکی کو کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ۔“ اس نے آذر کے چہرے پر غر سے نگاہ ڈالتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

\*\*\*

فائز نے گاڑی سے باہر نکلے ہوئے کار جھکے بارش اب کافی تیز ہو گئی تھی اور اس بارش میں بھی اسے کافی سارے کام مکمل کرنے تھے۔ آج وہ جگہ اس کا انٹرویو تھا اور اس کی فائز کو فکر نہیں تھی۔ اس کی تعلیمی قابلیت اس کا خود پر اعتماد سب باتیں اس کے حق میں تھیں۔

”تو بات یہ ہے۔“ اس نے چلتے ہوئے خود کلامی کی۔ ”کہ جب مجھے مل سکتی ہے۔ بشرطیکہ کسی کی اسٹوڈنٹ قسم کی سفارش نہ ہو۔“

صبح امی نے بھی نماز کے بعد اس کے لیے بہت دعائیں کی تھیں۔ دعائیں کرنے کے بعد وہ رونے لگی تھیں۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ وہ فائز کے سامنے آنسو

بہا تیں وہ اس کے سامنے خود کو مضبوط اور بہادر رکھا کرتیں۔ حتیٰ کہ اپنی بیماری کے بارے میں بھی منہ سے اف نہیں کرتیں کہ اس کا اٹھا اور پریشان ذہن مزید مضرب نہ ہو۔ خودی فائز کو ان کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تو دوسری بات تھی۔

”اب آپ کیوں رو رہی ہیں؟“ فائز نے ان کے دونوں ہاتھ تھامے تھے۔ ”اب تو اچھا وقت آنے والا ہے۔“

”ہاں اللہ کا کرم ہے۔“ عابدہ نے اپنی آنکھیں رگڑی تھیں۔

”زویا کو بتایا تھا؟“

”ہاں! اسے بھی میں نے دعا کرنے پر لگا دیا ہے، حالانکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے پتا ہے۔ صرف آپ اکیلے ہی اتنی دعا مانگ لیں گی کہ میرے لیے کافی ہے۔“

”تمہارا تو داغ خراب ہے۔“ عابدہ نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ”اور یہ بات بھی طے ہے کہ اگر آج تمہاری جاب ہو جاتی ہے تو اس میں سب سے زیادہ حصہ زویا کا ہو گا۔“

”واہ واہ۔ یہ تو فائل ہے۔“

”کوئی فائل نہیں۔“ تمہیں پتا نہیں ہے جوانی کی عبادت اور دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں۔“

”ماما! فائز نے ان کے کندھے پر اپنے ہاتھ پھیلانے۔ جب اسے زیادہ پیار آتا تو وہ انہیں ماما ہی کہتا تھا۔

”آپ نے جس طرح میری تربیت کی ہے، اس سے مجھے لگتا ہے کہ صرف دو لوگوں کی دعائیں میرے ساتھ نہیں ہوں گی بلکہ بہت سارے لوگ ہوں گے۔ کیونکہ میں نے بھی بھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا۔“ یہ بات تو میں بھول ہی گئی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر کہا تھا۔

اس کے علاوہ وہاں اور بہت سارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مستقبل کی خوش امیدوں سے بندھے ہوئے خواب دیکھتے ہوئے لوگ اور خواب تو وہ بھی

دیکھ ہی رہا تھا اس دن سے، حالانکہ اسے بہت اچھی طرح پتا تھا کہ ان خوابوں کو پورا ہونے میں بڑا عرصہ لگے گا اس لیے کہ اس کے پاس گزرے وقت کے تلخ تجربے تھے۔ وہ تلخ تجربے جو نہ چاہتے ہوئے بھی یاد آجاتے ہیں۔

زویا نے کہا تھا۔ ”فائز میں تمہیں وہ سب کچھ بھلا دوں گی گزرا وقت گزرا ہے وقت کی بری یادیں لوگوں کے سر روئے۔“

”اور میں بھولنا نہیں چاہتا۔“ فائز نے سوچا۔ ”ان چیزوں سے میں نے اپنے لیے مثبت راہیں تلاش کی ہیں۔ ان غموں سے میں نے زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھا ہے۔ ان چیزوں سے میں نے حالات سے لڑنا سیکھا ہے، تو جب فائز! اتنا کچھ سیکھا ہے تو آج بھی باؤس نہیں ہونا۔ اگر جاب نہیں ملتی تو اس سے بھی کچھ سیکھ لیتا۔“ فائز نے خود ہی دل کو سمجھایا۔

اس نے سوچ لیا تھا ابھی تو ایک لمبا سفر تھا جس کے بعد منزل آئے گی۔ زندگی کے بہت سارے تجربوں میں ایک آج کا تجربہ بھی سہی کہ آپ خالی ہاتھ بغیر کسی رشوت، سفارش کے جاب کے لیے پہنچ جائیں اور آپ کو جاب مل بھی جائے۔

ہے تو ناقابل یقین سی بات۔ لیکن شاید اتنی بھی نہیں۔ اس نے باہر نکل کر آنا، ہوا میں گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔

زندگی غیر متوقع طور پر اگر کچھ لیتی ہے تو بہت دفعہ اس سے زیادہ نواز بھی دیتی ہے۔ گزرے وقت کی جدوجہد میں اس کی بھلا کے لیے۔

ایک وقت ایسا بھی آتا ہے۔ جب خوشی کو آپ خوشی کی طرح لیتا چاہتے ہیں۔ اور سما ہوا دل خوش نہیں ہو پاتا۔ ان ہی متضاد کیفیت میں گھر کر اس نے زویا کو فون کر دیا شاید وہ اپنی باتوں سے اسے سنبھال لے۔ اس کے دل کو حوصلہ دے سکے۔

زویا نے ساری خبریں سکون سے سنی۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اس نے نارمل لہجے میں کہا۔

”تمہیں یہ جاب ملتی ہی تھی۔“

”ایک تم اور دوسری امی دونوں کو بری بات کی پہلی خبر ہوتی ہے۔“ اس نے چڑکر کہا۔

زویا اس کے لہجے پر ہنس پڑی۔ ”بے وقوف! سامنے کی بات ہے۔ تم اپنا ایک دم ریکارڈ تو دیکھو اور پھر فائز! تمہارے اندر بھی اتنی خوبیاں ہیں۔“

”یہ خوبیاں صرف تم کو ہی نظر آتی ہیں۔“ ”کیا کہہ سکتی ہوں۔ سولے اس کے کہ یہ تو میری خوش قسمتی ہے۔“ زویا نے شرارت سے کہا۔

”نہ جانے کون کس کی خوش قسمتی ہے۔ ویسے تم لوگوں نے علی سے میرے بارے میں بات کر لی ہے نا؟“

”ہاں بھئی! امی نے کی تھی پھر علی نے مجھ سے پوچھا۔“

”زویا! تم لوگوں میں بہت دوستی ہے نا۔“

”ہاں! ہم دو ہی تو بہن بھائی ہیں۔ اب کیا اس میں بھی دشمنی کر سکتے۔“

”بات دوستی دشمنی کی نہیں ہے زویا! انسان کے پاس رشتے موجود ہوتے چاہئیں۔ جن سے آپ دوستی یا دشمنی کا رشتہ بنا سکیں۔ لا تعلقی بہت اذیت دیتی ہے۔ جب ہم لوگ اس گھر میں آئے تھے زویا! تب میں اتنا برا نہیں تھا۔ میں لوگوں کو اور روتیوں کو اتنا نہیں جان سکتا تھا کہ وہ لوگ جو کل تک ہمارے بہت اپنے تھے وہ ہم سے ایک دم لا تعلقی کیسے ہو گئے۔ انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں بھی رکھا۔ میری ماں کی جو واحد خواہش تھی انہوں نے اسے بھی پورا کیا۔ یعنی میری تعلیم اور اس کے اخراجات لیکن یہ سب کچھ بہت لا تعلقی کے دائرے میں رہا اور یہ دائرہ آج بھی ہے۔“

”جو ہوتا ہے فائز! وہ اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے۔“ زویا نے ہمدردی سے کہا۔ ”تمہارے اوپر کسی کا کوئی قرض نہیں ہے۔ آپ پیسوں کا قرض ادا کر سکتے ہیں، محنتیں اور رویوں کا قرض نہیں ادا کر سکتے اور جو چیز تمہارے خاندان نے تمہیں نہیں دی تم بھی اسے ادا نہیں کرنا۔“



”یہاں کسی کو ضرورت بھی نہیں ہے۔ بڑے لوگوں کے دل پتھر کی طرح ہوتے ہیں۔“

”ایسا نہیں ہو گا۔ تم دیکھنا تو سہی۔ اچھی تعلیمی قابلیت، اچھی جاب اور شریف لڑکا۔ آج کل کے دور میں بڑی بات ہے۔“

”مثلاً، کتنی بڑی بات ہے۔“ فائز نے مذاق کیا۔

”کیا بد تیزی ہے۔“

”میں نے تو ایک سیدھا سا سوال کیا ہے۔۔۔ بد تیزی کی کیا بات ہے۔“ وہ مستقل شرارت کے موڈ میں تھا۔

”اچھا بس چپ کر جاؤ۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔“

”بات تو سنو!“ فائز نے اسے روکنا چاہا۔ مگر دنیا فون بند کر چکی تھی۔

وہ ہمیشہ اسی طرح اس کی دل جوئی کر کے ساری باتیں بھلائے پر مجبور کر دیتی تھی پتا نہیں۔ بعض لوگوں کی باتوں میں ہی عجز ہوتا ہے یا جن سے محبت کی جاتی ہے۔ ان کی ساری باتیں ہی اتنی خوب صورت لگتی ہیں۔

فائز نے سوچتے ہوئے گاڑی اشارت کی۔ بڑی مایہ ناز تین چار کام کئے تھے۔ جن کی وجہ سے گاڑی کی اجازت ملی تھی۔ اسی میں اس نے انشورہ بھی منڈایا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ جب لائسنس لیٹر ہاتھ آئے گا تب گھر میں بتائے گا۔ پتا نہیں کیوں لیکن اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اسے علم تھا کہ بڑے ماموں واثق کے لیے تین دفعہ کوشش کر چکے تھے کہ اس کی جاب کسی اچھی ملٹی نیشنل کمپنی میں ہو جائے لیکن ابھی تک ایسا کچھ ہو نہیں پایا تھا اور جب سے شہناز والی بات ہوئی تھی بڑے ماموں اس سے ویسے ہی ناراض تھے حتیٰ کہ سلام کا جواب بھی وہ منہ کے بجائے سر ہلا کر دیتے تھے اور اب یہی بات۔

وہ بڑے ماموں کی عزت بھی کرتا تھا اور ان کا احترام بھی۔ کچھ بھی تھا انہوں نے اس کی پڑھائی کے اخراجات برداشت کیے تھے اور فائز نہیں چاہتا تھا کہ

اس کے کسی بھی عمل سے ان کو تکلیف پہنچے۔

☆ ☆ ☆

اور جس دن اس کے ہاتھ میں لائسنس لیٹر آیا۔ وہ اسی کو بتانے کے بعد سیدھا بڑے ماموں کے پاس ہی گیا تھا۔

اس وقت سب لوگ شام کی چائے پی رہے تھے۔ وہ اس طرح کبھی ان سب لوگوں کے سامنے نہیں گیا تھا۔ نہ کبھی وقت نے مہلت دی نہ حالات نے۔ آج صرف وقت بدلا تھا، حالات وہی تھے۔ سب نے حیرت سے فائز کو آتے دیکھا اور چپ ہو گئے۔

ساریہ جلدی سے اپنی کرسی سے اٹھی اور فائز کے آگے کرسی رکھی۔

”نہیں! ٹھیک ہے۔“ فائز نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ اس نے لیٹر بڑے ماموں کے سامنے رکھ دیا۔ ان کے منہ میں اس وقت ہنس پڑا ہوا تھا۔ ایک نظر انہوں نے لیٹر پڑا۔ ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ پھر انہوں نے اپنے تاثرات چھپا لیے۔

”بہت مبارک ہو!“ انہوں نے اٹھ کر اس کا کندھا تھپکا۔

فائز کو احساس ہوا اس وقت یہ بھی بہت تھا اس کے لیے۔

وہاں بیٹھے سب لوگ ایک ایک کر پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آخر ایسی کیا بات ہوئی کہ انہیں کھڑے ہو کر مبارک دینا پڑی۔

شائے بھی حیرت سے سارا منظر دیکھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کا باپ جتنے بڑے عہدے پر ہے وہ ایسے ہی کسی چھوٹی سی بات کے لیے نہیں کھڑا ہو گا اور فائز کی کتنی ہی بڑی بات ہو وہ اس کے لیے کسی اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ وہ وہیں بیٹھی پاؤں جھلاتی رہی۔

”چلو اچھا ہے۔“ چھوٹی مامی نے لمبی سانس لی۔

”بے چارے کی جاب ہو گئی۔“

صرف جاب نہیں ہوئی ابی! ساریہ نے دور جانے

ہوئے فائز کو دیکھا۔ بہت اچھی جاب ہوئی ہے۔ جس کمپنی میں فائز گیا ہے وہاں اسے بنگلہ گاڑی سارے الاؤنسز ملیں گے۔“

”سب بکو اس ہے۔ کیا پرائم فیکٹر لگ گیا ہے۔“ چھوٹی مامی کو ذرا جو شین آیا ہو۔

”یہ بات نہیں ہے ابی! اب دنیا بڑی بدل گئی ہے۔ ہر چیز انجوشن پر ہے۔“

”اچھا! تو کس وقت پڑھتا تھا، نہ کبھی کالج، نہ یونیورسٹی۔“

”ہی! ساریہ! آگیا گی۔“ آپ اتنی جرح کس لیے کر رہی ہیں، اپنی آنکھوں سے ثبوت دیکھ تو لیا ہے۔ ہمارے بھائی اس طرح نہیں پڑھ سکتے تو اس کا یہ مطلب یہ کہاں سے نکلتا ہے کہ فائز بھی پڑھ نہیں پایا ہو گا؟“ ساریہ نے چڑ کر کہا۔ اس وقت تو وہ خاموش ہو گئیں۔ لیکن جب بچن میں لگیں اور عابدہ کو کام کرتے دیکھا تو ان کی زبان خاموش نہیں رہ سکی۔

”عابدہ! اب تمہیں کیا ضرورت ہے اتنا کام کرنے کی۔“

”کیوں چھوٹی بھابھی؟“ عابدہ کی سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا کہ آج اتنی مہربانی کس لیے کہ کام سے منع کیا جا رہا ہے۔

”اب زیادہ معصوم نہ بنو۔ اب تو فائز کو بڑا عہدہ مل گیا ہے۔“

”ہاں بھابھی! سب اللہ کا کرم ہے۔ اس کی عطا ہے۔“ انہوں نے خوشی سے کہا۔ ”لیکن اس کا کام سے کیا تعلق ہے۔ آپ تو جانتی ہیں یہاں سب کو میرے ہاتھ کا کھانا چاہیے۔ بھائی جان کو تو بالکل بھی کسی اور کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند نہیں۔ اور خود مجھے بھی عادت ہو گئی ہے۔ اپنے بچوں کے لیے خود اپنے ہاتھ سے بنانے کی۔“ وہ مسکرائیں۔

”اچھا اچھا!“ چھوٹی بھابھی نے منہ ہی منہ میں پردہ دار آہستہ سے کہا۔ ”کتنی میٹھی میٹھی باتیں کر رہی ہے، مجال ہے جو کانوں کان خبری ہو۔ جیسے ہم منع ہی تو کر دیتے۔“

”چھوٹی بھابھی! آپ کو کچھ چاہیے؟“ وہ سمجھیں ان سے کچھ کہا ہے۔

”نہیں بھئی۔“ وہ تنگ گئیں۔

”پتا نہیں سب کو کیا ہوا ہے، کوئی صحیح طریقے سے بات ہی نہیں کر رہا ہے۔ کیا کوئی نیا حساب کھلنے کو ہے۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

فائز نے تو کہا تھا کہ ابی! اب آنکھوں میں آنسو نہیں آنے چاہئیں۔ یہ آنکھیں بہت رو چکی ہیں۔ اب وہ اپنے پیارے بیٹے کو کیا بتائیں کہ آنکھوں اور آنسوؤں کا کوئی بہت پرانہ رشتہ ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے کبھی خالی ہی نہیں ہوتیں۔ انہیں رات کا واقعہ یاد آگیا۔

رات کو اچھی خاصی سردی تھی اور وہ شاید کوئی خواب دیکھ رہی تھیں۔ چاروں طرف پھیلا صحرا اور سر پر پتی دھوپ۔ ان کے پاؤں لوہان تھے اور حلق میں پیاس سے کانٹے سے اگ آئے تھے۔ دو گھونٹ پانی، صرف دو گھونٹ انہیں چاہیے تھا، جس سے ان کا حلق گھل گیا اور وہ مرے سے بچ جائیں۔

ان کے ہونٹ تلے، لیکن منہ سے آواز نہیں نکل سکی اور اگر نکلی تو اتنی آہستہ کہ شاید ان کے کان بھی نہیں سن سکے۔

لیکن فوراً ہی خواب کا یہ حصہ ختم ہو گیا۔ اب ان کے سامنے کوئی اور ہی خوب صورت دنیا تھی۔ کوئی ایسی دنیا جس کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ خوب صورت حسین وادیاں، بہتے جھرنے، فلک بوس حسین چوٹیاں، دودھ کی طرح سفید مٹی پالی۔

خواب دیکھتے دیکھتے کب وہ کمری نیند کی وادیوں میں اتر گئیں انہیں کچھ پتا ہی نہیں چلا۔

صبح فجر کی نماز کے وقت آٹھ گھنٹے پہلے سے پہلے نگاہ ان کی سرہانے پر بیٹھے فائز پر گئی، قریب ہی طشتری سے ڈھکائی کا گلاس موجود تھا۔ ان کو اٹھتا دیکھ کر فائز ان کے قریب آگیا۔

”رات کو کیا ہو گیا تھا؟“

”کچھ نہیں۔۔۔ بتاؤں گی، مگر تم کیا رات سے یہیں



بیٹھے ہوئے ہو؟

”تو کیا کرتا ہی!؟“ فائز نے سادگی سے کہا۔ ”میں سونے کے لیے لیٹ گیا تھا“ آپ نے پانی مانگا، میں فوراً ہی لے کر پہنچا مگر آپ نے خبر سو رہی تھیں اور آپ کے چہرے پر اتنا سکون تھا کہ مجھے اٹھانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی، میں پانی لے کر بیٹھا رہا کہ آپ کی آنکھ کھلے تو آپ کو دوں۔“

”فائز۔۔۔“ وہ اسے دیکھتی رہ گئیں۔ ماں کے لیے محبت کی وہ کہانی جو اولیاء نے لکھی تھی، جتنی سچی بن ذکریا کی ماں خوش نصیب تھیں۔

باہر موزن کی اللہ اکبر کی خوش بیاں آواز تھیں۔ صبح کا پھیلتا دم ہم اجالا اور کہیں بہت اندر سے فلکی دعا کی آواز۔

”اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے فائز! نیا و آخرت دونوں میں فلاح پاؤ۔ ایک ماں کے پاس اس سے زیادہ نہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

\*\*\*

باہر سردیوں کی شام کی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اتفاق تھا کہ گھر میں آج کوئی بھی نہیں تھا۔ بڑے ماموں گالف کلب گئے ہوئے تھے امی اور چچی جان کا پروگرام بھی کافی لمبا تھا۔ فائز اور پچھو جس ڈاکٹر کے پاس گئے تھے وہاں سے تین گھنٹے کے بعد ہی واپسی ممکن تھی۔

آذر نے کتنی دفعہ کہا تھا کہ شہنا مجھے کبھی گھر بلاؤ، اس وقت جب کوئی نہ ہو، ایک دفعہ گھر سے مانوس ہو جاؤں گا تو پھر گھر کے لوگوں سے بھی ہو جاؤں گا۔“ شہنا کی صرف اتنی بات سمجھ میں آئی کہ وہ گھر آنا چاہتا ہے۔ وہ اس کا گھر دیکھنا چاہتا ہے۔ اور آج اچھا موقع تھا۔

اس نے آذر کو فون کر دیا۔ اس سے ملے بہت دن بھی تو ہو گئے تھے۔ اس سے باتیں کیے ہوئے، اس کو دیکھے ہوئے، شہنا فون کرنے کے بعد تیار ہونے چلی گئی، آج اس کو پہلی دفعہ گھر آنا تھا اور وہ بہت اچھا تیار

ہونا چاہتی تھی۔ آذر نے کہہ دیا تھا کہ شاید اس کی ماما کے آنے میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ اس بات کو کہہ کر اس نے گزری ساری ٹکٹوں کا زالہ کر دیا تھا۔ وہ ساری ٹکٹیں جو اس نے محبت میں اٹھائی تھیں۔ وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں بھولی تھی لیکن اب جیسے سارے جلتے زخموں کو سکون آ گیا تھا۔ صرف دس بارہ روز کی ہی توبت رہ گئی تھی۔

شہنا نے جلدی جلدی بالوں سے رد لرز نکالتے ہوئے آخری بار اپنا جائزہ لیا۔ آئینہ کہہ رہا تھا، وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ آذر کو اس پر بلیک کٹر اچھا لگتا تھا، سو اس نے اسی کٹر کا سٹو پہنا تھا۔ وہ اپنی تیار یوں میں اتنی محو تھی کہ وہ خوف بھی دل سے نکل گیا کہ اگر کوئی آجائے گا تو وہ کیا جواب دے گی۔

”یہی ہو گا نا، پلٹا غصہ ہوں گے تو پلٹا سے کہہ دوں گی، آپ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اب پاپا کو اپنی اولاد پر اتنا اعتماد تو کرنا ہو گا اور آذر اتنا زبردست بندہ ہے کہ وہ اس کو ناپسند کر ہی نہیں سکتے۔“

وہ سوچتی رہی اور شام ڈھلتی رہی۔ لیکن آذر نہیں آیا۔

ایسی کیا بات ہو گئی۔ وہ چلے پھر کی بل کی طرح گھر میں گھومتی رہی۔ فون بھی نہیں کر سکتی تھی۔ آذر چڑ جاتا تھا۔ وہ کہتا تھا میں غلام نہیں ہوں شہنا کہ جس وقت کوئی حکم دے اور میں حاضر۔

پھر بھی اس نے ہمت کر کے ایک گھنٹے بعد فون کر لیا۔ لیکن فون آف جا رہا تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ ”کیا بات ہو گئی۔“ وہ جنونی کی طرح نمبر پر پلس کرنے لگی اور ہر بار ایک سرد مہر آواز نے اس کا استعمال کیا۔

”آپ کا مطلوبہ نمبر بند جا رہا ہے۔“ وہ بری طرح جھنجھلا گئی۔ اس نے فون دیوار پر دے مارا۔ فون کھل گیا اور اس کی ہڈیوں پر دھڑکا۔

بہت دیر بعد ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو دیوار پر مارا ہوا فون اس نے بیٹھ کر سمیٹا۔

”اگر وہ فون کرے گا تو اسی پر کرے گا۔“ ہم لگاتے

ہی آذر کا فون آ گیا۔ وہ اس طرح غصہ نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت غصے میں تھا۔ ”میں خود اتنا پریشان تھا اور تم ہو کہ فون بند کر کے رکھا ہوا ہے۔ مسئلہ کیا ہے آخر؟“

”وہ۔۔۔“ اپنی کوئی غلطی نہ ہوتے ہوئے بھی وہ ہلکا گئی۔ ”تم آئے کیوں نہیں؟“

”میں آئی تو رہا تھا۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”مگر مجھ سے ایک ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہی جھگڑ رہا ہوں۔“

شہنا کے پاس بولنے کے لیے کچھ رہا ہی نہیں۔ وہ خاموش ہو گئی۔

”حد ہو گئی۔“ اس نے اپنے آپ کو دل میں ڈانٹا۔ ”سب صحیح کہتے ہیں۔ میں بہت جذباتی ہوں۔ ایک لمحے کو بھی کوئی بات نہیں سوچتی ہوں۔“

”اچھا! پھر کب آؤ گے؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ہاں۔“ آذر کا موڈ ایک دم خوش گوار ہو گیا۔ ”یہ تو تم بتاؤ گی۔ کب آؤں؟“

”دو شایاں ہیں جن میں سے ایک شادی پر تو سب لوگ ضرور جائیں گے۔ بس اس دن آ جاؤ۔“

”جلو ٹھیک ہے۔“ ”صحیح سے گاڑی چلانا۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی آذر! کہ آج کیا ہوا۔“ اس کے لہجے میں آذر کی کھل گئی۔

”مجھے پتا ہے شہنا! میں جانتا ہوں تم نے میرا بہت انتظار کیا ہو گا۔ لیکن کبھی مجبوری بھی ہو جاتی ہے نا۔“ ”محبت مجبوری کو کب سمجھتی ہے۔“ شہنا نے دل میں سوچا۔

اس ڈیڑھ گھنٹے میں کتنے ہی خیالات آئے تھے جن کے متعلق سوچ کر بھی یوں لگتا تھا جیسے دم نکل جائے گا۔ محبت میں بے وفائی کا دھڑکا تو ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

اور صرف دو دن بعد جب وہ اس سارے واقعے کو سوچنے بیٹھی تو اسے ہنسی آئی۔

”حد ہو گئی بدگمانی کی۔“ اس نے دل میں سوچا۔ صرف ایک گھنٹے میں دل نے کیا کچھ نہیں سوچ لیا تھا۔ حالانکہ ایک گھنٹے میں کوئی کیسے بدل کر سکتا ہے۔ ”تم کیوں نہیں رہی ہو۔“ ساریہ نے اسے بغور دیکھا۔

”کچھ نہیں۔ تم بتاؤ کیا کر رہی تھیں؟“ اس نے بات پلٹ دی۔

”کچھ خاص نہیں۔ شادی میں پہننے کے کپڑے سلیکٹ کر رہی تھی۔ تم نے کیا سوچا ہے کیا پنوں کی؟“ اس نے کپڑے پلٹتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ بھی۔“ اس نے ساریہ کو بلا۔ ”تم تیاری کرو، تمہارے تو سسرال والے بھی ہوں گے۔“

”ہوں۔“ ساریہ کے چہرے پر شرمیلی مسکان ٹھہر گئی۔

شہنا نے بغور اسے دیکھا۔ وہ کوئی خاص خوب صورت نہیں تھی۔ لیکن شرم و حیا کے امتزاج نے اس کے چہرے کو بڑی بیاری سی چمک دی تھی۔

”پتا نہیں ایسی چمک میرے چہرے پر کب آئے گی۔ شاید چند روز یا بیس دن بعد تاں اس نے انگلیوں پر حساب لگایا۔

\*\*\*

”آپ لوگ چلے جائیں۔ میں ڈرائیور کے ساتھ آ جاؤں گی۔“ فائز جی جاب کے بعد بڑے ماموں نے ڈرائیور رکھ لیا تھا۔

”امی! آپ ہر بات کو اتنا ایشیون نہ بنایا کریں۔ میں کوئی منہ پی پی نہیں ہوں۔ آ جاؤں گی۔“ اس نے بد مزیزی سے کہا تو بڑی بھابی خاموش ہو گئیں۔ وہ اولاد کے آگے اسی طرح کمزور پڑ جاتی تھیں اور شہنا اس کے منہ کون لگتا ابھی ان کا اتنا دماغ نہیں خراب ہوا تھا۔

”سب امجد صاحب کا کیا دھرا ہے۔ سر پر چڑھا رکھا ہے اولاد کو۔ یہی وجہ ہے کہ اب کسی کے گھنے میں نہیں ہے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ اگر امجد صاحب اسلام آباد نہیں گئے ہوتے تو ابھی ان کی ان



سے جھڑپ ہو جاتی۔

\*\*\*

آج چار دن ہو گئے تھے۔ یہ وہ گھر نہیں تھا۔ جسے گھر کہا جاسکتا۔ شاید کوئی آسیب زدہ مسکن تھا یا پھر وہ جگہ جہاں بھوتوں کا قیام ہوتا ہے۔

اس معاشرے میں بہت سارے بھوت ہوتے ہیں جو وقت پڑنے پر اپنے مکروہ چروں اور لمبے لمبے ناخنوں کے ساتھ حملہ آور ہوتے ہیں۔

گھر میں کوئی ایک دوسرے سے بات نہیں کرتا تھا۔ سب لوگ بہت بہت آہستہ آہستہ چلتے۔ آہستہ آواز میں بات کرتے یوں لگتا جیسے یہ میت کا گھر ہو۔ اداس اور سوگوار صرف وہی گھر نہیں ہوتے جہاں کسی کی موت ہو گئی ہو۔

بہت سے لوگ جیتے جی بھی مر جاتے ہیں جیسے شہینا کے ساتھ ہوا۔

”اے اللہ! اسی طرح تو یہ سناٹا لو۔ کوئی تو زندگی کی لپید لے کر آئے۔“ ساریہ دل ہی دل میں دعا مانگتی۔ ”لیکن دعائیں کیسے قبول ہوں۔ دعاؤں کی قبولیت کا راستہ تو ہم نے خود اپنے اعمالوں سے بند کر دیا ہے۔ اب نہ کوئی روزن ہے نہ امید کا کوئی درے۔“ ساریہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں بند کیں، ویسے ہی کوئی فلم تو اسے آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔

کیمبرے کی لائٹس، ٹائیک پکڑے ہوئے رپورٹر، ان کے تیز تیز سوالات، نیم بے ہوش شہینا اور بی وی میں کرائم سین میں چلنے والی رپورٹر۔

”متول اور یا اثر خاندان کی لڑکی نے آشنا کے ساتھ مل کر گھر میں ڈکیتی کروائی۔ ملزم اور تقریباً ”ستر تو لے سونالے کر فرار۔“

پتا نہیں اور کب تک یہ ڈرامہ چلتا کہ امجد صاحب نے فوراً ”اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے یہ ساری رپورٹس بند کروائیں۔“

مگر جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔

سونا بھی گیا۔ سونے جیسی عزت بھی چلی گئی۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو چور نے غلام نے یا آشنا جو بھی نام دیا جائے اس نے ایک احسان تو کم از کم کیا ہی تھا۔ اگر سمجھا جاتا یہ ساریہ کا خیال تھا ورنہ وہ گھر جہاں اس کو دن رات ہاتھ اٹھا کر اور دامن پھیلا کر بد دعائیں دی جاتی ہوں، وہاں ایسی بات کہنا جو شیر لانے کے مترادف تھا۔

لیکن اس نے ایک دن دل کڑا کر کہہ ہی دیا تھا۔

”تائی امی! شکر کریں۔ کم از کم شہینا کی عزت تو محفوظ رہ گئی۔“ لیکن انہوں نے اس کے لئے لیے۔

”کون سی عزت کی بات کرتی ہو بی بی! سارے زمانے میں ڈنگے بچ گئے۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے اللہ سمجھے گا ان میڈیا والوں سے۔ آدھے گھنٹے میں سہلکے مجھایا۔ وہ تو میں دعا دیتی ہوں فائز کو کہ اس نے کتنی عقل مندی سے کام لے کر سارے واقعے کو خود سنبھالا اور نہ انی دی والوں کا بس چلتا تو وہ تو شہینا کی بھی تصویریں چلوایے۔“

فائز کے ذکر پر ساریہ کو یاد آیا۔ وہ اس واقعہ کے بعد بالکل چپ ہو گیا تھا۔ بات تو وہ پہلے بھی کم کرتا تھا لیکن چاب ملنے کے بعد جو اس میں ایک خوشگوار تبدیلی آئی تھی وہ تبدیلی بھی کھو گئی تھی۔

”پتا نہیں۔ ہم لوگوں کو اور کیا کیا کچھ کھوتا ہے۔“ اس نے گہری سانس لے کر سوچا۔

شہینا اس دن تک ہسپتال میں رہی وہ جو زندگی بھر لاڈلی رہی تھی۔ اس کو جتنی سزا مل رہی تھی اور مل چکی تھی۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

ساریہ نے شہینا کو بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس کے چہرے پر ابھی بھی زردی ہی ثبت تھی۔

”شہینا! تمہارے لیے جوس لے کر آؤں؟“

”نہیں۔“ شہینا نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ سر کے اشارے سے ہی جواب دیتی تھی۔

جانے وقت کا وہ کون سا لمحہ ہوتا ہے جب انسان

اپنی آواز بھی سننا نہیں چاہتا۔

دیوار کے اس پار دیکھنا نہیں چاہتا۔

اور پھر دنیا دیوار کے دوسری طرف رہ جاتی ہے اور آپ بالکل اکیلے رہ جاتے ہیں۔

یہ وہ ساری باتیں تھیں جو زویا نے فائز کی اس کزن کے حوالے سے سوچی تھیں جس کی وجہ سے فائز پریشان تھا ویسے بھی یہ وہی لڑکی تھی جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ پریشان رہتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بہت پوچھنے پر زویا کو بتایا تھا۔

”اس کی زبان سے لفظ ادا نہیں ہوتے کوئی زہر جیسی چیز ہوتی ہے۔“

آج بھی پریشانی کا باعث وہی لڑکی تھی۔ بس اس کی نوعیت بدل گئی تھی۔ زویا نے اسے پرسکون رہنے کا کہا تو وہ چپ ہو گیا۔

”اپنے گھر کے حالات سے لا تعلق نہیں رہ سکتے زویا!“

”میں نے لا تعلق ہونے کا کب کہا ہے۔“ زویا جھنجھلا گئی۔ ”لیکن تم بلا وجہ شہینا کی اتنی شیشیں نہیں لو۔“

”ہر چیز اختیار میں کب ہوتی ہے۔ تم یقین نہیں کرو گی زویا! کہ گھر کے حالات بڑے عجیب ہو گئے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کے رویے کی وجہ سے کبھی اس گھر کو اپنا نہیں سمجھا۔ لیکن اب بڑی عجیب بات ہو گئی ہے۔“ فائز کے چہرے پر شکنوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔

”بڑے ماموں اس وقت اسلام آباد میں تھے جب یہ سارے حالات ہوئے۔ پھر بہت ساری چیزوں کو فیس کرنا پڑا۔ انہیں سنبھالنا پڑا۔“

”پھر یہ تو اچھی بات ہے نا۔“ زویا نے نا سمجھی سے کہا۔

فائز نے پھر چکر کر کہا۔ ”یہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ اچھی بات ہے۔“

”مسئلہ کیا ہے فائز! اب کے زویا نے نری سے کہا۔

”مسئلہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن سب لوگوں کے رویے بدل گئے ہیں اور میں اس تبدیلی کو قبول نہیں کر پارہا ہوں۔ آپ چچن سے ایک چیز ٹیک رویے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس تکلیف اور دکھ میں بھی آپ جینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ زندگی کسی نہ کسی طرح چل ہی پڑتی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے یہ کسی اور کے لیے۔“

”مگر فائز یہ بھی تو تم ہی ہو۔“

”نہیں! یہ میں نہیں ہوں۔ یہ میرا عہدہ ہو سکتا ہے مگر میں نہیں۔ میں تو وہ تھا ایک کمزور تھا، اداس لڑکا جس کی ماں ہر بات صرف اس لیے برداشت کرتی تھی تاکہ اس کے بیٹے کی بڑھائی جاری رہے۔“

زویا نے اسے بولنے دیا۔ کئی حالات کے کتنے کڑے گھونٹ ہوتے ہیں جنہیں آدمی پیتا رہتا ہے اور پھر پیتا ہی نہیں چلتا کہ وہ ساری چیزیں کب زہر بن جاتی ہیں۔

اس کی آنکھوں کی اداسی اتنی گہری تھی کہ زویا نے کچھ بھی سمجھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

”اچھا چلو آؤ فائز! کھانا کھا لو۔ امی نے آج کو فٹے بنائے ہیں۔ علی کو بہت پسند تھے۔“

”اچھی بات یہ ہے کہ کھانے کے معاملے میں میری اور علی کی پسند بہت ملتی ہے ورنہ پتا نہیں میرا کیا حال ہوتا۔“

”اچھا اب زیادہ مظلوم نہیں بنو۔ آجاؤ!“

فائز نے گہری سانس لے کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ وہ گھر تھا جہاں وہ اس وقت بھی تازہ ہوا میں سانس لے سکتا تھا جب ہر طرف بہت ٹھنڈی تھی اندھیرا تھا اور اب جبکہ تازہ ہوا بھی تھی بہت سارے در بھی کھلے ہوئے تھے اور شاید کہیں روشنی بھی خفخفتی تھی تو اب وہ دل ہی نہیں رہا جواب ان باتوں سے بھل جاتا خوش ہوتا۔ وہ دکھ جو اپنوں سے ملتا ہے وہ غم سارے دکھ جو اکیلے اٹھاتے ہوئے ہوتے ہیں اور ان بہت سنگے رشتوں سے جنہیں دنیا نے کوئی نہ کوئی نام دیا ہوتا ہے، وہ کیسے بھولے جاسکتے ہیں وہ ساری چیزیں جو زندگی



کے ساتھ چلتی ہیں اور اندر تک آدمی کو مار دیتی ہیں۔  
فائز بہت دیر تک سوچتا رہا۔ کھانا کھا کر اسے گھر جانا تھا اور گھر جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔  
اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ لوگوں کے بدلے ہوئے رویے قبول نہیں کر پاتا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا، اس کا ماضی تھا اور اسے بہت اچھا سمجھتا تھا۔  
بھی آیا تھا پھر!

پھر وقت نے صفحہ کیوں پلٹ دیا کیا کہیں کوئی نیازم ہے یا پھر فائز بہت دیر تک سوچتا رہا۔  
ہاں اس کی ماں بہت خوش تھی۔ صرف یہی ایک اچھا پہلو تھا ان ساری باتوں کا اور وہ چاہتا تھا کہ صرف یہی ایک بات اس کا دل سوچ لے۔ اس کی خوشی کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ سچ اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔ ان ہونٹوں کی مسکراہٹ کے لیے۔ اس چہرے کی خوشی کے لیے جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔

مگر زندگی میں سب ہی کچھ کہاں آسان ہوتا ہے۔ زندگی کی بہت ساری مشقیں جمیل کر بہت ساری تکلیفیں اٹھا کر بھی اگر دل خوش نہیں ہے تو کیا فائدہ اس ساری بھاگ دوڑ کا۔

فائز کے رگ و پے میں جیسے تھکن اور اداسی نے جتنے گاڑ دیے تھے۔ وہ جس وقت کمزور تھا تب اس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔

لیکن اب جیسے کوئی چیز اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔ کسی آنے والے خطرے سے آگاہی جو انسانی جبلت ہے۔ وہ سب کچھ جو ہونا ہوتا ہے اور جسے کوئی روک نہیں سکتا۔

\*\*\*

گازی لاک کرتے ہوئے اس نے یونی لائن کی طرف نگاہ اٹھائی وہاں شینا بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی گری سوچ میں گم۔ صرف دو دن پہلے ہی فائز کو شینا سے آؤر کے سلسلے میں بات کرنی پڑی تھی۔ پولیس کو کچھ معلومات درکار تھیں۔

اور فائز کو اس سے بات کر کے پہلے دفعہ اچھا لگا تھا۔ وہ نہیں بدلی تھی۔ اس کا رویہ آج بھی فائز کے لیے تلخی اور حقارت لیے ہوئے تھا۔ کیونکہ وہ بڑے ماموں کی چیتنی اولاد تھی جن کا آج بھی اگنا تھا کہ۔  
”ٹھیک ہے۔ بچوں سے غلطی ہو جاتی ہے اور جتنی دولت بھی گئی۔ وہ اس کے سر کا صدقہ۔“  
اور اس دن فائز نے تلخی سے سوچا تھا کہ ”پھر انسان کیوں نہ مغرور ہو۔ ایسے لوگوں پر تو پھر سب ہی کچھ جتنا ہے۔ ادا دے دہری سے لے کر انداز خود سری تک۔“  
لیکن بس ایک غلطی تو وقت اور زمانہ کر رہی رہا تھا کہ زمانے کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ بچوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں اور یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں۔

\*\*\*

بڑی مایہ مستقل ڈپریشن کی مریض بن گئی تھیں۔ راتوں کو جاگ جاگ کر ان کی صحت تنگ کر رہی تھی۔ رشتے اب آتے نہیں تھے اور جو آتے تھے ظاہری بات تھی وہ اس طرح کے نہیں ہوتے تھے کہ جن کے متعلق سوچا بھی جاسکے۔

گھر والوں نے معاف کر دیا تھا۔ مگر زمانہ گھر والے نہیں ہوتے۔ دنیا کے اپنے حساب کتاب ہوتے ہیں۔ اپنے سبق ہوتے ہیں جن میں سب سے پہلا باب یہی ہوتا ہے کہ کبھی کسی کی غلطی معاف نہیں کرتی۔ سزا دینی ہے اور پھر پوری ہوتی ہے۔

اب جانے کون سزا میں تھا اور کون بڑا میں۔ شینا کو دیکھ کر تو ساریہ کو لگتا کہ اس کے سوا سب ہی سزا کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔

”اللہ جانے بعض لوگ اتنے بے حس کس طرح ہو جاتے ہیں۔ بے حس شاید ہمارا قومی مزاج بن گئی ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے بد صورت رویوں کا احساس ہی نہیں ہوتا۔“

ساریہ نے ذکیہ بیگم کو دوائی کھلاتے ہوئے سوچا۔ رات سے ان کا بی بی بانی تھا۔ جب ذرا ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی وہ پھر سے وہی قصہ لے کر بیٹھ جاتیں۔

ابھی انہوں نے آدمی بات ہی کی تھی کہ فائز اندر داخل ہوا۔ وہ آفس جانے سے پہلے ان کی خیریت ہی معلوم کرنے آیا تھا۔  
اس کے جانے کے بعد وہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

”او! بالکل سامنے کی بات تھی اور سمجھ میں ہی نہیں آئی۔“ انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔  
”کون سی سامنے کی بات؟“ ساریہ نے اچنبھے سے چاروں طرف دیکھا۔

”ارے فائز والی بات۔“ وہ تھوڑا سا مسکرائیں۔  
”فائز والی کون سی بات؟“ وہ اب بھی کچھ نہ سمجھی۔  
”تم نے فائز کو دیکھا ہے؟ ماشاء اللہ کیا رنگ روپ نکالا ہے اور پھر اتنی اچھی پوسٹ۔ گھر کا لڑکا ہمارے احسانوں تلے دیا ہوا۔ شینا کو کسی بات کا طعنہ بھی نہیں دے سکتا۔“ بڑی مایہ نے بیٹھے بیٹھے سارا پلان ترتیب دے لیا۔

غیبت تھا کہ ساریہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اگر کھڑی ہوتی تو ضرور گر جاتی۔ اس سے زیادہ بے تکلی بات کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

شینا اور اس کا رویہ کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ وہ خود کو ابھی بھی کسی شہزادی سے کم تصور نہیں کرتی تھی۔ یہاں صرف پہلی سی دراز پڑی تھی۔ باقی کچھ نہیں بدلا تھا۔ اور ساریہ کے خیال میں فائز بہت اچھا لڑکا تھا۔

لیکن یہ ساری باتیں۔ صرف وہ سوچ ہی سکتی تھی۔ گھر میں جن کا حکم چلتا تھا ان ہی کا چلتا تھا۔ یعنی امجد صاحب کا۔ باقی کسی کو دم ہارنے کی مجال نہیں تھی۔

\*\*\*

فائز اس دن گھر میں داخل ہوا تو اسے غیر معمولی پہل پہل کا احساس ہوا۔ وہ گھر جس میں یوں لگتا تھا کہ کسی آسیب نے قبضہ جمایا ہے وہ گھر آج تھوڑا بہت اپنے اندر بدلاؤ لیے ہوئے تھا۔ فائز کو بڑا اچھا لگا۔

”گھر کو گھر کی طرح ہی لگتا چاہیے، ہنستا مسکراتا۔“ وہ کمرے میں پہنچا تو عابدہ لپک کر اس کے قریب آ گئیں۔  
”فائز! ان کی آواز میں خوشی کا بھرپور تاثر تھا۔

”تمہیں بتا ہے؟ آج کیا ہوا؟“  
”مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟ میں ابھی آفس سے آیا ہوں۔“ اس نے کوٹ بٹنگ کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔  
”ویسے جو بھی بات ہے۔ وہ کوئی بڑی بات ہے۔“  
”بہت بڑی بات فائز! ہم تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس بات کا۔“ وہ بہت خوش تھیں۔

”میں کسی کو نہیں جانتا میں آپ کو جانتا ہوں۔“ آپ کیوں خوش ہیں؟

”میں کیوں خوش نہ ہوں بیٹا! تم نے دیکھا، اللہ نے کیسا دن دکھایا ہے۔ جو لوگ کل تک ہم لوگوں کو کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے، آج وہ شینا کا رشتہ لے کر آئے ہیں۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔“  
فائز کا بیکر کرنا ہوا ہاتھ ایک دم رک گیا۔

”امی! کیا ہو گیا ہے؟“  
”صحیح کہہ رہی ہوں۔ آج میری بھانجی خود چل کر یہاں تک آئیں انہوں نے ہمارے لیے بات کی ہے۔ میں کس منہ سے اللہ کا شکر ادا کروں۔“

”امی! فائز کو اب حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔“ آپ کو پتا ہے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ بہت خوش ہیں اپنی خوش کہ زویا کو بھول گئیں؟“ اس نے ماں کے جگمگاتے چہرے کو ایک دم تاریک پڑتے دیکھا۔

”بیٹا! میں بالکل بھول گئی انسان کو اپنی اوقات سے زیادہ ملے تو وہ یوں ہی ہر بات بھول جاتا ہے۔“ ان کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

”امی! آپ بھی تائیں ساری زندگی معصوم ہی رہے گا۔“

”مجھے بڑے بھیا کو جواب دینا ہے فائز!“  
”امی! جواب آپ کو پتا ہے۔ اور شینا کے لیے رشتوں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔ پتا نہیں بڑے ماموں نے یہ بات کس طرح کر لی۔ ایک دفعہ شینا سے بھی



پوچھ لیتے تو انہیں اپنی لاڈلی بیٹی کا بھی جواب پتا چل جاتا کیا وہ شینا کو جانتے نہیں ہیں۔ ان محترمہ کا مارا سا تو اس آسمان سے ذرا ہی نیچے رہتا ہے ان کا گزارا ہم جیسے لوگوں کے ساتھ کہاں۔

”نہیں نہیں۔“ عابدہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اب وہ بدل گئی ہے۔“

”میں نے بھی اسے دیکھا ہے اور مجھے بھی پتا ہے کہ وہ کتنا بدیل گئی ہے ای! شینا جیسے لوگ کبھی نہیں بدلتے۔ ای آپ کو پتا ہے نا غور یا تکبر اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اس کی شان ہے۔ کسی بندے پر زبا نہیں کہ یہ دو صفات اس کے اندر ہوں اور جو انہیں اختیار کرنا ہے پھر اسے یہ چیز کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“

”تم قسم قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ تم نے تو کبھی ایسی باتیں نہیں کہیں۔“ وہ حیران تھیں۔

”کبھی ایسے حالات بھی تو نہیں سامنے آئے۔“

رات تک فائز کے انکار کی خبر سارے گھر میں پھیل چکی تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

سب ہی لوگ بے یقین تھے حتیٰ کہ خود شینا بھی ششدر رہ گئی تھی۔

اس کے اشاروں پر چلنے والوں کو آج اتنی طاقت مل گئی تھی۔ ان کو اتنی جرات ہو گئی تھی۔ غصے نے جیسے اسے آتش جوالہ بنا دیا۔ وہ شخص جس نے محبت کے نام پر فریب دیا۔ دھوکا دیا اور پھر یوں غائب ہو گیا جیسے کبھی اس کا وجود ہی نہ رہا ہو اس پہ تو اس کا کوئی زور نہیں چل سکا۔

لیکن جو شخص دسترس میں تھا اسے وہ بہت اچھے طریقے سے بتا سکتی تھی کہ شینا کون ہے اور کیا کر سکتی ہے۔

اور اس دن اپنی گزری ہوئی زندگی میں اس نے پہلی مرتبہ فائز کو غور سے دیکھا۔ اس میں اچانک کون سی ایسی خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں کہ اس نے ایک دن میں انکار کھلوایا۔

آج دو دن گزرنے کے باوجود بھی اسے یوں لگ رہا تھا کہ یہ بالکل جھوٹی خبر ہے اور ابھی کوئی بھی اگر کہہ دے گا کہ۔

”شینا! فائز کی تو سمجھو لاٹری ہی کھل گئی ہے۔ ان ماں بیٹے کو تو اپنی خوش قسمتی کا یقین ہی نہیں آ رہا۔ سب فائز کی قسمت پر رشک کر رہے ہیں۔“

لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہاں ساری کی ای ضرور ہاتھ مل کر رہ گئیں۔

”کاش! امیر کو بیٹا اس قابل ہوتا تو اتنی دولت مند حسین لڑکی کو اپنی ہونیا بیٹی اور ایک ان لوگوں کو دیکھو گھر اتنی قسمت کا دروازہ خود اپنے ہاتھوں بند کر رہے ہیں۔“ عابدہ! فائز نے کیوں منع کیا ہے؟ ۴۹ نمبروں نے عابدہ سے پوچھا تھا۔

”وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے اس لیے۔“ وہ بے بسی سے بولیں اور اس سے آگے کا جملہ وہ دل میں سوچ کر رہ گئیں جو فائز نے تلخ لہجے میں کہا تھا کہ۔

”اگر شینا دنیا کی آخری لڑکی ہوتی ای! تب بھی میں اس سے شادی نہیں کرتا۔“

اب اتنے سخت جواب کے بعد پانی کیا بیچ گیا تھا کہ وہ فائز سے کچھ کہیں اور اس جواب کے بعد یہ ہوا کہ گھر کا ماحول جو پہلے ہی تلخ تھا۔ اب تلخ تر بن ہو گیا۔ فضا میں ایسا زہر گھلا ہوا تھا کہ سانس لینا بھی مشکل لگتا تھا۔



اس دن پھر کوئی رشتہ والے آئے ہوئے تھے۔ دولت مند تو تھے مگر نہ لڑکا کسی کو پسند آیا اور نہ ہی خاندان۔ عجیب سے لوگ تھے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد شینا کی امی کو پھر وہ پر گیا۔ انہوں نے کمرے میں رکھی ساری آرائشی چیزیں توڑ دیں۔

”کیا ہو گیا ہے بڑی بھابی کو۔“ عابدہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

”تمہارا کیا ہوا بھگت رہے ہیں۔“ چھوٹی بھابی نے بے رحمی سے کہا۔

”مگر میں نے کیا کر دیا ہے۔“

”ماشاء اللہ لوگ سب کچھ کہہ کر اور کر کے بھی معصوم بن جاتے ہیں۔ آئے دن کے ان ہنگاموں فساد سے جان عذاب میں آگئی ہے۔ میرے بچوں کی بڑھائی اس ماحول کی وجہ سے اور خراب ہو رہی ہے بلکہ ایک بڑھائی ہی کیا۔ سب ہی کچھ داؤ پر لگ گیا۔ اور یہ صرف تم دونوں ماں بیٹے کی احسان فراموشی کی وجہ سے ہے۔ فائز میاں نے ساری زندگی یہاں کا کھانا ماموں کے پیسے سے ساری تعلیم مکمل کی سوچو تو کم احسان نہیں ہیں اور اس احسان کو اتارنے کا وقت آیا تو تم دونوں نے ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔“ وہ برس پڑیں۔

”ایسی باتیں نہیں کریں چھوٹی بھابی! عابدہ رو پڑیں۔“

”ایسی باتیں کرنے پر تم لوگوں نے ہی مجبور کیا ہے۔ یہ تو آج وقت ہی ایسا آ رہا ہے کہ بڑی بھابی اور بھیا کو تم لوگوں کے سامنے سوال کرنا پڑا اور نہ فائز میاں کس دنیا میں اور کس خیالوں میں ہیں اور ابھی تو کچھ نہیں ہوا جب بڑے بھیا واپس پاکستان آئیں گے اور انہیں پتا چلے گا کہ۔“ فائز کو آٹا دیکھ کر انہوں نے بات ادھور ہی چھوڑ دی۔

”بچی جان! آپ کو کچھ اور کہنا ہے تو بتا دیجئے۔ میں تو شاید کچھ دیر اور سن لیتا۔ لیکن شاید میری ماں برداشت نہیں کر سکتی۔“ غصے کی زیادتی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

فائز کی آنکھیں اتنی لمورنگ ہو رہی تھیں کہ عابدہ کو بھی اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے خوف آ گیا۔ انہوں نے ایک دم گڑبڑا کر اس پر سے نظریں ہٹائیں۔

”فائز! کمرے میں آؤ۔“ انہوں نے نظریں ملائے بغیر فائز سے کہا۔

کمرے میں اتنا سکوت تھا اتنی خاموشی جیسے اب قیامت تک یہاں پر کوئی آواز نہیں ابھرے گی۔ اور قیامت ہوئی بھی کیسی ہے آج کسی نے احسان فراموشی کا طعنہ دے کر دل کو اندر تک سے زخمی کر دیا

تھا۔ ان کو لگ رہا تھا جیسے اندر کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ صرف ایک غلابے یہاں سے وہاں تک۔

”فائز! عابدہ کی آوازیں ایسی ٹھنڈی سی کیفیت تھی کہ فائز کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی اور نہ وہ ان کو تسلی دینا چاہتا تھا۔ انہیں بتانا چاہتا تھا۔

کہ جو کچھ چھوٹی مامی نے کہا وہ سب غلط ہے۔ اس نے اور اس کی ماں نے بھی ممکن حد تک اس احسان کی ادائیگی میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ جو انہیں گھر میں رکھ کر کیا گیا اور احسان کے بدلے زندگی نہیں مانگی جانی۔

”فائز! شینا سے شادی کر لو۔“

یہ لہجہ یہ آواز یہ اس آواز میں سب کچھ تھا۔ حکم، احتجاج، مان اور یہ یقین کہ جو بات کہی ہے وہ رو نہیں کی جائے گی۔ عابدہ نے کرسی کی پشت کو بہت مضبوطی سے تھما ہوا تھا۔ اتنی مضبوطی سے کہ ان کی انگلیاں سفید پڑ گئی تھیں۔

”فائز! کیا جواب ہے؟“

فائز نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اپنے سامنے کھڑی ہوئی ماں کو دیکھا۔ اس کے سر کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ وقت بہت بے رحمی سے دونوں پر ہی گزرا تھا۔ وقت نے دونوں کو ہی نوازا تھا۔ وہ جوان تھا۔ اس نے اپنے آپ کو پھر جوڑ لیا تھا۔

لیکن اس کے سامنے جو کھڑا تھا وہ اس کے لیے بے رحم وقت نہیں بننا چاہتا تھا۔ وقت جو صرف دکھ ہے، غم ہے، اذیت ہے اسے اچھی یاد بننا تھا اچھا وقت بننا تھا۔

فائز چپ چاپ کھڑا ان کے جھکے ہوئے سفید بالوں والے سر کو دیکھتا رہا پھر اس نے اس جھکے ہوئے اس وجود کو بیاڑوں میں تھام لیا۔

”آپ جو چاہیں گی اور جس طرح چاہیں گی وہی ہو گا۔“ اس کی آنکھوں میں بار بار دھند چھا رہی تھی۔ مگر اس کا لہجہ مضبوط اور ہموار تھا۔

اس نے ایک دم ہی ساری خواہشوں سے دست برداری اختیار کر لی تھی اور خوابوں سے دامن چھڑا لیا تھا۔ اندر بے شک بہت کچھ ٹوٹا تھا۔ لیکن ایک سکون



کا احساس تو تھا کہ اس نے ہاوس نہیں کیا۔ درد کا احساس بے شک رہ جائے گا، مگر درد بھی زندگی میں بڑے کام آتے ہیں۔ انہیں سنبھال کر رکھ لینا چاہیے۔

فائز نے سوچنے کو بہت کچھ سوچا لیکن وہ اواسی جو کہیں اندر رہ گئی تھی۔ اس نے شاید ساری عمر اس کا یوں ہی ساتھ دینا تھا۔ کبھی اس کو اکیلا نہیں چھوڑنا تھا۔

”نہ جانے زندگی اب کس ڈھنگ سے گزرے۔“ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچا۔ ”اتنی لمبی زندگی اور ایک ناپسندیدہ وجود جس نے ہر قدم پر توہین کی ہو۔ جس کا ہر لفظ حقارت میں ڈوبا ہوا ہو۔ وہ کیسے اس کے ساتھ زندگی کو گزارے گا۔“

بعد کے سارے مرحلے میں اس نے کیسے طے کیے، وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

جس شام اس نے زویا سے آخری ملاقات کی اس دن اسے پتا چلا کہ صرف زندہ انسان ہی سانس نہیں لیتے، مر جانے والے لوگ بھی سانس لیا کرتے ہیں۔

انہوں نے صبح اٹھ کر گھر والوں کو فائز کے فیصلے سے آگاہ کرنا چاہا مگر وہاں سارے ہی لوگ ناراض بیٹھے تھے۔ کسی نے ان کے سلام کا جواب دیا نہ ان کی طرف نگاہ اٹھائی۔

کسی کے چہرے پر ان کے لیے ایک مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔

عائدہ کا دل جیسے اندر تک ٹوٹ گیا۔ یہ کیسے لوگ تھے زندگی میں پہلی دفعہ انہوں نے اپنی مرضی سے کوئی کام کیا تھا۔ صرف اس لیے کہ پہلی بار ان کے بیٹے کی آنکھوں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔

اور وہ اتنی ظالم ماں تھیں کہ انہوں نے سارے خواب اس کی آنکھوں سے نوچ کر صرف اس احسان کا بدلہ اٹارنا چاہا تھا جو جانے احسان تھا بھی یا نہیں۔ دل

اتارنا ہو گیا کہ انہوں نے اپنے لب سی لیے۔ ”جب بھائی جان آجائیں گے۔ تب ہی بات ہو گی۔ ابھی دل کو تھوڑی اذیت اور برداشت کرنے دو۔ وہ خود اذیتی سے سوچ کر رہ جائیں۔“

اس وقت بھی وہ چائے بنا رہی تھیں، جب شہینا کچن میں داخل ہوئی۔ ”میرے لیے بھی چائے بنا دیجئے گا۔“ اس کی آواز میں اتنی کٹھنی تھی کہ کبھی شکوہ نہ کرتے لب بھی بول اٹھے۔

”شہینا! آگے پیچھے بھی کچھ لگتا ہے۔ یا میں اس ایک لفظ پچھو سے بھی گئی؟“

”مجھے نفرت ہے سارے رشتوں سے۔“ اس نے ایک ایک لفظ جپا کر کہا۔ ”اور آپ کو میں کیوں پچھو کہوں جو کچھ آپ نے کیا کیا وہ کافی نہیں ہے؟“

”شہینا! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں امنی تو بولائی گی سے خوفزدہ ہو گئیں۔

”واقعی! کہاں کچھ کیا ہے، صرف میرے ماں باپ کے منہ پر پتھر ہی تو مارا ہے۔“ وہ اپنا زہر دھیرے دھیرے ان پر اندر لے رہی تھی۔

”شہینا بیٹا! تم میری بات تو سنو۔“ وہ ان کی بھتیجی تھی۔ ان کا خون وہ اس کے دکھ سے ناواقف تو نہ تھیں کہ وقت ہی ایسا آ رہا تھا، ورنہ وہ بھی جانتی تھیں کہ اس نے کس درجہ فائز کی زندگی کو زہر بنا رکھا تھا اور اگر آج وہ جھنجھلائی ہوئی تھی۔ تو اس کا مطلب تھا کہ کہیں نہ کہیں برف پگھلی تھی۔

جن کے آئینے صاف ہوتے ہیں، انہیں ہر چیز کی شفاف نظر آتی ہے۔

وہ سمجھ رہی تھیں کہ برف پگھلی ہے انہیں خبر نہیں تھی۔ کہ وہاں صرف احساس برتری ہے اور اب جبکہ فائز نے انکار کیا تھا۔ تو صرف ایک زخم خوردہ آثار رہ گئی تھی۔

اسی وقت فائز بھی اندر آیا۔

”امی! میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ ایک کپ چائے مل جائے گی۔“ اس نے شہینا کو دیکھا

نہیں تھا یا دیکھا تو نظر انداز کر دیا۔

شہینا ہی دل میں بل کھا کر رہ گئی۔ ایک نے دل توڑا تھا۔ دوسرے نے انا کو سولی پر ٹانگ دیا تھا۔ ایک کھو چکا تھا اور دوسرے پر سے اختیار کھونے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے سلگتی ہوئی نظر فائز پر ڈالی اور ٹھنک گئی۔

اس کے چہرے پر حزن کی گہری تہ تھی جس نے اس کے پورے وجود کو اواسی کے پیکر میں بدل دیا تھا۔ ”ابھی سے کیوں فائز صاحب۔“ اس نے بے رحمی سے دل میں سوچا۔ ”ایک دفعہ وقت کی گرفت میرے ہاتھ میں آجائے، پھر میں تم سے اس انکار کا بدلہ لوں گی۔“ اسے پتا تھا اس کا باپ کبھی اس کی کھی ہوئی کوئی بات نہیں مانتا تھا، اتنے بڑے حادثے نے اسے توڑا ضرور تھا مگر اس کی شان اور رعونت میں کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔

وہ اپنے باپ کے لیے ہمیشہ ہی خوش قسمتی کا ستارہ رہی تھی۔ اس کی پیدائش کے بعد ہی دولت نے اس کے گھر کا راستہ دیکھا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اگر آج امجد صاحب نے سب بھلا دیا تھا تو باقی لوگوں کا بھی یہی فرض تھا کہ انہیں بھی اس واقعے کو بھول جانا چاہیے۔

دنیا میں آپ کی پرانی مرضی نہیں ٹھونس سکتے مگر اس کسی میں اس گھر میں رہنے والے اس فرد کو اپنی مرضی کا اختیار نہیں تھا جنہوں نے کبھی نظریں اٹھا کر بات نہیں کی، آج وہ سرسکس طرح اٹھا سکتے ہیں اور اگر انہوں نے سر اٹھانے کی ہمت کر لی تھی۔ تو اسے بہت اچھی طرح سر جھکانا بھی آتا تھا۔

\*\*\*

زویا نے بہت دفعہ نمبر ملایا، مگر ہر دفعہ فائز نے اس کا لبرکٹ دیا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر آنسوؤں پر اختیار ہی کب ہوتا ہے۔ وہ جانتی تھی اس نے جس شخص سے محبت کی ہے۔ وہ اتنا اچھا تو تھا کہ سارے ظلم سارے ستم اپنے اوپر سمجھ لے گا مگر کسی اور کو اس کی

وجہ سے کوئی تکلیف پہنچے، یہ اسے کبھی گوارا نہ ہو گا۔ اس نے کہا تھا۔

”زویا! تمہیں دکھ دینے کا میں کیسے سوچ سکتا ہوں۔ یہ تو بالکل ایسی بات ہے جیسے میں نے۔ آپ کو اذیت دی ہو۔ خود کو سولی پر چڑھایا ہو مگر موت ہی ایسا پڑ جائے تو کوئی کیا کرے۔“

صحیح بات ہے وقت ہی ایسا پڑ جائے تو کوئی کیا کرے۔ آنسو آنکھوں میں آتے تھے۔ مگر وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ رویا تو بے وفائی پر جاتا ہے۔

مگر وہ ایک دردی میں جوتا نہیں کیوں وہ سب کچھ یاد دلاتی جاتی، جو اسے بھولنا تھا۔ محبت کا وہی مقام جہاں مڑ کر دیکھنے پر پتھر کے ہو جانے کی شرط ہے، حالانکہ محبت کے مقدر میں پتھری پتھر ہوتے ہیں۔ چاہے وہ نظر آئیں یا نہیں خود اس نے بھی کب سوچا تھا۔ لیکن شاید تقدیر اسی کا نام ہے سارے فیصلے تو طے شدہ ہوتے ہیں، ہمیں تو صرف راضی و برضا رہنا ہے، ان فیصلوں پر جو اوپر ہو چکے ہوتے ہیں۔

اس نے بے دردی سے رخساروں کو گرزا۔ ”بس بھی کر دو یا ر! اب اور کتنا کیا میری آنکھیں مفت کی مل گئی ہیں۔“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”زویا! امی تجھ کے لیے وضو کرنے اٹھی تھیں۔“

”اکیلے میں کس سے باتیں کر رہی ہو؟“ ”کسی سے نہیں۔“ اس نے ہونٹ کاٹے۔ ”سو جاؤ رات سونے کے لیے ہوتی ہے۔“ انہوں نے پیار سے گھر کا۔

”سونے کے لیے یا رونے والوں کا پردہ رکھنے کے لیے۔ رات نہیں ہوتی تو کس طرح رویا جاتا۔“

”امی! بل بہت گھبرا رہا ہے۔“

”ہو جاتا ہے اس طرح بھی کبھی۔ پریشان نہ ہو۔“ امی نے اس کا ہاتھ چومنا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ ”تجربہ کی نماز پڑھ لو اور دعا مانگو سکون مل جائے گا۔“

”امی! سکون مل جائے گا؟“ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”ہاں بالکل! اس میں کوئی شک ہے ہی نہیں۔“



نماز پڑھ کر زویا بہت دیر تک خالی الذہن بیٹھی رہی۔ دعا کے لیے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور دل میں کوئی دعا نہیں تھی۔

”ابسا نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ میاں جی!“ اس نے ماں کی نظر بجا کر جلدی سے آنسو پونچھے۔ ”جب میں زندہ ہوں تو مجھے زندگی کا مقصد بھی عطا کر۔ میں تیرے حکم پر راضی ہوں۔ تو مجھے اپنی رضاء عطا کر دے۔“ اور جیسے اس کے اندر سے کسی نے کہا۔

”جب راضی ہو گے تو رضاء بھی مل جائے گی۔“ اگر یہ جملہ اس کو سکون دے سکتا تھا تو اس بندے کو بھی دے سکتا تھا جو اس کی طرح بے چین ہو گا۔

مقدّر نصیب بڑی عجیب چیزیں ہیں۔ آپ ان پر سر بھی جھکا دیں تب بھی دل کے اپنے تقاضے ہی ہوتے ہیں لاکھ بھلاؤ، بھلاؤ نہ بھلائے نہ سمجھتا ہے۔

اس نے فائز کو ایس ایم ایس کیا۔ وہ جاگ ہی رہا تھا جب ٹون نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ آج کتنے دنوں کے بعد اس کا میسج آیا تھا۔ ٹون تو اس نے اٹھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

ہر دفعہ اس کی آواز سنتے ہی اس کا ارادہ کمزور پڑنے لگتا۔ دل چاہتا سب کچھ بھلا دیا جائے۔ یہ دنیا اور اس دنیا کے احسان۔ اس کا وقت تو آئے بغیر ہی گزر گیا تھا۔ جب اس نے سوچا کہ اب وقت سے اپنا حصہ طلب کرنا ہے تو وقت نے ایک بے رحم حریف جیسا سلوک کر کے وہیں کھڑا کر دیا۔

اور اب کچھ باقی نہیں رہا تھا نہ کہیں کوئی مقابلہ نہ کہیں کوئی وکٹری اسینڈر منتظر۔ اب کس لیے بھاگا جائے اور کیوں؟ دل کے اندر جو کچھ مرجاتا ہے اس کا مددوار پھر نہیں ہوتا۔ فائز نے دیکھتے سر کو دونوں ہاتھوں میں دیا۔

”ایک واقعہ جس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ کن لوگوں کی غلطی تھی۔ یہ سب کچھ کس کی ذمہ داری تھی اور کس کے حصے میں خسارہ آیا اور وہ بھی اتنے تھوڑے سے وقت میں۔“

\*\*\*

آج بڑے ماموں واپس آ گئے تھے اور انہیں یہ خبر بھی پہنچ گئی تھی کہ فائز نے شہنا سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ بڑی بھانجی، چھوٹی بھانجی، سب لوگ اس گول میز کانفرنس کا حصہ تھے جس میں ان دونوں کے خلاف زہر اگلا گیا۔

”دیکھ لیا نا! میں نہ کہتی تھی کہ ہم آستین میں سانپ پال رہے ہیں۔ دیکھو تو ذرا بھی شرم نہیں آئی۔ پہلی دفعہ ہی کچھ مانگا تھا۔ میں اب ان ماں بیٹے کو ایک منٹ اس گھر میں برداشت نہیں کروں گی۔ شہنا کو بھی اپنی بھینھو کے انکار سے بہت دکھ پہنچا ہے۔“

ایسے تناؤ والے ماحول میں جب بچوں میں آپس میں کوئی ربط نہیں تھا۔ انہوں نے شہنا کا مؤقف بڑے سہاؤ سے پہنچایا۔

شہنا نے رات کو ہی ان سے کہا تھا۔ ”میری شادی فائز سے ہی ہوگی۔ مجھے اس سے اپنی توہن کا بدلہ لینا ہے جو ایک شخص نے میرے ساتھ کر لیا۔ وہی کافی ہے۔ اب دنیا کے کسی اور فرد کو یہ اجازت نہیں دوں گی۔“

ساریہ نے اس کی آنکھوں سے جھلکتی نیم دیوانگی کو دیکھا اور سوچا تھا۔

بعض لوگوں پر سے حادثے بس گزر جاتے ہیں۔ وہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں لاپاتے۔ آج بھی لہجے میں وہی رعونت ہے، وہی تیغی اور حقارت۔ ایک دفعہ تو دل سے اللہ سے معافی مانگی ہوئی۔ ان لوگوں سے معافی مانگی ہوئی۔ جنہیں آج بھی انسانوں کے کٹہرے میں نہیں کھڑا کیا جا رہا۔

”مجھے پتا ہے کیا کرنا ہے۔ کیا نہیں۔“ بڑے ماموں کھڑے ہو گئے۔ ”عابدہ کو میرے پاس بھیجو۔ میں جانتا ہوں، آج تک اس نے کبھی میری کوئی بات نہیں ٹالی۔ اسے ماننا ہی ہو گا اور نہیں تو میرے پاس دوسرے بھی راستے ہیں۔“ آخری جملے تک ان کے لہجے میں بھی رعونت آچکی تھی۔

”جاؤ! عابدہ کو بھیجو کرے میں۔“ عابدہ نے بریانی دم پر رکھتے ہوئے آج کی گھر

کی بہت عجیب سرد مہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اس پر شرابو اسنا تھا۔

”شاید سارے محل نماگھروں کے یہی طور طریقے ہوتے ہوں یا میں ہی آج تک مانوس نہ ہو سکی۔“ انہوں نے دل گرجتی سے سوچا۔

فائز کو بخار آ گیا تھا۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔ بڑے بھیا کو خوش خبری سنائی تھی۔ انہیں اور گھر والوں کو بتانا تھا کہ وہ احسان فراموش نہیں ہیں۔ ان سے جو طلب کیا گیا تھا۔ وہ انہوں نے پورا کر دیا ہے۔

اس کے لیے وہ اور ان کے بیٹے کو حد درجہ اذیت دے سکتا تھا۔ کیوں نہ کرنا پڑا ہو آج پھر ایک بیٹے نے رسم نامائیل نبھادی ہے۔

انہیں وہ رات یاد آئی۔ پانی کا گلاس اور فائز کا اظہار کرنا پھر اپنی دعا جو انہوں نے بڑے صدق دل سے مانگی تھی۔ پھر وہ کیوں قبول نہیں ہوئی۔ وہ کیسے عرش سے واپس آ گئی۔

”یہ تو تمہارے اپنے ہاتھ میں تھا عابدہ! تھوڑی سی محنت کر لیتیں۔“ اندر کوئی بولا تھا۔

”نہیں کر سکتی تھی بہت۔“ انہوں نے آنسو

\*\*\*

”قرض کندھوں پر ہوں۔ احساس کی شدت نے بہت سلب کر لی ہو تو کیسے کھڑا ہوا جا سکتا ہے محبتوں کی اور ان محبتوں سے وابستہ رشتوں کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ مجبوریاں رہ جاتی ہیں۔ جس طرح آج میں

محنت کو ان میں سے نکلتا پڑتا ہے۔ جس طرح آج میں محنت کو اس دروازے پر چھوڑ کر ..... اپنے دل سے نکال کر اندر جا رہی ہوں۔“

رکھنے والی ہونو دیا۔ زندگی بہت کچھ لیتی ہے تو بہت کچھ جانے انجانے میں دے بھی دیتی ہے بعض دفعہ ہم خود کو بھی دھوکا دے لیتے ہیں اور دوسروں کو بھی بھلا لیتے ہیں۔ مگر اس دل تک جس کی رسائی ہے، وہ تو سب کچھ جاننے والوں میں سے ہے۔ وہی ایک لمحے کو ایک بل کو اتنی طاقت





”یہ دیوار میرے بچو! اتم لوگ گراؤ نہ۔ یہ دیوار  
اس گھر کی زمین پر نہیں کھڑی ہوئی۔ یہ دیوار میرے دل  
کرو۔ کہ میں اس کو گرانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔  
میرے بچو! تم دونوں ہی میرا خاندان ہو۔ مجھ سے وعدہ  
کرو۔ کہ تم دونوں آپس میں شادی کر کے اس گھر کی



عطا کر دیتا ہے۔ جس کا گمان بھی بندے کو نہیں ہوتا۔  
جس وقت انہوں نے کمرے میں قدم رکھا تھا،  
بڑے بھیا اپنی سب سے چھوٹی بیٹی سونیا کے ساتھ بیٹھے  
ہوئے تھے۔ وہ اپنی چھوٹی بھئی تھیں۔ مگر بالکل  
شہینا کے نقش قدم پر چل رہی تھی۔ وہی ضد اور مزاج  
میں خود سری۔

اس وقت بھی وہ دفعہ اسے کمرے سے باہر جانے  
کا کہہ چکے تھے مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی۔  
”یاما! میری اس باری کے شوز خراب ہو گئے ہیں۔  
بالکل پتھی میچنگ کے نہیں ہیں۔ آپ مجھے دوسری  
باری لادیں۔ جس کے میچنگ شوز ہوں۔“

”ہاں ہاں! ٹھیک ہے جاؤ۔“ پھر وہ عابدہ کی طرف  
متوجہ ہوئے۔ ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور پتا نہیں کیوں  
ان کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ ہاتھ بھر کے فاصلے کو  
میرا ہر چہ چٹا رہتا ہے وہ سو نہ پاتا ہے اور پھر بھی کھونٹے  
والے کھو جاتے ہیں اور ان کھونٹے والے رشتوں کو  
بچانے کے لیے پھول کاٹوں کر پڑتا ہے۔

”آنسوؤں کو بے وقت آنکھوں میں نہیں آنا  
چاہیے۔ انسان کا سارا بھر م شتم ہو جاتا ہے۔“ انہوں  
نے اپنے آپ کو ڈانٹا لیکن آنسوؤں پر کس کا اختیار  
ہوتا ہے۔ دل کو کون سمجھا سکتا ہے جو ان کے آنسو اور  
دل سمجھ جاتا۔

”عابدہ! میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں۔ ساری  
زندگی تم نے کبھی ہماری کوئی بات نہیں مانی، ہمیشہ  
ہمارے ہر حکم پر سر جھکا یا۔“ بڑے بھیا نے کہنا شروع  
کیا۔ ”لیکن اولاد ہی ناخلف ہو جائے، نا فرمان ہو جائے  
تو ماں باپ کچھ نہیں کر سکتے۔ فائز سے مجھے بھی ایسی  
امید نہیں تھی۔ اب نتیجہ کی ساری ذمہ داری فائز کی  
ہے۔ تم اسے چھوڑ دو۔“

”بڑے بھیا!“ عابدہ نے ان کی غلط فہمی دور کرنا  
چاہی۔ ”انہیں بتانا چاہا کہ وہ فائز کے متعلق ساری باتیں  
غلط کر رہے ہیں۔“

لیکن تقدیر مسکرا رہی تھی۔ اپنا کام کر رہی تھی۔  
”ہم نے تمہاری ذمہ داری پہلے بھی اٹھائی ہے۔“



دیوار کو گرا دوں گے اور میرے دل کے ٹکڑوں کو آپس میں ملا دوں گے۔ وعدہ کرو مجھ سے۔“

حیات بی بی نے لرزتی آواز میں اپنی پوتی حنا اور اپنے بڑے بھائی سے وعدہ لیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بکتے گئے۔ ان دونوں کے دل ایک دوسرے کے لیے دھڑکتے تھے، مگر ایک دوسرے سے انہوں نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ کرتے کیسے بے چارے دونوں کی مائیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی تھیں۔

اظہار اور مظہر حیات بی بی کی آنکھ کے تارے تھے۔ اظہار بڑا اور مظہر ان کا چھوٹا بیٹا تھا دونوں میں بہت پیار تھا، مگر دونوں کی شادی کے بعد گھر کا سکون و رہم برہم ہو گیا۔ اظہار کی بیوی رومینہ سے ناہید جاتی تھی۔ ناہید چھوٹی بیوی تھی اس لیے حیات بی بی ہر کام رومینہ سے پوچھ کر سرانجام دیتی تھیں ناہید کو برا لگتا تھا یہ رومینہ کا گھر پر راج اس لیے تھا کہ وہ پہلے اس گھر میں آئی تھی۔ مگر ناہید نے اس بات کو دل میں بٹھا کر اظہار اور مظہر میں ایسی پھوٹ ڈالی کہ دونوں ایک دوسرے سے جھگڑ پڑے اور گھر کے سمن میں دیوار کھڑی ہو گئی۔ حیات بی بی نے لاکھ اپنے بیٹوں کو سمجھایا، مگر رومینہ اور ناہید کے درمیان جو کڑواہٹ پیدا ہو گئی تھی اس کی وجہ سے انہوں نے ماں کی بات نہ سنی۔ اور بوڑھی حیات بی بی کٹ کر رہ گئیں۔

دس دن وہ اظہار کے پاس گزار تیں اور دس دن مظہر کے پاس۔ دونوں نے ماں کو بے گھر کر کے اپنی اپنی بیویوں کو گھر بخش دیا تھا۔ حیات بی بی نے رومینہ اور ناہید کے دل صاف کرنے کی ہزار کوششیں کیں، مگر دونوں نے ایک نہ سنی۔ رومینہ کے نزدیک وہ درست تھی اور ناہید کے خیال میں وہ حق پر تھی۔ رومینہ کو اللہ نے بیٹے سے نوازا تھا۔ اور ناہید کے گھر میں خدا نے چاند سی بیٹی دی۔ یہ حیات بی بی کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ وہ ناہید کے گھر میں بیٹی دیکھنا چاہتی تھیں تاکہ وہ ناہید کی بیٹی حنا اور رومینہ کے بیٹے سعد کی شادی کروا سکیں اور اس طرح اپنے گھر کی دیوار کو گرا سکیں۔

سعد اور حنا ایک اسکول میں پڑھتے تھے۔ سعد حنا

سے تین سال بڑا تھا۔ داوی کے کہنے پر وہ حنا کا اسکول میں خیال رکھتا تھا۔ چنانچہ سعد کو اپنا بھتیجا اور پھر بڑے عمر کے ساتھ ایک خاموش محبت کا دیوانہ کے وجود میں آئے لگا۔

حیات بی بی کو سردی کی وجہ سے نمونیا ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں میں نمونیا بگڑ گیا اور ان کی حالت کافی خراب ہو گئی۔ اپنی آخری سانسوں میں وہ حسرت بھری نظروں سے دیوار کو دیکھ کر ان دونوں سے وعدہ مانگ رہی تھیں۔

سعد نے داوی کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے بولا۔  
”داوی جان! آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ فکر مت کریں۔ یہ دیوار گر جائے گی۔ آپ جو چاہتی ہیں ویرا ہی ہو گا۔“

حیات بی بی نے ایک لمبی آہ بھر کر اپنا کانٹا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور حنا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”میری چاند سی پوتی! کیوں رو رہی ہے۔ سعد بڑے خوشحال ہی خوشیاں دے گا۔“

حیات بی بی نے حنا کا ہاتھ سعد کے ہاتھ میں دے کر پیار سے کہا تھا حنا نے مضبوطی سے سعد کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ سعد کو احساس دلانا چاہتی تھی کہ وہ بھی اس محبت کرتی ہے۔ سعد مطمئن سا ہو گیا۔ اس سے کہا کہ وہ داوی کو تسلی دیتے حیات بی بی اللہ کو پیار دی ہو گئیں۔ حنا نے پھوٹ پھوٹ کر رونے شروع کر دیا۔ اظہار اور مظہر اپنے رشتہ دار کے قل شریف کے پرگئے ہوئے تھے۔ حنا اور سعد نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ وہ اپنی داوی کی خواہش پوری کریں اور پھر سے اس خاندان کو ایک کرویں گے۔

حیات بی بی دنیا سے چلی گئیں، مگر اپنے گھر کی حفاظت کے لیے دو سپاہی پیچھے چھوڑ گئیں۔



تین سال گزر چکے تھے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان چلی بدستور تھی۔

یہ چھت پر کیا لے کر گئی تھیں؟“ حنا سیر پھیل اتر رہی تھی جب اس کے ہاتھ میں خالی پلیٹ دیکھ کر ناہید نے غصے سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ چڑیوں کو چاول ڈالنے لگی تھی۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ تم بریانی اس خفیہ تھے انسان کو دے کر آئی ہو۔“ ناہید نے غصے سے کہا۔ حنا مسکرا کر بولی۔

”اماں! اس کا مطلب ہے کہ میں بھی خفیہ اور نکمی ہوں اس لیے کہ جو خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے شاید وہ میری رگوں میں بھی دوڑتا ہے۔“

”شاید۔ یہ تمہارا شاید ہے کیا مطلب ہے؟“  
”اوہ اماں! منہ سے نکل گیا۔ آپ ایک بات کو پکڑ کر نہ بیٹھ جایا کریں۔“

حنا اس کے پاس چارپائی پر آ بیٹھی۔

”اچھا! زیادہ باتیں نہ بنایا کرو۔ اور ایک بات اچھی طرح سمجھ لے۔ اس کا خواب اپنے دل سے نکال دے۔ یہ ان ماں بیٹے کی چال ہے۔ وہ مجھے اپنے گھر لے جا کر کچھ پر ظلم کر کے میرا دل دکھائیں گے۔“

ناہید نے حنا کو بوجھ کر اوچی آوازیں کہا تھا تاکہ اس کی آواز دیوار کے اس پار تک پہنچ جائے ناہید کی آواز کے فوراً بعد ایک برتن کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ ناہید کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”اماں! خدا کے لیے اشار پلے مت دیکھا کرو۔ کتنی شیطانی حرکتیں کرنے لگی ہو۔“ حنا نے روتی صورت بنا کر کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”دل خوش ہو گیا۔ جا جلدی سے بریانی پلیٹ میں ڈال کر لا۔ اب کھانے میں مڑا آئے گا۔“

حنا افسردگی سے اٹھی اور کچن میں جا گھسی۔ اس کا دل بچھ گیا تھا۔ رومینہ تانی اس کے پہلے سے خلاف ہیں۔ اماں کی بات پر مزید خلاف ہو جائیں گی تو وہ گھر کی دیوار کو کیسے گرا سکے گی۔



”جادو ہو جا ان ماں بیٹی کے پاس۔ نہ تو اس لڑکی کو شرم ہے اور نہ مجھے۔ غیر محرم کو کیسے بریانی دے کر گئی ہے۔ قیامت کی نشانی ہے۔“ رومینہ ہنسیا پر ڈوٹی مارا مار کر اپنا عصہ نکال رہی تھی وہ ابھی کھانا تیار کر رہی تھی کہ سعد بریانی کی پلیٹ پکڑے باورچی خانے میں داخل ہوا تھا اور وہیں میں نیبل پر بیٹھ کر اطمینان سے کھانے لگا۔

”اماں! کسی کو بریانی دینا قیامت کی نشانی ہے کیا؟ وہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ بریانی کیا۔ گلاب جامن بھی دے سکتی ہے۔“ سعد اطمینان سے بریانی سے انصاف کرتے ہوئے بولا۔

”سعد اس کو مت کھا۔ ان ماں بیٹی نے نہ جانے کیا پڑھ کر پھونکا ہو گا۔ یا اللہ! اس لڑکے کو کیسے سمجھاؤں کہ وہ کم بخت محبت کا جال پھینک کر اس گھر میں آنا چاہتی ہے اور مجھے اپنے بس میں کر کے مجھے اس گھر سے نکال دینا چاہتی ہے۔“

”اماں! میری شادی کے بعد یہ گھر ہو کا ہی تو ہوتا ہے۔“ سعد نے ہنسی دیا کہ جملہ پھینکا۔ رومینہ حل گئی۔ اس نے فوراً ”دل پر ہاتھ کر لیا۔“

”کیا بول رہا ہے؟ ہاں! تعویذ کا اثر اتنی جلدی ہو گیا۔ ابھی تو پوری پلیٹ بھی تو نے نہیں چالی۔“ رومینہ نے کھانا پکانا چھوڑ دیا اور قل پر جا کر وضو کرنے لگی تاکہ سعد روم کر کے اس جادو کا آثار کر سکے۔

”اماں! ابا کے لیے کھانا تیار کر لیں۔ میں مذاق کر رہا ہوں۔“ اس نے ماں کا پیلا چہرہ دیکھ کر جلدی سے کہا۔

”کھانا بھی بن جائے گا۔“ رومینہ نے منہ میں کچھ پڑھ کر سعد پر پھونکا۔

”اماں! یہ کیا کر رہی ہیں؟“ سعد فس کر بولا۔  
”آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی ہے۔ اس کے تعویذ کے وار کے لیے کافی ہے۔“ وہ مطمئن ہو کر بولی اور پھر اس کے لب ہلنے لگے۔

”اماں! کبھی مجھ پر تعویذ نہیں کروا سکتیں۔ میں ان کے بیٹے جیسا ہوں۔“ سعد نے ماں کو اپنے پاس



بٹھایا اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”نہیں تو صرف میرا بیٹا ہے۔ صرف میرا۔“  
رومینہ نے سعد کو سینے سے لگالیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

”اماں! آپ کا بیٹا آپ کے پاس ہے۔ اور جتنا بھی اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ رومینہ تنک کر بولی۔

”بس! مجھے میرا بیٹا چاہیے، کوئی حنا دینا نہیں۔“  
”اف! اماں! دینا بھی نہیں چاہیے۔؟“  
جس کو ہمارا میڈیا ہر گھنٹے بعد نیوز میں دکھا رہا ہے، آپ کو وہ نہیں چاہیے؟“ سعد نے ہستے ہستے ماں کے حنا دینا۔ کہنے پر پوچھا۔

رومینہ کانوں کو ہاتھ لگا کر منہ میں استغفار پڑھنے لگی۔



حنا اگلی صبح یونیورسٹی میں سعد کا بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔

”تم آج اتنی دیر سے کیوں آئے؟“ حنا نے سعد کو یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا تو اس کی طرف لپکی۔

”بس۔۔۔ ابھی پورا سانس بحال نہیں ہوا کہ تم نے کلاس لینا شروع کر دی۔“

”پورا آدھا گھنٹہ لیٹ ہو۔“ حنا نے گھڑی دکھا کر کہا۔

”یار! راستے میں کرنہ نہ پکڑ مل گئی تھی۔ اس کا سیف علی خان سے جھگڑا ہو رہا تھا کہ وہ شاہد پکڑ کے پاس جانا چاہتی ہے، مگر وہ اسے جانے نہیں دے رہا۔

بس کرنہ نہ پکڑ کی مدد کرتے کرتے دیر ہو گئی۔“ اس نے مسکرا کر یٹینین کا رخ کیا۔

”دوسروں کی کہانی تو چھوڑو۔۔۔ اپنی کہانی کا کیا بنے گا؟“

”یار! ہماری کہانی تو ہمارے ہاتھ میں ہے۔ چلو بھاگ چلتے ہیں۔“ اس نے ہنس کر یٹینین میں کرسی

پر قبضہ ہمارا جواب دیا۔

”نہیں میں بھاگ نہیں سکتی۔“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ مسکرایا۔  
”کیوں تمہارے پاس مضبوط۔۔۔ شوز نہیں ہیں کیا؟“

”نہیں مضبوط شوز تو ہیں، مگر میں تمہاری طرح دوڑ نہیں پیتی۔“ حنا نے منہ بنا کر کہا۔

”واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کیا بات کی۔۔۔ مڑا آگیا۔۔۔ اسی بات پر چائے ہو جائے؟“ سعد نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں! مگر میں وزیر اعظم کی طرح چائے پیوں گی۔ سموسے، میٹھی، کباب، پھپھس، بمکٹ، چاکلیٹ وغیرہ وغیرہ سب منگو لو۔“ اس نے اکر کر کہا۔

”توبہ! توبہ۔ اماں! جی پی کہہ رہی تھیں کہ تم مجھے کھا جاؤ گی اور میری ہڈیاں اس گھر میں دفن کر کے اکیلے اس گھر پر راج کرو گی۔“ سعد نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

حنا ہنس پڑی پھر اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ وہ لرزتی آواز سے بولی۔

”دادی یاد آگئی تھیں۔۔۔ آخری سانسوں میں انہوں نے میرا ہاتھ تمہارے ہاتھوں میں سوپا تھا اور وہ دیوار گرانے کی کتنی خواہش مند تھیں۔“ وہ بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔

”تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کسے؟“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کو اپنی ماں کی نفرت رومینہ تائی کے لیے صاف صاف نظر آئی تھی۔

”یار! اللہ ہے ناں۔۔۔ بس اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کچھ نہ کچھ کریں گے۔“ اس نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”اچھا۔۔۔ اچھا! زیادہ رونا تنک بہہ موت ہو اور چائے کا آرڈر دے کر آؤ۔“ اس نے آہستہ سے ہاتھ چھڑواتے ہوئے کہا تو سعد مسکراتے ہوئے چائے کا آرڈر دینے کے لیے اٹھ گیا۔



”مجھے آفتاب سے شادی نہیں کرنی۔۔۔ پلیر اماں! خدا کے لیے مجھ سے بار بار اس کے متعلق بات نہ کریں۔“ آفتاب ناہید کی دوست ثریا کا بیٹا تھا۔

”کیوں نہیں کرنی؟ میں نے ثریا سے ہاں کر دی ہے۔ یہ شادی ضرور ہوگی۔ تیرا باپ بھی رضامند ہے۔ وہ شام کو کھڑا ہے۔“

حنا نے حیرت سے ماں کو دیکھا اور گھبرا کر بولی۔ ”بابا بھی رضامند ہو گئے ہیں؟“

”ہاں! انہوں نے ہاں کی ہے اس لیے تو بات پکی کی ہے۔“ ناہید نے مطمئن ہو کر جواب دیا۔

”نہیں۔۔۔ بابا مجھ سے پوچھے بغیر ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ رونے لگی۔

”اس ذلیل کے لیے آنسو مت بہاؤ۔ وہ لوگ تمہاری ماں کے دشمن ہیں۔ تم ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔۔۔ یا خدا! یہ کیسی اولاد تو نے مجھے بخشی ہے۔“ ناہید نے چیخ کر اپنا سر پکڑ لیا۔

”اماں! وہ ہمارے دشمن نہیں، ہمارے اپنے ہیں۔“ اس نے روتے روتے جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو، اس گھٹے کو خبر دینے؟“ ناہید نے غصے سے پوچھا۔

”ہاں! وہ چیخ کر بولی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔“ اس گھٹے کو بتا دینا کہ ہم اس کی اور اس کی ماں کی چالاکیوں میں نہیں چھننے والے ہیں۔ یہ شادی ہو کر رہے گی۔ رومینہ کی چال میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ وہ ماں کی تیز آواز پر روتے روتے چھت کی سیڑھیاں چڑھنے لگی جہاں سعد افسردہ سا پہلے سے کھڑا تھا۔

”سعد! تم! وہ روتے ہوئے بولی۔ سعد نے ایک پیار بھری نظر اس پر ڈالی اور افسردگی سے بولا۔

”حنا! میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔“

”سعد! پلیر مجھ کو، ورنہ اماں میری شادی آفتاب سے کر دیں گی۔“

”حنا! میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے کوئی راستہ نظر

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش



450/-	سفرنامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سفرنامہ	دنیا گول ہے
450/-	سفرنامہ	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
275/-	سفرنامہ	چلتے ہو تو چین کو چیلے
225/-	سفرنامہ	مگرمی مگرمی پھر اسافر
225/-	سفرنامہ	خمار گندم
225/-	سفرنامہ	اُردو کی آکری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس ہفتی کے کوچے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاند گھر
225/-	مجموعہ کلام	دل دہشت
200/-	ایڈیٹر این این انشاء	اندھا کنواں
120/-	ادبیری این انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	سفرنامہ	باتیں انشاء جی کی
400/-	سفرنامہ	آپ سے کیا پردہ



مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی



نہیں آتا۔ تم میرے خاندان کی عزت ہو۔ کیسے بچا کوروا کروں۔ کیسے انہیں اس دنیا میں ذلیل کروادوں؟ میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں، مگر خاندان کی عزت سے نہیں کھیل سکتا۔

”پلیز سعد! مجھے یہاں سے لے جاؤ۔“ وہ رونے لگی۔ وہ بھی افسردہ تھا۔

روینہ نے اپنے بیٹے کی تمام باتیں سن لیں۔ وہ بھی چھت پر آجی اور بیج کرناہید کو پکارنے لگی۔

”اپنی مکار بیٹی کو یہاں سے لے جاؤ یہ میرے بیٹے کی جان لے رہی ہے۔

روینہ کے پکارنے پر ناہید بھی غصے سے چھت پر آ گئی اور خفگی سے بولی۔

”میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے اس لیے تمہارا بیٹا مرنے کا ڈراما چاہا ہے۔ تاکہ تم دونوں کی سزا کا سبب ہو جائے۔“

دونوں اپنے اپنے بچوں کو چھت سے اتار کر لے آئیں۔ اظہر اور منظر اپنے اپنے گھر موجود نہ تھے۔

روینہ اور ناہید نے اپنے بچوں کے اداوں کو ان سے چھپایا ہوا تھا کہ کہیں خون کے رشتے جوش میں نہ آجائیں۔

\*\*\*

حنا کا رشتہ طے کرنے کے بعد آفتاب کی ماں ثریا نے ایک چھوٹی سی مفتی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

منظر کی مرضی نہ تھی مگر ناہید نے روینہ اور سعد کو جلائے کے لیے اسے منایا۔

سعد مایوس تھا۔ مفتی کے تمام انتظامات کیے جا چکے تھے۔

جس دن مفتی تھی۔ اسی صبح منظر کو کسی نے اطلاع دی کہ آفتاب پہلے سے شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔ وہ پیپوں کی لالچ میں حنا سے شادی کر رہا ہے کہ وہ ان کی اگلی اولاد ہے۔

منظر کو یہ بات ہوا شہ نہ ہوئی اور اس کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ حنا باپ کو گرتا دیکھ کر چیخ اٹھی ناہید بھی رونے لگی۔

سعد اور اظہر نے منظر کے گھر پر رونے کی آوازیں سنیں تو دونوں بھاگے چلے آئے۔

اظہر اور سعد نے منظر کو سنبھال کر ہسپتال پہنچایا۔

یہ منظر ناہید کی آنکھوں میں بس سا گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں ٹھہر رہے تھے۔ روینہ کی بیج بڑھ رہی تھی۔ اس نے بیٹھ روینہ کو برا سمجھا تھا مگر آج اسے سمجھ آ رہا تھا کہ حیات بی بی اس سے مشورہ پہلے اس لیے کرتی تھیں کہ وہ اس گھر میں پہلے بیاہ کر آئی تھی۔ وہ وہ گھر کے تمام طور طریقوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ روینہ نے ناہید سے بات نہ کی۔ وہ حنا کو تسلیاں دیتی رہی۔ ناہید کے ذہن میں جھگڑا چل رہے تھے۔ خدا خواستہ منظر کو کچھ ہو جائے تو وہ تمنا اپنی بیٹی کے ساتھ کیسے رہائے گی۔ آفتاب کا ڈروانا چہرہ اسے سبق دے گیا کہ دنیا لاچی اور مکار لوگوں سے بھری بڑی ہے اور وہ اپنی بے چارائی میں ایک مکار شخص کو گھر کے بیٹے ترجیح دے رہی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر امیر جنسی روم سے نکلا۔

”اظہر صاحب کون ہیں؟ پلیز! آپ اندر آجائیں۔

آپ کے بھائی صاحب ملنا چاہتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے اظہر سے کہا تھا۔ روینہ لرزتی آوازیں بولی۔

”ڈاکٹر صاحب! مجھے اپنے شوہر سے ملنا ہے۔ کیا میں...؟“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور رونے لگی۔

ڈاکٹر صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہاں ضرور! مگر ان کے سامنے پلیز افسردہ ہو کر مت جائیں۔ انہیں دل کا ہلکا سا ٹیک ہوا ہے۔ انہیں پریشانیوں سے دور رکھنا ہو گا۔“

”جی... ضرور۔“ سعد نے کہا۔

اظہر صاحب روینہ کے ساتھ کمرے میں چلے آئے۔

”بھائی جان مجھے معاف کر دیں۔ پتا نہیں۔ میری زندگی کتنی باقی رہ گئی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا

کہ میں معافی مانگ لوں۔ میں اپنی جگہ غلط تھا۔“ منظر نے کہا تو اظہر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے بولے۔

”اللہ تمہیں میری عمر دے۔ بس آرام کرو، زیادہ باتیں مت کرو۔ گھر چلو پھر ڈھیر ساری باتیں کرتے ہیں۔“ منظر مسکرایا۔

ناہید منظر کو مسکراتا دیکھ کر مطمئن سی ہوئی۔ منظر پر سکون دکھائی دے رہا تھا۔ بارہ بج چکے تھے۔ کمرے میں کھڑی نرس نے مسکرا کر کہا۔

”آپ سب کو نیا سال مبارک ہو۔ اور مسٹر منظر! میری دعا ہے کہ آپ جلد صحت یاب ہو کر گھر چلے جائیں۔“ وہ منظر کو گلو کو زنگ لگا رہی تھی۔

اظہر صاحب مسکرا کر بولے۔ ”نئے سال کے آغاز میں ہی گلو کو زنگ لگا رہا ہے۔ صحت ہی صحت ہو جائے گی۔ کیوں منظر؟“ بچپن میں بھی تم مجھ سے موٹے تھے۔“

”بھائی صاحب مجھے معاف کر دیں۔ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ منظر تو ہمیشہ آپ کی عزت کرتے تھے۔ میں نے ہی۔“

”او... خیر وار! گھر کی ہوس گھر کی باتیں یوں باہر نہیں کرتیں۔“ نرس کے چلے جانے پر اظہر نے نصیحت کرتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

منظر مسکرا کر بولا۔ ”بھائی صاحب! بچوں کو بلوائیں۔ دونوں کی سانسیں اٹک رہی ہوں گی۔“

ناہید خوشی خوشی باہر آئی اور روینہ کے گلے سے لگ گئی۔ روینہ نے بھی اس کو بایاںوں کے حصار میں لے لیا۔

”بھابھی! مجھے معاف کر دیں۔ مجھے حسد کی آگ نے جلا دیا تھا۔ کتنے سال تک میں لڑتی جھگڑتی رہی اور اس کی کوئی وجہ بھی نہ تھی مجھ سے بہت سی غلطیاں ہوئیں۔ پلیز! مجھے معاف کر دیں۔“ ناہید رونے لگی۔

”بس! اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں عقل آگئی، ورنہ یوں ہی سال گزرتے رہتے اور ہم ختم ہو جاتے۔ اک

شرط پر تمہیں معاف کر دوں گی۔ اگر تم حنا کا رشتہ مجھے دے دو۔“ روینہ نے حنا کو دیکھ کر کہا تھا۔ خوشی میں حنا کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ سعد بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے لگا کہ دونوں کی ماؤں نے نئے سال پر اپنا کئی سال پرانا جھگڑا ختم کر دیا۔

دونوں کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے کہ ان کی واوی کی خواہش پوری ہو جائے گی اور وہ دیوار گر جائے گی جو ان کے دل پر کھڑی تھی۔

\*\*\*

سعد اور حنا صحن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ روینہ اور ناہید بازار کی ہوئی تھیں۔ دل ایک ہو گئے تو گھر کی ہنڈیا بھی ایک ہو گئی۔ دونوں صبح گھر کے سامان کے لیے نکلی ہوئی تھیں۔

حنانے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔ ”واوی دیکھ رہی ہوں گی ہم لوگوں کو اور اس گھر کو بھی دیوار گر گئی اور صحن کتنا پیارا لگنے لگا ہے، کھلا کھلا۔ میں سوچ رہی ہوں یہاں پر بچپنوں کے گلے سجاؤں۔“

”جی نہیں۔ واوی جان نہ یہ دیوار اس لیے گرانے کا سوچا تھا کہ ہمارے بچوں کو کھیلنے کے لیے کھلا صحن ملے گا اور تم گلے سجانے کی بات کر رہی ہو۔“ وہ مسکرایا۔ حنا بھی مسکراتے لگی۔

”دونچے آسانی سے کھیل لیں گے۔ فکر مت کرو۔“

”اچھا جی۔ واوی نے مجھ سے اک اور وعدہ بھی لیا تھا کہ یہ خاندان مجھے بدھانا ہے۔“ سعد نے قہقہہ لگا کر کہا تو حنا جھینپ گئی۔ اس کے آنگن میں خوشیوں کا ڈیرا تھا۔ حیات بی بی نے اسے آخری لمحے میں سعد کا ہاتھ تھما کر کہا تھا۔

”زندگی کا سفر خوشی سے طے ہو سکتا ہے۔ اگر ایک دوسرے کو سمجھ لیا جائے تو کبھی کسی گھر میں دیوار کھڑی نہیں ہوگی۔“

\*\*\*



## صیقل عسی

اپنے دھیان میں سبک رفتاری سے ڈرائیو کرتے وہ مارکیٹ پہنچتے ہی والا تھا جب اس کا فون بج اٹھا۔  
”کیا کر رہا تھا یار من؟“ اس کی ہیلو کے جواب میں وہ سری طرف سے عالم کی زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی تو بے اختیار اس کے لب مسکرا دیے۔  
”فی الحال تو ڈرائیو کر رہا ہوں۔“  
”کہاں جا رہا ہے؟“  
”شاپنگ کرنے۔“ اس کی جرح کے جواب میں وہ مسکرا کر بولا۔  
”میرے لیے کیا خریدے گا؟“ وہ سری جانب صاحب شاید کچھ زیادہ ہی فرصت میں تھے۔

صاف شفاف سرک پر مناسب اسپڈ سے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے وہ اس وقت خاصے خوش گوار موڈ میں تھا۔ چہرے سے نکراتے ہوئے ہوا کے جھونکوں میں در آنے والی ٹھنڈک، موسم کے بدل جانے کی اطلاع دے رہی تھی۔ گرمی نے تو اسے اچھا خاصا۔ بے زار کر دیا تھا۔ اس پہ مستزاد عالم کی غیر موجودگی وہ صرف گھر اور یونیورسٹی تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر آج موسم کی خوشگواہی کو محسوس کرتے ہوئے وہ شام میں سو کر اٹھنے کے بعد نماز ہو کر لاٹنگ ڈرائیو اور تھوڑی بہت شاپنگ کے ارادے سے نکل کھڑا ہوا تھا۔

## مکہ مکملہ





”کچھ نہیں۔ میرے پاس فالٹ پیسے نہیں ہیں۔“  
 اپنی مسکراہٹ دیا۔ وہ دیکھو گویا ہوا تو عالم مصنوعی  
 خفگی سے بولا۔  
 ”تجوس اعظم! کم از کم دل رکھنے کو ہی کہہ دیتا کہ تو  
 میرے لیے مارک اینڈ اینسٹر کی شرٹ ساجی کا  
 والٹ اور سی کو کی گھڑی خریدنے والا ہے۔“  
 ”او! کیا کہنے ہیں جناب کے۔ میرا پ حرام نہیں  
 کمار ہا جو میں تیرا دل رکھنے کو یہ سب کھتا ہوں۔“  
 ”حرام نہ سہی لیکن کچھ کم بھی نہیں کمار ہے۔ وہ  
 الگ بات ہے کہ تو ایک انتہائی بے مروت اور بد اخلاق  
 شخص واقع ہوا ہے۔“ دوسری جانب سے جل کر کہا گیا  
 تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔  
 ”تھینکس فار یو کامیادہ منٹس، لیکن کیا یہ ہی  
 اول فول ہلے کے لیے فون کیا ہے؟“ اس نے احتیاط  
 سے سوچا کہ اسے کال کی پارکنگ ایریا میں داخل  
 کی۔  
 ”نہیں بلکہ یہ تانے کے لیے کہ مجھے یہاں ایک  
 ڈیڑھ ہفتہ اور لگ جائے گا۔“ عالم اب کے سنجیدگی  
 سے گویا ہوا۔  
 ”لیکن تو تو کہہ رہا تھا کہ کام مکمل ہو گیا ہے۔“  
 گاڑی مناسب جگہ پہ پارک کرتے ہوئے اس نے  
 اگنیشن میں سے جالی نکالی۔  
 ”ہو تو گیا ہے، لیکن ایک دو چھوٹے موٹے مسئلے  
 ہیں جنہیں پھانا ابھی باقی ہے۔“ عالم کے والد غیاث  
 علی اگنیشن میں کھڑے ہو رہے تھے۔ لہذا اسی سلسلے  
 میں آج کل وہ سب اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ جہاں  
 ان کی تیاریاں اور مصروفیات اپنے عروج پر تھیں۔  
 حالانکہ اس علاقے کی نشستوں کے نتائج بنا کسی  
 مقابلے کے بھی سب کو ازبر تھے۔  
 ”چل پھر اگر کوئی اور ضروری بات نہیں تو میں فون  
 بند کرتا ہوں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔“  
 ”ہاں تو جا اور صرف اپنے لیے شاپنگ کر۔“ وہ  
 ”اپنے“ یہ زور دیتے ہوئے بولا تو شاہ نواز نے ہنستے

ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔  
 گاڑی لاگ کر کے وہ اپنے دھیان میں چلتا داخلی  
 سڑکیوں کی جانب چلا آیا۔ مین ڈور دھکیل کر وہ ابھی  
 اندر داخل ہوا ہی تھا جب پاس سے گزر کر ہا پر چلتے  
 ایک جوڑے پہ اسے ایک جانے پہچانے چہرے کا گمان  
 ہوا تھا۔  
 ٹھٹھک کر رکتے ہوئے اس نے بے یقینی سے پلٹ کر  
 پیچھے دیکھا تھا اور گویا سنا کہ رہ گیا تھا۔ اس سے محض  
 چند قدم کے فاصلے پہ وہ مکروہ چہرہ کھڑا تھا جسے وہ پورے  
 پانچ سال بعد آج دیکھ رہا تھا اور نئے پہچانے میں  
 اسے محض ایک لمحہ لگا تھا۔  
 یہ وہ بھئی تھی جس سے اسے اس دنیا میں سب سے  
 زیادہ نفرت تھی۔ جو نہ صرف اس کی زندگی بلکہ اس کا  
 دل، اس کا سکون ہر چیز برباد کرنے کی ذمہ دار تھی۔  
 اس کے لبوں پر کھلتی مسکراہٹ شاہ نواز کے تن بدن  
 میں چنگاریاں سی بھرنی تھیں۔ بے اختیار اسے اپنے  
 خون کی گردش تیز اور مٹھیاں بیچتی محسوس ہوتی  
 تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کر ہا پر نکلتے  
 شاہ نواز نے تیزی سے پلٹ کر گلاس ڈور کے پینڈل پہ  
 اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔  
 ”یہ کیا دیمیزی ہے؟“ اس کے ساتھ موجود مرد نے  
 تیز لہجے میں کہتے ہوئے اپنے سامنے کھڑے اس اونچے  
 لمبے نوجوان کو گھورا تھا جو اسے مکمل طور پہ نظر انداز  
 کیے اس کی بیوی کو گھور رہا تھا۔  
 اس کی اس اچانک حرکت نے مقابل نے بھی غصے  
 سے تیوری چڑھائے اپنی نظریں اٹھائی تھیں اور پھر گویا  
 پلکیں جھپٹنا بھول گئی تھی۔  
 ”شاہ نواز!“ اس کے چہرے کی سراپیمگی اور لبوں  
 کی بے آواز جھیش شاہ نواز سے پوشیدہ نہ رہ سکی  
 تھی۔ بے اختیار اس کے ہاتھ کپکپاتے تھے اور ان  
 میں پکڑے شاپنگ بیگس چھوٹ کر زمین پہ آگرے  
 تھے۔  
 ”کون ہے یہ زمین؟“ اس کے ساتھ موجود مرد

نے تیزی سے اس کے قریب آتے ہوئے سخت  
 نظروں سے نوازی کی جانب دیکھا تھا جس نے ایک نفرت  
 بھری تیز نگاہ ان دونوں پہ ڈالتے ہوئے اپنے قدموں  
 میں لڑھکھک آنے والے بیٹی کے کین کو پوری طاقت  
 سے ٹھوک ماری تھی۔ اگلے ہی لمحے کین اڑنا ہوا  
 سامنے دیوار کے ساتھ ٹکرانے کے بعد زوردار آواز  
 سے پھٹا تھا۔

بے اختیار زمین کی چیخ وہاں موجود دیگر لوگوں کی  
 توجہوں میں مدغم ہوئی تھی، مکروہ اس سارے ہنگامے  
 سے بے نیاز پلٹ کر ہا پر نکلتا چلا گیا تھا۔

\*\*\*

سڑک پہ بے مقصد گاڑی دوڑاتے اسے نہ جانے  
 کتنے گھنٹے گزر چکے تھے، مگر اس کے اندر جلتی آگ  
 کسی طور ٹھنڈی ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

کاش! کاش کہ اس وقت اس کے پاس بھری ہوئی  
 بائسل ہوتی تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا اسے اس کے  
 وجود پر خالی کر دیتا۔ جو نہ صرف اس کی بلکہ اور بھی بہت  
 سے لوگوں کی مجرم تھی اور جسے سبک سبک کر مرنے  
 دیکھنا اس کی اولین خواہش تھی۔

مکروہ نے ری قسمت کہ وہ اسے نظر بھی آئی تو کس  
 انداز میں۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ اس کی خوش  
 حال اور پرسکون زندگی کی غماز تھی، جبکہ وہ آج بھی  
 اپنی اوجھوری ذات کو مکمل کرنے اور دل میں پھیلے  
 سناٹے کو دور کرنے کے جتن کر رہا تھا۔ قدرت کی اس  
 نا انصافی پہ اس کے اندر احساس زیاں بہت شدت سے  
 جاگا تھا۔

اس سارے کھیل میں اس نے بنا کسی خطا کے  
 بہت کڑی سزا جھیلی تھی۔ لیکن کیا واقعی اس نے بنا  
 کسی خطا کے سزا جھیلی تھی؟ ضمیر کی آواز سناتے  
 ہوئے کوڑے کی مانند اس کے وجود پر برسی تو اذیت کی  
 ایک تیز لہر نے اسے سر تپا بھگو دیا۔

بے اختیار ہی اس کا پاؤں پوری طاقت سے بریک پہ

آڑا تھا اور گاڑی نے بری طرح اگر شدید جھٹکا  
 کھایا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو بیچ سڑک پہ اس کی یہ  
 بے احتیاطی زبردست تصادم کا باعث بن سکتی تھی، مگر  
 رات گئے اس پر وہاں ہر سوسنائے اور تاریکی کا راج  
 تھا، جس میں اس کی سسکیاں سننے والا دور تک کوئی نہ  
 تھا۔

\*\*\*

”السلام علیکم یایا!“ رائے نے جھک کر اخبار پڑھتے  
 حیات احمد کا چہرہ چومنا۔

”وعلیکم السلام! کیسی ہے بیباکی جان؟“ انہوں نے  
 اخبار فولڈ کرتے ہوئے اپنی لاڈلی کی طرف دیکھا جو ان  
 کے دامن جانب کرسی سنبھال چکی تھی۔

”پانگل ٹھیک، آپ سنائیں کیسا رہا ٹور؟“  
 ”فرسٹ کلاس، کیسی جاری ہے یونیورسٹی؟“ اس



کے سادہ سے چہرے پر نگاہیں جمائے انہوں نے شفقت سے پوچھا۔

”بہت اچھی، ان فیکٹ ہماری تو کلاسز بھی شروع ہو چکی ہیں۔“ وہ ان کے لیے جوس ڈالتے ہوئے بولی۔

حیات احمد پچھلے ایک ہفتے سے بزنس کے سلسلے میں جانا گئے ہوئے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں رائے کی ایم اے انگلش کی کلاسز شروع ہو گئی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے پہلا سوال اس کی یونیورسٹی کے متعلق ہی پوچھا تھا۔

”ایم اینا!“ اس نے اپنے لیے جوس ڈالتے ہوئے عافیہ بیگم کو پکارا جو پکن میں جمید کے ساتھ ناشتا بنوانے میں مصروف تھیں۔

”لاری ہوں۔“

”میں نے آج پراٹھا اور چیزز آلیٹ بنوایا ہے۔ ایک سے ناشتا کر کے جاؤ۔“ عافیہ ڈانٹتے ہوئے بولی۔

”زبردست بہن! پھر تو مزا آجائے گا۔“ جواب رائے کے بجائے حیات صاحب کی جانب سے موصول ہوا تھا۔ دونوں گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

”آپ کو کیوں مزا آجائے گا؟“ ان کی بات کا مطلب سمجھنے کے باوجود عافیہ بیگم نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

”پراٹھا اور چیزز آلیٹ جو بنا ہے۔“ انہوں نے معصومیت سے جواب دیا تو رائے کے لب بے اختیار مسکرا دیے۔

حیات صاحب ہارٹ پشمنٹ تھے اور جانتے تھے کہ عافیہ بیگم ان کے پریز کا کتنی سختی سے دھیان رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود ان کے بھولہ پن کی ایکٹنگ اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”پراٹھا اور چیزز آلیٹ وہ بھی ہارٹ پشمنٹ کے لیے؟ کیا کہنے ہیں آپ کے حیات صاحب!“ وہ طنز پر مسکراہٹ لبوں پہ سجائے گویا ہوئیں تو حیات صاحب لہجہ سے بولے۔

”ہار! ایک دن کی تو چھٹی دے دو۔“

”لیکن اس طرح آپ کا پریز۔“

”بھائو میں گیارہ پریز! چائنا میں کیا کم پریز ہوا ہے۔“ انہوں نے جھنجھلا کر عافیہ کی بات کالی تو رائے کے ساتھ ساتھ عافیہ بیگم بھی بفس پڑیں۔

”ٹھیک ہے، لیکن صرف آج کے لیے۔“ وہ جمید کے ہاتھ سے چیزیں لے کر ٹیبل پر رکھتی ہوئی بولیں۔

”ٹھینک یو مائی ڈیر۔“ انہوں نے جھٹ پٹ ایک پراٹھا اپنی پلیٹ میں منتقل کیا تو ان کی اس درجہ بے صبری پہ وہ دونوں پہلے انہیں اور پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر بفس پڑیں۔



اس کی آنکھ کھلی تو گھڑی صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہی تھی۔ اک گہری سانس لیتے ہوئے وہ سیدھا ہوا تو دایاں ہاتھ بے اختیار اس کے عالم میں دکھتی کپٹیوں پہ جا ٹھہرا۔ جو اس کے ذہنی تناؤ اور کشمکش کا نتیجہ تھیں۔

دو دن گزر چکے تھے، اس اتفاق ٹکراؤ کو مگر وہ خود کو اب تک سنبھال نہ پایا تھا۔ اس کے شب و روز جیسے ایک ہی نقطہ پر جم کر رہ گئے تھے، جبکہ دل کے زخم ایک بار پھر لوہے لگے تھے۔ پچھلے دو دن سے وہ خود کو اپنے کمرے میں مقید کیے ہوئے تھا۔ جہاں وہ تھا اور سو دویاں کے وہی پرانے کھاتے۔

اب بھی اس کی آنکھ اذانوں سے تھوڑی دیر پیشتر لگی تھی اور اب جو وہ اچانک بے دار ہوا تو سر میں بے تحاشہ درد تھا۔

آنکھیں موندے سر کو دیا تو وہ عجیب خالی الذہنی کے عالم میں تھا، جب سائڈ ٹیبل پر پرامبائل اچانک بج اٹھا۔

”ہیلو!“ بنا نمبر دیکھ اس نے کال انڈیز کرتے ہوئے فون کان سے لگایا تو دوسری جانب سے نگہت بیگم کی بر شفقت آواز اس کے تنے ہوئے اعصاب کو ایک لمحے کے لیے پرسکون کر گئی۔

”کیسے ہو بیٹا؟“

”میں ٹھیک ہوں امی! آپ کیسی ہیں؟“ اٹھ کر بیٹھے ہوئے اس نے آواز میں بشارت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”میں تو ٹھیک ہوں، لیکن مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“ اگلے ہی پل وہ تشویش سے بولیں تو شاہ نواز کے لبوں پہ اک پھینکی سی مسکراہٹ آن گھری۔ بھلا ماں کے دل کو بھی دھوکا دیا جاسکتا ہے۔

”جی وہاں ساز کام ہو گیا ہے۔“ وہ بوجھل دل کا بوجھ چاہ کر بھی بلگانہ کر پایا تھا۔ جانتا تھا کہ اگر انہیں اصل بات کا علم ہو گیا تو وہ اس کی جانب سے از حد فکر مند ہو جائیں گی، جو وہ کسی طور نہیں چاہتا تھا۔

”مجھے بتا تھا تم احتیاط نہیں کرو گے۔“ اسی لیے آج صبح فون کیا تھا کہ موسم بدل رہا ہے، اپنا دھیان رکھو، مگر وہی ہوا، اب وہاں اکیلے بیمار پڑے رہو گے۔“

ان کے لہجے میں پریشانی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی در آیا تو شاہ نواز انہیں مطمئن کرنے کو قصداً ہلکے پھلکے لہجے میں بولا۔

”امی! میں اکیلا کہاں ہوں، رشید ہے نا میرے ساتھ۔“

”کیا کہنے بیٹا تمہارے، وہ کسی قابل ہوتا تو مجھے فکر کس بات کی تھی۔ لیکن تم ذرا اسے فون دو، میں خود اسے سمجھاتی ہوں۔“

اور بے چارے رشید کی متوقع درگت کا خیال اس کے لبوں پر نہ چاہتے ہوئے بھی دھیمی سی مسکراہٹ بکیر گیا۔

”امی! اب چھوڑیں، میں خود اسے سمجھا لوں گا۔“

”تم کیا تمہاؤ گے، تمہیں تو خود کچھ بتا نہیں۔“

نگہت ڈپٹ کر بولیں تو وہ اک گہری سانس لیتا رشید کو آواز دے لگا۔

اس کی آمد پر موبائل اس کے حوالے کر تا وہ خود اٹھ کر کچھتہ روم کی جانب بڑھ گیا۔ ماں سے ہونے والی چند لمحوں کی گفتگو نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا

دھیان بٹا دیا تھا۔ اور چونکہ وہ اپنا دھیان اب بٹا ہوا ہی رہنے دینا چاہتا تھا، اس لیے یونیورسٹی جانے کے ارادے سے تیاری کرنے لگا، جہاں آج اس کی پہلی کلاس گیارہ بجے تھی۔

\*\*\*

”صاحب جی! آپ کہاں جارہے ہیں؟“ رشید نگہت بیگم کی ہدایت کے پیش نظر اس کا ناشتا روم میں سجائے کمرے میں داخل ہوا تو سامنے شاہ نواز کو تیار دیکھ کر قدرے حیرت سے پوچھ بیٹھا۔

”یونیورسٹی۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولا۔

”لیکن جی آپ کی تو طبیعت خراب ہے۔“ وہ اپنے سابقہ انداز میں بولا تو شاہ نواز فائل میں لگے پیپرز درست کرتے ہوئے لاپرواہی سے گویا ہوا۔

”ویار عین بالکل ٹھیک ہوں۔“

”میں نے بھی بیگم صاحبہ کو یہی کہا تھا، لیکن انہوں نے میری بے خبری پہ مجھے خوب ڈانٹا، ساتھ ہی ساتھ مجھے نکلا اور کام چور بھی کہا۔“

وہ منہ لٹکائے بولا تو بے اختیار شاہ نواز مسکرا دیا۔ وہ بے چارے رشید کا دکھ اچھی طرح سے سمجھ سکتا تھا۔ جسے صبح کی پاداش میں اچھی خاصی ڈانٹ سننا پڑ گئی تھی۔

”اوہو، یہ تو امی نے بہت زیادتی کی، تم تو خاصے اعلیٰ شہنشاہ ہو بھئی۔“ وہ اپنی مسکراہٹ دبانے کا کوچہ پہ آ بیٹھا تو رشید کا چہرہ کھل اٹھا۔

رشید کو چند ایک ضروری ہدایت دیتا وہ یونیورسٹی کے لیے نکلا تو رش کے باعث خالصتاً ہو گیا۔

لبے لبے ڈگ بھرتا وہ اپنے دھیان میں آگے بڑھ رہا تھا جب دور لا بریری کی مین پیڑھیوں پہ موجود بہت سے لوگوں کے درمیان اسے کسی چہرے کا گمان ہوا تھا۔ اور اس کی سانس ایک پل کے لیے گویا ساکت ہو گئی تھی۔

تیزی سے ڈبے ابھرتے دل کے ساتھ اس نے آنکھیں چمککتے ہوئے اپنے خیال کی تصدیق چاہی تھی



کہ بیچ میں پانچ سالوں کی گرد تھی۔ مگر اب اس بھیڑ میں وہ چہرہ میں نظر نہ آ رہا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ دیوانہ وار سن بلڈنگ کی جانب دوڑ پڑا تھا۔ اس کی حالت محض چند محلوں میں اس پیاسے کی سی ہو گئی تھی جسے ایک لمبی مسافت کے بعد صحرا میں اچانک خلستان نظر آ گیا ہو۔

تو کیا اس کی جدائی اس کے ذہن پر اس حد تک اثر انداز ہو چکی تھی کہ اسے اب اس کے الٹو نظر آنے لگے تھے؟ کیا شاہ نواز کی زندگی کا انجام یوں ہی کسی کی محبت میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے مر جاتا تھا؟

\*\*\*

وہ تینوں لان میں بیٹھی شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں، جب معا کی گھٹ سے اندر داخل ہوتی شخصیت کو دیکھ کر رطابہ خوش گوار حیرت کے زیر اثر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”شاہ نواز بھائی آپ!“ اگلے ہی لمحے وہ دوڑ کر آنے والے کے سینے سے جا لگی تھی، جبکہ نکمت اور سیما جن کی پشت گیٹ کی جانب تھی، حیرت سے پلٹ کر اسے دیکھتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”السلام علیکم! رطابہ کو بازو کے گھیرے میں لیے وہ ماں اور بھائی کے پاس چلا آیا تو نکمت بیگم آگے بڑھ کر بیٹے کا سر چومتے ہوئے بولیں۔

”وعلیکم السلام! اپنے آنے کی اطلاع تو دیتے۔“

”مگر پروگرام بنا کر آتا تو ضرور دیتا۔ وہ تو نیوورسٹی میں اگلے تین دن کے لیے ہڑتال کی کال دی گئی تھی۔ اس لیے میں گھر چلا آیا۔“

وہ پہلے سے سوچا گیا جواب دیتے ہوئے کرسی پر گر سا گیا۔ اپنے اندر کے شور اور باہر کی تھمائی سے گھبرا کر بھاگ آنے والے کو آخر کوئی تو پیمانہ بنانا تھا۔

”وہی میں بھی سوچ رہی تھی کہ ابھی برسوں تو تمہاری بات ہوئی تھی۔ تب تک تو تمہارا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ویسے اب طبیعت کیسی ہے؟“ انہوں نے اس کے مقابل کرسی سنبھالتے ہوئے

پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوا تو رطابہ اس کے برابر کرسی ٹھیک کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”مجھے تو ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔ اچھے خاصے ویک (کنور) ہو رہے ہیں۔ کیوں امی؟“ اس نے سامنے بیٹھی نکمت بیگم سے تائید چاہی تو وہ بغور اس کی جانب دیکھتے بولیں۔

”رطابہ ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا۔ تم اتنے کمزور کیوں ہو رہے ہو؟“ ان کے چہرے اور لمبے میں یک نیت پریشانی در آئی۔

”چھانچھو تو محسوس نہیں ہوا۔“ وہ قصداً مسکرا کر بولا تو نکمت بیگم اسے ڈپٹتے ہوئے بولیں۔

”کیسے محسوس نہیں ہوا؟ اپنے حلقے دیکھو۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کتے دنوں سے سوئے نہیں۔“

”شاید لیٹ نائٹ تک پڑھتا رہتا ہوں، اس لیے۔“ اس نے اپنے انداز میں زبردستی کی بے بسیاں اور بے نیازی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”بھائی میں گئی ایسی پڑھائی۔ کتنا کما تھا کہ اپنے اتفاقاً جی کو جان کر لو کہ مگر تم نے تو ہماری کوئی بھی بات نہ سننے کی جیسے قسم کھا رکھی ہے۔“

ان کی پریشانی ناراضی میں ڈھلنے لگی تو اک پھینکی سی مسکراہٹ شاہ نواز کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔ جسے دیکھ کر رطابہ بے اختیار ماں کو نوک کر گئی۔

”پلیز امی! اہل حال یہ ٹاپک رہنے دیں۔“

”کیسے رہنے دوں، دل جلتا ہے میرا باپ، بیٹے کی اس دوری پر۔“ اس سزا پر جو یہ خود کو اور ہمیں دے رہا ہے۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا گلہ رندہ گیا تو شاہ نواز اٹھ کر ان کے قدموں میں آ بیٹھا۔ وہ جانتا تھا اس سارے قصے میں سب سے زیادہ دکھ اور تکلیف اس کی ماں اٹھا رہی تھی، وہ بھی بتا کر قصور کے

”امی پلیز! آپ مت روئیں۔ آپ کے یہ آنسو میرا ہاسکون بھی چھین لیتے ہیں۔“ ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اس نے التجائی انداز میں کہا تو نکمت بیگم

کے آنسو ان کا چہرہ بھگونے لگے۔

”اور تمہاری یہ درپردہ کس طرح میرا سکون تار تار کر رہی ہے۔“ بھی یہ سوچا ہے تم نے؟“ انہوں نے بھرائے ہوئے لمبے میں سوال کیا تو شاہ نواز نظریں چرا گیا۔

”میں مانتی ہوں بیٹا کہ تمہارے لیے اسے بھلانا ممکن نہیں، مگر پھر بھی میری التجا ہے کہ تم اپنی ہند مٹھی کھول کر گزرتے ہوئے وقت کو جانے دو اسے اپنی جان کا روگ مت بناؤ میرے بچے! بے اختیار ان کا ہاتھ اس کے سر پہ آن ٹھہرا تو وہ جتنی ہی درخت خالی نظروں سے ماں کا چہرہ نکلا رہا۔ اور پھر آہستگی سے اثبات میں سر ہلاتا ہاتھ کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔

ملا تھا جگر کے رستے میں صبح کی مانند پچھڑ گیا تھا مسافر سے رات ہونے تک

میں اس کو بھولنا چاہوں تو کیا کروں آخر وہ مجھ میں زندہ ہے میری ذات ہونے تک

\*\*\*

انگلش ڈپارٹمنٹ میں آج صبح سے خاصی گھما گھمی تھی اور اس کی وجہ وہ تقریری مقابلہ تھا جس کی تیاری کئی دنوں سے کی جا رہی تھی، موضوع تھا۔

”آج کی محبت ایک آفاقی جذبہ یا صرف خواہش نفسانی؟“

رائے نے بھی اس مقابلے میں حصہ لے رکھا تھا، اسے موضوع کی مخالفت میں بولنا تھا۔ اس لیے وہ اور تانیہ، سینین اور شفق کے ساتھ جو ان کی کلاس فیلوز ہونے کے ساتھ ساتھ اب فرینڈز بھی بن چکی تھیں،

آڈیٹوریم میں چلی آئی تھیں۔ جہاں اسٹوڈنٹس کی کافی تعداد پہلے سے جمع ہو چکی تھی۔

”یار رائے! تم اتنے لوگوں کے سامنے بول لو گی؟“ اسٹیج کی طرف جاتے ہوئے شفق نے طائرانہ نظروں سے پال کا جائزہ لیا جو مختلف ڈپارٹمنٹس کے اسٹوڈنٹس سے بھرا ہوا تھا۔

”کیوں نہیں۔ میں کوئی پہلی بار اسپیکر تو نہیں کرنے لگی۔“ وہ عام سے لمبے میں بتا کر گھبراہٹ کے بولی تو شفق نے اسے ٹوک دیا۔

”گھبراہٹ کیوں؟ یہ اسکول یا کالج نہیں بلکہ یونیورسٹی کا آڈیٹوریم ہے، جہاں لوگوں سے زیادہ تعداد لوگوں کی ہے اور اگر وہ ایک بار کسی بات پہ ہونٹک شروع کر دیں نا تو اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔“

”اور نہیں تو کیا؟“ اوپر سے جب یہ محبت کے نیچے ادھیڑے کی تو وہ اسے اچھی طرح سے ارٹھیں گے۔

تانیہ طنزیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ اسے پہلے دن سے رائے کی رائے سے اختلاف تھا جو آج کی محبت تو کیا سرے سے محبت کے وجود سے ہی انکاری تھی۔

”ہونہ! دنیاوی محبت ہے ہی اسی قابل کہ اس کے نیچے ادھیڑے جائیں۔“

وہ پلٹ کے یک نیت انتہائی سرو لمبے میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتا تنفر اور لمبے کی سختی ایک پل کو ان تینوں کو حیرت میں مبتلا کر گئی۔

”تمہیں نہیں لگتا تمہاری رائے بہت Blunt ہے۔“

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شفق نے رمان سے کہا تو رائے گہری سانس لیتی خود پہ قابو پاتے ہوئے نرمی سے بولی۔

”امی ایم سوری، اگر تم لوگوں کو ایسا لگا، مگر یقین مانو یہ ہی حقیقت ہے۔“

”فار گاڈ سک یار! تم لوگ یہاں اس کا مورال بدھانے کے لیے آئے ہو یا آپس میں بحث کرنے کے لیے؟“ سینین نے بے اختیار انہیں ٹوکا تو وہ تینوں مسکرا دیں۔

”یہ پریکٹس تھی، اب یہ خاصی حد تک فارم میں آچکی ہے۔“

تانیہ نے اس کی پیٹھ ٹھوکی تو وہ ہنستی ہوئی سر منسوب کی جانب چلی آئی جو مقابلے میں شریک تمام اسٹوڈنٹس کو بیک اسٹیج جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔



وی سی صاحب اور تجز کی آمدیہ مقابلہ شروع ہوا تو تمام حاضرین محفل کا دھیان مقررین کی جانب مبذول ہو گیا۔ چونکہ موضوع دلچسپ بھی تھا اور اسٹوڈنٹس کا من پسند بھی، اس لیے سچرز کے ساتھ ساتھ وہ سب بھی خاصے غور سے مباحثے کو سنتے ہوئے کہیں داد دے رہے تھے تو کہیں ہوت کر رہے تھے۔

ایسے میں جب رائے کی باری آئی تو نہ چاہتے ہوئے بھی ان تینوں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مگر اس کا پر اعتماد انداز خوب صورت لہجہ اور مضبوط دلائل جلد ہی ان حاضرین محفل کو بھی اسے داد دینے پر مجبور کر گئے جو شروع میں اس کے بعض اختلافی پوائنٹس پر ہونٹ کر رہے تھے۔

خدا خدا کر کے مباحثہ ختم ہوا تو زلٹ اٹاؤنس کیا گیا اور جب رائے حیات کا نام سیکنڈ پوزیشن کے لیے نکالا گیا تو ان تینوں کے ساتھ ساتھ باقی تمام کلاس فیلوز کے درمیان بھی ٹوٹی کی لڑائی ہو گئی۔

”یار رائے! آج تو تمہاری طرف ٹریفٹ بنتی ہے۔“ وہ اپنی ٹرائی اور سر فیکلٹ اٹھائے ان تینوں کی معیت میں ہال سے باہر آئی تو اس کی کلاس کی سبھی لڑکیاں اس کے سرو ہو گئیں۔

”شیو رائے! ٹائٹ۔“ وہ خوش دلی سے ان سب کو لیے کینٹین کی جانب چلی آئی۔ جہاں سب کی پسندیدہ برگرز اور کولڈ ڈرنکس کا آرڈر دیا گیا۔

”ویسے آج یونیورسٹی کے سارے لڑکے تم سے خاصے ٹالائے ہوں گے۔“ عتیقہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو رائے بھی مسکرا دی۔

”تم لڑکوں کی بات کر رہی ہو، یہاں تو میری اپنی فرینڈز مجھ سے خاصی ٹالائے ہیں۔“ اس نے ساتھ بیٹھی تانیہ کی جانب اشارہ کیا جو کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے دھیمے سے مسکراتی تھی۔

”ویسے یار! میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ میں کبھی محبت کی بار کو بوں ہی خوشی میں لپیٹ کر لیں گی۔“ عتیقہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو تانیہ رائے کو گھورتے ہوئے بولی۔

”یہ سب اس فتنی کا پھیلا ہوا شر ہے۔“ ”مختصر یہ شر اس شر سے بہتر ہے جو آج کی نام نہاد محبت پھیلا رہی ہے۔“

رائے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ مگر اس سے پہلے کہ تانیہ کچھ کہتی ان کے دائیں جانب والی ٹیبل پر بیٹھے لڑکوں میں سے ایک نے رائے کو مخاطب کر کے ان سب کو دروازہ حیرت میں ڈال دیا۔

”ایکسکوز می!“ ”جی۔“ رائے اگر حیران بھی تھی تب بھی اس کی حیرت اس کے چہرے سے قطعاً عیاں نہ تھی۔

”آپ محبت کے اتنے ظاف کوں ہیں؟“ وہ اتنے نارمل انداز میں گویا ہوا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ اس کا سوال نہ چاہتے ہوئے بھی ان سب کی حیرت کو دو چند کر گیا۔ جسے اس لڑکے سمیت اس کے دوستوں نے بھی جی بھر کے انجوائے کیا۔ کیونکہ ان سب کے لبوں پر بڑی جان دار مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔

”آپ جیسوں کی وجہ سے۔“ رائے لمحے کا توقف کیے بنا، مسکرا کر کاٹ دار لہجے میں بولی تو ٹیبل پر موجود سب ہی لڑکیوں کی حیرت بے ساختہ ہنسی میں تبدیل ہو گئی، جبکہ مقابل چند لمحے اسے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بعد اپنی خفت مٹانے کی کوشش سے منہ پھیر گیا۔

\*\*\*

”السلام علیکم۔“

ٹریک سوٹ میں لباس شاہ نواز نے ڈانٹنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے تمام حاضرین محفل کو سلام کیا تو سب ہی ایک لحظے کو اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مگر وہ بنا کسی کی طرف دیکھے مطالبہ کے برابر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”وعلیکم السلام، کیسے ہو پر خوردار؟“ شاہ زنان نے بغور بیٹھی کی جانب دیکھا جسے گھر آئے دو سران تھا، مگر وہ آج اس کی صورت دیکھ رہے تھے۔

”ٹھیک۔“ وہ ایک لفظ میں انہیں جواب دیتا رہا۔

کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لے کر لبوں سے لگا گیا۔ ٹکٹ بیگم فہمائش نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں، جبکہ زنان صاحبہ کامل اس کی اس درجہ بیگانگی یہ تانسف سے بھر گیا۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح جتنا کچھ ظاہر کیے ایک بار پھر سامنے رکھے ناشتے کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”تمہاری یونیورسٹی کب کھل رہی ہے؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شہزاد نے قصداً ”ماحول کے بو جھل پن کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔“کل۔“ اس نے بوا اسل انداز اچھیلے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے تو اسے کہہ دیا ہے، مزید خوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ سیدھے طریقے سے اپنا بزنس جوائن کرے۔“

ٹکٹ بیگم اک کڑی نظر اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے بولیں تو زنان صاحبہ کے ساتھ ساتھ شہزاد کی نظریں بھی بے اختیار اس کی جانب اٹھ گئیں۔ جو بے اثر چہرے کے ساتھ کانٹنے اور چھری سے انڈے کے ٹکڑے کرنے میں مصروف تھا۔ یوں جیسے اس سے اہم کام فی الوقت اور کوئی نہ ہو۔

”ساتھ ہی امی! آپ اس کے لیے لڑکی بھی دیکھنا شروع کریں۔ بیوی آئے گی تو محترم خود ہی ٹکنا سیکھ جائیں گے۔“

سیمانے گوڈ میں بیٹھی اربیبہ کو سیری لیک کھلاتے ہوئے مشورہ دیا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو، اس لڑکے نے ہمیں جتنا پریشان کرنا تھا کر لیا۔ اب اس کی یہ من مائیاں میں مزید برداشت نہیں کروں گی۔“

اس کی بے نیازی ان کے غصے کو ہوا دے رہی تھی۔ جبکہ شاہ نواز کے لبوں پہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔

”کاش! میں نے من کی مانی ہوئی تو آج یہ بے سکونی اور رونا رانی میرا مقدر نہ بنتی۔“ زہریلی سوچیں ایک بار پھر اس کی ذات کا احاطہ

کرنے لگیں تو اس نے غیر محسوس انداز میں ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جبکہ دوسری جانب ٹکٹ بیگم اس کی کیفیت سے بے نیاز زنان صاحبہ سے مخاطب تھیں۔

”آپ ایسا کرس، آج ہی ٹار بھائی سے بات کریں۔ مجھے ان کی کل رخ بہت پسند ہے۔“ انہوں نے اپنے رشتے کے دیور کا کوالہ دیا تو شاہ نواز کا ضبط جواب دے گیا۔

”آپ لوگ میری خاموشی کا ناجائز فائدہ مت اٹھائیں تو بہتر ہوگا۔“ وہ دھیمے مگر انتہائی سرو لہجے میں گویا ہوا تو ٹکٹ غصے سے اس کی جانب پیش۔

”اور تم جو پچھلے پانچ سال سے ہمارے پیار ہماری نرمی اور ہماری خاموشی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو وہ؟“ ”اگر آپ کو ایسا لگتا ہے کہ میں پچھلے پانچ سالوں سے آپ کے پیار اور آپ کی نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہوں تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں، مگر اس سب کے بدلے میں آپ لوگ ایک بار پھر میری زندگی کے فیصلے اپنے ہاتھوں میں لیں گے۔ یہ آپ سب کی بھول ہے۔“

دو ٹوک اور واضح الفاظ میں اپنی بات مکمل کرتا وہ اٹھ کر کمرے سے نکلتا چلا گیا تو سب ہی افراتو خانہ اسے دکھ سے دیکھ کر رہ گئے۔

\*\*\*

اپنے کمرے کا دروازہ زوردار آواز سے بند کرتے ہوئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سائیڈ ٹیبل کی جانب چلا آیا۔ جس کی دراز میں پڑی سگریٹ وہ شان و نادر ہی پیا کرنا تھا۔

سگریٹ جلا کر وہ کھڑکی میں آکھڑا ہوا تو نظریں بے اختیار آسمان کی وسعتوں سے جا کھرائیں۔

پتا نہیں کاتب تقدیر نے اس کے لیے کیسی سزا مقرر کی تھی کہ روح کی جلن اور دل کی وحشت ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ کتنی ہی بار اس نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ اپنے والدین کے لیے دکھ کا باعث نہ بنے



گاہگر ہر بار وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے تلخ ہو جاتا تھا۔ اور ایسی ہر تلخ کلامی کے بعد پچھتاوا اور شرمندگی اس کے دامن سے آن لپکتی تھی جو اس کی ذہنی اذیت میں اضافہ کر دیتی تھی۔ ایسے میں اسے خود پر بے طرح غصہ آتا جو ماضی کے گرداب میں پھنس کر اپنے حال کو بریاد کر رہا تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ مجبور تھا بے حد مجبور! اسے آج بھی اس منحوس شام کا ہر گھٹیلہ لمحہ یاد تھا، جب اس کی معصوم محبت کے چہرے پر بے یقینی اور وحشت نے کچھ اس طرح سے نیچے گاڑے تھے کہ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو تک منجمد ہو گئے تھے اور اس کا وجود بھر پوری ریت کی مانند بکھر کر زمین پہ آگرا تھا۔

ایسے میں وہ ان ایہوں پر دوبارہ کبھی کیونکر اعتبار کر سکتا تھا۔ جنہوں نے اس پر اس کی ہر فریاد، ہر التجا رد کرتے ہوئے اپنے کان بند کر لیے تھے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان دونوں کا اس سارے قصے میں کوئی قصور نہ تھا۔

اس روز اس کے آغا جی نے بڑی بے حسی سے اپنے بیٹے کو اپنی انا اور اپنی ضد پہ سے وار کر کے ایک جانب پھینک دیا تھا۔ اور اب جبکہ اس کے اندر خوشی اور امید کی کوئی برق باقی نہ رہی تھی تو اسے زندگی سے دور کرنے والے یہ چاہتے تھے کہ وہ ایک مرتبہ پھر وہی شاہ نواز بن جائے جس کے لبوں سے مسکراہٹ جدا ہونے کا نام نہ لیتی تھی اور جو اپنے ماں باپ پہ جان چھڑکتا تھا۔ مگر کاش کہ اس کا اپنا آپ اس کے بس میں ہوتا تو شاید وہ یہ بھی کر کر زنا مگر وہ تو جیسے خود پر سے ہر اختیار کھو بیٹھا تھا۔

اس کے اندر اور باہر فقط ایک ہی شخص کے اختیار کامو سم تھا۔ جس کا وہ گناہ گار تھا اور جسے بھلانے سے وہ خود کو قاصر بنا تھا۔

رائجھا رائجھا کر دی وے میں آپے رائجھا ہوئی رائجھا رائجھا صدنی مینوں ہیر نہ آکھ کوئی بے خودی کے عالم میں شعر اس کے لبوں سے ادا ہوا تو وہ جیسے خود میں لوٹ آیا۔ سوچوں کے گرداب میں

پھنسے اسے بہت دیر ہو چلی تھی۔ مگر اسے احساس تک نہ ہوا تھا۔ تب ہی سائبرٹ ٹیبل پر رکھا اس کا موبائل بج اٹھا۔ بے زار سے انداز میں اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھاتے ہوئے اسکرین پر نگاہ ڈالی جہاں عالم کا نام جگمگا رہا تھا۔

”شائش ہے تجھ پہ! میں تو یہاں ایکشن کے جھمیوں میں مصروف ہوں۔ لیکن تو کمال غائب ہے جو ایک فون تک کرنے کی زحمت نہیں کی؟“ اس کی پہلو کے جواب میں دوسری طرف سے عالم کی ناراض سی آواز سنائی دی تو وہ حقیقتاً شرمندہ ہو گیا۔

”اُئی ایم سوری یار۔ بس کافی دنوں سے طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے بہت ہی نہیں ہو سکی۔“ ”کیوں؟“ ”خیر کبھی کیا ہوا؟“ ”وہ پریشانی سے گویا ہوا تو شاہ نواز تھکے تھکے سے لمبے میں بولا۔

”یوں ہی کا سا راتلو ہو گیا تھا۔“

”قلو ہو گیا تھا یا تو طبیعت کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی؟“ ”دوسری جانب بھی عالم تھا اس کا دم ساز اس کا غم خوار شاہ نواز بے اختیار اک گہری سانس کھینچ کر رہ گیا۔

”جب سب بتا ہے تو پھر کیوں پوچھتا ہے؟“ ”یہ ہی تو میں کہتا ہوں جب کچھ بھی چھپا نہیں تو پردے کیوں ڈالتا ہے؟“ ”وہ دہر دہر گویا ہوا تو شاہ نواز کے لبوں پہ اک تلخ مسکراہٹ آن گھری۔

”بھرم رکھنے کے لیے۔“

”چتا نہیں۔ میں تو خود پچھلے تین دن سے گھر آیا بیٹھا ہوں۔“ ”بڈ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ آہستگی سے بولا تو عالم کی پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی۔ ضرور کوئی بات ہوئی تھی، جو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے وہاں سے چلا آیا تھا۔ ورنہ اپنی بڑھاپی کے معاملے میں لاپرواہی اس نے کبھی بھی نہ برتی تھی۔

اپنے بل بوتے پہ لائف میں سبٹلمنٹ اس کی اولین ترجیح تھی۔ جب ہی اس نے کسی بھی حالت میں کبھی اپنی بڑھاپی کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔

”تو کوئی مسئلہ ہے؟“ ”اچھنبے سے پوچھتے ہوئے اس نے جیسے تصدیق چاہی۔

”ہاں۔“ ”اور اس کا جواب عالم کو پریشان کر گیا۔

”ایک بات پوچھوں؟“ ”چند لمحوں کے توقف کے بعد عالم نے تشکر کیے میں پوچھا تو اس کا انداز شاہ نواز کے لبوں پہ اک پھینکی سی مسکراہٹ بکھیر گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ اب اس سے کچھ بھی چھپانا فضول تھا۔

”یہ ہی کہ وہاں کیا ہوا تھا؟“ ”عالم کے دل میں سر اٹھاتا سوال از خود نوازی کی زبان پہ در آیا۔ دوستی پر خلوص اور سچی ہو تو اس کا تعلق دل سے جڑ جاتا ہے۔ اور اس کے کا احساس انہیں بار بار ہوا تھا۔ یا جو وہ اس کے کہ ان کی دوستی کو کوئی بہت زیادہ عرصہ نہیں بلکہ محض ماڑھے پانچ سال ہوئے تھے۔

”ہاں۔“ ”وہ بنا کسی جھجک کے بولا تو شاہ نواز اک گہری سانس لیتا سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ خود بھی اس بوجھ سے نجات حاصل کرنے کا شدت سے خواہاں تھا۔

”چند دن پیچتر میرا لکراؤ زمین اور اس کے شوہر سے ہوا تھا۔“ ”وہ بوجھل لمبے میں بولا تو ایک لمحے کے لیے عالم بھی چپ سا ہو گیا۔ کو کہ یہ کوئی اتنی انمولی بات نہ تھی کہ جس کا وقوع پذیر ہونا اسے جھٹلائے

چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ ٹھہرے ہوئے لمبے میں بولا تو شاہ نواز تلخی سے مسکرا دیا۔

”ٹھیک کہا، لیکن اس کا اطمینان اس کی خوشی اور اس کی آسودگی تو تجب کی بات ہے نا! یقیناً ماں جس دن سے میں نے اسے یوں بہتے مسکراتے دیکھا ہے میرا اپنی دعاؤں پر سے یقین اٹھ گیا ہے۔ میں تو کبھی بیٹھا کہ میری ترب اور میری بریادی اس کا گھر بھی کبھی آباد نہ ہونے دے گی۔ لیکن یار وہ تو مجھ سے میری آخری خوش فہمی بھی چھین لے گئی۔ اب بتائیں اپنے جلتے دل پہ لسی کے کون سے پھاہے رکھوں؟ قسمت نے میرے ساتھ بہت نا انصافی کی ہے یار بہت نا انصافی!“

بولتے بولتے آخر میں اس کا لہجہ بھرا گیا تو عالم کا دل اپنے دوست کی اس درجہ تکلیف پہ دکھ سے بھر گیا۔ مگر وہ محض اس کی ہمت بندھانے کو مضبوط لمبے میں بولا۔

”یار برے کے ساتھ ہمیشہ برا اور اچھے کے ساتھ ہمیشہ اچھا ہوا ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ذرا اپنے ارد گرد نظر دوڑا، تجھے زیادہ تر برائی آسودگی کی گود میں پیش کرتی اور اچھائی دھکے کھاتی نظر آئے گی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی دعاؤں پر یقین کرنا چھوڑ دیں۔ تو اپنا معاملہ اللہ پہ چھوڑ دے یار وہ خود ہی تیرے جلتے دل کی تسلی کا سامان کر دے گا۔“

”وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا یار، کیونکہ میں خود بھی کسی کا مجرم ہوں اور جب اس کی ذات انصاف کرتی ہے نا تو پھر وہ برابر کسی کی حق تلفی نہیں ہونے دیتی“ ”جبکہ میری جانب تو کسی کا بہت حساب نکلتا ہے۔“

وہ رندھی ہوئی آواز میں ہنسنے لگا۔



مضطرب دل قدرے ٹھہر گیا۔  
 ”دعا کر عالم! کہ وہ مجھے اس سے معافی مانگنے کا صرف  
 ایک موقع دے۔“  
 ”نہ صرف موقع دے بلکہ اسے تجھے معاف کرنے  
 کا حوصلہ بھی دے۔ دعا ہمیشہ پوری کرتے ہیں یار  
 من!“ وہ اس کی آواز میں قدرے بہتری محسوس کرتے  
 ہوئے خود بھی ہلکا ہوا گیا تھا۔  
 ”آمین اور تجھے اللہ تعالیٰ بہت سی خوشیوں اور  
 بہت سے بچوں سے نوازے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا  
 تو عالم قہقہہ لگاکے ہنس پڑا۔  
 ”یہ کی نامزے کی بات۔ اب یہ بتا واپسی کا کیا  
 پروگرام ہے؟“  
 ”کل کی ٹکٹ کفرم کروا تا ہوں۔“ دل کا بوجھ کیا کم  
 ہوا تھا وہ واقعی خود کو پہلے سے بہت بستر محسوس کر رہا  
 تھا۔

”چھا ای! میں جا رہا ہوں۔“ گنت بیگم نے جوں  
 ہی سلام پھیرا، مختصر کھڑا شاہ نواز ان کے قریب چلا آیا۔  
 مگر وہ بناس کی جانب دیکھ کر خفگی سے منہ پھیر گئیں۔  
 ”پلیز ای! مجھے معاف کر دیں۔“ ان کے نزدیک  
 بیٹھے ہوئے اس نے نرمی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔  
 ”میں جانتا ہوں کہ میں نے آپ کا بہت دل دکھایا  
 ہے۔ مگر یقین جانیں کہ اس کے بعد میں خود بھی ایک  
 مل سکون سے نہیں رہ سکا۔ آپ کی اور طلبہ کی ذات  
 پر کشش کا وہ واحد مرکز ہے جو مجھے اس گھر کی جانب  
 کھینچتی ہے۔ مگر نہ میری ذات کے گرد تو سناٹوں کی ایسی  
 اونچی فصلیں کھڑی ہیں کہ میں خود اپنے آپ سے ملنے  
 کے لیے ترس گیا ہوں۔ ایسے میں کسی نئے رشتے میں  
 بندھ کر میں ایک اور زندگی برباد کرنے کا متحمل نہیں  
 ہو سکتا۔ میں اپنے ضمیر پر ایک نیا بوجھ نہیں لا سکتا  
 ای! آپ پلیز میری بے بسی، میری مجبوری کو سمجھنے کی  
 کوشش کریں۔“  
 آنکھوں میں درد کا سمندر لیے وہ لاچار سے لہجے

میں بولتا چلا گیا تو گنت بیگم کے لیے مزید اپنی ناراضی  
 قائم رکھنا دشوار ہو گیا۔  
 ”میں سمجھ سکتی ہوں میرے بچے! لیکن میں  
 تمہاری زندگی کو ان سناٹوں کے سپرد کرنے کا حوصلہ خود  
 میں کہاں سے لاؤں؟ کیسے تمہیں برباد ہونے کے لیے  
 تیار چھوڑ دوں؟“  
 اس کی جانب چہرہ موڑتے ہوئے وہ بھرائے ہوئے  
 لہجے میں بولیں۔ تو نہ چاہتے ہوئے بھی نوازی زبان پر  
 شکوہ در آیا۔  
 ”ویسے ہی ای! جیسے آج سے پانچ سال پہلے چھوڑا  
 تھا۔“ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ آنکھوں سے  
 بولا تو گنت بیگم کی سانس جیسے رک سی گئی۔ اگلے ہی  
 بل ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آنسو قطرہ قطرہ ان  
 کے چہرے پر بننے لگے تو سانس اور شرمندگی نے ایک  
 بار پھر شاہ نواز کا احاطہ کر لیا۔  
 ”پلیز ای! مجھے معاف کر دیں۔ میری باتوں کو  
 دیوانے کی بڑ سمجھ کے نظر انداز کر دیا کریں۔“ ان کا  
 ہاتھ تھامے وہ بچتی انداز میں گویا ہوا۔  
 ”نہیں بیٹا! معاف تو تم ہمیں کر دو کہ ہم نے  
 حقیقتاً تمہاری فرماں برداری کی بہت کڑی سزا دی  
 ہے تمہیں۔“  
 آنسوؤں کے درمیان وہ نادم سے لہجے میں گویا  
 ہوئیں۔  
 ”نہت روئیں ای! پلیز نہت روئیں کسی کا کلام  
 قصور نہیں۔ فقط میری قسمت تھی جو مجھے دعا دے  
 گئی۔“  
 اس کا نااضطرب جواب گیا تھا۔ آنسو تیزی سے اس  
 چہرہ بھگوتے گنت بیگم کے بالوں میں جذب ہونے  
 لگے تھے۔  
 ”اگر اسے قسمت کا لکھا مانتے ہو بیٹا تو اپنے آقا  
 کو معاف کر دو۔ تمہاری حالت، تمہاری دوری، تمہیں  
 کس طرح پل پل تیرا پی ہے یہ تم نہیں جانتی  
 ہوں۔ وہ منہ سے چاہے نہ کہیں، لیکن اندر ہی اندر  
 اپنے جذباتی فیصلے پہ کس قدر پچھتاوا ہے یہ تم

جانتی ہو۔“  
 ”اس کے سینے سے سر اٹھائے وہ بے اختیاری کے  
 عالم میں گویا ہوئیں تو شاہ نواز کے لب بھینچ سے گئے۔  
 بھلا اس سے بڑھ کر زبان صاحب کی تکلیف سے  
 اور کون واقف تھا۔ جن کی پیاسی نگاہیں ہمہ وقت اس  
 کا احاطہ کیے رکھتی تھیں۔ جو اس سے بات کرنے کے  
 ہمارے ڈھونڈتے تھے اور جب وہ خاموشی سے آگے  
 بڑھ جاتا تو دور کس طرح ان کے پورے وجود سے مترشح  
 ہونے لگتا تھا وہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔  
 ان کا سر جو ستاوا آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”میرے لیے بہت دعا کیجئے گا“ اللہ حافظ۔“ وہ پلٹ  
 کر کمرے سے نکلتا چلا گیا تھا اور پیچھے گنت بیگم ہی دیر  
 اپنے شوہر کے لیے معافی اور اپنے بیٹے کے لیے سکون  
 طلب کرتی رہی تھیں۔



غیاث علی کی حویلی میں آج صبح سے رونق اپنے  
 مروج پر تھی۔ خوشی کے شادمانے دور سے ہی آنے  
 والوں کو متوجہ کر رہے تھے۔ وقفے وقفے سے فضا میں  
 کوئی نئی یونانی فاننگ کی آواز ان کی جیت کا اعلان  
 کر رہی تھی۔ حویلی کا گیت آنے والوں کے لیے پورا  
 گول دیا گیا تھا وسیع و عریض صحن میں شامیانے لگا کر  
 پورے گاؤں کے لیے کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔  
 ساتھ ہی ساتھ سب ہی کو مٹھائی اور جوڑے بھی دیے  
 جا رہے تھے۔

مستعد ملازم بخوبی سارا انتظام سنبھالے ہوئے  
 تھے۔ مگر پھر بھی شائستہ بیگم ہر چیز پہ کڑی نگاہ رکھ  
 لے تھیں۔ ابھی بھی وہ ڈانٹنگ روم سے محض  
 نہت کو چند ضروری ہدایات دینے کے لیے باہر آئی  
 تھیں۔ جب سکھان تیز قدموں سے چلتی ان کے پاس  
 پہنچی۔  
 ”بڑی بی بی! آپ کو چھوٹے صاحب باہر بلا رہے  
 ہیں۔“

اس نے ہاتھ سے صحن کے دوسری جانب اشارہ کیا

تو وہ دوپٹہ سنبھالتی زنان خانے سے باہر چلی آئیں۔  
 جہاں عالم کے ساتھ شاہ نواز کو کھڑا دیکھ کر ان کے لبوں  
 پہ خیر مقدمی مسکراہٹ در آئی۔  
 ”السلام علیکم آئی!“

”وعلیکم السلام بیٹا، کیسے ہو؟“ انہوں نے اس کی  
 پیٹھ دھیرے سے پیچھتی۔  
 ”اللہ کا شکر ہے آئی! آپ سنا میں؟“

”ماں! اس کی کسی بات کا جواب دینے کی ضرورت  
 نہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ یہاں ہفتہ پہلے پہنچ کر میرا  
 کچھ ہاتھ بٹا نہ یہ آج آ رہا ہے مہمانوں کی طرح۔“  
 عالم اسے گھورتے ہوئے بولا تو شائستہ بیگم کی  
 مسکراہٹ گرمی ہو گئی۔

”عالم ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹا! تمہیں تو یہاں کافی دن  
 پہلے آ جانا چاہیے تھا۔“  
 ”آپ کا گلہ سر آنکھوں پہ آئی! لیکن میں کیا کرتا  
 یونیورسٹی سے چھٹی ہی نہیں مل رہی تھی۔“

عالم اسے ساتھ لیے مردانے میں بنے وسیع  
 ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ جہاں فیروز بھائی سے ملنے  
 کے بعد وہ سیدھا غیاث علی کی جانب آیا جو صوفے پہ  
 بیٹھے چند حضرات سے محو گفتگو تھے۔

”وعلیکم السلام! کیسے ہو بیٹا!“ محبت سے جواب  
 دیتے وہ اٹھ کر اس سے بٹل گیر ہو گئے۔  
 ”آپ کو کامیابی مبارک ہو بیٹا جان۔“

”خیر مبارک بیٹا، لیکن میں تم سے سخت ناراض  
 ہوں۔“ اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے انہوں نے خفگی  
 سے اس کی جانب دیکھا تو شاہ نواز ان کا مطلب سمجھتے  
 ہوئے مسکرایا۔

”اور میں اپنی کوتاہی پہ سخت شرمندہ ہوں۔“  
 ”چلو اگر یہ بات ہے تو پھر معاف کر دیتے ہیں، لیکن  
 میں نے اب تمہیں ہفتہ ڈیڑھ سے پہلے واپس نہیں  
 جانے دینا۔“ انہوں نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

”وچل بھی تیری تو گرفتاری کے آرڈر آگئے۔“  
 تھوڑی دیر مزید ادھر ادھر کی باتوں کے بعد غیاث علی  
 ایک بار پھر اپنے مہمانوں کی جانب متوجہ ہوئے تو عالم



اسے ساتھ لیے دوسری جانب لگے صوفوں پر آ بیٹھا۔ انہیں نشست سنبھالنے دیکھ کر اللہ دتہ فوراً دونوں کے لیے فریش جوس لیے چلا آیا۔  
”تو بھی نا ایک کمیٹی چیز ہے۔“ شاہ نواز گلاس لیتے ہوئے بولا۔

”اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“ عالم نے مسکراتے ہوئے ہنسیوں اچکائیں۔

”تجھ سے بہت بہتر۔ یہ کون ہے؟“ نواز نے اپنے دھیان میں ارد گرد کا جائزہ لیا تو فیروز بھائی کے ساتھ کھڑے شخص کو دیکھ کر اپنی بات مکمل کرنا بھول گیا۔

”کون؟“ عالم نے بھی بے اختیار اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

”وہ۔ وہ جو فیروز بھائی کے ساتھ کھڑا ہے۔“ آن واحد میں اس کے چہرے پر بے چینی دہرائی تھی۔

”وہ فیروز بھائی کا دوست ہے یا اور۔“ اس نے ایک نظر فیروز کے ساتھ کھڑے شخص پہ ڈالتے ہوئے نواز کی طرف دیکھا۔

”یار! اس دن یہ ہی تو تھا زمین کے ساتھ۔“ وہ گردن موڑ کر عالم کی جانب دیکھتے ہوئے بولا تو وہ ٹھٹک سا گیا۔

”کیا تجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن زمین کے ساتھ یہ ہی آدمی تھا؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں استفسار کیا تو نواز کی نظریں ایک بار پھر اس شخص کی طرف اٹھ گئیں۔

”ہاں یار! بالکل یہی تھا۔“ وہ بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے عالم کی جانب پلٹا۔ جس کے چہرے پر یکایک نمودار ہونے والی مسکراہٹ اسے حیرت میں مبتلا کر گئی۔

”تجھے لگتا تھا کہ تیری دعاؤں اور تڑپ کو شنوائی نہیں ملی؟“ اس کی حیرت کو نظر انداز کیے عالم نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو نواز الجھ سا گیا۔

”ہاں لیکن۔۔۔“  
”بس اب اور کچھ مت پوچھ۔“ عالم نے اسے

بے اختیار ٹوک دیا۔ ”اور صرف سامنے دیکھ جہاں تیرے رب کا انصاف مجسم حالت میں کھڑا ہے۔ یہ وہ شخص ہے نواز! جس کی خاطر زمین نے بہت سے لوگوں کو زندہ درگور کر ڈالا تھا۔ مگر جس کے نصب میں اللہ نے ایک ذاتی، شرابی اور جوازی انسان لکھ کر اس کی محبت کو ہی اس کی سزا کا سامان بنا ڈالا ہے۔“

شاہ نواز کو اپنے رب سے کیے شکوے یاد آ گئے تھے۔ وہ زمین کے مسکراتے لبوں اور میک اپ سے تھڑے چہرے کو اس کی خوش گوار زندگی سے منسوب کر بیٹھا تھا۔ مگر ظاہر اور باطن ایک ہو ایسا پیش نہیں ہوا کرتا۔

ساکت بیٹھے شاہ نواز کو بے اختیار اپنی آنکھیں جلتی محسوس ہوتی تھیں۔ بے شک اس کے ہاں دیر ہے لیکن اندھیر نہیں۔ مگر خاک کا یہ پتلا حقیقتاً ”بڑا جلد باز اور کم ظرف“ واقع ہوا ہے۔



”رائے! میں اور ساجدہ بازار جا رہے ہیں۔ تم کو کچھ منگوانا تو نہیں بیٹا؟“ عافیہ بیگم نے کپیسور پر مصروف رائے کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں امی! لیکن آپ لوگوں نے کیا خریداری کر لی ہے؟“ اس نے اسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے مال کی جانب دیکھا جو کٹنے کے لیے تیار تھیں۔

”ساجدہ نے وقار کی شادی میں جو تالا دانا ہے اس کی شاپنگ کرنی ہے۔“ انہوں نے اپنی دیورانی کا حوالہ دیا جو آج کل اپنے بھانجے کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

”اس کا مطلب ہے آپ کی واپسی دیر سے ہوگی۔“  
”ہاں ڈرہ وہ دھنڈھنے تو لگ ہی جائیں گے۔“ وہ اپنی مثال درست کرتے ہوئے بولیں۔

”آپ جاتے ہوئے اس نجیب سے کہہ جائیے گا کہ گیٹ سے پلٹنے کی کوشش نہ کرے۔“ اس نے چوکیدار کا نام لیا جو نظر بچا کے غائب ہو جانے میں ماہر تھا۔

عافیہ باہر چلی آئیں، جہاں کریم گاڑی نکالے ان کا منتظر تھا۔

بازار میں مختلف دکانوں پہ خریداری کرتے انہیں کافی دیر ہو چکی تھی۔ آخر میں دو لمبا کے لیے گھڑی خریدنے کے ارادے سے وہ دونوں گھڑیوں کے شوروم میں چلی آئی تھیں۔ جب اچانک ساجدہ کچھ یاد آنے پر پاس رکھے شاہ زکھنگاتے ہوئے بولیں۔

”بھابھی! مردانہ سوئوں والا شاہر آپ کے پاس ہے؟“

”نہیں سوہ تو تمہارے ہاتھ میں تھا۔“ انہوں نے ایک نظر اپنے پاس موجود شاپنگ بیگز پر ڈالی۔

”مجھے لگتا ہے وہ ہیرا کی دکان پر رہ گیا ہے۔“ وہ پریشانی سے بولیں تو عافیہ اک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

”آپ بیٹھیں میں دیکھ کر آتی ہوں۔“ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ غلٹ میں باہر کی جانب پلکیں تو اس درجہ لاروائی پہ وہ کوفت سے سر ہلاتی سامنے رکھی گھڑیوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”جیٹھن گھڑیوں کی نئی کلیکشن دکھائیے گا۔“ کوئی ان کے دائیں جانب تھوڑے فاصلے پہ کرسی سنبھالتے ہوئے بولا تو عافیہ کا سامنے بڑے بائس کی طرف بڑھتا ہاتھ رک سا گیا۔ یہ آواز اور یہ لہجہ انہیں بے اختیار کسی کی یاد دلایا گیا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی نظریں ہاتھ میں پکڑی گھڑی پہ مرکوز نہ رہ سکی تھیں اور وہ جو کرسی قدرے ترچھی گئی بیٹھی تھیں۔ پلٹ کر دائیں جانب دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ جہاں موجود چہرہ ان کے غمان میں ہونے کے باوجود انہیں ساکت کر گیا تھا۔

ان کے یوں پلٹ کر دیکھنے پہ مقابل نے بھی نظریں اٹھائی تھیں۔ اور اس کا پورا وجود گویا زلزلے کی زد میں آیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی چیتی گھڑی ایک بے اختیار کی عالم میں پھوٹ کر شوکیس پہ گری تھی۔

”بی کیئر فل پلیز! سیلن میں کمی آ رہی اور قدرے بلند

آواز جہاں اسے ہوش میں لے آئی تھی وہیں عافیہ بیگم ایک جھٹکے سے چہرہ موڑتی ہاتھ میں پکڑا ٹیس واپس رکھتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”آئی آئی ایم رینگی وری سوری!“ بولا کہ اس نے اپنے سامنے دیکھا تھا جہاں گھڑی کے شیشے پہ باریک سی لکیر دیکھ کر اسے ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا تھا۔  
”سوری سے کیا ہوگا۔ یہ دیکھئے کتنا نقصان ہو گیا۔“ سیلن میں نے غصے سے گھڑی اٹھا کر اس کے سامنے کی۔

”میں نے کمانا آئی ایم سوری! آپ کا جو بھی نقصان ہوا ہے، میں بھرنے کے لیے تیار ہوں۔“ بھنجلا کر کہتے ہوئے اس نے اپنے بائیں جانب دیکھا تھا جہاں بڑی خالی کرسی ایک پلٹنے والے اس کا سانس بند کر گئی تھی۔

”وہ زیادہ دیر نہیں گئی ہوں گی۔“ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ ”آپ پلیز پہلے چل کر مینجر صاحب سے ملے۔“ اس کے چہرے کو مشکوک نظریں سے دیکھتے ہوئے سیلن میں نے فوراً۔ سے پشتر منہ کر کے آواز دے ڈالی تھی۔

”پلیز سر! زرا یہاں آئیے گا۔“ ان کے پیچھے بھاگ کر ان کے قدموں سے لپٹ جانے کی خواہش، خواہش ہی رہ گئی تھی۔ اپنی اس درجہ بدنصیبی پر آنسوؤں نے لمحوں میں اس کا چہرہ بھلو ڈالا تھا۔



ڈور بیل کی آواز پہ شاہ نواز نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو شہباز اور رطلابہ کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے حیران رہ گیا۔

”آپ؟“  
”جی ہم ایک ایسا سرسبز بازار؟“ شہباز مسکرتے ہوئے اس کے گلے سے آگاہ تو وہ بھی ہنس دیا۔

”بہت اچھا۔“ بھائی سے الگ ہوتے ہوئے اس نے مسکراتی ہوئی رطلابہ کو ساتھ لگاتے ہوئے پیار کیا۔



”لیکن یہ بتائیں کہ یہ اچانک پروگرام کیسے بنا؟“  
آگے بڑھ کر سلمان اندر رکھتے ہوئے اس نے دروازہ بند کیا۔

”بس یار! یہاں ایک پارٹی سے ملنا تھا اور یہ محترمہ ویسے ہی ساتھ ہوئیں۔“ وہ تینوں آگے پیچھے چلتے لاؤنج میں چلے آئے۔

”ہاں تو میری چشیاں تھیں میں کیوں نہ آتی۔“  
”یہ رشید کہاں ہے؟“ اس نے شاہ نواز کی جانب دیکھا۔

”پازار گیا ہے۔“  
”اس کا مطلب ہے میں چائے بھی بنا لاؤں۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی تو وہ دونوں اسے دیکھتے ہوئے مسکرا دیے۔

”اور شاہ نواز بھائی کیسی جباری ہے؟“  
”شہباز شاہ نواز کی طرف متوجہ ہوا تو بے اختیار چونک گیا۔ اس کے پارے۔“  
”ایمان کے یہ رنگ اس نے بہت عرصے کے بعد دیکھے تھے۔“

”پائلٹ ٹھیک۔“ وہ دھیمی سی مسکراہٹ لیے گویا ہوا تو شہباز کی حیرت دوچند ہوئی۔ مگر وہ کچھ بھی ظاہر کیے بنا تارمل لہجے میں بولا۔

”عالم گاؤں سے واپس گیا؟“  
”نہیں۔ تین چار دن تک آنے والا ہے۔“  
”آگے اس کا کیا ارادہ ہے؟“ شہباز نے سگریٹ

سلاگتے ہوئے پوچھا۔  
”امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس اشارت کرنے کا پلان ہے۔“

”اور تمہارا؟“ اس نے ایک بار پھر گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔  
”فی الحال تو ایم فل کھلیٹ کرنے کا ارادہ ہے۔“

شاہ نواز نے سرسری سے لہجے میں جواب دیا۔  
”تو تم اس کے ساتھ پارٹنر شپ کیوں نہیں کر لیتے؟“

”فوری تو وہ بھی بہت کر رہا ہے، لیکن میں نہیں چاہتا کہ ہماری اتنی پر خلوص دوستی کسی بڑس پارٹنر

شپ کی وجہ سے خراب ہو جائے۔“  
”یہ کیا بات ہوئی؟ انسان کو خود یہ بھروسا ہونا چاہیے یا۔“ وہ سگریٹ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے بولا۔

”خود یہ تو انسان کو بھروسا ہوتا ہی ہے بھائی! لیکن وقت کب اور کہاں آپ کی آزمائش کا سامان کر ڈالے؟ کسی کو کیا پتا۔“ وہ گلاس وندوسے باہر نگاہیں جمائے دھیمے لہجے میں بولا تو شہباز اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”دیکھو بار! میں نے بھی تو کسی کی بے وفائی کا دکھ جھیلا ہے۔ لیکن یوں ایک شخص کے پیچھے خود پہ ہر خوشی حرام کر لینا کہاں کی عقل مندی ہے؟“

”یہ ہی تو فرق ہے بھائی! آپ نے بے وفائی جھیلی ہے میں نے بے وفائی کی ہے۔“  
”تو مسکراہٹ لیوں پہ سجائے وہ زور دیتے ہوئے بولا تو شہباز جھجھلا سا گیا۔

”وجہ چاہے کچھ بھی ہو، بے وفائی بے وفائی ہوتی ہے جس کے حق میں کوئی تاویل نہیں دی جاسکتی۔“  
اس کی بات کانٹے ہوئے وہ قطعی لہجے میں بولا تو

شہباز اسے غصے سے دیکھنے لگا۔  
”یعنی اپنی اس سوکالڈ بے وفائی کی خاطر تم نہ صرف اپنی زندگی برباد کرنے کی ٹھانے بیٹھے ہو بلکہ اپنے ماں باپ کو بھی اذیت دینے پہ تلے ہوئے ہو؟ واہ! کیا کہنے ہیں تمہارے۔“

وہ طنزیہ لہجے میں بولا تو شاہ نواز اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔  
”مجھ جیسے کمزور انسان میں اتنی ہمت کہاں بھائی کہ خود کو اس بے وفائی کی سزا دے سکوں۔ ہاں لیکن روح یہ دھرے بوجھ میں کمی کے لیے کوشاں ضرور ہوں۔ آپ بھی دعا کریں کہ اللہ نے جہاں میرے کرتے

حوصلوں کو اک نیا سنبھالا دیا ہے وہیں وہ میری کوششوں کو بار آور کرنے کی بھی کوئی سبیل بنا دے۔“

بات کرتے کرتے آخر میں اس نے اس کا ہاتھ تھام

کے جیسے استاد عاکی تو شہباز کے غصے کی جگہ الجھن نے لے لی۔  
”کیسا سنبھالا؟“ اس نے بغور شاہ نواز کے چہرے کو دیکھا۔

”وقت آنے پر تباؤں لگ۔“ وہ آہستگی سے بولا تو شہباز نے چاہنے کے باوجود مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

\*\*\*  
”السلام علیکم! لاؤنج کا دروازہ کھول کر ساجدہ اور عافیہ اندر داخل ہوئیں تو کتاہوں میں سر دیے بیٹھی رات نہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”وعلیکم السلام! ایسی ہو بیٹا؟“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑے شاہ نواز کے صوفے پر رکھتے ہوئے اسے خود سے لگایا۔ جبکہ عافیہ سلمان کے ساتھ ساتھ خود بھی صوفے پر گر سی گئیں۔

”رات نہ! بیٹا پانی پلاؤ۔“ وہ عجیب منہ حال سے انداز میں بولیں تو رات نہ چونک کر ان کی جانب دیکھنے لگی۔  
”کیا بات ہے ابی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

وہ تیزی سے ان کے نزدیک چلی آئی۔  
”ہاں ٹھیک ہے۔ بس ذرا تھکاوٹ سی ہو گئی ہے۔“

وہ زبردستی کی بشارت لہجے میں پیدا کرتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھیں۔ مبادا ساجدہ ان کی بات کا برا نہ مان جائیں۔ مگر نہ جانے کیوں رات نہ کو ان کا لہجہ ان کے چہرے کا ساتھ دیتا نہ لگ رہا تھا۔ جس پہ زردی کے ساتھ ساتھ عجیب سے تاثرات رقم تھے۔ مگر ساجدہ

تیکم کے سامنے مزید کچھ پوچھنا اس نے مناسب نہ سمجھا تھا۔ اسی لیے خاموشی سے پانی لینے اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

\*\*\*  
شہباز دو دن رکنے کے بعد کونسل واپس چلا گیا تھا، جبکہ رطابہ کو شاہ نواز نے روک لیا تھا۔ اس کی تنہائی کے خیال سے شاہ نواز نے رشید کی بیوی ہاجرہ کو کچھ

دنوں کے لیے جہلم سے بلوایا تھا۔ جس کے بعد گھر میں خاصی رونق ہو گئی تھی۔

ابھی بھی وہ بیونورسٹی سے لوٹا تو رطابہ ہاجرہ کو ساتھ لگائے بچن میں مصروف تھی۔ جس کے باعث پورا گھر اشتیاء انگیز خوشبوؤں سے مہک رہا تھا، جبکہ رشید کو اس نے پورے فلیٹ کی تفصیلی صفائی پہ لگایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی حالت خاصی اتر ہو رہی تھی۔

”کیوں بھی رشید! کیسا لگ رہا ہے کام کرنا؟“ وہ فریٹ ہو کر لاؤنج میں چلا آیا، جہاں رشید صاحب بیٹھے کٹن کورز تبدیل کر رہے تھے۔

”آپ کو مذاق سوچ رہا ہے صاحب جی! یہاں رطابہ بی بی نے کام کروا کر وا کے میرا برا حشر کر دیا ہے۔“ وہ منہ بسورے بولا تو شاہ نواز کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جبکہ اس کے لیے ٹھنڈا جو س لاتی رطابہ بلند آواز میں بولی۔

”تمہارا تو اس سے بھی برا حشر ہونا چاہیے۔ جو حالت تم نے گھر کی کر رکھی ہے اس کے بعد تو تمہیں سر کے بل کھڑا کروا کے صفائی کروانی چاہیے، تاکہ تمہیں سزا بھی ملے اور آئندہ کے لیے سبق بھی۔“ وہ ہاتھ میں پکڑے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھتی شاہ نواز کے برابر بیٹھ گئی تو وہ بے اختیار بس پڑا۔

”ویسے سوچو طابی! رشید کیسا لگے گا لانا کھڑے ہو کر ویکووم لگاتا ہوا؟“ وہ ایک نظر رشید کے سوجے ہوئے منہ پر ڈالتا شرارت سے رطابہ سے مخاطب ہوا تو نہ صرف رطابہ بلکہ رشید خود بھی ہنس پڑا۔

”آپ بھی نا بھائی! لے کے ساری ڈانٹ کا اثر زائل کر دیا۔“ وہ مسکراتے ہوئے گلاس میں جوس ڈالنے لگی تو رشید دانٹ نکوتے ہوئے بولا۔

”بی بی! بی بی! کیا کام کل نہ کر لیں۔“

”جی نہیں۔ کل کے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں۔“ وہ ایک گلاس رشید کی جانب بڑھاتے ہوئی بولی تو وہ منہ بنا خاموشی سے گلاس تھام گیا۔

”جاؤ جا کے دیکھو ہاجرہ نے کھانا لگایا ہے کہ نہیں۔“ اس نے خالی گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے

دوں کے لیے جہلم سے بلوایا تھا۔ جس کے بعد گھر میں خاصی رونق ہو گئی تھی۔

ابھی بھی وہ بیونورسٹی سے لوٹا تو رطابہ ہاجرہ کو ساتھ لگائے بچن میں مصروف تھی۔ جس کے باعث پورا گھر اشتیاء انگیز خوشبوؤں سے مہک رہا تھا، جبکہ رشید کو اس نے پورے فلیٹ کی تفصیلی صفائی پہ لگایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی حالت خاصی اتر ہو رہی تھی۔

”کیوں بھی رشید! کیسا لگ رہا ہے کام کرنا؟“ وہ فریٹ ہو کر لاؤنج میں چلا آیا، جہاں رشید صاحب بیٹھے کٹن کورز تبدیل کر رہے تھے۔

”آپ کو مذاق سوچ رہا ہے صاحب جی! یہاں رطابہ بی بی نے کام کروا کر وا کے میرا برا حشر کر دیا ہے۔“ وہ منہ بسورے بولا تو شاہ نواز کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جبکہ اس کے لیے ٹھنڈا جو س لاتی رطابہ بلند آواز میں بولی۔

”تمہارا تو اس سے بھی برا حشر ہونا چاہیے۔ جو حالت تم نے گھر کی کر رکھی ہے اس کے بعد تو تمہیں سر کے بل کھڑا کروا کے صفائی کروانی چاہیے، تاکہ تمہیں سزا بھی ملے اور آئندہ کے لیے سبق بھی۔“ وہ ہاتھ میں پکڑے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھتی شاہ نواز کے برابر بیٹھ گئی تو وہ بے اختیار بس پڑا۔

”ویسے سوچو طابی! رشید کیسا لگے گا لانا کھڑے ہو کر ویکووم لگاتا ہوا؟“ وہ ایک نظر رشید کے سوجے ہوئے منہ پر ڈالتا شرارت سے رطابہ سے مخاطب ہوا تو نہ صرف رطابہ بلکہ رشید خود بھی ہنس پڑا۔

”آپ بھی نا بھائی! لے کے ساری ڈانٹ کا اثر زائل کر دیا۔“ وہ مسکراتے ہوئے گلاس میں جوس ڈالنے لگی تو رشید دانٹ نکوتے ہوئے بولا۔

”بی بی! بی بی! کیا کام کل نہ کر لیں۔“

”جی نہیں۔ کل کے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں۔“ وہ ایک گلاس رشید کی جانب بڑھاتے ہوئی بولی تو وہ منہ بنا خاموشی سے گلاس تھام گیا۔

”جاؤ جا کے دیکھو ہاجرہ نے کھانا لگایا ہے کہ نہیں۔“ اس نے خالی گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے

دوں کے لیے جہلم سے بلوایا تھا۔ جس کے بعد گھر میں خاصی رونق ہو گئی تھی۔

ابھی بھی وہ بیونورسٹی سے لوٹا تو رطابہ ہاجرہ کو ساتھ لگائے بچن میں مصروف تھی۔ جس کے باعث پورا گھر اشتیاء انگیز خوشبوؤں سے مہک رہا تھا، جبکہ رشید کو اس نے پورے فلیٹ کی تفصیلی صفائی پہ لگایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی حالت خاصی اتر ہو رہی تھی۔

”کیوں بھی رشید! کیسا لگ رہا ہے کام کرنا؟“ وہ فریٹ ہو کر لاؤنج میں چلا آیا، جہاں رشید صاحب بیٹھے کٹن کورز تبدیل کر رہے تھے۔

”آپ کو مذاق سوچ رہا ہے صاحب جی! یہاں رطابہ بی بی نے کام کروا کر وا کے میرا برا حشر کر دیا ہے۔“ وہ منہ بسورے بولا تو شاہ نواز کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جبکہ اس کے لیے ٹھنڈا جو س لاتی رطابہ بلند آواز میں بولی۔

”تمہارا تو اس سے بھی برا حشر ہونا چاہیے۔ جو حالت تم نے گھر کی کر رکھی ہے اس کے بعد تو تمہیں سر کے بل کھڑا کروا کے صفائی کروانی چاہیے، تاکہ تمہیں سزا بھی ملے اور آئندہ کے لیے سبق بھی۔“ وہ ہاتھ میں پکڑے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھتی شاہ نواز کے برابر بیٹھ گئی تو وہ بے اختیار بس پڑا۔

”ویسے سوچو طابی! رشید کیسا لگے گا لانا کھڑے ہو کر ویکووم لگاتا ہوا؟“ وہ ایک نظر رشید کے سوجے ہوئے منہ پر ڈالتا شرارت سے رطابہ سے مخاطب ہوا تو نہ صرف رطابہ بلکہ رشید خود بھی ہنس پڑا۔

”آپ بھی نا بھائی! لے کے ساری ڈانٹ کا اثر زائل کر دیا۔“ وہ مسکراتے ہوئے گلاس میں جوس ڈالنے لگی تو رشید دانٹ نکوتے ہوئے بولا۔

”بی بی! بی بی! کیا کام کل نہ کر لیں۔“

”جی نہیں۔ کل کے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں۔“ وہ ایک گلاس رشید کی جانب بڑھاتے ہوئی بولی تو وہ منہ بنا خاموشی سے گلاس تھام گیا۔

”جاؤ جا کے دیکھو ہاجرہ نے کھانا لگایا ہے کہ نہیں۔“ اس نے خالی گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے



ٹرے اٹھا کر رشید کے حوالے کی۔

”بھائی! کھانے کے بعد میرا سامنے والی آنٹی اور ان کی بیٹی کے ساتھ بازار کا روگرام ہے۔ اس لیے آپ پیسے دے کر سونے جائیے گا۔“ اس نے اطلاع کے ساتھ ساتھ فرمائش بھی جاری رکھی تو شاہ نواز مسکرا دیا۔

”تم نے اتنی جلدی دوستی بھی کاٹھلی؟“

”اور نہیں تو کیا؟ آپ کی طرح تھوڑی کہ پانچ سال میں صرف ایک ہی دوست بنایا ہے۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”ویسے اس بار مجھے عالم بھائی سے ملوائے گا ضرور۔“ گوکہ وہ سال میں ایک آدھ چکر یہاں کا ضرور لگاتی تھی۔ مگر اتفاق تھا کہ بھی عالم سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ نعمت البتہ عالم سے دو تین بار مل چکی تھیں۔

”اوکے! ملا دوں گا۔ اب اٹھو! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامتے اٹھ کھڑا ہوا تو رطابہ دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کرتی شاہ نواز کے ساتھ ڈانٹ لگ کر چلی آئی۔

گوکہ شاہ نواز کے دبیے میں در آنے والی تبدیلی کو اس نے پہلے ہی روز محسوس کر لیا تھا۔ مگر اسے یوں بے ساختہ ہنستے مسکراتے اور باتیں کرتا دیکھ کر وہ اندر تک سرشار ہو چلی تھی۔

تبدیلی کے اس محرک کے بارے میں جاننے کی البتہ اس نے کوئی کوشش نہ کی تھی کہ اس کے لیے فی الوقت یہ ہی بہت تھا کہ اس کا بھائی ڈپریشن کے ایک لمبے دور کے بعد خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور وہ اسے کبھی نہ پھر سے پرانی الجھنوں میں نہیں الجھانا چاہتی تھی۔

”اوکے بھائی میں جاری ہوں۔“ وہ کھانے کے بعد تیار ہو کے اس کے کمرے میں آئی۔

”تم لوگ جاؤ گے کس طرح؟“ تو اڑنے بڑے میں سے پانچ ہزار کے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

”شمالہ کی گاڑی میں۔“ اس نے پیسے پکڑتے

ہوئے انصاری صاحب کی بیٹی کا حوالہ دیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا سونے کے لیے دروازہ کھولا۔

\*\*\*

”ہی! آپ ٹیکر کا کام ختم کر لیں۔ میں اور رطابہ جب تک سامنے سے ہو کر آتے ہیں۔“ شمالہ نے سڑک کے اس پار موجود ہونے سے سپراسٹور کی جانب اشارہ کیا تو مسز انصاری اثبات میں سر ہلاتی آگے بڑھ گئیں، جبکہ وہ دونوں سڑک پار کر لی امریکن طرز بنے اس وسیع و عریض اسٹور میں چلی آئیں۔

”یہاں ہمیں میک اپ سے لے کر ہینگز، جیوری ڈیکوریشن، ہیسنز اور ہاؤس ہولڈ آئٹمز تک ہر چیز ملے گی۔ اب بتاؤ کس طرف چلیں؟“ شمالہ نے رطابہ کی جانب دیکھا تو وہ پوچھ انداز میں بولی۔

”میرے خیال میں ان کے لیے پرفیوم ٹھیک رہے گا۔“ اس لیے کامیٹکس اینڈ پرفیومز۔“ والے سیکشن کی طرف چلو۔

کل شاہ نواز کی سالگرہ تھی۔ اس لیے رطابہ آج خاص طور پر اس کے لیے گفٹ لینے بازار آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ ایک مشہور پیکری پہ جا کے اس کے لیے ٹیک کا آرڈر بھی بوائے آئی تھی۔

شمالہ کے ہمراہ چلتی ہوئی وہ مطلوبہ سائڈ پر چلی آئی تو وہ اسے ایک علیحدہ بنے کارنر کی جانب لے آئی۔

”یہ جینٹلس کارنر ہے، تم یہاں سے پرفیوم سلیکٹ کرو۔“ میں جب تک اپنی چند ایک چیزیں خرید کر واپس آئی ہوں۔“ وہ پرس میں سے شاپنگ لسٹ نکال کر دیکھنے لگی تو رطابہ اثبات میں سر ہلاتی سامنے لگے ڈھیروں میٹرز کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”ہم تیرے جیسے تجھوس نہیں یا رمن! اس لیے جو چاہیے فنانٹ بول، میں صرف تیرے گفٹ کی خاطر گھر جانے کے بجائے سیدھا بازار آیا ہوں۔“

وہ جو کوئی بھی تھا خاصی خوب صورت آواز کا مالک تھا۔ جب ہی نہ چاہتے ہوئے بھی ایک پل کے لیے رطابہ کا سارا دھیان اس آواز کی جانب مبذول ہو گیا

تھا۔

”اوہ! کیا کہنے ہیں جناب کے۔“

اب کی بار آواز کے ساتھ ساتھ اس کی دھیمی سی ہنسی بھی رطابہ کے کان میں پڑی تو وہ غیر محسوس انداز میں اپنا رخ پھیر گئی۔ جہاں اس سے تھوڑے فاصلے پر کان کے کڑکڑاتے وائٹ شلوار سوٹ میں دروازے قامت شخص قدرے ترچھا کھڑا موبائل پہ محو گفتگو تھا۔

”چل پھر اگر تو میری پسند یہ راضی ہے تو یوں ہی سی۔“ میں نے ٹوٹا لے! اچھے بڑا اچھا موقع دیا تھا۔“ وہ مسکراتے ہوئے رطابہ کی جانب پیٹھ موڑ کے اپنے پیچھے لگے ریک کا جائزہ لینے لگا تو وہ بھی سر جھٹکتی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

اسے ایک پرفیوم پسند آیا تو وہ سیلزمین کو اس کا نام دتا کہ خود کاؤنٹر کی جانب چل دی۔ مگر ابھی چند قدم ہی آگے بڑھ پائی تھی کہ اچانک اس کے دامن طرف بنے ریکس کے پیچھے سے ایک ننھا سا چوڑا بھگتا ہوا آکر اس کی ٹانگوں سے ٹکرانے کے بعد پیچھے کر کے رونے لگا۔

”لوئے اوئے! سوری بیٹا، رونا نہیں۔“ اگلے ہی لمبے وہ ہاتھ میں پکڑے شارز نیچے رکھتے ہوئے دو زانو جھک کر روتے ہوئے بچے کو پیار کرنے لگی۔ تو اپنے دھیان میں اس طرف متوجہ ہونے والا عالم قدرے چونک کر اس لڑکی کو دیکھنے لگا جو ارد گرد کی پروا کیے بنا زمین پر بیٹھی اس چھوٹے سے بچے کو انتہائی نرمی سے چپ کروانے میں مصروف تھی۔

”چوٹ تو نہیں لگی؟“ اس کے گھٹنوں کو مسلتے ہوئے اس نے پیار سے پوچھا تو نہ چاہتے ہوئے بھی عالم کے لبوں پہ دھیمی سی مسکراہٹ آن تھری۔ بے اختیار اس کی نظروں نے سامنے موجود صبیح چہرے کا تفصیلی جائزہ لیا تھا جو اپنی لٹ کان کے پیچھے اڑتی اس بچے کو گود میں اٹھائے خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

بچے کے گل کو چومتے ہوئے اس نے متلاشی

نظروں سے یقیناً اس کی ماں کو متلاشنا چاہا تھا۔

”اچھا آکس کریم کھاؤ گے؟“ اپنے مقصد میں ناکامی پر وہ ایک بار پھر بچے سے مخاطب ہوئی تھی۔ جو اس مزے دار آفریہ اینارونا بھول بھال کے زور و شور سے اثبات میں سر ہلاتا عالم کی مسکراہٹ گہری کر گیا تھا۔ ”چلو پھر چل کے آکس کریم کھاتے ہیں۔ لیکن آپ اب رونا نہیں، اوکے؟“ وہ بچے پر اسامان چھوڑ چھاڑا اپنی دھن میں آگے بڑھ گئی تو عالم اس بے خبر حسینہ کی عقل پہ عیش عیش کرتا تیزی سے اس کے سامان کی طرف چلا آیا۔

”اگے کس کی وزی مس!“ اپنے دھیان میں آگے بڑھتی رطابہ کو ایک باری وہی خوب صورت آواز اپنے بے حد قریب سنائی دی تو وہ بے اختیار پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھنے لگی۔ جہاں وہی دروازہ اجنبی اپنی تمام تر وجاہت لیے اس سے چند قدموں کے فاصلے پہ کھڑا تھا۔

”جی!“ وہ قدرے حیران سی گویا ہوئی تو عالم نے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بگ کو اس کے سامنے کر دیا۔ ”یہ غالباً آپ کے ہیں۔“ وہ شائستگی سے بولا تو رطابہ کے چہرے پر خفت کے ساتھ ساتھ تشکر کے رنگ بھی نمایاں ہو گئے۔

”جی۔“ شرمندہ سی اس نے ہاتھ بڑھا کر ہینگز تھام لیے۔ ”تھینک یو وری مچ۔“

”مائی پیلیٹرز! بائے داوے آپ کا بیٹا کیوٹ ہے۔“ اپنی شرارت چھپائے وہ مسکرا کر بولا تو رطابہ کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔

”یہ میرا بیٹا نہیں ہے۔“ وہ بمشکل تمام اپنی ناگواری پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ تو عالم کے لیے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن چہرے کے تاثرات اس نے سنجیدہ ہی رکھے۔

”پھر کس کا ہے؟“

”پتا نہیں۔“ وہ رس رس کرتے بچے کو چپ کرواتے ہوئے بولی تو عالم مصنوعی حیرت سے بھنوس اچکا گیا۔



”جی؟“ اور رطلبہ کا دل چاہا کہ زمین چھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

”مممم میرا مطلب ہے کہ یہ بچہ اچانک مجھ سے ٹکرا کر گر پڑا تھا۔ میں اس کی مدد کر رہی تھی۔“

مقابل کے لبوں پہ لچک بے لچک گہری ہوتی مسکراہٹ اسے مزید خفیف کر گئی تھی۔

”او آئی سی!“ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے عالم نے اسے مزید تنگ کرنے کا ارادہ موقوف کر دیا۔

”آپ ایسا کریں کہ میٹھر کے آفس میں۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کر تا پچھ ایک قریب آتی عورت کو دیکھ کر ماما پکارا نہ کہنے لگا۔“

”او میرے اللہ! تیرا شکر ہے۔“ آنے والی نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے بچے کو رطلبہ سے لیتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔

”معذرت کے ساتھ“ لیکن محترمہ! حد ہوتی ہے لاہر والی کی۔ اگر یہ بھلی خاتون آپ کے بچے کو نہ سنبھالتیں تو نہ جانے یہ کتنی سی جان کس مشکل میں گرفتار ہو جاتی۔“

پیشانی پہ بل سجائے وہ غصے سے بولا تو وہ خاتون اچھی خاصی شرمندہ ہو گئیں۔

اسی اثنا میں سامنے سے شاملہ چلی آئی تو وہ اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

”فارغ ہو گئیں؟“ شاملہ نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بس ایک منٹ۔“ وہ غلٹ میں کہتی پیچھے پلٹی۔ مگر وہاں اس اجنبی کو نہ پا کر نہ جانے کیوں دل میں اٹھتے یو سی کے احساس کو روک نہ سکی۔

\*\*\*

رات کے کھانے کے بعد رائے نے حسب معمول گرین ٹی تیار کی۔ حیات احمد کو ان کا کپ لاؤنج میں دینے کے بعد وہ اپنا اور عافیہ بیگم کا کپ ٹرے میں رکھے

ان کے کمرے میں چلی آئی۔ جہاں وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بالکل چپ چاپ بیٹھی تھیں۔

”کیا بات ہے ابی؟ آپ آج پاپا کے پاس لاؤنج میں کیوں نہیں بیٹھیں؟“

ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے بیڈ پہ رکھی۔

”بس یوں ہی سر میں درد تھا“ اس لیے میں یہاں آگئی۔“ سیدھی ہوتے ہوئے انہوں نے کپ اٹھا لیا۔

”کیا بات ہے ابی؟ آپ جب سے بازار سے آئی ہیں بہت چپ چاپ کی ہیں۔ خیر تو ہے؟“ گہری

نظروں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے رائے نے اپنی سوچ کو زبان دی۔ ان کا یہ کھویا کھویا سا انداز اسے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

”خیر ہی ہے“ بس تھکاوٹ کافی ہو گئی ہے۔“ وہ بوجھل سے لہجے میں گیا ہوئیں تو رائے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ کچھ تو وہاں ہے۔

”رائے!“

”جی۔“ اس نے نظریں اٹھاتے ہوئے ان کی جانب دیکھا جن کے چہرے پر عجیب کشمکش کے تاثرات تھے۔

”وہ۔۔۔ وہ اپنے پاپا کو چائے دے دی تھی؟“ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد انہوں نے آہستگی سے پوچھا تو

رائے اک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ آخری وقت پہ بات بدل گئی تھیں۔ مگر وہ ایسا

کیوں کر رہی تھیں یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

”امی پلین! مجھے سچ بتائیں بازار میں کیا ہوا تھا؟“ ہاتھ میں پکڑا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے اس نے

دو ٹوک الفاظ میں پوچھا۔

”کہا تو ہے کچھ نہیں۔“ وہ ایک سخت درشتی سے بولیں تو رائے خفا نظروں سے انہیں دیکھتی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ جبکہ پیچھے عافیہ بے اختیار سر ہٹا کر رہ گئیں۔

\*\*\*

رطلبہ آج صبح سے ہاجرہ اور رشید کو ساتھ لگائے شام کے ساتھ ساتھ رات کے لیے شان دار سے ڈنر کی تیاریوں میں بھی مصروف تھی۔ مگر وہ پھر کو اس نے نہ تو کوئی اہتمام کیا تھا اور نہ ہی نواز کو منوش کیا تھا۔

نواز بھی بنا کچھ جتنائے خاموشی سے صبح یونیورسٹی چلا گیا تھا اور واپسی پر کھانا کھانے کے حسب معمول لیٹ گیا تھا۔

مگر اب جو وہ سو کر اٹھا تو لاؤنج میں گیا کیا اہتمام اسے خوش گوار سی حیرت میں مبتلا کر گیا تھا۔

”ابھی برتن ڈالے مانی فیر بڑا در!“ رطلبہ مسکراتے ہوئے اس کے سینے سے آگئی تو وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

”تھینک یو سویت ہارٹ“ میں تو سمجھا تھا بھول گئیں۔“

”پہلے کبھی بھولی ہوں جو اس بار بھولتی۔“ وہ اسے بتاتے ہوئے بولی تو نواز اسے تنگ کرنے کو کندھے اچکا گیا۔

”میں سمجھا شاید تمہیں ہر بار امی یاد دلاتی ہوں۔“

”بھائی!“ اس نے خفگی سے اسے گھورا تو نواز نے ہنستے ہوئے اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔

”یہ آپ کے لیے۔“ رطلبہ نے ہاتھ میں پکڑا گفٹ اس کی جانب بڑھایا۔

”تھینک یو۔“ وہ گفٹ لیے اس کے ساتھ صوفے پر آ بیٹھا۔ ”میرے پیسوں سے لیا ہے؟“

وہ گفٹ کھولتے ہوئے معصومیت سے بولا تو رطلبہ نے بے اختیار اس کے بازو پہ ایک مکا جڑ دیا۔ جس پہ

شاہ نواز کے ساتھ ساتھ ہاجرہ اور رشید بھی ہنس دیے۔

”ساگرہ مبارک ہو صاحب جی!“ ان دونوں نے اسے مبارک باد دی۔

”خیر مبارک! چلو بھی اب چائے لگاؤ۔“ وہ فریوم کا لاکسا اسپرے بول کے ڈھکن میں کر کے چیک کرتے

”بیوٹی فُل! تھینکس اگین سوئی۔“ وہ رطلبہ کی جانب پلٹا۔

”یو آر ویلکم بھائی! چلیں اب چل کے کیک

کاٹیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے اٹھ کھڑی ہوئی تو نواز اس کے ساتھ چلا ڈانٹنگ نیبل تک چلا آیا۔ جہاں رطلبہ نے کافی کچھ بنا کے سجا رکھا تھا۔

ماچس ہاتھ میں پکڑے وہ جھک کر کیک پہ مگی موم بتیاں جلانے میں مصروف تھی۔ جب معا“ ڈور نیل کی آواز اسے بد مزہ کر گئی۔

”یہ اس وقت کون آگیا۔ جاؤ رشید جا کے دیکھو۔“

اس کے کہنے پہ رشید باہر کی جانب بڑھ گیا۔

”السلام علیکم! آ“ دروازہ کھلنے کے بعد رشید کی پرچوش سی آواز سنی دی تو رطلبہ نے بے اختیار نواز کی جانب دیکھا جو لاعلمی سے کندھے اچکا کر سی سے اٹھ گھڑا ہوا۔

”کہاں ہے یار من؟“ اچانک ایک جانی پہچانی سی آواز رطلبہ کی سماعتوں سے ٹکرانی تو اسے حیرت کے

اس کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ جبکہ نواز مسکراتا ہوا تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ جس کے بعد گالیوں

توقبول اور کوسنیوں کے درمیان آنے والی ہستی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی اور اسے یوں ڈانٹنگ نیبل کے پاس بہت بنا کھڑا دیکھ کر خود بھی ایک پل کے لیے حیران

کھڑی رہ گئی تھی۔

”بھئی کی کوئی بات نہیں یار! یہ رطلبہ ہے۔“ اس کے یوں تنگ کر رک جانے پہ ساتھ چلتے نواز نے

تعارف کروایا تو وہ اپنی حیرت پہ قابو نہ آ کر بڑھ آیا۔

”اور طابی! یہ رے تمہارے عالم بھائی، جن سے ملنے کا تمہیں بے حد اشتیاق تھا۔“ شاہ نواز اپنے فری

اینڈ فرینک انداز میں بولا تو رطلبہ کا چہرہ سخت کے مارے گلابی پڑ گیا۔ جبکہ عالم کے لبوں پہ محظوظ سی مسکراہٹ

آن بھری۔

”السلام علیکم!“ رطلبہ نے آہستگی سے سلام کیا۔

”و علیکم السلام کیسی ہیں آپ؟“ اس نے شائستگی سے سوال کیا۔

”الحمد للہ۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟“ اس نے جواباً ”مزاں جی برسی کی۔“

”بہت اچھا۔“ اس کی جانب دیکھتے ہوئے وہ



قدرے معنی خیزی سے گویا ہوا تو ایک پل کے لیے رطابہ گڑبڑا سی گئی۔  
”چلیں بھائی ایک کائیں۔“ اگلے ہی لمحے وہ شاہ نواز سے مخاطب ہوئی تو عالم اپنی مسکراہٹ دبائے نیل کے قریب چلا آیا جہاں تالیوں کے درمیان شاہ نواز نے ایک کانٹا اور پھر ایک بہت خوب صورت سی شام اور شان دار ساؤنڈز کے جب عالم اپنے گھر لوٹا تو رطابہ شاہ زمان کا خیال نہایت چپکے سے اپنے ہمراہ لیے چلا آیا۔

\*\*\*

پچھلے دو دنوں سے رائے عافیہ بیگم سے مکمل طور پر ناراض تھی اور وہ چاہ کر بھی اسے منانہ سکی تھیں جس سے نہ چاہتے ہوئے بھی رائے کو تشویش ہونے لگی تھی کہ وہ تو اس کی ذرا سی بھی ناراضی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ تاکہ دو دن۔

ان کا یہ سب لگبلا انداز سرکھٹا ہے یہ پاور کو آگیا تھا کہ اس مرتبہ اس کی یہ جذباتی بلک میناٹ اس کے کسی کام نہیں آئے والی کیونکہ وہ اسے کچھ نہیں بتانے والی تھیں اور یہ بات ہی سوچتے ہوئے اس نے اپنی خود ساختہ ناراضگی ختم کرنے کا ارادہ کیا تھا کہ وہ انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اور اسی لیے آج شام کی چائے کے ساتھ اس نے ایک دو لوانہات اپنے ہاتھوں سے تیار کیے تھے جنہیں بڑے میں سجائے وہ لاؤنج میں چلی آئی تھی جہاں عافیہ بیوی آن کیے اکیلی بیٹھی تھیں۔

”یہ دیکھیں مام! میں نے آج کیا بنایا ہے۔“ وہ جب بہت موڈ میں ہوتی تو انہیں اسی طرح پکارتی تھی۔ مگر آج ان کی شکایتی نظریں خود پر مرکوز پارکروہ شرمندہ سی مسکرا رہی تھی۔

”چھاپا اب آئی ایم سوری!“ بڑے سینئر نیل پر رکھ کر وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے گلے میں جھول گئی تھی۔

”ہو گیا اپنی غلطی کا احساس؟“ چہرہ موڑے انہوں نے خفگی سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

”وہ تو کل ہی ہو گیا تھا۔“ مسکراہٹ دبائے وہ معصومیت سے گویا ہوئی تو عافیہ اسے گھورنے لگیں۔ مگر جو بنی اس نے آگے بڑھ کر ان کا چہرہ جو امان کے لیے اپنی ناراضی کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کا سر اپنے شانے سے لگایا۔

”لاؤ دکھاؤ کیا بنایا ہے تم نے۔“ آگے کو جھکتے ہوئے انہوں نے نیل کا جائزہ لیا۔ جہاں سجا کر گرم ”برا“ اور ”چکن ونگز“ اس بات کا ثبوت تھے کہ اس نے محض ان کی خاطر ساری دوسری چکن میں گزاری ہے۔

”میری بچی! انہوں نے بے اختیار اسے خود سے لگایا۔ ”کیا ضرورت تھی اتنی محنت کی؟“

”آپ کو منانا جو تھا۔“ وہ ایک بار پھر شرارت سے گویا ہوئی۔ ”چھاپا کھا کر تائیں کیا بننا ہے۔“ ان سے الگ ہوتے ہوئے اس نے پراکا ٹکڑا کٹ کر پلیٹ ان کی جانب بڑھائی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے پکھٹیں، مجید ”ٹکڑا لیں“ لیے اندر چلا آیا۔

”چھوٹی بی بی! آپ کی سہیلی کافون ہے۔“ اس نے فون رائے کی جانب بڑھاتے ہوئے اطلاع دی تو اس نے ہاتھ صاف کر کے فون تھاں لیا مگر جو بنی اس نے ”ہیلو“ کہا دوسری جانب سے آتی آواز انہوں میں اس کا چہرہ فٹ کر گئی۔

”کون؟“ ڈوٹے دل کے ساتھ اس نے مشکل تمام اپنے خدشے کی جیسے تصدیق چاہی تھی۔ اور جیسے ہی دوسری طرف سے اس کے سوال کا جواب دیا گیا، اس کی پھٹی پھٹی بے یقینی نگاہیں ماں کے چہرے پر آئیں۔ جو آنکھوں میں ابھرنے لگی اور پریشانی لیے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

اسے یوں متوحش نگاہوں سے اپنی جانب تکتا ہوا کہ انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر فون اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کان سے لگایا۔

”ہیلو!“ وہ قدرے سختی سے گویا ہوئیں۔ مگر جو بنی دوسری جانب سے آتی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی

وہ بے اختیار لب بھیج کر رہ گئیں۔  
”دوبارہ یہاں فون مت کرنا!“ انتہائی سرد لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے لائن کٹ دی اور بلند آواز میں مجید کو پکارنے لگیں۔

”جی بیگم صاحبہ!“ وہ حیران سا اندر چلا آیا۔  
”جا کے یہ نمبر نوٹ کرو اور فون کی تار نکال دو۔“ دوبارہ اس نمبر سے اگر کل آئے تو ریسیوٹ کرنا۔“ انہوں نے اسے ہدایت کے ساتھ ساتھ تاکید بھی جاری کی تو حیران پریشان سا مجید اثبات میں سر ہلانا لگے پاؤں باہر نکل گیا۔

”امی! یہ یہاں۔“ رائے کے اعصاب تو اس اچانک افوا سے جیسے جھنجھٹا اٹھے تھے۔ ”جانتی ہوں۔“ اس دن بازار میں دیکھا تھا میں نے۔“ وہ پشیموڈ سے گویا ہوئیں تو رائے نے بے اختیار اپنا سر تھاں کر رہ گئی۔ عافیہ بیگم کی پریشانی، خاموشی پر بات کا اسے از خود جواب مل گیا تھا اور اب وہ جیسے خود گنگ سی ہو چکی تھی۔

قسمت کیوں ہر بار ان کا سکون دور ہم پر ہم کرنے پر تلی رہتی تھی اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

\*\*\*

رطابہ تقریباً ”ایک ڈیڑھ ہفتہ اسلام آباد میں گزارنے کے بعد آج واپس چلی گئی تھی کہ دو دن بعد اس کی کلاسز شروع ہونے والی تھیں۔ اس دوران عالم کی اس سے ایک دوبار اور ملاقات ہوئی تھی اور ان سرسری سی ملاقاتوں میں ہی وہ اسے اپنے دل کے اس حد تک قریب محسوس ہوئی تھی کہ آج جب اسے اس کی واپس کی اطلاع ملی تھی تو وہ اپنے اندر پھیلتی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے خود بھی حیران رہ گیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس روز اس چھوٹے سے بچے میں کتنی وہ معصوم سی لڑکی اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی جانب متوجہ ہونے پر مجبور کر گئی تھی۔ مگر شاید وہ اسے ایک آدھ دن میں بھول جاتا اگر جو وہ اگلے ہی روز اس سے ایک یکسر مختلف حوالے سے نہ

آن ٹکرائی۔

اس شام عالم کو اس پیاری سی لڑکی کے محبت بھرے دل کی ایک اور جھلک دیکھنے کو ملی تھی جو صرف اور صرف اس کے بھائی کے لیے تھی اور بھائی کیوں اسے یہ احساس ہوا تھا کہ یہ لڑکی اپنی ذات سے منسلک سبب ہی رشتوں کے لیے اتنی ہی پر غلو ص اور محبت کرنے والی ثابت ہوگی جتنی کہ وہ اپنے بھائی کے لیے تھی، جس سے کہ اس کا خون کار شہ نہ تھا یا اس بچے کے لیے جسے وہ جانتی تھیں۔

اور اتنی اچھی لڑکی کو کھونا اس کے نزدیک سراسر حماقت تھی۔ مگر اپنے دل کی خواہش لبوں سے لانے سے پہلے وہ خود کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا چاہتا تھا، تاکہ دنیا داری کا ہر تقاضا پورا ہو جائے اور کوئی چھوٹی سی بات بھی وجہ انکار نہ بن سکے۔ مگر کاش یہ زندگی ہمارے مائع ہو سکتی اور اس کی چھوٹی میں موجود ہر لمحہ ہمارا مطبع۔ اے کاش!

\*\*\*

قسمت کا کیسا بھیانک مذاق تھا کہ جس ہستی کے بغیر کبھی اس کا سانس لینا ناممکن تھا آج وہی ہستی اس کے نزدیک مشکل میں شمار ہو رہی تھی۔ جس کا سامنا وہ کسی طور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پتا نہیں یہ دنیا کبھی اتنی چھوٹی کیوں بننے لگتی ہے کہ کسی پناہ گاہ کا حصول دشواری نہیں بلکہ ناممکن سا لگنے لگتا ہے۔

کتنی مشکل سے زندگی کو گھسیٹ کر انہوں نے دوبارہ برائی ڈگر پر ڈالا تھا کہ اب یہ اچانک۔  
”آئی۔“ آئی ایم ریلی ویری سوری!“ سوچوں میں ڈوبی وہ جوں ہی دائیں جانب مڑی، سامنے سے آتے بندے سے بری طرح ٹکرائی اور چونکہ وہ جانتی تھی کہ قصور اس کی بے دھیانی کا ہے اس لیے بے ساختہ معذرت کرتے ہوئے نیچے جھک کر مقابل کے ہاتھ سے گر جانے والی فائل اور پیپر سمیٹنے لگی۔

”اٹس اوکے۔“ میں اٹھاتا ہوں۔“ رسان سے کہتا وہ خود بھی جھک کر اس کی مدد کرنے لگا تھا۔ لیکن فائل



کوڑھ کو نہ رائے کے ہاتھ میں تھا اس لیے وہ خاموشی سے اُدھر اُدھر بکھرے کانڈ اٹھا اٹھا کر اپنے پاس ہاتھ میں پکڑی کتب میں ڈالنے لگا۔ جب معاہدہ اس کی جھکی نظروں کے سامنے، موم سے تراشیدہ لمبی انگلیوں کے درمیان اٹکا تھو بیو کھر کا نکل کور آگیا۔  
”نہ پیچھے“ سبک ہوا سا لہجہ اس کی نظروں کے ارٹکار کو بکھیر گیا تو وہ لمحے بھر کی اس خیانت پہ جڑ جڑ ہوتا فائل تمام کیا۔

”تھینک یو۔“ سیاٹ لہجے میں کہتا اگلے ہی بل وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور تب ہی مقابل بیٹھی رائے نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پہلی بار سامنے کھڑے شخص کے چہرے پر نگاہ ڈالی تھی۔ عین اسی لمحے شاہ نواز کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھی تھیں اور دونوں کی نظروں میں گویا ملت آسان موم کے تھے۔

نواز کے ہاتھ میں پلائی فائل ”تاہیں اور موبائل سبھی ہاتھ ایک ساتھ ڈسٹن ہوس ہوا تھا اور رائے کی تو لاٹو دین میں نو مین والی یلایت تھی۔ اس کا وجود ایک ننگے سے زہاں و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر خلا میں معلق ہو گیا تھا۔ جہاں نہ پیروں تلے زمین تھی اور نہ سر پہ آسمان۔ یہ بے سرو سامانی کی کیفیت اسی کی عطا کردہ تھی جو کبھی اس کی زندگی تھا۔ مگر جس نے اسے حقیقتاً ”زندہ دور کر ڈالا تھا۔“

دیکھتے ہی دیکھتے رائے کے پورے وجود میں چنگاریاں سی اڑنے لگی تھیں۔ جن کے شعلوں کی لپک سامنے کھڑے شاہ نواز کو اپنے دامن تک آتی محسوس ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ سامنے کھڑی اس معصوم لڑکی کا گناہ گار تھا۔ مگر گزشتہ پانچ سال سے جلتی نگاہیں، اس کے روشنیوں بکھیرتے چہرے سے ہٹنے سے انکاری ہو گئی تھیں۔ جہاں اس کے لیے سوائے شدید نفرت کے دوسرا کوئی تاثر نہ تھا۔

جبکہ رائے کے لیے اس کی خودی بھی نگاہیں گھن کا باعث تھیں، جنہیں مزید برداشت کرنا اس کے بس میں نہ رہا تو اس نے نفرت سے چہرہ موڑتے ہوئے، زمین پر ٹھوک دیا اور اگلے ہی لمحے لمبے لمبے ڈگ بھرتی

اس کے برابر سے نکلتی چلی گئی۔ یہ دیکھ بٹا کہ پیچھے کھڑے نواز کا پورا وجود اس کی نفرت سے نیلا پڑ گیا تھا۔ بے اختیار اس کی کپکپاتی انگلیاں اپنی پیشانی سے مس ہوئی تھیں جو یک وقت اسے لمبی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ مگر وہاں سوائے ٹھنڈک کے دوسرا کوئی تاثر نہ تھا۔



رات کا تیسرا پہر اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ ہر سوسٹالے اور تاریکی کی دیوار چھلی ہوئی تھی جس کے تلے ہر ذی نفس نیند کی گہری آغوش میں تھا۔ سوائے ایک شاہ نواز کے جس کی تلاش اس قدر اچانک ختم ہو جائے گی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ جو جو پھر کا اور آنکھیں جلتے جلتے راکھ کا ڈھیر ہو چکی تھیں، مگر رائے حیات کا چہرہ اور اس چہرے پہ چھائی انتہاؤں کو چھوٹی نفرت ایک بل کے لیے بھی اس کے ذہن سے مٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

گزشتہ پانچ سالوں میں اس نے ہر لمحہ یہی دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسے رائے سے ملنے کا ایک موقع دے دے تاکہ وہ اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگ سکے، چاہے اسے اس کے پیروں میں ہی کیوں نہ گرنا پڑ جائے اور آج جب اس کی دعا مستجاب ہو کے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی تو اسے احساس ہوا تھا کہ وہ تو بیشادھوری دعا مانگا رہا تھا۔

اس نے جب تک رائے کو نہیں دیکھا تھا، دل کی بے قراری بھی برداشت کی حد میں تھی۔ مگر اب جب سے دونوں کا سامنا ہوا تھا۔ دل کی تڑپ اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ دردِ روح سے نکل کر اس کے سینے کے بائیں حصے اور بازو میں ٹھیس دیے لگا تھا۔ جسے صفا کرتے ہوئے وہ بے اختیار ایک پل کے لیے آنکھیں بھیچ گیا تھا۔

”نن، نہیں مولا! اب ابھی نہیں“ ایک ایک بار اسے مجھے معاف کرنے کا حوصلہ دے دے۔“ آنسو

اس کی بے بس آنکھوں سے نکل کر بڑی تیزی سے اس کا چہرہ بھگوئے لگے تھے۔ جو تکلیف کی شدت سے اپنا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے سینے میں شرابور ہوتے جسم کی پوری طاقت لگاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی جانب بڑھا تھا۔ جسے کھول کر اس نے لاؤنج میں سوئے رشید کو اپنی پوری قوت صرف کرتے ہوئے پکارا تھا۔

”جی! جی صاحب جی!“ ہڑپا کر اٹھتے ہوئے اس نے لاؤنج میں روشن ٹائٹ بلب کی روشنی میں نواز کے کمرے کی جانب دیکھا تھا۔ جہاں اسے دلہیز تھا، درو سے نڈھال ہوا بتو کچھ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر لاٹ جلاتا اس کی جانب بھاگا تھا۔

”صاحب آپ ٹھیک تو ہیں؟“ تیزی سے اسے تھمتے ہوئے رشید نے اسے صوفے پر بٹھایا تھا۔

”ڈاکٹر شمس کو کال کرو۔“ بلب کا تھوڑا حوصلے سے بولا تھا اور بولھایا، گھبرایا رشید سرپٹ ٹیلی فون کی جانب بھاگا تھا۔ جہاں ڈاکٹر شمس کے ساتھ ساتھ اس نے عالم کو بھی فون کر کے فوراً ”پیچھے کے لیے کہا تھا۔“



دائیں ہاتھ کی مٹھی لبوں پہ جمائے، عالم کی متفکر نگاہیں نواز کے چہرے پر جمی تھیں جو دو اؤں کے زیر اثر سو رہا تھا۔ چند گھنٹے پیشتر جب رشید نے اسے شاہ نواز کی طبیعت خرابی کے بارے میں اطلاع دی تھی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صورت حال اس قدر سنگین بھی ہو سکتی ہے اور جب ڈاکٹر شمس نے ہارٹ پر ایلم بتاتے ہوئے اسے فوراً ”پیچھے ہسپتال لے جانے کے لیے کہا تو عالم کے گویا پیروں تلے زمین ہی نکل گئی تھی۔

اندھا دھند گاڑی دوڑاتے وہ اگلے دس منٹ میں قریبی ہسپتال کی ایمرجنسی میں تھا جہاں نواز کی حالت کے پیش نظر فوراً ”ٹریٹمنٹ شروع کر دیا گیا تھا۔ گوکہ

ڈاکٹر نے ”ماہینو انجائنا انیک“ بتاتے ہوئے اسے کافی لمبی دی تھی مگر پھر بھی وہ یہ سوچ کر ہی تھرا اٹھا تھا کہ اگر اسے پیچھے میں دیر ہو جاتی یا نواز ہی درو کے باعث اپنے کمرے میں بے ہوش ہو جاتا تو؟

اور اس تو کے آگے اس کا دل جیسے ماؤف ہونے لگتا تھا۔ نواز کا چیک اپ ہو جانے کے بعد اس نے فوری طور پر شہباز کو اطلاع دینی چاہی تھی۔ مگر نواز نے اسے سختی سے کونڈ فون کرنے سے منع کر دیا تھا اور چونکہ ڈاکٹر نے اس کے درو کی وجہ، حد سے زیادہ بڑھا ہوا زہنی دیاؤ بتایا تھا۔ اس لیے عالم اس سے کسی بھی قسم کی بحث کرنے سے قاصر تھا۔ رشید کو بھی اس نے اپنے سامنے فون کروا کے منع کر دیا تھا۔

ڈاکٹر نے اس کی کنڈیشن دیکھتے ہوئے اسے اگلے چوبیس گھنٹے ”انڈر آبزرویشن“ رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے روم میں شفٹ کر دیا تھا۔ جس کے بعد وہ تو دو اؤں کے زیر اثر سو گیا تھا، مگر عالم اس وقت سے لے کر اب تک ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا۔ آخر اچانک ایسا کیا ہوا تھا جو نواز کے لیے اس درجہ پریشانی کا باعث بنا تھا کہ وہ اس حال کو پہنچ گیا تھا۔ جب کہ گزشتہ دنوں وہ اس کے رویے میں در آنے والی مثبت تبدیلی کو بھی محسوس کر چکا تھا۔

”کیس رائے سے متعلق کوئی بات کوئی اطلاع تو اس تک نہیں پہنچی؟“ سوچتے ہوئے اس کا ذہن اس نقطہ پر آ کے ٹھہر سا گیا تو بے اختیار اس کی نظریں ایک بار پھر آنکھیں موندے نواز پہ جا ملیں، جس کے چہرے پر چھائی زردی اس کا دل تاسف سے بھر گئی تھی۔



قطرہ قطرہ بھگتی رات آج رائے کی ایک اور غلط فہمی دور کر گئی تھی۔

پانچ سال پہلے اسے گمان ہوا تھا کہ اب اس کی آنکھوں میں اس شخص کے نام کا کوئی آنسو باقی نہیں بچا۔ مگر آج وہ ایک بار پھر رو رہی تھی اور بے تحاشا رو



رہی تھی۔ کیوں؟ اسے معلوم نہ تھا۔ حالانکہ اب تو روئے کو بھی کچھ نہ بچاتا تھا۔

اس کی زندگی کی ہر خوشی تو وہ منحوس شام نگل گئی تھی، جس کے بعد اس نے اپنا سب کچھ گنوا دیا تھا۔ عزت، یقین، پھر وسعت، رشتے، ہر چیز کی تو اس نے خود قبر کھودی تھی۔ پھر بھلا آج یہ روٹا کپا سستی رکھتا تھا؟ وہ بھی اس صورت میں جبکہ گزشتہ پانچ سالوں میں وہ خود بے اور حالات میں جی بھر کے آنسو بہا چکی تھی۔

اس نے ان پانچ سالوں میں بہت سے سبق پڑھے تھے اور اب وہ وقت آگیا تھا جب اسے ان اسباق کے بل بوتے پر حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا تھا۔ حیات احمد اور عافیہ بیگم سے اس نئی مصیبت کا ذکر کر کے وہ انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ نہ ہی اپنے تعلیمی سلسلے میں کسی قسم کی رکاوٹ قبول تھی۔ اپنے ماؤں کے لئے وہ اس کا اولین مقصد تھا جس میں ناکامی وہ کسی طور برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

زمرین اور شاہ نواز یہ دونوں نام اس کے لیے قصہ پارینہ بن چکے تھے جنہیں وہ اپنی زندگی سے نہ صرف ہوش کے لیے نکال چکی تھی بلکہ ان پر فاتحہ بھی پڑھ چکی تھی۔ پھر بھلا مردہ لوگوں سے کیا گہرانا؟ بلکہ اسے تو انہیں اپنی کامیاب اور بر سکون زندگی کی جھلک دکھانی تھی۔ یہ جانتا تھا کہ وہ ان کے بنا بھی زندگی گزار سکتی ہے اور بہت اچھی گزار سکتی ہے۔ مگر اس کے لیے اسے سب سے پہلے اپنے رب اور اپنی قسمت سے نالاں ہونا چھوڑ کر منطقی انداز میں سوچنا ضروری تھا اور عقل کا بھی کہنا تھا کہ جب وہ تنہا ہی زندہ سلامت اس دنیا میں موجود ہیں تو پھر کبھی نہ کبھی کیسے نہ کیسے ان کا آپس میں ٹکرا جانا چھوڑنا ناممکن بھی نہ تھا۔ اور اب چونکہ یہ گراؤ ہو چکا تھا تو عقلمندی کا بھی تقاضا تھا کہ وہ ان پر ان کی اوقات واضح کر دیتی۔ انہیں یہ حقیقت باور کروا دیتی کہ رات نہ حیات کے لیے ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔



”بس یار! اور نہیں بیا جا رہا۔“ شاہ نواز نے مشکل

تمام جوس کا آدھا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا تو عالم نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”گھر سے فون تو نہیں آیا؟“ سر پیچھے رکھے تکیے پر ٹکاتے ہوئے اس نے آہستگی سے عالم سے استفسار کیا۔

”فی الحال تو نہیں۔“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بند کے کنارے پر ٹک گیا۔

”مجھے پھر برکتنا اعتبار ہے نواز؟“

”کیا مطلب؟“ وہ اس اچانک اور غیر متوقع سوال پر چونک کر عالم کا چہرہ دیکھنے لگا جو آنکھوں میں سنجیدگی لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”کیا میں مجھے اس قابل نہ لگتا تھا کہ تو اپنی پریشانی مجھ سے شیئر کرتا یا پھر تیرے نزدیک ہماری دوستی ابھی اعتبار کی اس منزل پر نہیں پہنچی جہاں ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹ سکیں؟“

چہرے پر دکھ کی گہری پرچھائیں لیے اس نے بو جھل سے کچے میں پوچھا تو سناکت بیٹھا نواز نے جواب دیا۔

”تو نے یہ بات سوچی بھی کیسے عالم؟“ حیرت اس کے چہرے سے ہی نہیں بلکہ اس کی آنکھوں سے بھی عیاں ہو رہی تھی، مگر وہ تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹک گیا۔

”میں نے نہیں سوچی تو نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ اجنبیت کا یہ رخ احساس تو نے میرے اندر اندھا بنا دیا ہے نواز! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔“

پیشانی پر بل اور آنکھوں میں نمی لیے وہ اپنا سرخ پڑا چہرہ دوسری جانب پھیر گیا تو تکیے کے سارے نیم دراز نواز تیزی سے اٹھنے کی کوشش میں بے اختیار کراہ کر رہ گیا۔

”مجھے کون کہہ رہا ہے کہ اٹھ کر بیٹھ! اپنا غصہ بھلائے عالم نے تیزی سے پلٹ کر اسے تھامتے ہوئے ڈپٹا تو وہ عدل سائیکس پر سرگردا گیا۔

”تو جو مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔“ وہ اس کے ہاتھ

پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے تھامت سے بولا تو عالم نے اختیار ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

”مجھ سے میری پریشانی کی وجہ نہیں پوچھتے گا؟“ اس کے تنے ہوئے نقوش پر نگاہیں جمائے نواز نے محبت سے کہا۔

وجہ رات نہ ہے۔ آگے بتا۔“ وہ اسے خفگی سے دیکھتے ہوئے بولا تو بے اختیار شاہ نواز کے لبوں پر وہی سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔ واقعی اچھا اور مخلص دوست اللہ پاک کی جانب سے دیے گئے تحفے کی مانند ہو کر آتا ہے اور وہ ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھا جنہیں یہ نعمت عطا کی گئی تھی۔ لاشعوری طور پر عالم کے ہاتھ پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔

”صرف رات نہ نہیں بلکہ رات نہ سے ہونے والا ٹکراؤ ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا تو عالم اس انکشاف پر حیرت زدہ سا رہ گیا۔

”کب؟ کہاں؟“

”کل یونیورسٹی میں۔“ وہ شاید وہیں بڑھتی ہے۔“ اس نے پہلے سے بھی برا انکشاف کیا تو سناکت بیٹھا عالم گنگ سا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مزید اس سے کیا پوچھے۔

”مجھے وہ پہلے کبھی نظر آئی؟“ وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد اپنی حیرت پر قابو پانے کے قابل ہوا تھا۔

”نہیں۔“ اور تب ہی نواز کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ جب دور لا بیری کی سبڑھیوں نے اسے بہت سے چہروں کے درمیان رات نہ کے چہرے کا گمان ہوا تھا اور وہ یوانہ وارا اس کی جانب دوڑ رہا تھا۔

”شاہد ہاں ایک بار دور سے اس کا گمان ہوا تو تھا۔“

”اور تو نے اسے اپنا الوٹن سمجھا ہو گا۔“ عالم نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔۔۔“ وہ دھیرے سے نظریں چرا گیا اور خاموشی ایک بار پھر ان کے درمیان آن ٹھہری۔

”پتا ہے عالم! میں نے اسے اس شام کے بعد کل دیکھا ہے۔ وہ اس شام بہت تکلیف میں تھی اور میں نے اس کے درد کو کم کرنے کے بجائے اسے اذیت کے

نے سمندر میں دھکیل دیا تھا اور جب اس کی وحشت زدہ بے یقین نظریں میری جانب اٹھی تھیں۔ تب مجھے بے اختیار اپنی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اور کل کل تو یار! یہ دل اس کی نفرت سہا رہی نہیں سکتا۔“

غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے وہ کرب آمیز لہجے میں بولا تو عالم ہمارے دکھ کے سختی سے لب بچ گیا۔

”ان گزرے سالوں میں اس کے صحن کی طرح اس کی نفرت بھی دو آتشہ ہو گئی ہے۔“ وہ زخم خوردہ سا مسکرایا تو عالم کا ضبط جواب دے گیا۔

”خدا کے لیے نواز بس کر! آنکھوں میں آنسو لیے اس نے بے اختیار اس کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے ہلکا سا جھٹکا دیا۔“ تو یونیورسٹی چھوڑ دے۔ تو واپس چلا جا یا ر۔ پلیز واپس چلا جا۔“

”ابھی نہیں۔ ابھی تو میں نے اسے جی بھر کے دیکھا بھی نہیں یا ر! ابھی تو میں نے اس سے معافی بھی نہیں مانگی۔“ نفی میں سر ہلاتے وہ حسرت زدہ سا بولا تو عالم نے اختیار چلا اٹھا۔

”تو میرے جانے کا نواز!“

”اس سے دور چلا جاؤں گا تو مچاؤں گا۔“ خود اذیتی کی یہ کون سی منزل تھی عالم مجھنے سے قاصر تھا۔

”ٹھیک ہے میں ابھی انکل کو فون کرتا ہوں کہ وہ تجھے یہاں سے اُکر لے جائیں۔“ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑاتا وہ فیصلہ کن انداز میں بولا تو شاہ نواز جیسے تڑپ کر سیدھا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

”اگر تو نے ایسا کیا عالم! تو میں ساری زندگی تیری شکل نہیں دیکھوں گا۔“ اسے جب سے موبائل نکالتا دیکھ کر وہ زور سے بولا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے تیز ہوئی دھڑکنوں نے اسے ہانپنے اور عالم کو اپنی جذباتی حرکت پر پچھتاتے ہوئے مجبور کر دیا تھا۔

”اوکے“ ریلیکس یار! میں کچھ نہیں کر رہا۔ تیرا جو جی میں آئے وہ کر۔“ اس کے بازو کو تھامے وہ جھنجھلا کر بولا تو اپنی سانس بحال کرنا شاہ نواز دھیرے سے مسکرا دیا۔



”مجھے بتا تھا تو ہر حال میں میرا ساتھ دے گا۔“ اور عالم نے خفگی سے منہ پھیر لیا تھا۔

\*\*\*

”یار! ہمارے لیفٹ پے دو ٹیبل چھوڑ کے کھڑکی کے ساتھ والی کرسی پہ جو بندہ بیٹھا ہے۔ اسے ذرا ایک نظر دیکھنا۔“

شفیق نے نگاہیں سامنے رکھے کافی کے کپ پہ جمائے ہوئے ان تینوں سے کہا تو رائے کا دل دھک سے رہ گیا۔ آخر کار کسی تیسرے کو بھی اس خاموش تعاقب کا احساس ہو ہی گیا تھا۔ بے اختیار نظریں چرائے اس نے اپنا کپ اٹھا کر یوں سے لگا لیا تھا۔ جبکہ تانیہ اور سبین نے غیر محسوس انداز میں اب اپنے بائیں جانب دیکھا تھا۔

”وہ ایک کھولے بیٹھا ہے۔“ تانیہ نے تصدیق دے دی۔

”ہاں وہی۔“ شفیق نے گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا تو رائے نے دھیرے سے گردن موڑتے ہوئے چور نظروں سے کھڑکی کی جانب دیکھا جہاں نواز ہاتھ میں کپ پکڑے نظریں کتاب پہ جمائے بیٹھا تھا۔ اگلے ہی پل لب بچتے اس نے رخ پھیر لیا تھا۔

”یار! بندہ تو جی بھر کے پیئڈ سم ہے۔“ سبین نے برشوق نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا تجزیہ پیش کیا تو شفیق دانت پیستے ہوئے بولی۔

”بہت گھور لیا اب منہ ادھر کر لو۔“

”خود ہی تو دیکھنے کے لیے کہا تھا۔“ سبین منہ نہاتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی۔

”ایک نظر کہا تھا۔“ وہ اسے ڈپٹے ہوئے بولی تو تانیہ مسکرا دی۔

”یار اس کا کوئی قصور نہیں، بندہ واقعی بے حد پیئڈ سم ہے۔“

”اور یہ پیئڈ سم پچھلے ایک ہفتے سے ہمیں فالو کر رہا ہے۔“

”کیا؟“ شفیق کے انکشاف پہ وہ دونوں ایک ساتھ

بولیں تو وہ گزربا کر ارد گرد دیکھنے لگی۔

وہ چاروں اس وقت یونیورسٹی کیفے ٹیرا میں موجود تھیں۔ رائے بے اختیار لب کاٹ کر رہ گئی۔ اس ایک ہفتے میں وہ کرب کی تن منڑوں سے گزری تھی۔ یہ کوئی اس سے پوچھتا، جس کا ہر زخم نے سرے سے لو دینے لگا تھا۔ مگر وہ خود ضبط کے کڑے پیرے بٹھانے پر مجبور تھی۔ ہر چیز اپنے ہاتھوں برباد کرنے کے بعد اب یہ شخص کیا جانتا تھا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

”خدا کے لیے آہستہ بولو جاہلو! وہ انہیں گھورتے ہوئے بولی تو وہ دونوں شرمندہ سی قدرے آگے کو جھک آئیں۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ تانیہ نے اب کے آہستگی سے پوچھا۔

”بس یار ایسے ہی کچھ دن پیشتر محسوس ہوا تھا۔ جیسے یہ بندہ ہمارے ارد گرد ہوتا ہے۔ گو کہ یہ ہر وقت ہمیں فالو نہیں کرتا۔ مگر نوٹ کرنا کہ دن میں ایک بار تو یہ ضرور ہی ہمارے آس پاس نظر آئے گا۔“

”لو! دن میں ایک بار تو ہمارے آس پاس کئی چہرے نظر آتے ہیں۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ تانیہ سر جھٹکتے سیدھی ہو بیٹھی۔

”تم نے بھی ایسا محسوس کیا ہے رائے! جیسے یہ بندہ ہمیں فالو کرتا ہو؟“ تانیہ نے خاموش بیٹھی رائے سے پوچھا۔

”میرے خیال میں ہمیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ یہ شخص ہمیں فالو کرتا ہے یا نہیں۔“ وہ بے زار سے لہجے میں گویا ہوئی تو سبین چمک کر بولی۔

”فرق کیسے نہیں پڑنا چاہیے۔ اتنا پیئڈ سم بندہ اگر واقعی ہمیں فالو کر رہا ہے تو میں تو خوشی سے پاگل ہی ہو جاؤں گی۔“ محض تصور ہی اس کی باجھیں کھلانے کے لیے کافی تھا۔

”تم اب بھی کوئی خاص صحیح الدماغ نہیں۔“ شفیق نے مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا۔ ”اور ویسے بھی تمہیں کیا کنفرمیشن ہوگی کہ وہ تمہارے پیچھے خوار ہو رہا

ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ میرے حسن جہاں سوزیہ دل ہار بیٹھا ہو۔“ اس نے ایک اداس آنکھیں ہٹھائیں تو سبین جل کر رہ گئی۔

”ہونہ! یہ منہ اور مسوری وال۔ تم رائے کا نام لو تو کوئی تک بھی بنے۔“

”ہاں ویسے بھی کمائیوں میں ہیرو بیٹھ اسی لڑکی کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اسے لفٹ نہیں کرواتی۔“

تانیہ نے رائے کی جانب دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا تو وہ زہر خندی مسکرا دی۔

”تمہیں کس نے کہا کہ یہ ہیرو ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ولن ہو۔ وہ کہتے ہیں نا!

Dont judge things by their appearance (چیزوں کا ظاہر دیکھ کر فیصلہ نہ کرو)

”چلو ہیرو ہے یا ولن، نظر تو ہر حال اب اس پہ رکھنی پڑے گی۔“ تانیہ نے پرسوج انداز میں کہتے ہوئے ایک بار پھر چہرہ موڑ کر شاہ نواز کی جانب دیکھا تو رائے بے اختیار راک گری سانس لے کر رہ گئی۔

\*\*\*

”سر! آپ کے لیے کسی یاد رکھنا صاحب کی کال ہے۔“ انٹرکام ٹی ٹیل پہ حیات احمد نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو دوسری جانب سے ان کی سیکریٹری نے انہیں شائستگی سے مطلع کیا۔

”یاد رہے؟“ ایک لحظہ کو فائل پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے انہوں نے ذہن پر زور دیا۔

”کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں؟“ گوشش کے باوجود کوئی چہرہ ان کے ذہن کی اسکرین پہ نمودار نہ ہو سکا تھا۔

”سر! وہ کہہ رہے ہیں کوئی برسل میٹر ہے۔“ نازش یقیناً پہلے ہی یہ سوال پوچھ چکی تھی جب ہی بنا کسی توقف کے بولی تھی۔ جبکہ حیات احمد کے چہرے پر ابھار اور آیا تھا۔

”اچھا آپ ملائیں۔“ انٹرکام بند کرتے ہوئے وہ ہاتھ

میں پکڑا قلم فائل پہ رکھ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سیدھے ہو بیٹھے۔

چند سیکنڈ بعد فون کی بیل بجی تو انہوں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

”ہلو! بھاری مروانہ آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے شائستگی سے بولے۔

”معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”کمال ہے آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ بیلا!“

نہایت مستغرانہ انداز میں کہا کیا تو حیات احمد کا پورا جسم من ساہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب ان کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے حفا اٹھا گیا تھا۔

”آپ سے مجھے بے مروتی کی امید تو تھی۔ لیکن اس درجہ؟“ وہ دھیرے سے ہنسنا تو حیات احمد بے اختیار لب بچھڑ کر رہ گئے۔ ”خیر میں یاد رکھ بات کر رہا ہوں۔ آپ کا۔“

”تمہاری جرات کیسے ہوئی یہاں فون کرنے کی؟“ آگے سننے کا ان میں حوصلہ نہ تھا۔ جب ہی بے اختیار دباڑاٹھے تھے۔

”اب لگ رہا ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا۔“ دوسری طرف سے وہ مسکراتے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

”اور جرات کی بھی آپ نے خوب کمی۔ میں کتنا جری اور نڈر ہوں یہ بھلا آپ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔“ وہ جس بات کا حوالہ دے رہا تھا۔ اسے محض سوچ کر ہی خون حیات احمد کی کپٹیوں میں ٹھو کریں مارنے لگا تھا۔

”میرا مطلب ہے آپ کو ٹریس کرنا کوئی آسان کام تھوڑی تھا۔ یہ تو مجھ جیسا کوئی بہادر ہی کر سکتا تھا۔“

انہیں جتانے کے بعد وہ آخر میں خباثت سے بات بدل گیا تو حیات صاحب مٹھیاں بچھڑ کر رہ گئے۔

”بکواس بند کرو اور کام کی بات کرو۔ کیوں فون کیا ہے یہاں؟“

”یہ بہتر سوال ہے اور کام کی بات یہ ہے کہ مجھے



آپ کی پر اپنی میں سے اپنی بیوی کا شیر چاہیے۔  
وہ بنا کسی ٹال مٹول کے دو ٹوک الفاظ میں بولا تو  
حیات احمد کے لبوں پہ بے اختیار اک طعنیہ مسکراہٹ  
آن ٹھہری۔

”وہ! تو یہ بات ہے۔ بھئی مان گئے تم واقعی بہت  
بہادر ہو۔ اتنا عرصہ صبر کیا اوقات پہ آنے کے لیے  
ورنہ میں تو شادی کے کچھ ہی دنوں بعد تمہاری طرف  
سے اس مطالبے کا منتظر تھا۔ خیر تمہاری اطلاع کے  
لیے عرض ہے کہ تمہاری بیوی کو میں اپنی تمام تر  
جائیداد سے عاق کر چکا ہوں۔ اس لیے دوبارہ مجھے  
دُشرب کرنے کی غلطی مت کرنا۔“

پُرسکون انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ  
ریسیور رکھتے کو تھے جب اس کا دھمکی آمیز لہجہ انہیں  
ساکت کر گیا۔

”اور فون رکھنی کی غلطی آپ مت کیجئے گا۔ آپ  
دشمن کو اپنی جانہ انہیں سے علی کر رہے ہیں یا نہیں۔  
پھر اور دوسرے دن صبح پر اپنی میں سے اس کا حصہ  
کا ہے اور اس دن وہ گئی تھی نیز میز انکیوں سے بھی  
نکلنا آتا ہے۔“

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“ ان کا چہرہ مارے  
غیظ و غضب کے سرخ پڑ گیا تھا۔

”فی الحال تو سمجھا رہا ہوں۔ ویسے بھی جن کی جوان  
بیشیاں ان کے گھروں میں ہوں۔ انہیں اس درجہ اکڑ  
اور غلط نہیب نہیں دیتا۔“

وہ استہزائیہ انداز میں بولا تو حیات احمد کا دل تیزی  
سے ڈوب گیا۔ ”اور مجھے یقین ہے کہ مجھے دوبارہ آپ  
کو سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی سہجایا!“

اس نے ایک بار پھر ان کی حالت سے لطف اٹھایا تھا  
اور حیات صاحب بے بسی سے اپنے لب کاٹ کر رہ  
گئے تھے۔ کیونکہ وہ اس کی کینٹکی اور ذلالت دونوں  
سے بخوبی واقف تھے۔

\*\*\*

رات کا نجانے کون سا پھر تھا جب دھاڑ کی آواز

سے دروازہ کھول کے کوئی اس کے کمرے میں داخل  
ہوا تھا اور گہری نیند سوئی رائے ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی  
تھی۔

”کو کون؟“ اچانک بیداری کے باعث اس کا دل  
بری طرح دھڑک گیا۔

”رائے! جلدی اٹھو۔ تمہارے پاپا کی طبیعت ٹھیک  
نہیں۔“

عافیہ نے روہانے لہجے میں کہتے ہوئے کمرے کی  
لائٹ جلائی تھی اور وہ ایک جھٹکے سے کبل خود پہ سے  
ہٹاتی ان کے کمرے کی جانب بھاگی تھی جہاں حیات  
احمد کاؤچ پہ دروسہ تڑھال نیم بے ہوشی کی حالت میں  
پڑے تھے۔

اگلے ہی لمحے وہ پلٹ کر تیزی سے باہر بھاگی تھی۔  
چوکیدار کو یا آواز بلند پکارتے ہوئے وہ دیوانہ وار ایک بار  
پھر اندر کی طرف دوڑی تھی۔

چوکیدار کی مدد سے حیات صاحب کو گاڑی میں  
ڈالنے کے بعد وہ عافیہ تکمر کو ساتھ لیے ہسپتال چلی آئی  
تھی جہاں ڈاکٹر نے انہیں فوراً ”سے مشین آئی سی یو  
میں داخل کر لیا تھا۔ ان کا لی بی بے حد شوٹ کر گیا تھا۔  
جس کے باعث صورت حال خاصی پریشان کن تھی۔

باہر ان دونوں ماں بیٹی کے آسٹو تھے کا نام نہیں  
لے رہے تھے گو کہ عافیہ کی ایک کال پہ ان کے دیور  
راشد اپنی بیوی ساجدہ کے ہمراہ دوڑے چلے آئے

تھے۔ مگر ان دونوں کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بھری دنیا  
میں تنہا رہ گئی ہوں زندگی نے انہیں بہت بار اور بہت  
برا آزمایا تھا۔ مگر اب کی بار وہ انہیں جس دکھ سے دوچار  
کرنا چاہتی تھی وہ اسے کسی طور قبول نہ تھا۔

اس کا ناتواں وجود کم از کم اس غم کا بوجھ نہیں سہار  
سکتا تھا۔ تب ہی اپنے رب کے حضور بے اختیار زمین  
پہ جھکتا چلا گیا تھا۔

سجدے میں سر گرائے وہ اپنے اللہ سے رورو کے  
اپنے باپ کی زندگی مانگتی رہی تھی اور شاید یہ اس کی  
دعاؤں کا ہی اثر تھا جو محض چند گھنٹوں بعد ڈاکٹر نے  
انہیں بستر کی نوید سنائی تھی اور وہ کتنی ہی دیر اپنی ماں

کے سینے سے لگی تشکر کے آنسو ہاتھ چلی گئی تھی۔

\*\*\*

رائے کی غیر حاضری کو آج تیسرا دن تھا اور شاہ نواز  
کے لیے اپنے وسوسوں سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہو چلا  
تھا۔ اس کے بیونورشی چھوڑ دینے کا دھڑکا اس کی  
راتوں کی نیند اڑا لے گیا تھا۔ بے چینی حد سے سوا  
ہونے لگی تو وہ تمام تر مصلحتیں بھلائے اس کی فریڈز  
کے پاس چلا آیا تھا۔ جو اس کے یوں سامنے آکھڑے  
ہوئے یہ پہلے اسے اور پھر ایک دوسرے کو حیرت سے  
دیکھنے لگی تھیں۔

”جی؟“ بالآخر تانیہ ہی تھی جو خود پہ قابو پانے کے  
قابل ہوئی تھی۔

”میرا نام شاہ نواز زمان ہے۔ میں ایم فل کا  
اسٹوڈنٹ ہوں۔“ وہ اپنی عادت کے مطابق انتہائی  
شان لگتی سے گویا ہوا تھا۔

”مجھے ایک چھوٹی آپ کی فریڈز رائے حیات کے  
بارے میں پوچھنا تھا کہ وہ کیوں نہیں آرہیں۔ بٹ  
اوٹلی اف بوڈنٹ مائنڈ۔“ اس کے چہرے پر نگاہیں  
جھانکے وہ اعتماد سے بولا تو اس درجہ اعتماد پہ وہ تیوں ایک  
پل کے لیے عیش کر گئیں۔

”لیکن اگر میں کہوں کہ یس وی ڈو مائنڈ کیونکہ ہم  
آپ کو نہیں جانتے تو؟“ گلہ کھنکھارتے ہوئے  
تانیہ نے بھی رساں سے جواب دیا تو وہ جیسے سے مسکرا  
دیا اور مقابل بیٹھی تین کل ڈول کر رہ گیا۔

”تو میں کہوں گا احتیاط اچھی چیز ہے۔ ایسا ہے  
مس کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں کیونکہ ہم  
آپس میں رشتہ دار ہیں۔“

نواز ذہن میں ترتیب دیے ہوئے الفاظ کو دہراتے  
ہوئے بولا۔ ”حیات انکل اور عافیہ آئی سمیت میں ان  
کی پوری فیملی سے بخوبی واقف ہوں اور وہ سب بھی  
مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن چونکہ کچھ فیملی  
پر اہل حق کی وجہ سے ہمارے خاندان ایک دوسرے سے  
نہیں ملتے اس لیے آپ کے توسط سے پوچھنا چاہ رہا

تھا کہ ان کے گھر میں سب خیر تو ہے؟“  
وہ بنا کسی جھجک کے مضبوط لہجے میں گویا ہوا تھا اور  
ان تیوں کے منہ یہ ساری تفصیل سن کے کھلے کے  
کھلے رہ گئے تھے۔ اس دن جب وہ تیوں اس شخص  
کے متعلق قیاس آرائی کر رہی تھیں تب رائے نے تو  
ایسا کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔ لیکن پھر کوئی اتنی دیدہ وبری  
سے اتنا برا جھوٹ کیوں بولے گا۔ وہ بھی انکل، آنٹی کا  
نام لے کر؟“ سوچ کی پر چھائیاں تانیہ کے چہرے پر  
پھیلنے لگیں تو منتظر کھڑا نواز گہری سانس لیتے ہوئے  
بولا۔

”میرے خیال میں آپ کو میری بات کا یقین نہیں  
آ رہا۔“

”نہیں ایسی بات نہیں۔“ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے  
بولی۔

شفیق کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے پوچھے کہ جب  
آپ کا خاندان رائے کی فیملی سے قطع تعلق کر چکا ہے تو  
پھر آپ کس خوشی میں اس کا پیچھا لے ہوئے ہیں اور  
اس کی غیر حاضری پہ پریشان ہوئے پھر رہے ہیں؟ لیکن  
ایک تو رائے اور اس کی دوستی محض چند ماہ پہ مشتمل  
تھی اور دوسرے مقابل نے ان سے فقط حال احوال  
دریافت کیا تھا۔ کوئی غلط یا رائے کے متعلق ذاتی بات  
نہ پوچھی تھی۔ اس لیے اس کے نزدیک سرسری سا  
جواب دینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔

”ایک چھوٹی رائے کے فادر بچھلے دو دن سے  
ہسپتال میں داخل ہیں۔ اس لیے وہ نہیں آرہی۔“  
تانیہ کو تذبذب میں گھرا دیکھ کر وہ نرمی سے بولی تو شاہ  
نواز کے ساتھ ساتھ تانیہ کی نظریں بھی اس کی جانب  
اٹھ گئیں۔

”لیکن انکل کو کیا ہوا؟“ بے اختیار اس کے لہجے  
اور چہرے پہ فکر در آیا۔

”ہارٹ پر ایلم۔“ اس نے قصداً اختصار سے کام  
لیا۔

”وہ کس ہسپتال میں ہیں؟“ شاہ نواز نے پریشانی  
سے پوچھا تو ایک لحظے کو بھن خاموش ہو گئی۔



ہنس پڑیں۔

☆ ☆ ☆

”ایک کیو زی!“

”جی!“ رلیشپن پہ موجود لڑکی نے کمپیوٹر سکرین پر سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے عالم کی جانب دیکھا۔

”حیات احمد صاحب کس روم میں ہیں؟“

”روم نمبر فور لائی کر اس کر کے سیدھے ہاتھ پہ چوتھا

کمرہ۔“ کمپیوٹر پہ چپک کرنے کے بعد اس نے راستہ

سمجھایا تو عالم شکر یہ ادا کرنا سامنے بی طویل راہداری کی

جانب بڑھ گیا۔ وہ یہاں نواز کے شدید اصرار پہ حیات

احمد کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ جن سے تعارف کا

مرحلہ خاصا دشوار تھا۔

طے یہ پایا تھا کہ اگر تو وہ سو رہے ہوئے تو وہ خود کو ان

کے دوست کا بیٹا بنائے گا۔ اگر جاگ رہے ہوئے اور

کوئی خاتون ان کے پاس ہوئی تو وہ خود کو راشد صاحب

کے دوست کا بیٹا بنائے گا اور اگر کوئی صاحب ان کے

پاس ہوئے تو وہ خود کو راشد کے کلاس فیلو کی حیثیت

سے متعارف کروائے گا اور اگر سب ہی ہوئے تو پھر

اللہ مالک تھا۔ صورت حال تو ہر طرح سے ویسے بھی

خاصی خطرناک تھی کہ وہ ان میں سے کسی کو بھی نہیں

جانتا تھا۔ مگر وہ ری دوستی کہ وہ ایک نوازی ضد کی خاطر

پھول اٹھائے اس آؤر ڈچویشن میں پھنسے کو آپہنچا

تھا۔

راہداری کے آخری سرے پر پہنچ کر اس نے ایک

لحظے کو خود کو کمپوز کرتے ہوئے دائیں جانب دیکھا تھا

اور گویا منجھد ہو گیا تھا۔ اس سے کافی فاصلے پر یاد رکھ

ایک عورت اور ایک مرد سے بات کر رہا تھا۔ ”یاد

ملک اور یہاں۔۔۔؟“ پریشانی سے سوچتے ہوئے وہ

سرعت سے رخ موڑتا تھا جس جانب قدم بڑھا گیا تھا۔

جب اسے لیٹن ہو گیا کہ وہ جا چکا ہو گا۔ اس نے

ایک بار پھر پیچھے دیکھا تھا اور اسے وہاں نہ پا کر اک

اطمینان بھری سانس لیتا پلٹ کر رخ موڑ گیا تھا۔

بے اختیار اس کی نظریں سامنے کی جانب اٹھی

تھیں۔ جہاں دور وہ خاتون اب راہداری میں رکھی  
کر سی پر بیٹھ گئی تھیں اور وہ مردان کے قریب کھڑا کچھ  
بول رہا تھا۔ یا شاید انہیں تسلی دے رہا تھا۔ کیونکہ عالم  
کو تو وہ روٹی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ مگر چونکہ اتنی  
دور سے کوئی حتمی بات کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے چند  
لمحے کچھ سوچنے کے بعد وہ قدم اٹھاتا ان کی جانب چلا  
آیا تھا۔ اور نزدیک آنے پہ اس کے وہم کی تصدیق ہو  
گئی تھی۔

”پلیز بھابھی! آپ پریشان مت ہوں۔ وہ کچھ نہیں

کر سکتا۔“ اس مودتے دھیسے لمحے میں اس روٹی ہوئی

خاتون کو تسلی دی تھی اور عالم بے اختیار چونک گیا تھا۔

وہ آدمی یقیناً ”راشد“ کے چچا اور وہ خاتون راشد کی والدہ

تھیں اور موضوع گفتگو یقینی طور پر یاد رکھ تھا۔ جس

کی موجودگی پہلی نظر میں ہی اسے ٹھٹھکنے پر مجبور کر گئی

تھی۔ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اس نے آن

واحد میں اپنا راہداری لیا تھا۔

لگے ہی لمحے وہ انجان بنان دونوں کے پاس سے

گزرتے ہوئے قدرے فاصلے پر رکھی کر سیوں میں

سے ایک پہ جا بیٹھا تھا۔ یوں جیسے کسی کا خطرہ ہو۔

”نہیں راشد! وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ سب کچھ۔“

اس کی موجودگی کے باعث وہ اپنی آواز دبا کے بولی

تھیں۔ مگر چونکہ راہداری میں مکمل سنا تھا اس لیے

عالم تک ان کی آواز اور اس میں پناہ خوف دونوں

با آسانی پہنچ گئے تھے۔

”اور مجھ میں مزید نقصان اٹھانے کا حوصلہ

نہیں۔“ ”آؤ ایک پارچہ پرن کی آنکھوں سے بہہ نکلے

تھے۔“ میں تو شکر کرتی ہوں کہ حیات سو رہے تھے اور

راشد گھر پہ بھی ورنہ نچلے کیا ہو جاتا تم پلیز کل ہی

ویل کو بلاؤ۔ میں اس عذاب کو مزید برداشت نہیں کر

سکتی۔ آج اس شخص کو سامنے پا کے مجھ پہ کیا گزری

ہے ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”میں آپ کی کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن ذرا

حوصلے سے کام لیں۔ بھائی جان کی طبیعت ٹھیک ہو

جائے تو وہ خود اس معاملے کو دیکھ لیں گے۔“ رمان

سے کہتے ہوئے انہوں نے ایک نظر عالم پہ ڈالی تھی جو  
جب میں سے موبائل نکال کر خود کو مصروف اور  
بے نیاز ظاہر کرنے کی ایک ٹنگ کر رہا تھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ ان کا فیصلہ مجھ سے الگ نہ ہو

گا۔ کل جب میرے بے حد اصرار پر انہوں نے مجھے

اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتائی تھی تو ان واحد میں میں

نے انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ ہماری رائے ہماری کل

کائنات ہے۔ اس کی جان اس کی عزت سے بڑھ کر

ہمارے لیے کچھ بھی نہیں۔“ اپنے آنسوؤں سے

پونچھتے ہوئے انہوں نے واضح اور مضبوط لہجے میں کہا۔

راشد کے ذکر پہ عالم کا پورا جسم کان بن گیا۔ یقیناً

معاملہ خاصا گہیر تھا اور حیات احمد کی اچانک طبیعت

خرابی کا باعث بھی۔

”لیکن بھابھی! یہ تو اس کے حوصلے بلند کرنے والی

بات ہوئی تاکہ اس کا جب جی چاہے وہ ہمیں بلیک میل

کرے اور اپنی منوالے۔“ ان کی بات پہ راشد

صاحب بے اختیار جھنجھلا کر بولے تھے۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں کسی طور کوئی خطرہ

مول نہیں لے سکتی۔ چاہے بے شک ہمیں آدھی

کے بجائے پوری جائیداد یوں نہ اس کینے کے حوالے

کرنی پڑے۔ میں اپنی پکی پی سے ہر چیز قربان کرنے کو

تیار ہوں۔“

وہ قطعیت سے بولی تھیں اور عالم کی سمجھ میں

بہت کچھ آ گیا تھا۔ یاد رکھ ملک کا اچانک ایبٹ آباد سے

اٹھ کر اسلام آباد آ جانا اور یہاں آ کے طویل قیام کرنا

ہر چیز جیسے واضح ہو چکی تھی۔

”چلیں جیسے آپ مناسب سمجھیں، لیکن میں

آپ کو ایک بات بتا دوں۔ یہ معاملے کا کوئی ٹھوس حل

نہیں۔“ راشد صاحب پیشانی پہ ہل لیے گویا ہوئے

تھے۔

”تو پھر تم ہی بتاؤ ہم کیا کریں؟“

بے بسی کا احساس ان کے چہرے سے ہی نہیں بلکہ

ان کے لہجے سے بھی عیاں ہو رہا تھا اور عالم کا دل چاہ رہا

”دیکھیں پلیز! اگر آپ رائے کی ناراضی کا سوچ کر  
پریشان ہو رہی ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں  
آپ کے لیے یا ان کے لیے کوئی پرانیم کھڑی کرنے کی  
نیت سے یہ سب نہیں پوچھ رہا۔ میں صرف ہاسپٹل جا  
کے ان کی عیادت کرنے کا خواہش مند ہوں اور  
بس۔“

وہ ملتجیانہ انداز میں گویا ہوا تو سامنے بیٹھی شفق

شش و پنج میں پڑ گئی۔ نچلے ان لوگوں کا کیا مسئلہ تھا۔

لیکن ایک بات تو طے تھی کہ یہ شخص راشد کے لیے

ایسٹل میں نرم گوشہ ضرور رکھتا تھا۔

”اسلام آباد ہسپتال۔“ وہ دھیرے سے بولی تو

بے اختیار شاہ نواز کے چہرے پر تشکر کا احساس چمک اٹھا۔

جبکہ بین اور تانیہ کی نظریں ایک دوسرے سے آن

کھراں۔

”شٹنگ ب۔“ شٹنگ ب۔ سو سوچ۔ بلو می میں آپ کو

آپ کی فرینڈ کی نظر میں بھی شرمندہ نہیں کرواؤں

گا۔“

”شٹنگ ب۔“ اس کی یقین دہانی شفق کو یک لخت

پاکھا سا کر گئی۔ بے اختیار اس کے لبوں پہ دھیمی سی

شکر اہٹ آن گھری۔ وہ پلٹ کر سیڑھیاں اترتا چلا گیا

تو پریشان سی تانیہ، شفق کو تشکر نگاہوں سے دیکھتے

ہوئے بولی۔

”تم نے اسے ہسپتال کا نام کیوں بتایا؟“

”کیونکہ یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے۔“ اس نے

رمان سے جواب دیا۔

”اور اگر کوئی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو۔۔۔؟“ بین کی

وہی طبیعت اسے مطمئن نہ ہونے دے رہی تھی۔

”تب کی تب دیکھی جائے گی۔ لیکن فی الحال ایک

مسئلہ تو حل ہوا۔“ شفق نے سنجیدگی سے کہا تو بین

بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

”کون سا؟“

”یہی کہ محترمہ نہ تو تمہارے پیچھے خوار ہو رہے تھے

اور نہ ہی میرے حسن جہاں سوز کا شکار ہوئے تھے۔“

بظاہر منہ لٹکائے وہ شرارت سے بولی تو وہ دونوں بھی



تھا کہ وہ یاور جیسے ذلیل اور بزدل انسان کا منہ توڑ کر رکھ دے جو شرفاء کی عزتوں کو ان کی کمزوری بنانے کے اپنی من مانیوں کرنے کا عادی تھا۔

”آپ زمین کو جائیداد میں سے اس کا حصہ دیں یا نہ دیں۔ لیکن رائے کی شادی میں مزید تاخیر مت کریں۔“ رمان سے کہتے ہوئے وہ ان کے برابر آ بیٹھے تو عالم قصداً ”کلائی“ بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالتا اٹھ کر ربا داری میں شملے لگا۔

”رائے کی شادی۔“ عانیہ بیگم کے متفکر چہرے پر سے اک سایا سا زور گیا، جسے عالم محسوس کیے بنانہ وہ سکا۔ ”لیکن وہ تو اس کے لیے کبھی تیار نہ ہوگی۔“

”اسے تیار ہونا پڑے گا بھائی! بلکہ جب آپ اسے بھائی جان کی طبیعت خرابی کی اصل وجہ سے آگاہ کریں گی تو وہ خود ہی مان جائے گی۔ ایک بار اس کا مستقبل معلوم ہوا جائے پھر اس یاور ملک کو میں نے گاؤں بلانے کا ارادہ کیا ہے۔“

”ابن راشد! اگر وہ مان بھی جائے تو یہی میں ایسا بندہ کہاں سے لاؤں جو میری معصوم بچی کی پاکدامنی، اس کی ذات پر کوئی بھی سوال اٹھائے بنا اسے قبول کرنے کو تیار ہو۔ میں ایسا عالی ظرف کہاں سے ڈھونڈوں جو اس بے خطا کو کسی ناکردہ گناہ کی سزا نہ دے۔“

بات کرتے کرتے وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تو عالم کا دل دکھ سے بھر گیا۔ زندگی واقعی کچھ لوگوں کے لیے بہت تلخ، بہت سخت رویہ اپناتی ہے۔

بے اختیار ایک بو جھل سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس نے گہری نظروں سے اس روتی ہوئی بے بس ماں کی جانب دیکھا تھا اور اگلے ہی لمحے بھاری قدموں سے باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

\*\*\*

”کیا بنا سب ٹھیک تو ہے؟“ عالم ہاسپٹل سے سیدھا شاہ نواز کے فلیٹ پر آیا تھا۔ رائے کے ذکر پر اس کا پورا جسم کان بن گیا۔ یقیناً

معاملہ خاصا گنہگار تھا اور حیات احمد کی اچانک طبیعت خرابی کا باعث بھی۔ ”پتا نہیں“ میں ان سے نہیں ملا۔“ بو جھل لہجے میں کتنا وہ کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

”تو پھر تو اتنی دیر سے کہاں تھا؟“ اس کا انتظار یکایک غصے میں بدل گیا۔ ”ہسپتال میں۔“ وہ آہستگی سے بولا تو نواز کے چہرے پر ابھرنے کے آثار دور آئے۔

”تو پھر تو ان سے ملا کیوں نہیں؟“ تعجب سے استفسار کرتا وہ اس کے برابر آ بیٹھا۔ تو عالم اک گہری سانس لیتا اس کی جانب دیکھنے لگا۔

”کیونکہ وہاں یاور ملک آیا ہوا تھا۔“ ”یاور ملک؟“ وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔ ”تو بالآخر حیات انکل نے اسے قبول کر ہی لیا۔“ سب کی زندگیاں سیٹ ہو گئی تھیں۔ بس ایک اسے ان سب نے مل کر تباہ کرنا تھا، سو کر لیا۔

”ہاں۔ اس نے تو ہاں ہونا ہی تھا۔ ولاد جو ہوا۔“ وہ تنہی سے مسکرایا۔ ”دایا نہیں، بلیک میلر!“ عالم نے دھیمے لہجے میں اس کی تصحیح کی تو وہ بے اختیار چونک کر اس کا چہرہ تکتے لگا۔

”کیا مطلب؟“ ”مطلب یہ کہ انکل کی طبیعت خرابی کی وجہ یاور ملک ہے۔ جس نے نہ صرف جائیداد میں سے زمین کا حصہ مانگا بلکہ انکار کی صورت میں رائے کو نقصان پہنچانے کی دھمکی بھی دی ہے۔“ عالم نے ساری حقیقت اس کے گوش گزار کی تو وہ حیرت زدہ سا اسے دیکھتے ہوئے پولا۔

”لیکن تجھے یہ سب کیسے پتا چلا؟“ اور جواباً ”عالم نے اسے پوری تفصیل کہہ سنائی۔“

”میں صرف میں نے دار ہوں اس کی بربادی کا!“ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بھرائے ہوئے لہجے میں بڑبڑایا تو عالم کا ہاتھ بے اختیار اس کے شانے پر آن ٹھہرا۔

”ایسا مت کہہ یار! یہ سب شاید بونی ہونا طے تھا۔“ ”نہیں عالم! یہ سب بونی ہونا طے نہیں بلکہ طے کیا گیا تھا۔ اللہ نے بیٹھ دو میں سے ایک راستے کا انتخاب اپنے بندوں پر چھوڑا ہے۔ پھر میں بھلا سارا الزام مقدر پر ڈال کر خود کو کیسے بری الذمہ قرار دے سکتا ہوں۔“ برستی آنکھوں کے ساتھ وہ پچھتاؤں سے چور لہجے میں بولا تو عالم اک بو جھل سانس کھینچ کر رہ گیا۔

”خدا آگاہ ہے کہ رائے کا اس سارے قصے میں کوئی قصور نہیں، مگر پھر بھی اگر اس کی ذات پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں تو بتا اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کون ہے جس کی بدولت آج اس کی ذات بند گلی میں آکھڑی ہوئی ہے یوں کہ خوشیوں کا کوئی روزن، کوئی دریچہ اس کے لیے وا ہونے کو تیار نہیں۔“

نواز نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال اٹھایا تو عالم بے اختیار نظریں چر گیا۔

”چپ کیوں ہے؟ بونٹا کیوں نہیں کہ یہ میں ہوں جو اسے پوری دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا کر گیا۔ اس کی محبت کو بے اعتبار کر کے بیچ چور ہے اس کی عزت۔“ ایک جھٹکے سے اٹھ کر اونچی آواز میں چلاتے ہوئے وہ ایک تخت اپنا سینہ منسنے لگا تو عالم نے تیزی سے اٹھ کر اسے تھام لیا۔

”خدا کا واسطہ ہے نواز! خود کو سنبھال!“ زبردستی اسے کاؤچ پر بٹھاتے ہوئے وہ خود بھی اس کے شانے پر بازو پھیلانے اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”نہیں عالم! میں اب تب تک نہیں سنبھال سکتا جب تک اس کے لیے کچھ نہ کر لوں۔“ نفی میں سر ہلاتے وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

”تو کیا کر سکتا ہے یار؟“ اس نے دکھ سے نواز کی جانب دیکھا۔

”تم از کم اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کی ایک کوشش تو کر ہی سکتا ہوں۔“ اس نے اپنا سر کاؤچ کی بیک سے نکال دیا۔

”تو شاید ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تجھے ایک کوشش تو ضرور کرنی چاہیے۔ کیا پتا وہ سب تجھے معاف کر کے قبول کر لیں۔“ عالم کے دل میں ایک ناکام امید کی نئی کرن جاگ اٹھی۔ ”پھر ہم اس سلسلے میں کسی۔“

”میں اس کے قابل کہاں یار۔“ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے تلخی سے مسکرایا۔ ”یہ باب اب بھی نہیں کھل سکتا۔ ویسے بھی اس کے لیے تو کوئی بہت اچھا، بہت پیارا سا سانس ہونا چاہیے۔ جو اس کے سارے دکھ۔“

بات کرتے کرتے اس کی نگاہ عالم پر آٹھری تو وہ ایک لحظے کو خاموش ہو گیا۔

”کیا ہوا؟“ عالم نے بے اختیار اس کے شانے پر دباؤ ڈالا۔

”عالم! تو جانتا ہے ماں کے میں دن رات انیت کی کس بھٹی میں سلگ رہا ہوں؟“ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اچانک سیدھا ہو بیٹھا تو عالم اس غیر متوقع سوال پر اسے حیرت سے تکتے لگا۔

”ہاں۔“ ”تو مجھے اس روزن سے نکالنے کے لیے کس حد تک جاسکتا ہے یار؟“ وہ اسے امید سے دیکھتے ہوئے گویا ہوا تو عالم بنا کسی پس و پیش کے مضبوط لہجے میں بولا۔

”جس حد تک تیری سوچ جاسکتی ہے۔“ ”تو پھر تو نور رائے کے لیے اپنا رشتہ بھجوا دے۔“ ”کیا؟“ دو سو والٹ کا کرنٹ بھی اگر عالم کو لگتا تو اسے اتنا شدید جھٹکا نہ لگتا جتنا کہ شاہ نواز کی بات سن کر لگتا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟“ پھٹی پھٹی بے یقین نگاہوں سے اس نے شاہ نواز کو یوں دیکھا جیسے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہو۔

”میں“ میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں یار۔ تو نہ صرف اس کے ماضی بلکہ حال سے بھی بخوبی واقف ہے اور تیری اچھائیوں کا میں خود معترف ہوں۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہر لحاظ سے بہترین



شریک حیات ثابت ہو گے۔" اس کا ہاتھ تھامے وہ دبے دبے جوش سے بولا تو عالم ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتا ہاتھ کھڑا ہوا۔

"تو پاگل تو نہیں ہو گیا؟" اس کی حیرت دھیرے دھیرے غصے میں ڈھلنے لگی تھی۔ "میں... بھلا میں کیسے رات سے شادی کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں کر سکتا۔ آخر تجھے کبھی نہ کبھی کسی اچھی لڑکی سے شادی کرنی تو ہے۔ تو پھر وہ لڑکی رات سے کیوں نہیں ہو سکتی؟" شاہ نواز نے اس کے غصے کو خاطر میں لائے بارسان سے پوچھا تو عالم جھنجھلا اٹھا۔

"بس نہیں ہو سکتی؟" وہ بھلا اسے اب کیسے سمجھاتا کہ اس نے وہ اچھی لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔

"دیکھ عالم! اگر تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں صرف رات سے کی بات اور اس کی خوشیوں کو دیکھ کر یہ بات کر رہا ہوں، تو تو بالکل غلط سوچ رہا ہے۔ میں تو یار! اتنے بے رحم ہو کر ہمارا ہاں نہیں دے گا۔ میں خود صرف تمنا کر سکتا ہوں۔ اسے پا نہیں سکتا! ہاتھ اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے وہ حسرت زدہ لمحے میں بولا تو عالم اک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

"میں تیرے غلوں پہ شک نہیں کر رہا شاہ نواز۔ لیکن تو یہ تو سوچ کے میں اپنے دوست کی محبت پہ کیسے یہ ظلم ڈھال سکتا ہوں؟ میں سب کچھ جانتے بوجھتے کیسے اس لڑکی کو اپنا سکتا ہوں جو میرے دوست کی ہر دعا میں شامل رہی ہو؟ نہیں یار! میں خود کو اتنے بڑے امتحان میں نہیں ڈال سکتا۔" وہ بے اختیار نفی میں سر ہلا گیا تو نواز اسے غصے سے گھورنے لگا۔

"نہیں کر سکتا تو پھر اتنے بڑے بڑے دعوے کیوں کیے تھے؟ میں نے کتنی امید سے تیری جانب ہاتھ بڑھایا تھا کہ تو مجھے اس برنخ سے نکال لے گا۔" بات کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی تو وہ بے اختیار رخ موڑ گیا۔

"نواز پلیر! سمجھنے کی کوشش کر، اگر ایسا ہوا تو ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے چھوٹ جائیں گے۔" اس نے تیزی سے بڑھ کر نواز کا بازو تھاما۔

"نہیں بلکہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کی دعاؤں میں شامل ہو جائیں گے! اپنے بازو پہ رکھے عالم کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے وہ اس کی جانب رخ پھیرتے ہوئے نرمی سے بولا۔ عالم اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"تو کیوں خود یہ انتہا برا ظلم کرنے چلا ہے؟ کیوں ایک بار اسے اپنا حال دل نہیں سنا؟... بلکہ تو چھوڑ میں میں خود بتاؤں گا رات سے کو تیری تری دیوانگی کا عالم تو اس کی خوشی اور محبت کی خاطر خود کو نازت کے کس صحرائیں دھکیلنے چلا ہے میں اسے بتاؤں گا۔" وہ غلوں سے بولا تو شاہ نواز دھیرے سے مسکرایا۔

"تجھے ایک بات بتاؤں عالم! محبت کی آبیاری چار چیزیں کرتی ہیں۔ اعتبار، عزت، وفا اور یقین۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر اسے ملنا بند ہو جائے نا تو یہ جذبہ کمزور پڑنے لگتا ہے۔ واہوں اور دوسو سوں کا شکار ہو کے بے جان ہونے لگتا ہے۔ جبکہ میں نے تو رات سے کی محبت کو اسی وقت ایک جھٹکے سے ان چاروں چیزوں سے محروم کر دیا تھا جب اسے میرے ساتھ اور میری محبت کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اس لیے میرے یار! اب کوئی بھی حرف یقین اس کی نظروں میں مجھے سرخرو نہیں کر سکتا۔ اس دراز کو حتم نہیں کر سکتا جو اس کے دل کو ہمیشہ کے لیے دھڑکن میں تقسیم کر گئی ہے۔ ایسے میں اس کے زخم کب کب کب بھلے گئے بجائے کیوں نہ ان زخموں کے لیے مرہم تلاش کرنے کی کوشش کروں۔ کیوں نہ کوئی ایسا قدم اٹھاؤں کہ اس کی زندگی کی ہر جگہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔"

"اور تیری محبت؟" عالم کے لمحے میں نمی اتر آئی۔

"اس کی سسکیاں بھی تب ہی جھمیں گی جب رات سے آباد ہوگی۔ میرے نزدیک "محبت" میں پناہی سب کچھ نہیں ہے یار! بلکہ محبوب کی خوشی میں خوش رہنا اصل محبت ہے۔" وہ انتہائی سکون سے گویا ہوا تو عالم کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"یہ محبت تو نہ ہوئی یہ تو "عشق" ہوا۔" عالم دھیرے سے بڑھ دیا۔

"نہیں ضبط عشق! شاہ نواز آنکھوں میں نمی لیے ہوئے سے مسکرایا تو عالم نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالیا۔ وہ اگر آج شاہ نواز کو منع کر بھی دیتا تب بھی وہ اب اسے کبھی رطابہ کے لیے نہیں کہہ سکتا تھا اور جب رطابہ نہیں تو پھر کیوں نہ رات سے ہی سہی۔ کم از کم اس طرح وہ دل کی نہ سہی، لیکن دوست کی نظروں میں تو سرخرو ہو سکتا تھا۔

اور یہی سوچ اسے خاموشی سے اپنے آنسو سمیٹنے پر مجبور کر گئی تھی۔



"کیا؟ تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟" شائستہ بیگم کے مزاج کی تمام تر خوشگوار بھک سے اڑ گئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ ساؤنڈ نیبل پہنچتے ہوئے انہوں نے بے اختیار غیاث علی کی جانب دیکھا تھا جو خود بھی یہ ساری تفصیل سننے کے بعد چپ کے چپ بیٹھے رہ گئے تھے۔

"اس میں دماغ خراب ہونے والی کون سی بات ہوئی؟"

عالم کی پیشانی پہ تلے سے آن ٹھہرے وہ ساری فیملی اس وقت لاؤنج میں بیٹھی شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جو آج عالم کی اسلام آباد سے اچانک آمد پر۔ بچانے کتنے دنوں بعد یوں مل کر پٹی جا رہی تھی۔ غیاث علی بھی لاہور سے کل رات ہی واپس آئے تھے، اس لیے گھر میں خاصی رونق تھی۔ باتوں کے دوران عالم نے رات سے کاؤز پر چھپر کر ان سب کو خاصا حیران کر دیا تھا، مگر جو نمی اس نے ساری حقیقت ان سب کے گوش گزار کی، تمام حاضرین محفل کو گویا سانپ سوگھ گیا۔

ان کا رد عمل عالم کے لیے کسی اچھے کا باعث نہ تھا۔ وہ اس ری ایکشن کے لیے اس لمحے سے ہی تیار تھا جب اس نے نواز کے مشورے سے اپنے گھر والوں کو تمام تر حقیقت سے آگاہ کرنے کی ٹھانی تھی کہ بہر کیف اتنی بڑی بات کا چھپانا ان دونوں کے نزدیک سراسر ایک

حفاظت اور ایک انتہائی غلط بات تھی، جو آنے والے وقت میں رات کے ساتھ ساتھ خود عالم کے لیے بھی بہت سی مشکلات کھڑی کر سکتی تھی اور ایسی ہر مشکل سے بچنے کے لیے سیدھا راستہ یہی تھا کہ وہ اپنے گھر والوں سے کوئی بات بھی نہ چھپانا اور اس نے یہی کیا تھا، مگر شائستہ بیگم کے تیور دیکھ کر اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ رہا تھا کہ ان سب کو قائل کرنا اتنا آسان بھی نہ تھا جتنا کہ وہ سمجھے ہوئے تھا۔ جب ہی بے اختیار اک گہری سانس لیتے ہوئے وہ اس محاذ پہ لڑنے کے لیے میدان میں اتر آیا تھا۔

"بیجے! ابھی کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔" شائستہ نے طنزیہ نظروں سے شوہر کی جانب دیکھا۔ "میں پوچھتی ہوں، دنیا کی ساری لڑکیاں مرگتی ہیں جو تم اس لڑکی سے شادی کرنے چلے ہو؟" انہوں نے "اس" کو جبارا کر کرتے ہوئے دکھا جانے والی نظروں سے بیٹے کو گھورا۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس لڑکی میں ایسی کوئی برائی نہیں جو اس سے شادی نہ کی جائے۔" عالم نے بھی "اس" پہ زور دیتے ہوئے جواب دیا تو شائستہ بیگم استہزاء سے انداز میں مسکرا دیں۔

"مگر وہ اتنی ہی اچھی ہے تو شاہ نواز خود کیوں نہیں اسے اپنا لیتا؟ تمہارے گلے میں یہ دھول کیوں لٹکا رہا ہے؟"

"وہ اسے سو بار اپنا لیتا، اگر جو یہ ممکن ہوتا اور میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں جو وہ مجھ سے جو چاہے کروا تا پھرے۔ میں نے یہ فیصلہ اپنی مرضی اپنی خوشی سے کیا ہے۔ ہاں لیکن مجھ سے یہ غلطی ضرور ہوئی ہے کہ میں نے آپ سب کو دھوکا دینے کے بجائے پوری بات انتہائی ایمان داری اور سچائی سے یہ سوچ کر بتا دی کہ سچائی کو جاننا میرے والدین کا حق ہے، لیکن مجھے آپ سے اس درجہ تنگ نظری کی امید نہ تھی۔ آپ نے مجھے حقیقتاً "بہت مایوس کیا ہے اہل بہت مایوس!"

جو جھل لمحے میں کتنا وہ شائستہ بیگم اور غیاث صاحب دونوں کو ایک پل کے لیے شرمندہ کر گیا۔



”میں تمہاری اس درجہ تابعداری کی قدر کرتا ہوں  
بہن! لیکن تم اپنی ماں کی فیلتنگز کو بھی تو سمجھنے کی  
کوشش کرو۔ اس کے لیے ایک ایسی لڑی کو قبول کرنا

”کیسی لڑی؟“ عالم نے انتہائی سکون سے انہیں ٹوکا  
تو غیث صاحب بے اختیار خاموش ہو گئے۔  
”اس سارے قصے میں اگر آپ کو رائے کا کوئی قصور“  
اس کے کردار میں کوئی جھول نظر آیا ہو تو آپ مجھے  
بتائیں۔ بلکہ اگر آپ غیر جانب داری سے سوچیں تو  
اس بے چاری نے تو اس سارے قصے میں کھویا ہی  
کھویا ہے۔ غلطی اس کی بہن کی تھی مگر سزا اسے دی  
گئی اور آج تک دی جا رہی ہے۔ کیونکہ ہم جیسے اور  
آپ جیسے لوگ اسے اور اس کے ماں باپ کے ناکرہ  
گناہ کو بخشنے کے لیے تیار نہیں۔ جبکہ یاد ملک جیسے  
نام نہاد شریف انسان سے ہم خوشی ملتے ہیں کیونکہ وہ  
ایک سزا ہے اس کی ظنا کو ہم بڑے ہلکے ہلکے انداز میں  
”لومین“ کا نام دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور  
دوسری جانب اسی بات کو نقطہ اعتراض بنا کر ہم کسی  
بے گناہ کو سزا دینے سے پہلے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ آیا  
اس سارے معاملے میں اس کا کوئی قصور ہے بھی کہ  
نہیں۔

اگر ایک فیملی کی کوئی لڑی غلط قدم اٹھاتی ہے تو اس  
کی سزا خاندان کی باقی لڑکیوں کو کیوں دی جاتی ہے؟ یہ  
رکھے ہٹا کہ وہ خود کیسے کردار کی مالک ہیں۔ جبکہ وہی کام  
اگر کوئی لڑکا کرے تو اس کی ماں بہنوں کو کیوں معصوب  
نہیں ٹھہرایا جاتا؟ کیوں ان کے کردار کو بھی ان کے  
بیٹے یا بھائی کے عمل کے حوالے سے نہیں جانچا جاتا؟

وہ بولنے پہ آیا تو بولتا چلا گیا تھا اور وہاں بیٹھے سب  
لوگوں کے لبوں پہ چپ کی مرگ گئی تھی۔ وہ عالم کی  
کسی بھی بات کو بھٹلانے سے قاصر تھے۔  
”عالم ٹھیک کہہ رہا ہے یا! اگر وہ لڑکی اچھی ہے۔  
اس کی فیملی اچھی ہے تو میرے خیال میں ہمیں کسی  
گزری ہوئی بات کو ایشو نہیں بنانا چاہیے۔“ چند

لحوں کی خاموشی کے بعد فیروز کی مستحکم آواز کرے  
میں گوجی تو عالم آنکھوں میں خوش گوار حیرت لیے بھائی  
کو دیکھنے لگا۔

”اماں! بھلا نواز سے بڑھ کر بھی کوئی اس لڑکی کی  
اچھائی کی گواہی دے سکے گا۔ جو نہ صرف اس سے  
منسوب رہ چکا ہے بلکہ آج تک اپنے کیے پر بچتا بھی  
رہا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر آپ کہیں تو میں آپ کی تسلی  
کے لیے شاہ نواز کی والدہ سے آپ کی بات کروا دیتا ہوں۔  
آپ ان سے رائے اور اس کی فیملی کے متعلق جو  
چاہیں پوچھ سکتی ہیں۔“

عالم نے رمان سے ماں کو جواب دیا، لیکن غیث  
صاحب نفی میں سر ہلا گئے۔  
”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ بندوں کی اتنی  
پہچان تو میں بھی رکھتا ہوں کہ کھرے اور کھولے میں  
تمیز کر سکوں۔ مجھے شاہ نواز پر اعتبار ہے۔ تم مجھے اس  
لڑی کے والد کا نام پتا بتاؤ۔ باقی کی معلومات میں خود کروا  
لوں گا۔“

”جی ہمت۔“ ان کا جواب عالم کے ساتھ ساتھ سب  
ہی یہ ان کی نیم رضامندی ظاہر کر گیا تھا اور شائستہ بیگم  
خواہش کے باوجود مزید کچھ نہ کہہ سکی تھیں۔

\*\*\*

آنے والے دنوں میں غیث صاحب نے حیات  
احمد اور ان کے خاندان کے بارے میں کیا معلومات  
کروائی تھیں اور کس سے کروائی تھیں۔ عالم کو  
بالکل علم نہ تھا اور نہ ہی اس نے دخل اندازی کی کوئی  
کوشش کی تھی۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے طور پر  
اپنی اور شائستہ بیگم کی تسلی کروائیں کہ یہی ان سب  
کے حق میں بہتر تھا۔

البتہ جس روز غیث صاحب نے اسے اپنی  
شائستہ اور فیروز کی اس سلسلے میں اسلام آباد کے  
متعلق مطلع کیا تھا، اس روز اس نے آخری بار اپنے  
دل کی ادھوری رہ جانے والی خواہش کو جی بھر کے ساتھ  
تھا۔

وقت نے اسے عجیب سے دورا پر لا کھڑا کیا تھا۔  
جہاں ایک طرف دل تھا اور دوسری طرف دوست! وہ  
اگر دوست کو انکار کر کے دل کی آواز پہ لبیک کہہ بھی  
دیتا تب بھی وہ پھر کبھی خود میں شاہ نواز کے سامنے  
رطلہ کے لیے دست سوال دراز کرنے کی ہمت نہ پا  
سکتا تھا اور اسی تلخ حقیقت نے اسے شاہ نواز کی مدد  
کرنے پر مجبور کر دیا تھا، جو فقط عالم کی فیملی کی آمد کا سن  
کر ہی بے طرح خوش ہو گیا تھا اور وہ کتنی ہی دیر محبت  
کے اس روپ کو حیرت زدہ سا دیکھ گیا تھا۔ جہاں  
چاہنے والے کے لیے اگر کچھ اہم تھا تو ایک اس کے  
محبوب کی خوشی اور اس کا سکون۔ باقی ہر چیز جسے اس  
کے لیے بے معنی ہو چلی تھی۔ حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی  
اور یہی عالم کو منظور نہ تھا۔

”ہوں۔“ اس نے اپنی پلیٹ سے نظر س ہٹاتے  
ہوئے مقابل بیٹھے عالم کی جانب دیکھا جو گہری نظروں  
سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

وہ دونوں آج فز کرنے باہر آئے ہوئے تھے۔  
جہاں باتوں کے دوران عالم نے اسے اماں، بابا اور فیروز  
بھائی کی آمد کے متعلق مطلع کیا تھا اور اس کی بے تحاشا  
خوشی دیکھ کر اس نے بہت دنوں سے اپنے دل و دماغ  
میں بیٹے ایک خیال کو زبان دینے کی کٹھالی تھی۔

”ایک بات تو ابھی طرح سمجھ لے۔ میں رائے سے  
تب ہی شادی کروں گا جب تو شادی کے لیے تیار ہو  
گا۔“

”کیا مطلب؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن در  
آئی۔

”مطلب یہ کہ تجھے بھی بہت جلد اپنے لیے ایک  
اچھا سالانہ نف پائز تلاش کرنا ہو گا۔“ عالم نے مکمل  
سنجیدگی سے جواب دیا تو شاہ نواز بے اختیار خاموش ہو  
گیا۔

”ٹھیک ہے اور کچھ؟“ چند لحوں کے توقف کے  
بعد وہ آہستگی سے بولا تو عالم کی بے یقین نگاہیں اس کے  
بے تاثر سے چہرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ سامنے بیٹھا

بندہ محبت کے کس مقام پہ کھڑا تھا۔ عالم کے لیے  
حقیقتاً ”اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا۔“  
”اور یہ کہ تو مجھ سے کبھی قطع تعلق کرنے کی  
کوشش نہیں کرے گا۔“ خود کو سنبھالتے ہوئے وہ  
اپنے سابقہ انداز میں بولا تھا، مگر اب کی بار شاہ نواز کے  
چہرے پر بے چینی نمودار ہو چلی تھی۔

”لیکن یا ارگ۔۔۔“  
”اگر مگر کچھ نہیں۔ رائے کو اس بارے میں کچھ پتا  
نہیں چلے گا۔ تو اس طرف سے بے فکر رہ۔“

”اوکے۔“ اس نے تھک کر بیٹھے تھیا رڈال دیے  
تھے۔ ”اب بس،“ با کچھ اور بھی رہ گیا ہے منوانے کو؟“  
اس نے خف سے عالم کی جانب دیکھا تھا۔

”اور یہ کہ میری شادی کے بعد سب سے پہلی کال  
تو مجھے کرے گا۔“ مسکراہٹ دے دے وہ شرارت سے  
گویا ہوا تھا اور نواز اسے گھور کر رہ گیا تھا۔

\*\*\*

حیات احمد نے اپنی صحت یابی کے بعد سب سے  
پہلا کام وکیل کو بلوا کر کرنے سرے سے جائیداد کے  
کاغذات تیار کروانے کا کیا تھا اور چونکہ وہ نہیں  
چاہتے تھے کہ اس معاملے کی ذرا سی بھی ہینک رائے  
کے کان میں پڑے، اس لیے انہوں نے راشد سے  
کہہ کر تمام کام انہیں ہی مکمل کروایا تھا، مگر آج  
وکیل صاحب نے انہیں چند ایک ضروری باتیں  
ڈسکس کرنے کے لیے اپنے پیجر بلوایا تھا اور اسی  
سلسلے میں راشد انہیں خود لینے کے لیے آئے ہوئے  
تھے۔

چونکہ رائے نے ابھی تک یونیورسٹی سے چھٹی لے  
رکھی تھی، اس لیے اس موضوع پہ کوئی بھی بات کیے  
بنا وہ دونوں ٹنگنے کے لیے تیار کھڑے تھے جب ملازم  
نے مہمانوں کی آمد کا بتانے کے ساتھ ساتھ ایک  
وزنگ کارڈ بھی حیات صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”ایم پی اے غیث علی؟“ انہوں نے ابھ کر ساتھ  
کھڑے بھائی کو دیکھا۔ جو خود بھی آنے والوں کا



تعارف سن کر حیران رہ گئے تھے۔  
 ”میں تو انہیں نہیں جانتا۔ پھر ہمارے گھر کیا لینے آئے ہیں؟“ وہ حیران پریشان سے گویا ہوئے تھے۔  
 ”اب یہ تو ان سے ملنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔“  
 راشد خود بھی خاصے الجھ سے گئے تھے۔  
 ”کون کون ہے ان کے ساتھ؟“ انہوں نے اب کے پاس کھڑے مجید سے پوچھا۔  
 ”صاحب جی ایک مرد اور ایک خاتون۔“ اور خاتون کی آمد کا سن کے وہ مزید شش و پنج میں مبتلا ہو گئے تھے، مگر چونکہ یہ وقت کسی بحث میں پڑنے کا نہیں تھا، اس لیے مجید کو عافیہ بیگم کو مطلع کرنے کا کہہ کر وہ خود راشد کو لیے ان کا استقبال کرنے پورچ میں چلے آئے تھے۔ جہاں انہیں دیکھتے ہی پاوروی ڈرائیور نے آگے بڑھ کر گاڑی کے دروازے کھول دیے تھے۔  
 ان کے اترنے پر حیات صاحب اور راشد صاحب دونوں نے خوش آمدی سے آئے والوں کا غیر مقدم کیا تھا۔  
 ”سری ہے مال احوال کے بعد وہ انہیں لیے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں چلے آئے تھے۔ جہاں عافیہ بیگم سہلے سے بیانی کی منتظر کھڑی تھیں۔  
 تھوڑی دیر اور دھڑا دھڑکی باتوں کے بعد شائستہ بیگم نے اصل موضوع کی جانب پیش رفت کی تو ان تینوں کو گویا سانپ سوکھ گیا۔  
 ”معاف کیجئے گا لیکن آپ نے میری بیٹی کو کہاں دیکھا؟“ اپنی حیرت کو پس پشت ڈالتے ہوئے عافیہ نے مزید انداز میں دریافت کیا۔  
 ”یونیورسٹی میں۔ میں وہاں ایک بروگرام میں شرکت کے لیے گئی تھی اور وہیں میں نے آپ کی بیٹی کو دیکھا تھا۔“ شائستہ نے بیٹے کی ہدایت کے مطابق جواب دیا۔  
 ”اواچھا!“ عافیہ کے چہرے پر پھینکی سی مسکراہٹ در آئی۔ بے اختیار ان کی نظریں سامنے بیٹھے شوہر کی جانب اٹھی تھیں، جو خود بھی چہرے پر پرمردگی لیے بیٹھے تھے۔  
 ”ایسا ہے غیاث صاحب!“ چند لمحوں کے متذبذب

کے بعد حیات احمد نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے تمہید باندھی تھی۔ ”آپ کا اتنا سر آنکھوں پر، لیکن میری بیٹی کے ساتھ ایک بہت بڑا مس ہنس ہو چکا ہے۔ میں چاہتا تو آپ سے یہ بات چھپا بھی سکتا تھا۔ لیکن میں نے زندگی میں کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا اور باوجود اس کے کہ مجھے معلوم ہے کہ میری بات سن کے آپ لوگ اپنا ارادہ بدل دیں گے۔ میں آپ سے کسی قسم کی کوئی غلط بیانی نہیں کرنا چاہتا۔“  
 وہ انتہائی ضبط سے گویا ہوئے تو باوجود کوشش کے عافیہ بیگم کی آنکھیں بھر آئیں، جنہیں سب سے چھپانے کو وہ بے اختیار نظریں جھکا گئیں، مگر پھر بھی ایک گھٹی گھٹی سی سسکی ساتھ بیٹھی شائستہ کو ان کی جانب متوجہ کر گئی۔  
 سر جھکائے آنسو پونچھتی اس بے بس مال یہ انہیں بے اختیار ڈھیروں ترس آیا تھا جو بنا کسی جرم کے دنیا کے سامنے، محض اس وجہ سے سر جھکا کر رنجور ہو گئی تھیں کہ وہ بیٹی کی مال تھیں، ایک ایسی بیٹی جس کا اس سارے قصبے میں کوئی تصور نہ تھا، مگر پھر بھی وہ معقوب ٹھہراؤ کی گئی تھی۔  
 ”آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، ہم ہر بات سے واقف ہیں۔“  
 غیاث علی نے رمان سے کہا تو حیات احمد کے ساتھ ساتھ راشد صاحب بھی گنگ سے بیٹھے انہیں دیکھتے چلے گئے، جبکہ عافیہ بیگم کا جھکا سر تیزی سے اوپر کو اٹھا تھا۔ حیرت اور بے یقینی کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ ان کی آنکھیں برساتا تو کیا جھپکنا تک بھول گئی تھیں۔  
 ”ہم نے آپ کے گھر آنے سے پہلے آپ لوگوں کے بارے میں پوری معلومات کروالی تھیں۔ آپ کی بیٹی کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں اور میں ایک فرد کے لیے کی سزا پورے خاندان کو دینے کا قائل نہیں۔ اس لیے آپ ہماری طرف سے بے فکر ہو جائیں کیونکہ ہم اپنا ارادہ بدلنے والوں میں

سے نہیں۔“  
 اپنی بات مکمل کر کے وہ دھیسے سے مسکرائے تو حیات احمد کے لیے ان کی اچھائی پہ یقین کرنا مشکل ہو گیا۔  
 ”معدرت کے ساتھ غیاث صاحب! لیکن میرے لیے آپ کی بات پہ یقین کرنا خاصا دشوار ہو رہا ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ آپ کے بیٹے اور آپ کے خاندان کو رشتوں کی کوئی کمی نہیں۔“  
 الجھن بھری اک نظر ساکت بیٹھی عافیہ پہ ڈالتے ہوئے انہوں نے غیاث علی کی جانب دیکھا جن کی مسکراہٹ ان کی بات سن کے گہری ہو گئی تھی۔  
 ”آپ کی صاف گوئی مجھے بے حد پسند آئی اور جی آپ نے بالکل درست کہا۔ ہمیں حقیقتاً رشتوں کی کوئی کمی نہیں، لیکن کیا کہجئے کہ ہماری بیگم کو آپ کی بیٹی کچھ اتنی پسند آئی کہ ہم آپ کی طرف آنے پر مجبور ہو گئے۔ باقی جہاں تک بات اعتبار کی ہے تو اس کے لیے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ جیسے بانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ویسے سب انسان اور ان کے سوچنے کا انداز بھی ایک جیسا نہیں ہوتا۔“  
 ہم اللہ کے فضل سے بڑھے لکھے اور روشن خیال لوگ ہیں۔ ہمارے نزدیک آپ میں یا آپ کی بیٹی میں کوئی کمی نہیں۔ اس لیے ہم بلا جھجک آپ کے گھر چلے آئے ہیں۔ باقی اگر آپ کو ہماری بات مناسب لگے اور آپ کا دل ہم پہ یقین کرنے کو تیار ہو جائے تو ہم خوشی بات آگے بڑھانے کو تیار ہیں۔ بصورت دیگر کوئی گلہ نہیں۔“  
 انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کی تو راشد صاحب اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔  
 ”بالکل درست کہا آپ نے۔ سب ہی لوگ ایک سے نہیں ہوتے اور اس بات کا سب سے بڑا ثبوت آپ لوگوں کی یہاں موجودگی ہے۔ مجھے اچھا خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری بیٹی کی سچائی اور پاکیزگی پہ کوئی حرف نہیں آنے دیا اور آپ سے اچھے اور قلیلے

ہوئے لوگوں سے ہمیں ملوایا۔ باقی ہم بیٹی والے ہیں۔ اپنی تسلی کے لیے ہمیں تھوڑا سا وقت درکار ہے اگر آپ برائے نامیں تو۔“ انہوں نے ایک نظر بھائی پہ ڈالتے ہوئے کہا تو حیات احمد کے چہرے پر اطمینان در آیا۔  
 ”کیوں نہیں، یہ تو آپ کا حق ہے بھائی صاحب!“  
 جواب غیاث صاحب کے بجائے شائستہ بیگم کی جانب سے آیا تو وہ ممنون سے مسکرا دیے، جبکہ عافیہ کو تو اب تک اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ یہ یکایک اللہ نے ان کے لیے اپنی رحمت کا کون سا دروا کر دیا تھا، ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔  
 ”عافیہ! اگر آپ برائے نامیں تو تھوڑی دیر کے لیے رائے کو بولا لیجئے۔“ شائستہ بیگم نے دھیسے لہجے میں کہا تو وہ بے اختیار اثبات میں سر ہلاتی اندر کی جانب بڑھ گئیں۔  
 مجید اس دوران چائے تیار کر چکا تھا۔ اسے چند ایک ضروری ہدایات دیتی وہ تیز قدموں اور چمکتے چہرے کے ساتھ رائے کے کمرے میں چلی آئیں۔ جہاں وہ کتابیں پھیلانے پڑھنے میں مصروف تھی۔  
 ”رائے! جھوٹو یہ سب کچھ اور فوراً منہ دھو کے آؤ۔“ الماری کی طرف بڑھتے ہوئے انہوں نے تیزی سے اسے ہدایت جاری کی تو وہ حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔  
 ”لیکن کیوں؟“  
 ”کیونکہ بچے کچھ لوگ تمہیں دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔“ قصداً اس کی جانب پشت کیے وہ اس کے لٹکے ہوئے جوڑوں کو آگے جھکے کرتے ہوئے عام سے لہجے میں بولیں تو رائے کی بے یقین نگاہیں ماں کی پشت پر جم کر رہ گئیں۔  
 ”کیا؟ کیا کہا آپ نے؟“ اس نے سر سراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔  
 ”جو تم نے سنا۔“ بنا اس کی طرف دیکھے وہ ہلک اور پنک جوڑا اتار کے سپاٹ چہرے اور بے تاثر لہجے میں جواب دیتی بیڈ پہ اس کے کپڑے پھیلانے لگیں تو



رائے کے لیے اپنے اشتعال پہ قابو پانا مشکل ہو گیا۔  
”تو پھر آپ بھی سن لیں۔ میں کہیں نہیں جانے  
والا۔ کسی سے نہیں ملنے والی۔“ وہ ایک لخت چلا کر  
گستاخی سے بولی۔

”یہ تم کس لمحے میں بات کر رہی ہو۔ ہاں؟“ غصے  
سے ہاتھ میں پکڑا دیندے بیڑے بیٹھے ہوئے وہ لے لے  
ڈگ بھرتی اس کے قریب چلی آئیں۔

”ایک بات میری غور سے سن لو! نیچے آئے  
مہمانوں کے پاس تمہارا پیار باپ تمہارا منتظر ہے اب  
چاہے اس کی عزت رکھ لو یا بہن کی طرح روند کر چلتی  
ہو۔“

انگلی اٹھا کر سخت لمحے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ  
کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔ تو کتنے ہی خاموش آنسو  
اس کی پتلی آنکھوں سے نکل کر اس کے چہرے کو  
لگ گئے۔

”السلام علیکم! تمہارا دس منٹ بعد وہ نظرس  
بجائے عافیہ بیگم کی معیت میں ڈرائنگ روم میں  
داخل ہوئی تو چائے پیتے تمام حاضرین محفل کی نگاہیں  
اس کی جانب اٹھ گئیں اور اس تمام عرصے میں پہلی بار  
شانستہ بیگم کے لبوں پہ دل کی گہرائی سے بڑی خوب  
صورت سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔

”وعلیکم السلام! ماشاء اللہ۔“ انہوں نے بے اختیار  
اٹھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

”او بیٹا! یہاں میرے پاس بیٹھو۔“ اس کا مرمیس  
ہاتھ تھامے انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔

”کیسی جارہی ہے بھائی؟“ انہوں نے بغور اس  
کی دودھیا رنگت میں گتے حزن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”جی اچھی۔“ وہ ہنسی لکھیں اٹھائے آہستگی سے بولی۔

وہ اس وقت خود پہ اور اپنے آنسوؤں پہ کیسے بند باندھے  
بیٹھی تھی، یہ وہ جانتی تھی یا اس کا دل جو اس وقت  
شدید درد کی پلٹ میں تھا۔

تھوڑی دیر مزید اُدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ  
لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تو رائے بھی اپنے کمرے میں  
چلی آئی، جس کا دروازہ بند کرتے ہی اس کا ضبط جواب

دے گیا اور وہ وہیں دروازے سے پشت ٹکائے دونوں  
ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے چلی گئی۔  
\*\*\*

”آپ لوگ میرے ساتھ ایسا بھی کر سکتے ہیں۔  
مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔“ شدت گریہ کے  
باعث اس کی آنکھیں سوچ چکی تھیں، مگر آنسو تھے  
کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

”ابھی تم غصے میں ہو، اس لیے تمہیں ایسا لگ رہا  
ہے۔ جب تم ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو گی تب  
تمہاری بہتری اور بھلائی کے لیے ہی کرنا چاہ رہے  
ہیں۔“ عافیہ بیگم نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھامتے  
ہوئے کہا مگر رائے نے تیزی سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”بہتری؟ کس بہتری کی بات کر رہی ہیں آپ؟ وہ جو  
آپ لوگ میرے ساتھ ایک بار پہلے بھی کر چکے ہیں؟“

طنز پر نظروں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے اس  
نے کھلم کھلا اپنے میں استفسار کیا تو عافیہ بیگم کے لبوں  
پہ پھپکی سی مسکراہٹ آن ٹھہری۔

”خواہش اور ارمان تو تب بھی تمہاری بہتری اور  
بھلائی کا ہی تھا بیٹا! لیکن کیا کرتے؟ اپنے ہی راہ کھولی کر  
گئے۔“ ان کا گلا رندھ گیا تو پشیمانی کا ہلکا سا احساس  
اسے نظرس چرانے پر مجبور کر گیا۔

”لیکن اگر تمہیں ایسا لگتا ہے کہ ہمارے فیصلے کی  
وجہ سے تمہیں تکلیف اٹھانی پڑی تو میں تم سے معافی  
مانگتی ہوں۔ تم ہمیں معاف کر دو بیٹا! بات کرتے  
کرتے انہوں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تو وہ  
ترنپ اٹھی۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں امی!“ اس نے تیزی سے  
ان کے بندھے ہوئے ہاتھ تھام لیے۔

”نہیں بیٹا! ہم واقعی تمہارے گناہ گار ہیں۔ ہماری  
وجہ سے تمہیں بہت کچھ بھینٹا۔“

”پلیز امی! مجھے مزید شرمندہ مت کریں۔ میں نے

آپ لوگوں کی وجہ سے کچھ نہیں بھینٹا۔ آپ میری  
نہیں بلکہ میں آپ کی گناہ گار ہوں۔“ ان کے ہاتھ  
تھامے وہ اپنی زبان درازی پہ رو پڑی تو عافیہ بیگم نے  
اسے سینے سے لگا لیا۔

”تم تو میرا فخر، میرا مان ہو میری جان! تمہیں  
تکلیف دینے کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں  
سکتی۔ لیکن بیٹا! بعض دفعہ حالات اتنے ناگزیر ہو جاتے  
ہیں کہ انسان کو اپنے فیصلے بدلنے پڑتے ہیں۔ نہ صرف  
اپنے لیے بلکہ اپنی ذات سے منسلک رشتوں کے لیے  
بھی۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے  
سراٹھایا۔ عافیہ بیگم کتنی ہی دیر خاموشی سے اسے  
دیکھتی رہیں اور پھر اک بوجھل سانس فضا کے سپرد  
کرتے ہوئے انہوں نے یادِ ملک کے مطالبے سے  
لے کر اس کی دھمکی اور حیاتِ صاحب کی طبیعت  
خرابی تک ہر بات اس کے گوش گزار کر دی اور وہ پچھلی  
پچھلی بے یقین نگاہوں سے انہیں دیکھنے چلی گئی۔

”اس دن جب میں نے زمین کو بازار میں دیکھا  
تھا، تو مجھے اس کے چہرے پر اک ترنپ، اک پاس نظر  
آئی تھی۔ یوں جیسے اندھی خواہشوں کی طلب کے اس  
سفر نے اسے بھی سوائے حقیقتوں کے اور کچھ نہ دیا  
ہو اور فون۔ اس کی آنسوؤں بھری آنکھوں نے میرے  
اس وہم کو یقین میں بدل دیا تھا، لیکن یادِ ملک کے مطالبے  
نے میرے اس یقین کو ایک بار پھر متزلزل کر دیا۔ اس  
نے مجھے ایک بار پھر یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا میں  
نے ایک بیٹی کو پیدا کیا تھا یا ناگن کو جو نہ تو اپنے پیدا  
کرنے والوں کی بن سکتی ہے اور نہ ہی اپنے پیدا کردہ کی۔“

آنسوؤں کے درمیان وہ ٹوٹے ہوئے لمحے میں  
پولیس توفیق رنگت کے ساتھ انہیں چپ چاپ سنتی  
رائے نے اپنے خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیری۔

”آپ نے پاپا کو زمین کے بارے میں بتایا؟“

”کیا بتاؤں؟ یہ کہ آپ کی ملاؤں بھی اپنے شوہر ناقدار

کے ساتھ اسی شہر میں موجود ہے اور شاید اس کے اس  
مطالبے میں برابر کی شریک! انہیں میں انہیں یہ بتا کر  
مزید اذیت سے دوچار نہیں کرنا چاہتی۔ زمین کو  
جائداد سے غرض ہے اسے وہ مل جائے گی۔ باقی تم  
اللہ کی مہربانی سے اپنے گھر کی ہو جاؤ۔ ہمیں اور کچھ  
نہیں چاہیے۔“

اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے انہوں نے اس کے سر  
پہ ہاتھ پھیرا تو بے بسی کی انتہائی تیزی سے اس کی  
آنکھیں بھگو گئی۔

زمین ایک بار پھر اسے یوں بے دست دیا کر جائے  
گی، اس نے بھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا، جبکہ  
دوسری جانب عافیہ کی اس خاموشی کو ثبت انداز میں  
لیتے ہوئے، دھیرے دھیرے اسے آج پیش آنے  
والے حیرت انگیز واقعے کے متعلق بتانے لگیں، جو  
ان کے نزدیک کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

”اور تمہیں پتا ہے، ہمیں انہیں کچھ بھی بتانے کی  
ضرورت نہیں پڑی۔“ انہوں نے خوشی سے کھکتے  
لمحے میں کہا تو رائے کے لیے مزید اپنی خاموشی کو قائم  
رکھنا مشکل ہو گیا۔

”کیا مطلب؟“ اس کے لیے یہ بات کسی طور قابل  
قبول نہ تھی کہ اس کے ماں باپ کسی سے کوئی غلط بیانی  
کرتے یا کوئی بات چھپاتے۔ جب ہی اس کے چہرے  
پر بے چینی اور پیشانی پہ بل سے آن ٹھہرے تھے۔

”مطلب یہ کہ وہ ہمارے بارے میں پوری  
معلومات کروا کے آئے تھے اور تمام حقیقت جاننے  
کے باوجود انہیں کسی بات پہ کوئی اعتراض نہیں۔“  
اس کے پریشان چہرے پر نگاہیں جمائے انہوں نے  
رسان سے جواب دیا تو رائے کے لیے ان پہ یقین کرنا  
ناممکن ہو گیا۔

”ایسا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ اضطراب کے باعث  
اس سے بات کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

”یہی سوال ان سے تمہارے پاپا نے بھی کیا تھا اور  
جواباً انہوں نے یہ کہہ کر ہمیں حیران کر دیا کہ وہ کسی  
ایک فرد کے کیسے کی سزا پورے خاندان کو دینے کے



قائل نہیں اور چونکہ انہیں تمہارے یا ہمارے بارے میں کوئی غلط بات نہیں بتا چلی، اس لیے انہیں ماضی سے کوئی لینا دینا نہیں۔ پھر تم ہی بتاؤ بیٹا بھلا ہم ایسی نعمت خداوندی کو ٹھکرانے کی فاش غلطی کیسے کر سکتے تھے؟

انہوں نے پیار سے اس کے چہرے پر ہنسی لٹیں کانوں کے پیچھے اڑتے ہوئے سوال کیا۔ یہ دیکھے بنا کہ ان کی بات سن کر اس کا اضطراب دو چند ہو گیا تھا۔ ”ہی! کہیں ان کا بیٹا کسی غلط عادت کا شکار تو نہیں؟“ یہ لوگ خود کوئی فراڈ تو نہیں؟ وہ انہوں کی ڈیڑھی ہونے لگی۔ غیروں سے اس درجہ اچھائی کی امید بھلا کیسے کر سکتی تھی۔

”ہم ان کی اچھائی کے قائل ضرور ہوئے ہیں بیٹا۔ لیکن اندھا بین تو ہم کسی بھی نہیں کر سکتے۔ تم ہمارے جگر کا فلاں ہو۔ اپنی نسل کے بغیر ہم کسی بھی کوئی لہلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم کم از کم اس طرف سے بے فکر رہو۔“

انہوں نے آگے بڑھ کر اس کی سرپیشانی چومتے ہوئے اپنی محبت کا تعین دلایا تو بے اختیار اس کا دل اپنے رب کو نکار بیٹھا۔

”یا اللہ! مجھے اور میرے ماں باپ کو کسی نئی آزمائش میں گرفتار ہونے سے بچالینا۔ بے شک تو سب سے بڑا محافظ ہے۔“

\*\*\*

حالات نے یک لخت اسے اتنے عجیب سے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی یونیورسٹی نہ جاسکی تھی۔ اس دوران حیات صاحب اور راشد صاحب نے عالم اور اس کی فیملی کے متعلق تمام معلومات کراولی چھیں۔ جو ہر لحاظ سے مثبت اور اطمینان بخش ثابت ہوئی تھیں۔

اچھی طرح سے تسلی کر لینے کے بعد حیات صاحب نے غیاث علی سے ان کے گھر آنے کی اجازت طلب کی تھی۔ جہاں عالم سے رو برو ملنے کے

بعد تو گویا ان کا ہر اہم اپنے آپ دور ہو گیا تھا۔ اس پر مستزاد ان کا رکھ رکھاؤ گھر بار پر ہر جزئیاتی شان دار تھی کہ حیات احمد کے لیے انکار کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ بالآخر اثبات میں جواب دیتے ہوئے انہوں نے غیاث علی کو ان کی پوری فیملی سمیت ڈنر پر انوائٹ کیا تھا۔

ان کی خواہش تھی کہ راتہ اور عالم ایک بار ایک دوسرے سے مل لیں۔ سو اسی بات کو سوچتے ہوئے انہوں نے کھانے کی دعوت دی تھی جس میں عالم کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔

اور اس دن پہلی بار عالم کے لیے نواز کو پوری روداد سنا مشکل ہو گیا تھا۔ اپنا آپ اسے ایک عجیب سے بوجھ تلے دیتا محسوس ہوا تھا کہ وہ یہ سب کچھ شاہ نواز کے ہی ایمپائر کر رہا تھا، مگر پھر بھی اپنے اور راتہ کے رشتے کے خوالے سے بات چیت اسے اپنی ہی نظروں میں شرمندہ کیے دے رہی تھی اور اس بات کا احساس شاہ نواز کو بھی ہو گیا تھا۔ جب ہی اس نے اپنی واپسی کے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا سوچ لیا تھا۔

عالم نے محض اس کی دوستی میں اپنی زندگی کے سب سے بڑے فیصلے کا اختیار اسے سونپ کر جو مان اور محبت اسے بخشی تھی وہ شاید ایک بھائی بھی نہ دے سکتا تھا، سو اس کے اطمینان کو اگر اسے اپنی جان سے بھی گزرنا پڑتا تو وہ ہنس کر گزر جاتا۔ یہ تو پھر محض واپسی کا فیصلہ تھا۔ ہاں لیکن جانے سے پہلے آخری بار وہ ایک نظر راتہ کو دیکھتا چاہتا تھا اور یہی خواہش لیے وہ اگلے دن یونیورسٹی آنے کے بعد گزشتہ دو ماہی ہفتوں کی طرح سیدھا انگشٹ فٹائرمنٹ چلا آیا تھا۔ لان میں اپنی مخصوص جگہ پر درخت کے ساتھ ٹیک لگائے اس نے اپنی نگاہیں دور راہداری میں پھلتے پھولنے والے کے کلاس روم کے دروازے پر نکا دی تھیں۔ جہاں تھڑ پیرہ کے کفتم ہونے کے بعد اسٹوڈنٹس معمول کے مطابق باہر آنے لگے تھے۔

آنکھوں میں پیاس سموئے اس نے بڑی آس سے روز کی طرح اتنے بہت سے چروں میں فقط ایک

چہرے کو تلاشنا چاہا تھا، جو خدا جانے آج بھی نظر آنے والا تھا یا نہیں۔

لیکن اسے اتفاق کہیں یا اس کے دل کی تڑپ جو آج حد سے سوا تھی کہ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اسے اپنی دوستوں کے ہمراہ باہر آتی دیکھائی دی تھی اور وہاں موجود ہر وجود جیسے غائب ہو گیا تھا اور اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے کھڑا شاہ نواز گویا خود سے بھی بیگانہ!

”اے وقت ٹھہر جا! یہ گھڑی پھر نصیب ہونہ ہو۔“  
دوانہ وار اس کے چہرے کو تکتے ہوئے اس کے دل نے تڑپ کر اشتہار عاکی تھی اور منظر یک لخت دھندلا گیا تھا۔

ایک کے بعد ایک آنسو اس کے چہرے کو بھگوئے لگے تھے مگر اسے سوائے لختہ بہ لختہ دور جاتی راتہ کے دوسری کی بات کا ہوش نہ تھا۔

وقت نے اس کے ساتھ کیسا عجیب کھیل کھیلا تھا کہ وہ جس کے بنائے اس کی اپنی زندگی ادھوری تھی آج وہ محض اس کی زندگی کے ادھورے پن کو دور کرنے کی خاطر اسے بخوشی کسی اور کو سونپنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ آج وہ ایک بار پھر زباں پر قفل لگائے اپنی متاع جاں سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے یہ زہر کا پیالا اسے زبردستی پلایا گیا تھا، مگر آج اس نے اسے خود اٹھا کر لبوں سے لگا لیا تھا۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہونے تک

\*\*\*

ڈور بیل کی آواز پر رشید نے دروازہ کھولا تو عالم کو کھڑا دیکھ کے سلام کرتے ہوئے ایک طرف ہو گیا۔ ”کسے ہو رشید؟“ وہ مسکراتے ہوئے اندر چلا آیا۔ ”ٹھیک ہوں جی۔“ وہ دروازہ بند کرتے ہوئے اس کے پیچھے چلتا لاؤنچ میں چلا آیا۔

”لیکن تمہارا صاحب مجھے ٹھیک نہیں لگتا۔ کدھر ہے وہ؟“ اس نے ہنسنے اچکاتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ تو جی کو سنبھلے گئے ہیں۔“ رشید نے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا تو عالم حیرت زدہ سا رہ گیا۔ ”کو سنبھلے؟ لیکن کب؟“

”رات کو جی پائے روڈ روانہ ہوئے ہیں۔“  
”وہاں سب ٹھیک تو ہے؟“ اس کے جواب نے عالم کی حیرت کو پریشانی میں بدل دیا تھا۔

”جی۔ وہاں تو خیریت ہے۔ صاحب کو کوئی ایسا ضروری کام تھا۔“ رشید نے عام سے لہجے میں کہا تو عالم کے چہرے پر ابھرنے کے ساتھ ساتھ خفگی بھی در آئی۔

”ایسا بھی کون سا ضروری کام تھا جو اطلاع دینے کی بھی زحمت نہیں کی۔“ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے جب سے موبائل نکال کر ایک بار پھر اس کا نمبر ملایا، مگر دوسری جانب سے ”پاورڈ آف“ کی ریکارڈنگ سن کر وہ تپ اٹھا۔

”ایک تو اس نے موبائل بجائے کیوں آف کر رکھا ہے۔“ جھنجھلا کر کال ڈسکنیکٹ کرتے ہوئے وہ پیاس پڑے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

”صاحب جی! آپ پریشان مت ہوں۔ وہ آپ کے لیے کاغذ چھوڑ گئے ہیں۔“ رشید نے تیزی سے اسے مطلع کیا تو عالم کا ضبط جواب دے گیا۔

”تو پہلے بیٹا تھا نا!“ وہ غصے سے بولا تو رشید کان دباے شاہ نواز کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

پرچا اسے تھمکنے کے بعد وہ خود خاموشی سے کچن میں جا گھسا جبکہ عالم نے تیزی سے تہہ شدہ کاغذ کھول لیا۔

”یار من!“

میں واپس جا رہا ہوں۔ کیوں؟ یہ تو بھی جانتا ہے اور میں بھی۔ تو نے جو کچھ میرے لیے کیا ہے۔ میں اگر چاہوں تب بھی اس کا بدل نہیں دے سکتا۔ تیری دوستی میرا مان، میرا تحریے اور اپنے غور سے تعلق توڑنے کے بارے میں میں سوچ بھی نہیں سکتا، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تیرے لیے یہ سب کرنا کوئی



آسان کام نہیں اور میری موجودگی میں تو شاید اور بھی مشکل۔ اس لیے تیری اور اپنی یہ مشکل آسان کرنے کے لیے میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔

میری اس شہر میں موجودگی نہ تو ہماری دوستی کے لیے اور نہ ہی تیری آنے والی زندگی کے لیے مناسب ہے۔ سو زندگی کو کسی بھی تلخی سے بچانے کے لیے میں تجھ سے دور جا رہا ہوں، محض یہ سوچ کر کہ ہمارے درمیان آنے والا یہ فاصلہ دلوں میں آنے والے فاصلوں سے بدتر ہے۔

اللہ تعالیٰ تجھے اس نیکی کا اجر، زندگی میں بے شمار خوشیوں کی صورت عطا فرمائے۔ اتنی خوشیاں کہ ایک دن تجھے رات سے سچی محبت ہو جائے تم دونوں ہمیشہ میری دعاؤں کے حصار میں رہو گے۔ کوئی نہ چنچنے میں خود تجھ سے رابطہ کروں گا۔ تب تک اپنا بہت خیال رکھنا۔

لفظوں سے پہلے سلام کی نظر اس کے نام پر آ کے گھس رہی تھی۔ بے یقینی سے ہاتھ میں پڑے کاغذ کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس مختصر سے پیغام کو پڑھا تھا مگر اس بار آخر میں لکھا اس کا نام دھند لایا تھا۔

\*\*\*

”عالم غیاث ولد غیاث علی“ آپ نے راتہ رات حیات بنت حیات احمد کو بوجھ باج لاکھ روپے سکھ رائج الوقت اپنے نکاح شرعی میں قبول کیا؟“

قاضی صاحب کے استفسار پر عالم کا مضبوط اور بھاری لہجے میں کیا گیا اقرار، تیری بار بھی، ساؤنڈ سسٹم کے ذریعے ڈور تک روم میں بیٹھی راتہ رات تک پچھتاؤں کے آنسوؤں میں تیزی آگئی۔

”تو زمین! تم ایک بار پھر میری زندگی کا فیصلہ کر گئیں۔ کل جب میں اپنی خوشی سے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی تھی تو تم نے میری آنکھوں سے ان کا ہر خواب نوچ کر انہیں ویران کر دیا۔ میرے دل سے اس کی ہر خوشی چھین کر اسے کھنڈر بنا دیا اور آج جب اس

کھنڈر کو آباد کرنے کی ہر خواہش دم توڑ چکی ہے تو تمہاری ذات ایک بار پھر میرے لیے امتحان کا باعث بن گئی۔

تم نے ایک بار پھر مجھے اپنا پویا کانٹے پر مجبور کر دیا۔ خدا تمہیں کبھی کوئی خوشی نصیب نہ کرے۔ تم اپنی خود غرضی اور بے حس کی سزا ہمیشہ بھگتو!

عافیہ بیگم کے سینے سے لگ کر زار و قطار روتے ہوئے اس کے تڑپتے دل نے بے اختیار رسک کر اپنی ماں جانی کو کو سنا تھا۔

اس بہن کو جس کی وجہ سے کل اس کی محبت اس سے چھین گئی تھی اور آج وہ ایک اجنبی سے بندھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ایک ایسا شخص جسے راتہ رات سے محبت تو دور انسیت تک نہ تھی، مگر پھر یہاں محبت کی ضرورت بھی کس تھی۔ اس جذبے سے تو اس کا ایمان اس شام ہی اٹھ گیا تھا۔ جب اس کے دعوے دار نے اسے تباہ کر دیا تھا۔ سو جب جس یقین اور مان تھا اس نے ہی ہاتھ جھٹکنے میں لحد نہ لگایا تھا تو یہاں تو ایسا کوئی مان کوئی یقین سرے سے موجود ہی نہ تھا اور اسی لیے اس رشتے سے اسے کوئی توقعات بھی نہ تھیں۔

ہاں! لیکن ایک عزت کی تمنا ضرور تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس بار اس کی جھولی بھرنے والی بھی ناقصت ایک بار پھر اس کی آزمائش کا سامان کرنے والی تھی۔

\*\*\*

راتہ رات کو رخصت کروا کے اسلام آباد والے گھر کے بجائے حویلی لایا گیا تھا۔ جہاں اگلے دن غیاث صاحب نے شاندار وسیلہ کا اہتمام کر رکھا تھا، جس میں ملک کے نامور سیاست دانوں کے علاوہ بیوروکریٹس اور تاجروں کا ایک وسیع حلقہ شرکت کرنے والا تھا۔

حویلی میں راتہ رات شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ مختلف رسومات کے بعد اسے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا جبکہ عالم مردانے میں چلا آیا تھا۔ جہاں قریبی رشتے دار اور کزنز محفل سجاے بیٹھے تھے۔ ہنس مذاق، چھیڑ چھاؤں نے ماحول کی رونق میں اضافہ کر دیا تھا، مگر عالم کے دل

کی کیفیت ہرگز رتے لمحے کے ساتھ عجیب ہوتی چلی جا رہی تھی۔

شاہ نواز کو گئے آج ڈیڑھ مہینہ ہوئے کو تھا۔ اس دوران اس کی کئی کالز آئی تھیں مگر عالم نے اس کی کوئی کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔ اسے نواز کے یوں خاموشی سے چلے جانے پہ لال کے ساتھ ساتھ بے حد غصہ بھی تھا۔ جب ہی وہ اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر مقابل بھی شاہ نواز تھا، جو اپنے دوست کی رگ رگ سے واقف تھا۔ اسی لیے بغیر راما نے وہ روز اسے حال احوال اور اپنی نئی روئین کے مہیجے کرنا تھا تھا۔ غیاث علی اور فیروز سے بھی وہ مسلسل رابطے میں تھا۔ جس کی وجہ سے شاہی کا پورا اٹینڈول اس کے علم میں تھا۔

آج صبح بھی اس کا دماغ اس سے بھرا بہت خوب صورت سامیجے عالم کو ملا تھا اور اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اڑ کر جائے اور اسے اپنے ساتھ لے آئے اپنی زندگی کے اس اہم ترین دن پہ اسے اپنے عزیز ازاں دوست کی بے حد کمی محسوس ہو رہی تھی، جو محض اسے اور اس کی زندگی کو انجمنوں سے بچانے کے لیے اپنی ہر خواہش سے دستبردار ہو گیا تھا۔

کوئی نہ جا کے اس نے زبان صاحب کا برنس جوائن کر لیا تھا اور ایسا کرنا اس کے لیے کتنا تکلیف دہ تھا۔ اس بات کا عالم کو بخوبی اندازہ تھا۔ اس نے عالم کے کہے کے مطابق اپنی ماں کو اپنے لیے رشتہ ڈھونڈنے کی بھی اجازت دے دی تھی اور ایسا کرتے وقت وہ کرب کی کن انتہاؤں سے گزرا ہو گا، عالم کو اس حقیقت کا بھی اچھی طرح سے علم تھا اور آج جبکہ اس کے ہاتھوں تاوت میں آخری میل ٹھکی تھی تو وہ عالم کیسے خوش ہو سکتا تھا؟

شاہ نواز چاہے کتنی ہی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیوں نہ کرنا، عالم جانتا تھا کہ اس کے بار کا بیار دل آج دردی انتہاؤں پر تھا۔ وہ ”ضبط عشق“ کی کڑی منزل پہ تھا۔ پھر بھلا عالم کس طرح دل سے مسکرا سکتا تھا؟ وہ وہاں تہائی کا زہر اپنے اندر اتار رہا تھا تو عالم کیسے

ان رونقوں سے محفوظ ہو سکتا تھا۔ نہیں وہ انتا ہے جس ہرگز نہیں تھا کہ اپنے دوست کے ان کہے دکھ کو محسوس نہ کر پاتا۔

خود میں پچھری اس وہہری جنگ نے اسے اندر ہی اندر بڑھال کر کے رکھ دیا تھا، جس کی وجہ سے وہ کسی بھی رسم میں دل سے خوش نہ ہو سکتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے پہلو میں بیٹھی راتہ رات کو بھی ایک نظر دیکھنے کی کوشش نہ کی تھی اور اب بھی وہ اپنے کزنز کے درمیان بیٹھا مسلسل کم صم صم کرتا تھا۔ مگر کب تک؟

بالآخر جب شائستہ بیگم کے بلاوے پر وہ نیوز اور اپنے کزنز کے ہمراہ، اندر چلا آیا، تو اس کی بہن اور بھانجی سمیت سب ہی خواہشیں نے اسے ایک بار پھر گھیر لیا اور ہنس مذاق، نیگ کی بحث کے دوران کب اسے اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اسے پتائی نہیں چلا۔

\*\*\*

دھیرے دھیرے جھپکی رات اپنا نصف سے زیادہ سفر طے کر چکی تھی، مگر کھڑکی میں کھڑے شاہ نواز کی آنکھوں میں دور تک نیند کا شائبہ نہ تھا۔ غیر مرنی نقطے پہ نگاہیں جمائے اس کا دل آج صبح سے ہزاروں میل کی دوری پہ بھٹک رہا تھا۔ جہاں آج اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے جا رہی تھی۔

آج وہ ایک عرصے کے بعد اپنے اندر سکون کی گہری لہر اتارنی محسوس کر رہا تھا۔ راتہ رات کو محفوظ ہاتھوں میں سونپنے کے بعد پانچ سال سے چلنے والا وہ، آج پہلی بار اسے پھواری برستی محسوس ہوئی تھی اور اسے یوں لگا تھا جیسے بالآخر رب کائنات کی بارگاہ میں اس کے آنسوؤں کو قبولیت عطا ہو گئی تھی۔ جیسی تو مولانا اسے یہ دن دکھایا تھا۔ جب وہ ایک عرصے کے بعد اپنی محبت کے سامنے سر اٹھانے کے قابل ہوا تھا۔ خود سے نظریں ملانے کے لائق ہوا تھا مگر نہ اپنے آپ سے نظریں چراتے چراتے وہ تو اب حقیقتاً ”بڑھال ہو چلا تھا۔“

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

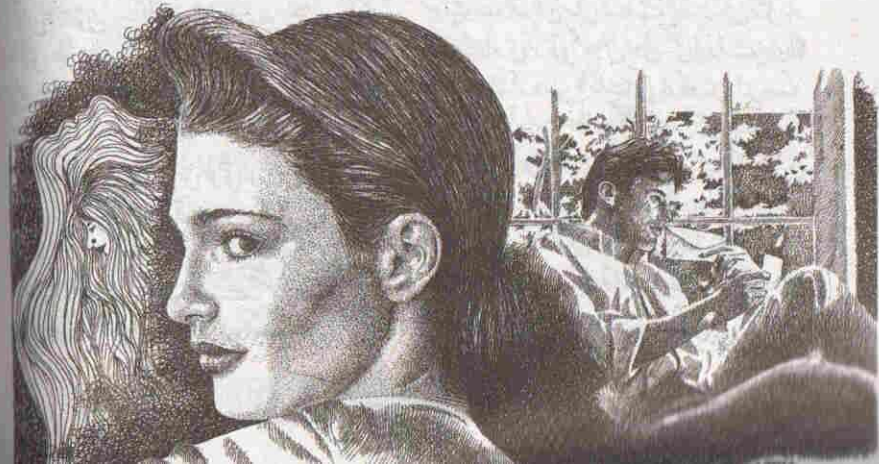


## سیرتِ محمدیہ علیہ السلام

غریب گھرانے میں پیدا ہونے والی سارا کو اپنی خوب صورتی پر بہت غور ہے۔ بچپن کا بیشتر اوجہ خوب صورت ہونے کے محض غریب ہونے کی بنا پر ٹھکرا دیا۔ اگرچہ نواز اکرم کا پورا خاندان اور وہ خود معمولی شکل کے تھے۔ لیکن سارا نے پورے خاندان سے ٹکر لے کر ان سے شادی کر لی۔ لیکن بھی نواز اکرم کو وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ انہیں اپنی بدی بٹی ماہین سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہ شکل و صورت میں دوھیال پر پڑی ہے، جبکہ چھوٹی بیٹی میرب بالکل ان کا برعکس ہے۔ سارا اعلوی اور میرب ہر وقت ماہین کو اس کی کم صورتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ جس سے ماہین اپنے رنگ کے معاملے میں متاس ہو گئی ہے۔ دونوں بہنوں میں بالکل نہیں بنتی۔ اس کی واحد دوست رفعت اسے نت نئی رنگ گورا کرنے والی کرکٹس ادا کرتی ہے اور یہ ہوتی ہے۔ کہ میں وہ نواز اکرم کے قریب ہے، لیکن ہر وقت کی تنقید اور رشتوں سے انکار نے اسے لذیبا کی طور پر حتما کر ڈالا ہے۔ نواز اکرم کی بہن ثروت بھی اس سے محبت کرتی ہے، لیکن سارا اعلوی کے ناروا سلوک کے باعث بھائی کے گھرانے سے کڑھاتی ہے۔

میرب کے لیے نواز اکرم کے دوست رضا اپنے بیٹے کا رشتہ دیتے ہیں تو میرب اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ سارا کا ایک ذہنی طرز پر کمزور بھائی شہزاد ہے جس کی ذمہ داری ماں نے مرتے وقت سارا کے سر دے رکھی تھی۔ اسے آوارہ گردی کا اور مشورہ دینے کا شوق ہے۔ ماموں شہزاد کو ماہین سے خاصی انیت ہے جو دیگر لوگوں کی طرح انہیں ڈانٹنے کے بجائے ان کا خیال رکھتی ہے۔

## کناؤلیٹ





فاخرہ کی اپنے شوہر ریاض کے انتقال کے بعد دنیا اندھیر ہو گئی۔ اسے چند ماہ تک اپنے بیٹے کاشف کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ میکے والے اس موقع پر اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاض کے بچپن کا دوست اقبال کاشف کو اپنی چکنی چڑی باتوں سے متاثر کر لیتا ہے۔ حالات کی سنگینی کا احساس فاخرہ کو اس وقت ہوتا ہے جب کاشف ماں کو اقبال سے شادی کا مشورہ دیتا ہے۔ فاخرہ اسے احساس دلاتی ہے کہ وہ اقبال سے دور رہے، لیکن کاشف اقبال انکل کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بیٹے کو مجبور کرنے پر وہ اقبال سے عقد ثانی کر لیتی ہے۔ شادی کے فوراً بعد اقبال اچھا لہا تار چھینکتا ہے اور ماں، بیٹے کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ گھر کا پیسہ فاخرہ کی اسکول کی نوکری پر ہی چلتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ کاشف کو اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ نواز اکرم کے یہاں بطور اکاؤنٹنٹ کلرک کام کرتا ہے اور ابھی کسٹمری ماں سے ملتا ہے اور ہر وقت فاخرہ کو علیحدگی کا مشورہ دیتا ہے۔ اس عمر میں بدنامی کا خوف انہیں ایسے فیصلے سے روکے ہوئے ہے۔ فاخرہ کے لیے اقبال کی غیر اخلاقی سرگرمیاں ناقابل برداشت ہیں۔

(اب آگے پڑیے)

## ۱۰ دسویں اور آخری قسط

”نواز! تم ایک کمزور اور بزدل مرد ہو اور کمزور مرد کے کمزور فیصلے نہ صرف اس کی اپنی بلکہ اس کے گھر والوں کی زندگی بھی اجڑا کر دیتے ہیں۔“

”ثروت تم! ثروت کے سفاک تجزیے پر نواز اکرم بے ساختہ چونکا تھا۔ آج پہلی بار ثروت نے اپنے بھائی کے رویے پر یوں کھل کر اظہار خیال کیا تھا۔

”سوری نواز! برا مت ماننا، مگر یہ حقیقت ہے کہ جس طرح سارا نے ماہین کے معاملے میں ہمیشہ کو لٹائی پر تکی اور محض شکل و صورت کی بنا پر اس نے ہمیشہ بیٹی کو کسی ناپسندیدہ چیز کی طرح خود سے دور رکھا۔ اسی طرح تم بھی میرب کے معاملے میں اپنی ذمہ داری ایک باپ کی حیثیت سے نہیں نبھا سکتے۔“

”میں نے کیا کی دی ہے اس کو؟“

”تم نے کبھی اس کو غلط کاموں اور باتوں سے نہیں روکا جو ایک باپ کی حیثیت سے تمہارا فرض تھا۔ اسے کبھی باپ بن کر نہیں دکھایا۔“

”ثروت! ایسا نہیں ہے، مجھے وہ بہت پیاری ہے۔ ماہین کی طرح۔ مگر وہ میری بات ماننے سے تباہ۔“

”تم نے منوانے کی کوشش کی؟“ ثروت آج احتساب کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

”وہ صرف سارا کی بات سنی ہے۔“

”سارا نے کبھی بھی ماہین کو اپنی بیٹی نہیں سمجھا، اس کی کم صورتی کی بنا پر اسے کمتر سمجھا اور تم نے کبھی اس کے اس رویے پر روک ٹوک نہیں کی۔ اس نے میرب کی خوب صورتی کی بنا پر اس کی بے جا حمایت کی لیکن تم خاموش تماشا بنے ہو۔“ ثروت نے گہرا سانس لے کر اسے دیکھا۔

”پھر اب کیا کروں ثروت!“ وہ بے بسی سے سر تھام کر بیٹھا تھا۔

”اب۔۔۔ بزدلی چھوڑو، ہمت پکڑو اور اپنے اندر قوت فیصلہ بیدار کرو۔“

”قوت فیصلہ؟ تم کیا سمجھتی ہو، میرب اور سارا میری بات مان لیں گی؟“

”کیوں نہیں مانیں گی بھی۔ انہیں ماننا چاہیے اور تم میں منوانے کی طاقت ہونا چاہیے۔ کچھ فیصلوں میں حتیٰ بھی کی جاتی ہے۔ تاکہ ان کا مطلوبہ رزلٹ حاصل ہو سکے۔“

”ثروت! میں سارا پر سختی نہیں کر سکتا ہوں۔“ نواز نے بے بسی سے سر جھکا لیا۔

”نواز! تمہاری اسی نرمی کا فائدہ اٹھایا ہے

تھیں، مگر ہمت کہاں سے لانا۔

”نواز! یاد رکھنا والدین کو بچوں کی اصلاح کے لیے بعض اوقات بڑے سخت فیصلے بھی لے پڑتے ہیں، تم بیٹی کے باپ ہو۔ خود جا کر آناں سے بات کرو۔ اسے اعتماد میں لو اور پھر اپنی بیٹی کو سمجھاؤ۔ عالیہ واسطی نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میرب کو عقل دے کر سمجھا بچھا کر بھیج دیں۔ اگر وہ آجاتی ہے تو ٹھیک، ورنہ ہم اسے لینے نہیں آئیں گے اور اگر وہ علیحدہ ہونا چاہتی ہے تو اس کے لیے بھی ہم تیار ہیں۔“

”کیا۔۔۔؟“ نواز کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

”بالکل۔۔۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں نواز! عقل و ہوش کرو، بزدل بن کر تم نے جو خاموشی میرے لیے اختیار کی تھی وہی خاموشی اب میرب کی زندگی بھی برباد کر سکتی ہے۔“

ثروت نے بالا خرہ بات جو کئی برسوں سے اس کے دل میں ایک شکوکے کی مانند سلگ رہی تھی، آج کہہ دی تھی، اور اس کی بات سن کر نواز نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا تھا اور بہت دیر تک دیکھا تھا۔



”آیاں! تمہارے آیا آج بہت ناراض ہو رہے تھے کہ تم نے اپنی حرکتیں آپ تک نہیں چھوڑی ہیں۔ تم کل رات کس لڑکی کے ساتھ تھے؟“

عالیہ واسطی نے اسے آفس جانے سے قبل ناشتے کی میز پر دھر لیا تھا، ورنہ تو وہ صبح کا ٹکڑا رات کو آتا تھا اور تمام دن وہ اس سے بات کے انتظار میں اگلے روز خود بھی صبح صبح اسے بروجیکٹ کے لیے نکل جاتی تھیں، مگر آج اتوار تھا تو انہیں اپنے آفس سے چھٹی تھی۔

”ماما! میں تو وہ توہانی ایک فرینڈ کے ساتھ۔۔۔“

”یہ فرینڈ بازی کا چکر ختم نہیں ہوا تمہارا، تمہاری ان ہی چکر بازیوں نے تمہارا گھر برباد کر دیا ہے اور تمہیں کوئی احساس ہی نہیں ہے۔“ عالیہ کو غصہ آیا۔

مارا نے، مجھے غلط مت سمجھنا۔ مگر تمہاری تھوڑی سی سختی سے گھر کے معاملات سدھ سکتے تھے، اور اگر تم نے اب بھی اپنی روش نہ بدلی تو تمہاری بیٹی کا گھر مزید برباد ہو جائے گا۔ بڑی مشکل سے ابھی ماہین والا مسئلہ حل ہوا ہے تو میرب کا جھگڑا شروع ہو گیا ہے۔ اب ضروری نہیں کہ خوش قسمتی ہر بار تمہارے در پر دستک دے اور میرب کے لیے بھی کوئی دوسرا اچھا بندھن۔“

”ثروت۔۔۔“ نواز اکرم نے تڑپ کر اس کی بات کاٹی تھی۔

”اللہ نہ کرے، مگر جو حالات نظر آرہے ہیں، وہ اسی بربادی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ عالیہ واسطی ہر بار اپنے بیٹے کو مناکر، سمجھا کر یہاں بھیجتی تھیں، مگر اس بار نہیں۔ وہ سب اگر اسی طرح اپنی ضد پر اڑے رہے تو سوچو کیا ہو گا۔ تم میرب سے سختی سے کہہ دو کہ اس نے پسندے شادی کی ہے اور اسے اتنی جلدی تباہ کرنے کا اختیار اسے نہیں ہو گا۔“

”سارا بھی قہ۔۔۔“

”سے اس معاملے سے بالکل الگ کرو۔ وہی میرب کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ اسی کی شہ پر میرب اتنی اچھل کود کر رہی ہے۔ تم میرب کے شوہر سر سال والوں سے رابطہ کر کے ان کے خدشات دور کرو۔ تب ہی یہ پر ایلم حل ہوگی۔ اور یاد رکھنا نواز! تمہاری اس وقت کی بزدلی، تمہاری بیٹی کے لیے عمر بھر کا عذاب بن جائے گی۔ ابھی جو فیصلہ اسے اچھا لگ رہا ہے، وہ فیصلہ پندرہ ماہ یا چند سال بعد اس کے لیے عمر بھر کی پشیمانی اور دکھ بن جائے گا۔ بہتر ہو گا تم اب معاملات اپنے ہاتھ میں لو۔“

ثروت بے حد التجائیہ انداز میں کہہ رہی تھی۔ بلکہ ایک بار تو اس نے اس کے سامنے ہاتھ تک جوڑ دیے تھے۔

نواز اکرم نے خود کو عجیب سی بے بسی میں پھنسا دیا، کیا تھا۔ ثروت کی باتیں دل پر تو اثر کر رہی



”ماما! میرا گھر کسی چکر کی وجہ سے نہیں بلکہ میرب کے چکروں کی وجہ سے برباد ہوا ہے۔ آپ کو پتا ہے پھر بھی۔“ وہ اٹھنا پر ناراض ہوا تھا۔

”نالی دونوں ہاتھوں سے جھتی ہے آیان! تم نے کون سا اسے اپنی محبت کا یقین دلایا ہے کبھی۔ اس وقت تم نے ہماری ہر بات کو جھٹلایا۔ اپنی منوالی تب میرب نواز تمہیں دنیا کی واحد خوب صورت لڑکی لگتی تھی، جس کے بغیر تم زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اب ہماری نیند اڑا کر ہمیں پریشان کر کے مزے سے لگے۔ اڑا رہے ہو۔ یہ کیا بات ہوئی۔“

عالیہ واسطی اس سے ہر بات کھل کر کرنا چاہتی تھیں۔ اپنے سر کھل اور ملنے جلنے والوں کو وضاحتیں دے دے کر اب وہ تھک گئی تھیں۔

”ماما! غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میں نے میرب کو سمجھا ہی نہیں۔ وہ اتنی خدی اور خود سر ہو گئی یہ مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔“

”بیٹا! زندگی میں کسی شخص کو ہم سمجھ نہیں پاتے تو کیا اسے زندگی سے نکل دیتے ہیں۔ رشتوں اور اپنے سے جڑے انسانوں کو زندگی سے نکالنا اتنا آسان نہیں ہوتا، کچھ وقت انہیں سمجھنے کے لیے اور بہتر ہونے کے لیے دینا چاہیے۔ تم میرب کو۔“

”ماما پلیز میں اس کا نام بھی سننا گوارا نہیں کرتا ہوں۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اپنی مرضی سے ہی آئے گی اور مجھ سے یہ توقع نہ رکھیے کہ میں اسے اپنے جاؤں گا۔“ آیان نے یک دم غصے سے بھڑک کر کہا تھا۔

”پھر وہی بات کچھ تو۔“

”ماما۔۔۔ اس نے چڑ کر ماں کی بات کاٹی۔“ آپ میری عادت کو اور مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں خیرے برداشت کرنے والا نہیں ہوں، اور اس لڑکی کے تو میں نے بہت زیادہ خیرے برداشت کیے ہیں۔ سمجھتی کیا ہے خود کو۔ بہت ہو گیا۔ ہر روز اپنے میکے جا کر بیٹھ جاتی تھی، اور میں لینے جاتا تھا۔ ذرا ڈر اسی بات پر

منہ پھلایا اور اوپر سے یہ بھی ڈھانڈا کہ میں اسے مناؤں۔ مجھے خیرے دکھانے اور اپنی اہمیت جتانے والی عورتیں بہت بری لگتی ہیں۔“

”تو یہ سب تمہیں اس سے شادی سے قبل سوچنا چاہیے تھا۔“

”وہ شادی سے قبل ایسی نہیں تھی۔ میں اس کے خروں کو ادا نہیں سمجھ کر نظر انداز کرتا تھا۔ پریشان ہو کر خود مجھے منانی تھی۔ اسی لیے تو میں۔۔۔ وہ عجیب سے لمحے میں اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا تھا۔ عالیہ کے دل کو کچھ ہوا۔ اگلا تو آلاؤلا بیٹا شادی کے صرف ڈیڑھ ماہ بعد ہی کیسی تنہائی کی زندگی گزار رہا تھا۔ شادی شدہ ہو کر بھی اس کی زندگی میں کوئی رنگ ہوئی خوشی نہ تھی۔

”بیٹا۔۔۔ میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیے۔ تاکہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ پرکھ سکیں۔ دوری تو کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ انہوں نے پیار سے اسے سمجھایا۔

”بی۔۔۔ لیکن صرف میرے اگلے کی کوشش سے کیا ہوتا ہے۔ میرب تو مسئلے کو سمجھانا ہی نہیں چاہتی۔ شاید اسے یہ احساس ہو گیا ہے کہ اس نے جلد بازی میں اور جذبات میں اگر مجھ سے شادی کا جو فیصلہ کیا تھا وہ غلط تھا۔ اسی لیے تو اس نے ایک بار بھی مجھے فون نہیں کیا۔ سوری نہیں کیا۔ حتیٰ کہ آنے کے لیے بات تک نہیں کی۔ اور آپ اس لڑکی کی فیور کر رہی ہیں۔ چھوڑیں ماما۔ اگر اسے میری پروا نہیں ہے تو مجھے چھی اس کی پروا نہیں ہے۔ گو تو بیل میرب۔“

وہ ناراضی سے کہہ کر پھر نکل گیا تھا اور عالیہ واسطی گم صم سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔ گزرے ایک ماہ سے زائد عرصہ کا پل بل اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ جب انہیں یہ احساس ہوتا تھا کہ میرب زیادتی کر رہی ہے اور کئی بار وہ میرب کو ٹوٹنا بھی چاہتی تھیں، مگر نئے دنوں کا احساس کر کے خاموش ہو جاتی تھیں۔ اس کا روزانہ ناشتے کے بعد میکے جانا اور پھر رات گئے والی آنا بھی اسی معمول میں شامل تھا۔ کئی بار آیان نے

اسے گھر میں رہنے کو کہا تھا، مگر وہ سرال میں رہنا پسند ہی نہیں کرتی تھی۔ اسے تو اپنی ماں باری تھی۔ اور وہ ہر روز اس سے ملے بغیر سو نہیں پاتی تھی۔

”اور اب کیا وہ خود آجائے گی۔ اس کی ماں بھی تو کچھ نہیں سمجھتی ہے۔ انسانی کو شہر دے رہی ہے کہ ناک سے لیکر سر تک اس کی ماں کے ساتھ جانا۔ تو یہ شہناز بھابی کے سامنے مجھے کتنی شرمندگی ہوئی تھی اور وہ بھی کیا مزے لے کے کر باتیں بتا رہی تھیں۔“

عالیہ لگتی تھی دیر افسوس سے بیٹھی رہ گئی تھیں۔ سونا گھر تاج انہیں زیادہ ہی محل رہا تھا۔ روزانہ تو وہ اپنے آفس جاتی تھیں۔ دن کا آدھ سے زیادہ حصہ ان کا وہاں گزار جاتا تھا، مگر آج صبح سے ہی گھر کی طرف لگتی اور اواسی انہیں پریشان کر رہی تھی۔

”سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔“ انہوں نے اپنی ٹھنڈی ٹھار کافی کا مک اٹھایا۔ سیکنڈ اتوار کو چھٹی کرنی تھی، اسی لیے وہ گھر کا چھوٹا موٹا کام خود ہی کر لیتی تھیں۔ اسی بل فون کی بیل بجی تھی۔

”مرے یہ کس کا فون آ گیا۔“ یہ کافی کا مک بچن میں رکھ کر واپس آئیں۔ پٹی سی ایل بمبرج رہا تھا۔

”دیکھ لو۔“

”بیٹو عالیہ بھابی بول رہی ہیں؟“

”جی جی نواز بھائی۔ السلام علیکم!۔“

”و علیکم السلام بھابی! کیسی ہیں آپ؟ بھائی صاحب کیسے ہیں؟“

”بالکل ٹھیک، شکر اللہ کل آپ بتائیں۔ بوئے دن کے بعد فون کیا آپ نے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی گلہ ان کی زبان پر آ گیا تھا۔

”بھابی!۔۔۔ دراصل میں آپ لوگوں سے ملنے گھر آنا چاہتا ہوں۔ آیان بیٹا سے بھی گپ شپ ہو جائے گی۔ مل بیٹھ کر اس مسئلے کا حل نکالیں گے تو یقیناً کچھ نہ کچھ حل نکل آئے گا۔“ نواز اکرم نے کچھ ہچکچاتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ عالیہ نے چونک کر ریسیور کو دیکھا۔

”جی ضرور۔ آپ جب چاہیں آجائیں بھائی صاحب! آپ کا اپنا گھر ہے۔ اجازت اور اطلاع تو غیروں کو دی جاتی ہے۔“

عالیہ کو نواز اکرم کی اس بات نے خاصا پر جوش کر دیا تھا۔ ان کی طرف سے گفتگو کا مطلب تھا کہ وہ بہتر حل چاہتے ہیں۔

”جی شکریہ۔ خدا حافظ۔“ فون رکھ کر عالیہ نے بے ساختہ ایک کپڑا سانس لیا تھا کہ اس مسئلے کے حل کی امید تو نظر آئی تھی۔



”مرے شہناز بھابی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ میری بیٹی کوئی گئی گزری معمولی لڑکی نہیں ہے۔ جو میں اسے خود سرال چھوڑ کر آؤں گی۔ وہ میرب نواز ہے۔ اور اس کے لیے خود عالیہ کو بیٹے سمیت آنا ہو گا۔ میری تمام شرائط مان کر میرب کو لے جانا ہو گا۔ ورنہ بیٹی کی دو روٹیاں بھاری نہیں ہیں مجھ پر۔ بہت لاڈلی ہے میری بیٹی۔“

سارا نے فخر سے گردن اکڑائی تو ایک طنزیہ پر مسکراہٹ بے ساختہ ان کے لبوں پر پھیلی تھی۔

”ہائے سارا۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ وہ عالیہ تو کتنی ہے۔ نہ میں جاؤں گی نہ میرا بیٹا۔ خود سارا اور نواز بیٹی کو میرے پاس چھوڑ کر جا میں گے تو یہ مسئلہ حل ہو گا۔ ورنہ میرے بیٹے کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔“

”تو میری حور جیسی بیٹی کو کیا کمی ہے بھئی۔ آج بھی رشتوں کی لائن لگ جائے۔ سمجھتی کیا ہے عالیہ واسطی۔“

سارا کو غصہ دلانے کے لیے شہناز رضا کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ بے حد خود پرست تھی اور ذرا سی میرب یا اس کے خلاف بات ہوتی تو وہ بھڑک جاتی تھی۔

”رضا بتا رہے تھے! نواز بھائی ان لوگوں سے خود



بات کریں گے۔

”کیا! نواز! انہیں نواز کیوں بات کریں گے ان لوگوں سے، انہیں اپنی بھوسے غرض ہوگی، اسے گھر لے جانا ہوگا تو وہ خود آئیں گے۔“ سارا نے بڑے کدفر سے اس کی بات کی تردید کی تھی۔

”تو پھر آپ بہت انجان ہیں، آپ کو نہیں معلوم آج نواز بھائی ان سے میرب کے سلسلے میں کوئی بات کرنے ان کے گھر جائیں گے۔ یا شاید جا بھی چکے ہوں۔ خیر اچھی بات ہے۔ بیٹیوں کے ماں باپ کو اتنا سخت مزاج اور اگر انہیں دکھائی چاہیے۔ بیٹے والے ہمیشہ اونچے ہوتے ہیں۔“

شہناز نے درپردہ اسے بتایا۔ اور خود کو برتر ثابت کرنے کو یہ بات کہی تھی۔ کیونکہ یہ بات سارا اعلوی کی کمزوری تھی۔

”کم ظرف لوگ ہوتے ہیں وہ جو شادی کے بعد بدل جاتے ہیں۔ شادی سے پہلے یہی بیٹے کی ماں پیاس چکر لگا کر اپنا سوال کر لیتی تھی اور بڑی منت کرنے کے بعد ہاں کی تھی میں نے بہت سے لائق فائق بیٹوں کی ماؤں کو جواب دے کر جو آج بھی شاید کسی امید، آس میں ہیں۔ خیر۔ میں نواز کا پتا کرتی ہوں۔ سوری بھابھی، خدا حافظ۔“

اس کے جواب نے یقیناً ”شہناز کو سر تپا چھلکا دیا ہوگا۔ اسی کے اوپر حکم کھلا اس نے طنز کیا تھا، مگر ان کا جواب اب لمبی چوڑی بحث کو جنم دیتا۔ سوانہوں نے فوراً ”سوری کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔“

”اب جلتی بھنتی رہے گی۔ جلے کم بخت اکثری ہے کہ بیٹے کی ماں ہے۔ ہونہ۔“ سارا نے طنز سے سر جھٹکا اور اپنے سیل پر نواز کا نمبر ملائے لگی، مگر فون بند تھا۔

”کیا مصیبت ہے؟ یہ نواز کا فون آج آف کیوں مل رہا ہے۔ اس نے دو تین بار زانی کی، پھر آفس سے پوچھا۔“

”میم صاحب تو مجھ سے بھر پور افس سے چلے گئے ہیں۔“ آپریٹر کی اطلاع پر وہ ہنسی۔ ”تو کیا شہناز کی

اطلاع ٹھیک تھی۔“

اس نے بے چینی سے ٹھٹھا شروع کر دیا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ نواز اکرم واقعی میرب کے سسرال والوں سے رابطہ کرتے گیا ہے۔ ”مجھ سے پوچھو بغیر وہ کیسے ہمارا کورہ کر رہا ہے؟“ وہ بار اس کا دل چاہا کہ وہ عالیہ بھی بند کیا ہوتا تھا۔ ایک دو بار اس کا دل چاہا کہ وہ عالیہ واسطی کے گھر فون کر کے پوچھ لے، مگر پھر اسے مناسب نہیں لگا کہ عالیہ سے پوچھے۔

پہلے ہی سارا کے بارے میں سارے حلقہ احباب میں مشہور تھا کہ اس کا نواز اکرم پر بہت رعب ہے۔ اور نواز کو اگر وہ سانس بند کرنے کا حکم بھی دے تو وہ سانس بند کر لے گا۔

”نواز کو آجائے دو ایسا مزا چکھاؤں گی کہ یاد رکھے گا عمر بھر۔ یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے بتایا نہیں۔ میرب سے پوچھا نہیں اور چل دیا اس کے سسرال۔ برا کیا طرم خان۔ اب نہ جانے کیا کیا کہ سن آئے گا۔“

سارا مارے غصے کے ادھر سے ادھر ٹھٹھاتے ہوئے بے حد پریشان اور فکر مند تھی۔ میرب کا معاملہ ہو اور اس کا مشورہ اور تائید شامل نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ماہین کے کسی بھی معاملے کو ہینڈل کرنے کا پورا اختیار اس نے نواز کو دے رکھا تھا۔ مگر میرب کے کسی ایک بھی معاملے میں دخل اندازی کا نواز کوئی اختیار نہیں تھا۔

”ماما۔ خیریت! آپ پریشان لگ رہی ہیں۔ بیٹھیں نا۔“ میرب نے ماں کو لاؤنج میں ادھر سے ادھر ٹھٹھاتے دیکھا تو قریب آکر جبر سے پوچھا۔

”پریشان ہوں میرب! بہت پریشان ہوں میں۔ تمہارا باپ کیا ہوا ہے تمہارے سسرال والوں سے بات کرتے، تمہارے سلسلے میں۔“ سارا نے چبا چبا کر کہا۔

”واٹ! بابا گئے ہیں۔ مگر کیوں؟ اور اکیلے ہی چلے گئے ہیں۔ کم از کم مجھے تو بتاتے۔ میں انہیں وہ سب باتیں تو بتا دیتی جو وہ وہاں میرے حق میں بول سکتے تھے۔“ میرب نے پاؤں پیچھے ہٹتے ہوئے غصے سے جھٹکا

کہا۔

”ارے! میں یہ ہی تو سوچ سوچ کر بلکان ہو رہی ہوں کہ نواز کو اصل معاملے کا علم نہیں ہے اور چل دیا معاملہ حل کرنے۔“

”معاملہ! ماما وہ سب انہیں میرے بارے میں نہ ہانے کیا کیا بتائیں گے۔ عالیہ آئی تو میری ساری باتیں پر اعتراض ہوتا ہے۔ ہر وقت مجھے روٹی ٹوٹی ہیں۔ اب وہ تمام باتیں بابا کو پتا چلیں گی تو سوچیں بابا کو تو ہم نے بتایا ہے، وہ تو اب ان کی باتوں پر ہی یقین کریں گے نا۔“

”ایسے ہی یقین کرے گا۔“ میرب کی پریشانی پر سارا نے غصے سے بھڑک کر کہا۔ ”نواز اکرم کو جو میں بتاؤں گی وہ اسی پر یقین کرے گا۔ باقی دنیا والے جو مرضی آئے بتائیں، سکھائیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ ”ماما! آپ سمجھ نہیں رہی ہیں۔ بابا کو وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔“ ”میرب نے پریشان ہو کر پاؤں پیچھے ہٹے ہیں۔ اس لمحے میں کہا تھا۔ اسے محسوس کر کے سارا اٹھ کھڑی۔ بغیر میرب کو دیکھا۔

”میرب! تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ سچ بتاؤ کیا معاملہ ہے؟“

”ماما۔ وہ۔ میں نے جھوٹ بولا تھا کہ مجھے عالیہ اپنی نے گھر سے نکالا ہے۔ میں خود ان کی باتوں سے ہٹ ہو کر لو کر گھر سے آگئی تھی۔“ ”میرب نے ہانپاتے ہوئے اصل بات بتائی تو سارا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔

”تم نے مجھ سے جھوٹ بولا، مجھ سے بھی؟“

”ماما۔ عالیہ آئی کا سلوک بہت برا تھا میرے ساتھ۔ میں کیا کرتی، میرا ایک منٹ بھی اس گھر میں رہنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسی لیے میں وہاں سے اٹھ گئی تھی اور اگر میں رہنا نہ بتاتی تو آپ مجھے واپس بھجوا دیتے۔“ اس نے منہ بسورتے ہوئے بچوں جیسے انداز میں ٹھٹھک کر کہا تو سارا نے بے ساختہ اپنا سر تھام لیا۔

”اف میرب۔ تم مجھے بہت تنگ کرتی ہو۔ اب تمہارے اسی جھوٹ کی وجہ سے میں خود کو کتنا کمزور

سمجھ رہی ہوں۔ ویک پوائنٹ پر لا کھڑا کیا ہے تم نے مجھے۔“

”ماما پلینز۔ میری پیاری ماما۔ آپ بات کو سن بھال لیتا نا۔“ اس نے لاڈ سے ماں کے گلے میں بائیں ڈال کر کہا تو سارا نے ناراضگی سے اسے دیکھا۔

”غلط بیانی کی تم نے مجھ سے۔ میں سب کو عالیہ کے ظلم و ستم بتاتی رہی اور تم۔“ ”ماما! بابا کو تو آپ بتائیں گی نا۔“

”نواز کی مجھے فکر نہیں ہے۔ مسئلہ تمہارے سسرال والوں کا ہے۔ توبہ توبہ اتنا غریبا سسرال ہے تمہارا۔ ذرا اسی بات پر ان سب کی ایگو ہرٹ ہو جاتی ہے۔ اور ایک میرا سسرال تھا۔ مجال نہیں تھی کسی کی کہ مجھے سوتے سے اٹھا لیا جائے یا کوئی کچھ کہہ دے۔ میں نے تمہاری ثروت پھو پھو کا کاٹنا بھی راستے سے ہٹا دیا تھا۔ تب بھی نواز مجھے کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ اسی لیے میں جنہیں سمجھاتی تھی کہ تم اس شخص سے شادی مت کرو۔ اسے اپنے خاندان، اپنی خوب صورتی پر غرور ہے۔“

”ماما اب میں آپ جتنی جوصلے والی اور بہادر نہیں ہوں، میں عالیہ آئی کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہوں۔ اسی لیے میں الگ رہنا چاہتی ہوں۔ بڑی مین نکالتی ہیں وہ۔“ ”میرب نے منہ بنا کر کہا۔

”اب مجھے کیا کچھ کرنا پڑے گا تمہارے لیے میرب۔“ ”ماما! اب جو بھی کریں۔ یاد رکھیں مجھے اس گھر میں نہیں رہنا اگر آیان کو مجھ سے محبت ہے تو وہ مجھے الگ گھر لے کر وہاں لے جائے۔ آیان کا اپنا فلیٹ بھی ہے۔ ماما کوئی پرالیم نہیں ہوگی۔“

میرب کی بات پر وہ کم صم ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

\*\*\*

”میرب کو سمجھائیں بھائی صاحب! گھر اس طرح نہیں بنتے ہیں۔ جو وہ کر رہی ہے اور کرتی رہی ہے۔ یہ



سب ہم نے آپ کو بتایا ہے۔ یقیناً "میرب نے آپ کو اصل بات نہیں بتائی ہوگی، کیونکہ مجھے بھی جولاہر اُدھر سے باتیں معلوم ہو رہی ہیں وہ بالکل غلط اور جھوٹ ہیں۔ میرب مجھے بدنام کرنے کو کہہ رہی ہے کہ میں نے اسے گھر سے نکالا ہے۔ حالانکہ وہ خود یہاں رہنا نہیں چاہتی ہے۔ میں اسے روک رہی تھی، مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اب آپ ہی انصاف کریں بھائی صاحب یہ تو کھربانے والے طریقے نہیں ہیں نا۔"

عالیہ واسطی کے سوال نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔ اور شرمندہ تو وہ اور بھی بے شمار باتوں پر ہوا تھا۔ وہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں، جو نظا ہر بہت معمولی تھیں۔ مگر میرب کے طرز عمل نے اسے گھٹایا اور کم کر دیا تھا۔ انہیں سن کر نواز اکرم کو شرمندگی بھی ہوئی تھی، افسوس بھی۔ میرب کی ضد اور من مانی فطرت سے وہ آگاہ تھا، مگر میرب اس حد تک غلط بیانی کر کے گھر آئے کی اور اس طرح کی حرکتیں کرے گی۔ یہ اسے گمان تک نہ تھا، کیونکہ وہ میرب کو سارا کی زبانی جانتا تھا۔ پوچھ سارا ہی اس کی تشریحات کرنے میں پیش پیش ہوتی تھی، اسی لیے تو ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اسے کبھی اپنی بیٹی کے بارے میں یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ اس قدر عجیب اور ضدی عادت کی مالک ہے۔

"بھائی صاحب! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کی براہِ علم، آپ کا دکھ سمجھ سکتا ہوں۔ ہر حال غلطی دونوں طرف سے ہوئی ہے، ہم اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہیں۔ آپ بھی بھابھی اور میرب کو سمجھائیں، بچوں کی پرالہلو کو بڑے ہی تو حل کرتے ہیں۔ ان کا آپس میں محبت اور پیار سدا قائم رہے۔ اور گھر آباد ہیں۔" انور واسطی کی اپنی کوئی بیٹی نہیں تھی، مگر وہ ایک بیٹی کے باپ کو اس وقت اپنے سامنے ایک مجبور، بے بس شخص کی شکل میں دیکھ رہے تھے اور اس لیے انہوں نے نرمی اور محبت سے نہ صرف اسے سمجھایا تھا بلکہ حوصلہ اور دلاسا بھی دیا تھا۔

"بہت شکریہ بھائی صاحب۔ آپ کی باتوں نے مجھے بہت حوصلہ دیا ہے۔ میں ان شاء اللہ بہت جلد

اس مسئلے کو حل کر لوں گا۔"

نواز نے اچھے ہوئے بڑے وثوق سے کہا تو واسطی نے قدرے طنز مکر اہٹ کے ساتھ انور واسطی کو دیکھا تھا اور یہ لمحہ بھر کی مسکراہٹ اور ایک معنی خیز نظریں بھر میں نواز اکرم کو پانی پانی کر گئی تھی۔ امتحان نہیں تھا اس نظر سے اسے اکثر ایسی نظروں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

"بھائی صاحب، آپ بھابھی کو متالیں تو وہ میرب کو خود ہی سمجھالے گی۔" چند لمحوں کے بعد معنی خیز اشارے کو زبان مل گئی تھی۔ نواز کے پاس اس بات کا جواب نہیں تھا۔ اس نے محض گرلن ہلائی اور جلدی سے گھر سے باہر آ گیا تھا۔ پورچ میں انور واسطی نے رخصت کیا تھا۔ اور رخصت کے وقت اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے دھیمے اور معنی خیز انداز میں سمجھایا تھا۔

"نواز صاحب، زندگی میں کبھی کبھی بڑے تلخ اور سخت فیصلے بھی کرنے پڑ جاتے ہیں، مگر یہ فیصلے بہت سے لوگوں کے لیے بہت اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی اب کچھ ایسے فیصلے ضرور کرنے ہوں گے اور آپ خود کو ان فیصلوں کے لیے تیار کر لیں اور بہت کریں۔ میرب کو مال کے لاڈنے بگاڑا ہے۔ باپ کی سختی سدھارے گی۔ میری بات پر غور کیجیے گا۔"

اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے نواز کے کندھے دھرے اپنے ہاتھ کو لپکا سا دیا کر اٹھایا تھا اور نواز اکرم پل بھر کو ساکت سا ہو گیا تھا۔

"بہت کریں نواز صاحب! واپسی کے سفر میں اس کے کانوں میں ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔ یہاں ہر شخص ایک ہی بات کر رہا تھا کہ "ہمت کرو، ہمت کرو۔" شروت بھی یہ ہی کہتی تھی۔ رضا بھی، اور اب انور واسطی بھی۔

"تو کیا میں واقعی ایک بزنل اور کمزور مرد ہوں جس کے عمر بھر کے خوف نے اس کے گھر کو تاڑک ٹکڑا کر آشیانہ بنا دیا ہے۔ اور اب بیٹی کا گھر بھی میری دھم سے۔"

"میرب کو مال کے لاڈنے بگاڑا ہے۔ باپ کی سختی سدھارے گی۔"

"باپ کی سختی۔" وہ ذرا بے پروا ہوا۔ "کیا میں اس پر سختی کر سکوں گا۔" اس نے قدرے کھلا ہٹ میں یہ سوال خود سے کیا تھا، اور با آواز بلند کیا تھا۔

"نہیں۔ نہیں میں اس پر سختی نہیں کر سکوں گا۔" اس نے بے اختیار زوردار بریک لگائی۔ بروقت بریک کے سامنے والی گاڑی سے ٹکر ہونے میں محض پندرہ منٹ کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔

"تمہاری نرمی اور ڈرنے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ بزنل بن کر تم نے جو خاموشی میرے لیے اختیار کی تھی نا وہی اب کرو گے تو میرب کی بھی زندگی برباد ہو جائے گی۔ تم چاہتے تو اباجی کے سامنے میرے لیے زبان کھول سکتے تھے۔ اباجی تمہاری بات بہت سنتے تھے۔ مگر تم نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ پلیرب اب اسامت کرنا! ثروت نے بہت برسوں بعد زندگی میں پہلی بار جذباتی ہو کر اسے طعنہ دیا تھا۔ ورنہ آج تک اس نے کبھی بھی یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ اسے نواز کی خاموشی سے کوئی گلہ شکوہ بھی تھا۔

"سوری ثروت! سوری۔ میں نے بہت برا گناہ کیا تھا۔ تب مجھے بولنا چاہیے تھا تمہاری حمایت میں۔ تمہارے حق میں، مگر میں بزنل بنا رہا ہوں اور آج۔"

گھر سامنے تھا۔ مل بھر میں سارا لانج کا سیاہ اور لہری ریلو پیکل گیٹ کھلتا اور اس کی گاڑی اندر جانے والی تھی۔ تو پھر!

"تو پھر! ایک آہستہ آہستہ واہو رہا تھا، اور ساتھ میں اس کا ذہن بھی۔ وہ بے حد سنجیدگی سے سامنے کھلے گیٹ کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا، چونکہ کیدار نے حیرانی سے اسے یوں گاڑی روک کے گیٹ سے باہر کھڑے دیکھا۔ پھر ایک لمحہ لگا تھا اور اگلے ہی مل اس نے سر جھٹک کر گاڑی اشارت کی اور زن سے گاڑی اندر لے گیا۔

"کہاں سے آرہے ہو تم۔" وہ لاؤنچ میں داخل ہوا ہی تھا کہ سارے سوال کر ڈالا تھا۔ اور اس کے انداز اور لہجے کو پہچاننے والا نواز اکرم فوراً ہی سمجھ گیا تھا کہ سارا کو اس معاملے کی بھنگ پڑ گئی ہے۔ "میں انور واسطی سے ملنے گیا تھا۔" "کیوں؟" اس نے ابھرا دیکھا۔

"میرب کے سلسلے میں بات کرنے گیا۔" "میرب کے سلسلے میں بات کرنے گئے تھے، اور میرب سے پوچھتے بغیر؟" سارا کے لہجے پر اسے یکدم غصہ آ گیا تھا۔

"ہاں۔ کیونکہ میں اس کا باپ ہوں۔" نواز اکرم نے بے حد سنجیدہ لہجے میں دو ٹوک انداز میں جواب دیا تو سارا نے غصہ سے کہا۔

"کیا۔ کیا کہہ رہے ہو نواز! باپ ہو تو کیا تمہیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے کہ تم اپنی بیٹی کی مرضی کے بغیر اسے زبردستی واپس بھیج دو گے؟"

"ہاں۔ بھیج دوں گا۔ کیونکہ وہ جھوٹی ہے، اور وہ یہاں اپنی مرضی سے آئی ہے اسے عالیہ واسطی نے نہیں نکالا۔"

"سنالیا! آپ نے سن لیا نا، یہی بات میں آپ سے کہہ رہی تھی نا کہ وہ لوگ بیباک کے سامنے سچے بٹنے اور خود کو معصوم ثابت کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ کیونکہ ان کا جواب دینے والا وہ سارا کوئی اور نہیں تھا۔ آکر بیباک۔"

"میں سن چکا ہوں سارے سوال جواب۔ مجھے بھی عقل ہے۔ سچہ نہیں ہوں میں۔"

"اوہ۔ اوہ نواز اکرم۔ آج تو بڑے طرم خان بن کر آئے ہو۔ ویسے تم اکیلے مجھ سے پوچھتے بغیر گئے کیوں تھے وہاں؟ انہوں نے بلایا تھا کیا؟"

"نہیں۔ میں خود گیا تھا اور صرف اسی لیے گیا تھا کہ میرب کا اصل مسئلہ معلوم کر سکوں۔ جو باتیں مجھے تمہاری زبانیں معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے بعد اصل حقیقت جاننا بھی ضروری تھا۔" نواز سنجیدگی سے بولا۔





”تو جان لی اصل حقیقت؟“ اس نے بے حد طر سے اسے بتایا۔

”ہاں جان لی۔ بہت اچھی طرح اور میرب! تم بھی کان کھول کر سن لو۔ اب تمہاری فضول حرکات پر میں مزید خاموش نہیں رہوں گا۔ تم اپنی تیاری پکڑو۔ کل میں تمہیں خود تمہارے سرال چھوڑ کر آؤں گا۔“ نواز اکرم نے بے حد شجیدگی سے دونوں کو دیکھتے ہوئے میرب کو کہا تھا، سارا علوی تو بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی تھی۔

”نواز! تمہارا دل غٹھک ہے، تم خود اپنی بیٹی کو لے کر اس کے سرال جاؤ گے؟ کیا اپنی عقل بالکل ان کے پاس گروی رکھ آئے ہو؟“ سارا بھڑکی تھی اور سر تپا جلتے لگی تھی۔

”ابھی تو عقل آئی ہے سارا۔ اور ہاں تم بھی غلط باتوں پر اسے شہر دینا بند کرو۔ کیونکہ یہ بہت جھوٹی اور نکمی لڑکی ہے۔ اس کے سرال والوں نے اسے قبول کیا، ان کا شکر یہ۔ ورنہ تمہاری بیٹی کے اندر کوئی ایک گن بھی ایسا نہیں ہے کہ اسے ہو بنایا جائے۔“ نواز نے بغیر ڈرے، خوف زدہ ہوئے اسے صاف صاف بتا دیا تھا۔

”نواز! سارا زور سے چیختی تھی۔

”چچو مت سارا! بہت سن چکا ہوں تمہاری بھی باتیں۔ مگر اب وہی ہو گا جو میں چاہوں گا۔ پچھلے کئی برسوں سے تم نے کھر کے اتنا دل سے لے کر بیچوں کے مستقبل تک کے فیصلے خود کیے ہیں۔ اور اب کیا ہو گا، کیوں ہو گا؟ کس کے لیے ہو گا؟ یہ سب فیصلے میں کروں گا۔“ میرب غصے سے تن فن کرتی گئی تھی۔

”تم بالکل ہو گئے ہو نواز!“ نواز کے سنجیدہ اور فیصلہ کن لہجے نے سارا علوی کا رنگ اڑا دیا تھا۔ وہ بے حد حیرت زدہ اور ٹھک کر اسے دیکھ رہی تھی اور کچھ ایسا ہی حال میرب کا بھی تھا، جس نے باپ کو ہمیشہ ماں کے سامنے دبا ہوا، مسکین اور عاجز سمجھا تھا۔

”تمہیں سارا! میں نے تو تمہیں بھی نہیں کہا کہ تم بالکل ہو گئی ہو۔ حالانکہ بہت سارے تمہارے فیصلے

اور باتیں ایسی تھیں جنہیں درست نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ تمہارا بالکل بن تھا، مگر میں نے کبھی تمہیں بے عزت نہیں کیا، تمہاری بات کو نہیں جھٹایا اور تو اور تمہیں مالی اخراجات میں بھی کی نہیں ہونے دی۔ یہ بھی تم مجھے ہی پاگل کہہ رہی ہو۔ شرم کرو سارا۔“ سارا کے سر پر ہم پھٹا تھا۔

”نواز! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم ہوش میں تو ہو، یا تمہارا دل غلط چل گیا ہے۔“ سارا نے شکی نظروں سے اسے گھورا۔

”آج ہی تو ہوش میں آیا ہوں سارا۔ تمہیں میرا دل غلط صحیح نہیں لگ رہا ہے۔ جبکہ آج میرا دل غلط بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں اپنی محبت سمجھ کر تمام حقوق دے دیے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ یہ حق تم کس طرح استعمال کرو گی اور اسی لیے آج میری بیٹی کا گھر برباد ہو رہا ہے۔ تمہاری وجہ سے سارا تمہاری شہر پر یہ سب کام ہو رہا ہے۔ تم نے میرب کو برباد کر دیا ہے۔“

”میرب یہ میری بیٹی ہے اور اس کے مستقبل کا میں خود فیصلہ کروں گی۔“

”صرف تمہاری بیٹی سارا! میرب صرف تمہاری بیٹی ہے، میری کچھ نہیں لگتی؟“ نواز کے لیے سارا کا جواب ایک شاگ سے کم نہ تھا۔

”کیونکہ نواز! تم نے مائیں کے لیے جو بھی کیا، جتنا بھی کیا۔ میں نے کبھی تمہارے کام میں تمہاری باتوں میں دخل نہیں دیا۔ جبکہ میں میرب کا مسئلہ خود حل کرنا چاہتی ہوں، تو تم بیچ میں کود رہے ہو۔ حالانکہ تمہیں اصل معاملات کا کوئی علم نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں سارا! سب کچھ جانتا ہوں۔ میرب کا سارا قصور ہے۔ اسے تم نے اپنی طرح جذباتی، غرضیلی اور لڑا کا بنا دیا ہے۔ سرال والوں کی باتیں بڑے حوصلے اور ضبط سے برداشت کرنی ہوتی ہے۔ میرب تو ان کی باتوں کو غلط رنگ دے کر گھر ہی ہار آئی۔“

”غلط باتیں نہیں نواز، بالکل صحیح باتیں۔ تمہیں پتا اس کی ساس کا وہ چالاک چتر عورت ملازمہ

کرنے والی اسے گھر میں چین کہاں آتا ہے خود تو سارا دن عیش و آرام میں باہر سیر پانا کرتی پھرتی ہے اور سو کو گھر میں قید کرنا چاہتی ہے۔ اسے ہو نہیں گھر میں کام کرنے والی ملازمہ چاہیے تھی۔ تاکہ اس کی غیر موجودگی میں وہ گھر سنبھال لے اور کھانا بھی پکا ہوا مل جایا کرے۔ یہ تھی اس چالاک عورت کی پلاننگ اور جب میرب نے کھانا بنانے سے انکار کیا تو اس نے اس کے خلاف محاذ کھول لیا، مائیں کے بھی کان بھرے اور اب سارے خاندان کی تھو تھوکی وجہ سے ہو گھر واپس لانا چاہتے ہیں۔“ سارا نے حرف بہ حرف وہی کہا تھا جو اسے میرب نے بتایا تھا۔

”بالکل غلط۔ اسی لیے تو کہتا ہوں، تمہیں صرف اپنی بیٹی ہی معصوم اور سیدھی نظر آتی ہے۔ باقی دنیا والے بھی آنکھیں رکھتے ہیں۔ میں خود میرب کو لے کر اسے اس کے گھر چھوڑنے جاؤں گا۔“

”بہت شکر یہ تمہارا۔ وہ اس وقت تک نہیں جائے گی۔ جب تک عالیہ اور آیان خود نہیں آئیں گے۔ اور اگر معافی بھی مانگیں، غضب خدا کا ایک ماہ کی بیاتھا دلہن کو کھر سے نکالتے شرم نہیں آئی انہیں۔“

”سارا! بات کو بڑھانے کی نہیں، منانے کی ضرورت ہے۔ اور میں ان لوگوں سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ میرب کو خود لے کر آؤں گا۔“

”کیوں۔ کیوں وعدہ کیا تم نے ان سے؟ مجھ سے اور میرب سے پوچھو بغیر جس کی زندگی کا یہ سوال ہے، کم از کم اس سے تو پوچھ لیتے۔“ سارا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ نواز اکرم کو کھڑے کھڑے فنا کر دیتی۔ نواز اکرم نے بے حد شجیدگی سے بغور اسے دیکھا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ تم سوچ لو۔ اگر تم نے میرب کو اپنے ساتھ رکھنا ہے تو پھر میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔“ نواز شجیدگی سے اپنا فیصلہ سنا کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا، سارا کے لیے آج یوم قیامت تھا۔ پے در پے شاگ لگ رہے تھے۔ اور وہ بھی نواز کی طرف سے۔

”ہو نہ! آیا بڑا دھکی دینے والا۔ دودن میں سیدھا کروں گی۔ ستیاناس جائے ان لوگوں کا۔ نہ جانے اسے کیا کیا پٹیاں پڑھائی ہیں کہ دماغ ہی الٹ گیا ہے اس کا۔ میرے سامنے بولنے کی جرات نہیں تھی اور اب۔! آخر کروں گی اس کا بندوبست اور اچھی طرح کروں گی۔“

سارا زخمی ناگین کی طرح تل کھاتی، آئندہ کالا کچھ عمل سوچتی رہی تھی، مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اب کی بار نواز اکرم محض عارضی نہیں بدلا۔ نہ ہی کسی کی باتوں نے اسے بدلا ہے۔ اس کے اندر تبدیلی بہت دیر بعد آئی تھی۔ مگر وہ سر تپا نواز کو بدل گئی تھی۔ اور اب ایک بالکل مختلف اور بدلے ہوئے نواز اکرم کے ساتھ اس کا واسطہ پڑنے والا تھا۔



”میرب! میں نے تم سے کل کچھ کہا تھا۔ تم نے اپنی پیکنگ مکمل کر لی ہے؟“ صبح ناشتے کے بعد آفس جانے سے پہلے وہ ناشتا کرتی میرب کے پاس آکر پوچھنے لگا تو مکھن لگاؤں میں روٹی کا قلمہ بے ساختہ اس کے حلق میں اٹکا تھا۔

”ہاں! میں نے آپ کو کل ہی بتا دیا تھا کہ۔“ ”تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا، میں نے تمہیں تیاری کا کہا تھا۔ اس کا بتاؤ۔ کر لی ہے تو اٹھو میں تمہیں آفس جاتے ہوئے تمہارے گھر چھوڑ دوں گا۔“ نواز نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی تھی۔

”ہاں! آپ سمجھ کیوں نہیں رہے ہیں۔ خواہ مخواہ کی ضد کر رہے ہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ جب تک وہ لوگ خصوصاً آیان مجھے لینے نہیں آجائے گا۔“

”مگر تمہیں آیان کا اتنا ہی انتظار ہے تو تمہیں اپنی واپسی کا راستہ کھلا رکھنا چاہیے تھا۔ جبکہ تم نے تو واپسی کے سارے راستے ہی مسدود کر دیے تھے۔ کس بل بوتے پر کس آس پر تم آیان کی منتظر ہو رہے نہیں آئے گا۔“ نواز نے لہجے کو کنٹرول کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔



”نہیں آئے گا تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔ بابا! وہ اگر اپنی ضد کا پکا ہے تو میں بھی ضدی ہوں۔“  
 ”میرب! اپنا گھر پیاد کر لو کی تمہیں احساس نہیں ہے کہ تمہاری یہ روز روز کی لڑائیاں اور جھگڑے بہت خطرناک ثابت ہوں گے۔ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ تم ضد چھوڑ دو۔ اور میرے ساتھ اپنے سرسرا چلو۔“

”کیا ہو گیا ہے نواز تمہیں۔ کیوں جائے یہ اپنے سرسرا بیٹی کو دھکے دے کر نکالنا چاہتے ہو تم۔“  
 ”سارا! تم سمجھ نہیں رہی ہو، حالات اب پہلے سے نہیں ہیں۔ وہ لوگ بہت ناراض ہیں۔ اور پہلے کی طرح اسے منانے بھی نہیں آئیں گے۔“ نواز نے بے بسی سے سارا کو دیکھا۔

”تومت آئیں۔ اگر انہیں اپنی آڑ دکھانی ہے تو تم کیا فقیر ہیں؟ ان سے کم تر ہیں جو ان کی بات سنیں اور مان میں میرب صرف آیان اور عالیہ واسطی کے ساتھ جائے گی۔“ سارا اپنے اڑی ہٹ دھرم انداز اور فیصلہ شکن لہجے میں بولی جو آج نواز کو کوڑے کی طرح محسوس ہوا تھا۔

”تو تم میری بات نہیں مانو گی؟“ اس نے بے انتہا پیچیدہ ہو کر پوچھا تھا۔

”تمہاری فضول بات مان کر میں اپنی بیٹی کی بے عزتی کروا دوں۔ تمہیں کیا پتا جو باپ یوں ہاتھ پکڑ کر اپنی بیٹیوں کو ان کے سرسرا میں چھوڑ کر آتے ہیں نا۔ ان بیٹیوں کی عزت ہوتی ہے نہ ہی ان باپوں کی۔“  
 ”غلط بیٹی کا گھر سنانا ہے مجھے۔ اپنی عزت سے بڑھ کر مجھے بیٹی کی فکر ہے۔“

”مگر تمہارا انداز اور طریقہ غلط ہے۔ مجھے لگتا ہے تم اسے سرے اتار رہے ہو۔“  
 ”کتنی گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔ میں ایسا کیوں کروں گا؟ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اسے کوئی ایسا دکھ نہ ملے جو ہمارے لیے جگہ بنائی بن جائے۔“

”یہ نہیں ہوگا نواز! تم فکر مت کرو۔ تم دیکھنا میں کیا اس معاملے کو پینڈل کرتی ہوں۔“ سارا نے

گردن اٹھا کر کہا تو نواز اسے دیکھتا رہ گیا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم معاملہ ہینڈل کر سکتی ہو تو کرو۔ مگر یاد رکھنا۔ اس کام میں زیادہ دیر نہیں چلاہیے۔ ورنہ یہ معاملہ خراب بھی ہو سکتا ہے۔ نواز نے دوبارہ اسے سمجھایا۔

”جانتی ہوں میں۔ تم جاؤ آفس بزنس دیکھو یہ گھر پلو معاملات تو میں خود دیکھ سکتی ہوں۔“ سارا نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے اسے گویا بھی سمجھا دیا تھا کہ اب وہ اپنے کام سے کام رکھے۔ مزید اسے میرب کے معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے چلا گیا تھا۔

”دیکھا تم نے پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔ اس نے تو رنگ ہی بدل لیا ہے۔ یہ تو مجھے نواز اکرم ہی نہیں لگتا۔ رات بھر یہی سوچ سوچ کر میں پریشان ہوئی رہی ہوں کہ یہ کیا ہو گیا ہے نواز کو۔ ایسا کیا جاؤ کر دیا ہے تمہاری سرسرا نے کہ اب اسے غیرت اور عزت سب ہی یکدم مباد آگئے ہیں۔“

سارا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جا کر عالیہ واسطی کو گولی مار دیتی نہ جانے اس نے کیا تحراس کے کانوں میں اندھا تھا کہ وہ سر تباہ بدل گیا تھا برسوں اسے دبا کر اپنے ناز خروے اٹھوا کر اپنے غلام کی حیثیت سے دیکھتے ہوئے سارا علوی نواز اکرم کے اس نئے انداز کو قطعاً قبول نہیں کیا رہی تھی۔

”ماما! آپ بابا کو بتاویں۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گی ایسے۔ جب تک آیان نہیں لینے آجاتا۔“ میرب نے ماں کی شہ پر مزید اڑتے ہوئے کہا تھا۔  
 ”ارے فکر مت کرو۔ کون بھیج سکتا ہے تمہیں۔ میں زندہ ہوں ابھی۔ تم دیکھنا تو نواز کی ساری فول فال چٹکیوں میں نکال دوں گی ہاں۔“

سارا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بھرپور تسلی دی تھی۔ اور میرب نے بھی ماں کی تسلی پر بڑے مزے سے ناشتا دوبارہ کرنا شروع کر دیا۔

\*\*\*

اگلے روز ماہین بھی آگئی تھی بد قسمتی سے اس نے

میرب سے اس کا آئندہ کارپروگرام پوچھ لیا تھا۔ بس پھر کیا تھا میرب تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔ سارا غصہ اور نواز اکرم کا اشتعال بھی ماہین پر اتار دیا۔  
 ”تمہیں اور بابا کو تکلیف کیا ہے؟ کیوں تم لوگ میرے پیچھے بگڑے ہو میرا جب جی چاہے گا میں جاؤں گی۔ اگر دل نہیں چاہے گا نہیں جاؤں گی۔ سنا تم نے۔“

”تو چیخ چیخ کر یہ بات بتانے کی کیا ضرورت ہے بھئی۔ آرام سے بتاؤ۔ تم تو لگتا ہے، بھری بیٹھی ہو۔“ ماہین بھی اب اس کے رعب میں نہیں آئی تھی۔ صاف صاف سنا دیا۔

”تم کیوں پوچھ رہی تھیں؟ تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ تمہارا میاں بہت اچھا ہے۔ تمہیں خوش رکھتا ہے، تو جا کر شہر میں اس بات کا اعلان کرو۔ یہاں کیوں آجاتی ہو؟ شومارنے کے لیے۔ ہونہو۔“ میرب نے اسے مزید دوچار سنا سنیں اور اٹھ کر چلی گئی۔ ماہین کے ماتھے پر ہل آگئے تھے۔

”تم سے کیا ہوا ہے۔ کر لے کھا کر بیٹھی ہے۔ یقیناً بابا سے جھڑپ ہوئی ہوگی۔“ ماہین نے قیاس کیا اور اس کے قیاس کی تصدیق بھی نواز اکرم نے کر دی تھی۔  
 ”ہاں۔ میں نے میرب سے کہہ دیا ہے کہ تم اپنے سرسرا جانے کی تیاری کرو۔ میں مزید اسے یہاں نہیں رہنے دوں گا۔“

”مگر بابا! وہ ایسے نہیں جائے گی۔“  
 ”میں اسے خود لے کر جاؤں گا۔“  
 ”آپ کے ساتھ تو وہ کبھی بھی نہیں جائے گی۔ ماما کے ساتھ جاسکتی ہے۔“

”سارا اسے بھی میں نے کہہ دیا ہے کہ اسے سرسرا بھیج دو۔ بے چارے بامروت اور لحاظ والے لوگ ہیں۔ اسی لیے تو میری بات مان لی۔ مگر یہ سارا اور میرب دونوں بہت ضدی ہیں۔ کم عقل اپنا گھر اجاز کر چھپتائے گی روئے گی، تمام عمر۔“ نواز اب بھی بہت فکر مند اور پریشان تھا۔

\*\*\*

”متم کب آئیں؟“ موبائل آف کر کے سارا ابرو اچکا کر ماہین کو دیکھا۔  
 ”کتنی دیر ہو گئی ہے ماما۔ آپ گھر پہ نہیں تھیں۔ میرب بھی نہ جانے کہاں گئی ہے۔“  
 ”تمہارا باپ تو تمہیں مل گیا ہے نا۔ اسی کے لیے تو آتی ہو تم۔“  
 ”ماما! اس نے سارا کے طنز اور سر دہلچے پر دھک سے اسے ٹوکا۔

”میں آپ سے اور میرب سے بھی ملنے آتی ہوں۔ آپ اور میرب میرے لیے غیروں کیا؟ آپ دونوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے؟ صرف بابا ہی سے میرا رشتہ ہے؟“

”بی بی! یہ سب جو سر جوڑ کر باپ سے باتیں کرتی ہو۔ ہم سے تو کبھی تم نے اپنا کوئی مسئلہ شیئر نہیں کیا۔ اس لیے کہہ رہی ہوں ورنہ جانتی ہوں کہ تم میری بیٹی ہو۔“ سارا نے اسے جتایا۔

”سارا! یہ فضول بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اولاد کے درمیان تفریق پیدا کر کے تم نے ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے سارے گھر کو۔“ نواز اکرم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو ماہین حیران سی ہو گئی نواز اکرم نے آج تک کبھی سارا کو اس کی ان باتوں پر نہیں ٹوکا تھا۔

”کیا؟ ہمیں نے ٹکڑوں میں بانٹا ہے گھر کو؟ تم نے ہی یہ تقسیم شروع کی تھی۔ اسے گلے سے لگا کر اور میرب کو دور کر کے۔“

”کیونکہ تم نے اسے دور کر دیا تھا خود سے اور میرب کو مجھ سے۔“ نواز اکرم آج ہمیشہ کی طرح خوش نہیں رہا تھا بلکہ دودھ و جواب دے رہا تھا۔ ماہین نے پریشانی سے دونوں کو دیکھا۔

”ماما! بابا پلیز۔ پلیز ہمارے لیے آپ دونوں نہ لڑیں۔“

”میری تو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ اچانک تمہیں میرب کی محبت کا دورہ کیسے پڑ گیا ہے۔ بچپن سے کبھی تم نے اس کی کسی بات میں دخل نہیں دیا۔ وہ کیا پڑھتی



ہے کیا کھاتی ہے کہاں جاتی ہے کبھی خیال نہیں کیا۔ اور اب اچانک ہی باپ کی شفقت اٹھ پڑی ہے۔

”شٹ اپ سارا! اگر اب تک خیال نہیں آیا تھا تو اس کی وجہ بھی تم ہی تھیں۔ تم نے عمر بھر میرے اور میرے درمیان دیوار کھڑی رکھی۔ اپنی باتوں اور گھٹیا خیالات کے ذریعے اس کا ذہن اتنا خراب کر دیا کہ وہ مجھے باپ بھی نہیں سمجھتی ہے۔“

”ماما۔“ اسی بل میرے اندر آئی تھی۔ اس کے کانوں میں باپ کے الفاظ پڑ گئے تھے اور اب ماں کے جواب سے بھی وہ واقف تھی۔ وہ تیزی سے آگے آئی تھی۔

”ماما پلینز! مت جھگڑا کریں آپ دونوں اور بابا! آپ کو میری زندگی کے فیصلے کا اختیار کس نے دیا ہے؟ میں خود اپنی زندگی کا فیصلہ کروں گی۔“

”ہٹنا۔“ یکدم فضا میں زوردار آواز گونجی تھی اور جیسے پوری کائنات پر سناٹا چھا گیا تھا۔ میرے منہ پر ہاتھ رکھے ساکت باپ کو گھور رہی تھی۔

”بس۔ آئندہ ایک لفظ بھی میرے سامنے مت بولنا۔ بہت سن چکا ہوں تمہاری بکواس اور ہاں تم تیار ہو۔“ وہ ابھی یہاں تک ہی کہہ پایا تھا کہ سارا علوی چیل کی طرح اس پر چھٹی تھی۔

”تم نے میری بیٹی کو مارا۔ تمہاری یہ جرأت! تم نے اسے پھینکا۔“ وہ نواز کا گریبان پکڑے اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر چلا رہی تھی۔ اس کے اس قدر شدید رد عمل کا نواز کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر کو توبے حس ساکت کھڑا اس کے جنون کو ستارہا۔ پھر یکدم ایک جھٹکے سے اپنا گریبان اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اس کی قمیص کے دو بٹن ٹوٹ گئے تھے۔

”ہاں مارا ہے باپ ہوں اس کا۔“

”میں ہوں تم اس کے باپ۔ ایسا بے رحم اور سنگ دل باپ جو اپنی بیٹی کو مارے۔ اسے باپ کہلانے کا حق نہیں ہے۔“ سارا اس کی بات کاٹ کر چیخی تھی اور اس بل وہ اتنی جنونی ہو رہی تھی کہ لگتا تھا نواز اکرم

سمیت پورے گھر کو تنہا تنہا کر دے گی۔ میرے ایک دم روتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئی تھی اور باہر گم سمی دونوں کو لڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”سارا! اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی اور میرے کو اس کی حرکت پر ناجائز شہہ دی تو یاد رکھنا۔ میں کبھی کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اور اس عمر میں طلاق لے کر کہاں جاؤ گی۔ یہ بھی سوچ لینا۔“

نواز اکرم کے سنگھار لہجے میں اتنی سختی اور سرد مہری تھی کہ سارا کو سکتہ ہو گیا تھا۔ باہر بھی حیرت سے گم سم باپ کو جانتے دیکھ رہی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے گم ہوتے حواس کے ساتھ ذہن پر زور دیا۔

”یا اللہ خیر۔“ ناخنیں مزید اس کا بوجھ سارنے سے انکاری تھیں۔ وہ دنگ لگائی۔ سارا علوی پتھر ہو چکی تھی۔ اسے لگا وہ کسی بھی لمحے گر جائے گی۔

”ماما! آپ بیٹھ جائیں۔“ اس نے زبردستی اسے بلایا۔ مگر وہ تو صرف برف بن گئی تھی سرد اور بے جان۔

”ماما۔“ اس نے زبردستی اسے صوفے پر بٹھایا۔

”یہ نواز کیا کہہ رہا تھا۔ سناتم نے۔“ اس کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

”ماما پلینز ہوش کریں۔ بابا غصے میں تھے۔ کچھ نہیں ہو گا۔ بس بولیں۔“

باہر نے اسے سہلانا چاہا تھا مگر سارا بچی نہیں تھی نواز اکرم کے انداز اور لہجے نے سارا کو احساس دلایا تھا کہ اب وہ محض دھمکی نہیں دے رہا۔ نہ ہی ڈراوا۔ اب وہ جو کہہ رہا ہے۔ اس پر عمل بھی کرے گا اور یہی وہ شاک تھا جو اس کے لیے بے حد خوفناک ثابت ہو رہا تھا۔

”سناتم نے، نواز نے مجھے کیا کہا ہے۔ مجھے مجھے دھمکی دے کر گیا ہے۔ وہ۔ سارا کو۔ سارا علوی کو۔ اس کی یہ جرأت۔ میں اسے قتل کر دوں گی۔“ یکدم وہ اچھل کر کھڑی ہوئی تھی، اور اب وہ سرپا غضب تھی غصے توہین اور ذلت سے اس کا سرخ و سفید چہرہ تانے کی طرح جل رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ایسی کھولن تھی

کہ باہر نے کادل کاٹ گیا تھا۔

”ماما پلینز۔ خود کو سنبھالیں۔ پلینز ہوش سے کام لیں اس عمر میں خود کو اور ہمیں تماشہ نہ بنائیں۔“

”دفع ہو جاؤ تم بھی یہاں سے اور جا کر بتا دو اپنے باپ کو کہ وہ مجھے کیا طلاق دے گا۔ میں خود اس سے طلاق لوں گی۔ لعنت بھیجتی ہوں میں اس جیسے شخص پر، اس کے ساتھ زندگی کے اتنے برس گزار دیے اور کیا صلہ ملا طلاق کی دھمکی؟ اس جیسے شخص کے ساتھ مجھ جیسی عورت نے گزارا کیا۔ اپنا دل مار کر اپنا پیار بھلا کر اور بتا دینا اپنے باپ کو سارا چل گئی ہے اسے پھوڑ کر۔“ وہ غصے سے کہہ کر باہر کی جانب نفی تو ماہرین تیزی سے اس کے پیچھے گئی تھی۔

”ماما پلینز۔“ ماما رک جائیں۔ ماما! غلطی نہ کریں۔ خدا کے لیے ماما! یہ غلطی نہ کریں۔ ماما! نہ جائیں۔“ وہاں کے سامنے ہاتھ جوڑے روتے ہوئے

انتہا کر رہی تھی۔ مگر سارا پر تو جیسے ایک جنونی غضب ناک کیفیت طاری تھی۔ اس نے باہر کو دھک دیا تھا اور باہر نے لڑکھڑا کر دور جا کر رکھی تھی۔ سارا تیزی سے اخروٹ کی بھاری لکڑی سے بے گیٹ کی جانب لپکی تھی اور اس سے قبل کہ باہر نے تعلق اسے باہر سے گاڑی کے اشارت ہونے کی آواز آئی۔

”میرے میرے۔“ اس نے زور زور سے میرے کو پکارا، مگر وہ دروازہ بند کیے اندر شاید رو رہی تھی۔ اس لیے اس کی پکار اس تک نہیں پہنچی تھی۔

”بابی۔۔۔ باہر نے باہر کیوں بلایا رہی ہیں؟ ارے آپ گر گئی ہیں۔ زیادہ جوت تو نہیں لگی۔“ خالد بے حد پریشانی سے اسے دیکھتا ہوا اس کی جانب بڑھا تھا۔ وہ اپنی کہنی سہلاتی اٹھی تھی۔

”خالد! ماما باہر گئی ہیں۔ جلدی سے جا کر دیکھو وہ چلی تو نہیں گئی ہیں۔“

”بابی! آپ کو۔۔۔“

”مجھے چھوڑو۔ جاؤ دیکھو۔“ وہ بے ساختہ چیخی۔ خالد فوراً بیرونی دروازے کی جانب بھاگتا تھا۔ جبکہ وہ اپنا بازو تھامے، تکلیف برداشت کرنے کی کوشش کر

رہی تھی۔

”بابی! باہر تو بیگم صاحبہ نہیں ہیں۔“ خالد نے مایوسی سے آکر جواب دیا۔

”اوہ خدا۔“ وہ پریشانی سے فون کی جانب لپکی۔

”خالد! میرے بابی کو فوراً بلاؤ۔ جلدی کرو۔ جاؤ۔“ اس نے فون اپنی جانب کھسکایا اور بابا کا نمبر مار کر

یہ چیخی سے انتظار کرنے لگی۔

”آپ کا ماما ہوا نمبر الیال بند ہے۔ برائے مہربانی کچھ دیر بعد فون کریں۔“

”اوہ شٹ۔ اب کیا کروں!“ اس نے فوراً احمد کا نمبر ملایا۔

”بابی! میرے بابی تو دروازہ نہیں کھول رہی ہیں۔“ خالد کچھ ہی دیر بعد واپس آ گیا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر اسے دیکھا۔ دوسری جانب احمد پیلو پیلو کہہ رہے تھے۔

”احمد آپ کہاں ہیں؟“

”گھر ہے ہوں۔“ خیریت!“ اس کے لہجے کی پریشانی اس نے فوراً بھانپ لی تھی۔

”خیریت نہیں ہے احمد! وہ ماما بڑے غصے میں گاڑی لے کر گھر سے نکلی ہیں۔ مجھے بہت پریشانی ہو رہی ہے۔ انہیں اچھی ڈرائیونگ نہیں آتی ہے اور۔“

”مگر وہ غصے میں کیوں گئی ہیں؟“ احمد کا سوال بالکل جائز تھا۔ اس کی اطلاع کے جواب میں اس نے یہی پوچھا تھا۔ باہر نے بل بھر کو دنگ لگائی تھی۔

”وہ وہ بابا کے ساتھ ان کا کچھ جھگڑا ہوا تھا۔“ وہ احمد سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی، اسی لیے صاف صاف بات اسے بتادی۔

”اوہ۔۔۔ پھر!“ وہ صورت حال سمجھ گیا تھا۔

”پھر۔۔۔ احمد پلینز! آپ گاڑی نکالیں اور فوراً ماما کو چیک کریں۔ بابا کا نمبر بھی نہیں مل رہا۔ میں کیا کروں۔“ وہ رو دینے لگی۔

”اوکے اوکے ڈونٹ وری میں ابھی نکل رہا ہوں۔ تم فکر مت کرو۔ میں جا رہا ہوں۔ دعا کرو۔ اللہ انہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔“

اس کا تو رواں رواں ماما کی حفاظت کے لیے دعا گو



تھا۔ کیونکہ ماما کی ڈرائیو تک بہت اچھی نہیں تھی۔ وہ رش میں گھبرا جاتی تھیں اور بابا نے ان کے لیے ڈرائیو رکھا ہوا تھا۔

”میرب“ میرب دروازہ کھولو۔ میرب! ماما چلی گئی ہیں گھر چھوڑ کر۔ اس نے گلوگیر لیمے میں اپنی بہن کو ریکارڈ کیا تھا اور شاید اس کی کپکپاتی آواز میں چھپا خوف ہی تھا کہ میرب نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔

ماہین نے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں بھی سرخ اور متورم تھیں۔ اس کی پلکیں ابھی تک نم تھیں۔ چہرے پر بے انتہا خفگی اور غصہ تھا۔ ماہین کے دل کو کچھ ہوا۔ اپنی چھوٹی بیاری بہن اسے بہت لاڈلی تھی۔ آج تک کبھی کسی نے اسے نہیں مارا تھا۔ سب ہی اس کی بات مانتے تھے اور اسی لیے وہ بہت ضدی خود سر تھی، مگر آج بابا نے اسے مارا تھا۔ ماہین کی نگاہ بے اختیار اس کے دائیں کال پر ابھرے نشانوں پر جا پھری تھی۔

”کیا کہہ رہی تھیں تم ماما چلی گئی ہیں۔ کہاں گئی ہیں ماما؟“ اس نے ماہین کو کم صدمہ دیکھ کر فکر مندی سے سوال کیا تھا۔

”ہاں۔ میرب ماما گاڑی لے کر گئی ہیں اور بہت غصے میں۔“

”کیا؟ گاڑی لے کر کہاں۔ کہاں گئی ہیں؟“ میرب کا رنگ یکدم فق ہوا تھا۔ ماما کی ڈرائیو تک کے بارے میں اسے بھی معلوم تھا۔

”ماما خود گاڑی لے کر گئی ہیں؟“ وہ پل بھر میں سب کچھ بھول گئی تھی۔

”ہاں“ مجھے نہیں پتا وہ کہاں گئی ہوں گی۔ مگر وہ بہت غصے میں گاڑی لے کر نکلی ہیں میں نے بابا کو فون کیا تو ان کا سیل بھی بند ہے۔ احمد کو بتایا ہے۔ وہ گاڑی لے کر نکلے ہیں۔“ ماہین نے اسے تفصیل بتائی۔

”اوہ ماما! ماما کو اکیلے گاڑی لے کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ تو کہہ دو خدا اگر ماما کو کچھ ہو گیا تو میں بابا کو بھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ غصے سے بولتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی تھی۔ ماہین اس کے پیچھے لپکی۔

”تم دوبارہ بابا کو فون کرو۔ ہو سکتا ہے وہ ماما کو مل گئے ہوں۔“ کچھ دیر اضطراب اور بے چینی سے لاؤنج میں چکر لانے کے بعد میرب نے اس سے کہا تو وہ سر ہلا کر فون کی جانب بڑھ گئی۔ مگر بابا کا نمبر منور نہ تھا۔ اس نے احمد کا نمبر ملایا۔ وہ گھر ہی کی طرف آرہے تھے۔

”میں آرہا ہوں۔ مجھے وہ کہیں نظر نہیں آئی ہیں۔ تم میرے ساتھ چلنا۔ ان کی فرینڈز کی طرف چلتے ہیں۔“ احمد کے ساتھ بات کر کے اسے مزید پریشانی نے آگھر اٹھا۔ میرب سوالیہ نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”احمد گھر آرہا ہے۔ میں اس کے ساتھ جاتی ہوں، ماما کی فرینڈز کی طرف۔“ وہ ماموں کی طرف گئی ہوں گی ماما۔ ان کی طرف جاؤ۔“

”اوہ ہاں۔ وہ تانی کی طرف ہی گئی ہوں گی۔ میں ادھر ہی جاتی ہوں۔ تم اپنا خیال رکھنا اور اگر بابا کا فون آئے تو انہیں بتا دینا۔ اوکے۔“ وہ جلدی جلدی اسے سمجھا کر باہر بھاگی کیونکہ احمد باہر مارن دیے جا رہے تھے۔ اس نے بیٹھتی ہی بتایا۔

”احمد! تانی کی طرف چلیں۔ ماما اپنے بھائی کی طرف گئی ہوں گی۔“ احمد نے سر ہلا کر گاڑی اشارت کی۔ وہ راستے بتاتے ہوئے تانی کے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر مڑنے ہی والے تھے، جب ماہین کے سیل پر بابا کا نمبر آیا تھا۔

”بابا۔۔۔ بابا کہاں ہیں آپ؟“ اس نے فوراً بے تابی سے پوچھا۔

”میں ہاسپٹل میں ہوں بیٹا۔“ نواز اکرم کی تڑھال تڑھال آواز آئی تھی۔

”کیا! ہاسپٹل میں۔۔۔ مگر کیوں بابا! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ اس نے بے اختیار دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹا، تمہاری ماما کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ہم ہمز میں ہیں۔ تم یہاں آ جاؤ۔“ انہوں نے اطلاع دیتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ ماہین نے کپکپاتے ہاتھوں سے سیل آف کیا۔

”احمد! ماما۔۔۔ اس کے گلے میں پھنسا لگا تھا۔ احمد پل بھر میں اس کے چہرے کو دیکھ کر ساری بات سمجھ گیا تھا۔

”کس ہسپتال میں ہیں وہ؟“ اس نے گاڑی موڑی۔ ”ہمز۔“ آنسو اس کے گالوں پر بہہ نکلے تھے۔ جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا تھا۔ احمد نے اس کا ہاتھ تھام کر دیا۔

”خوصلہ کرو ماہین! پلیز دعا کرو، رونے سے کیا ہو گا۔ اس نے اسے سمجھایا۔

”میں میرب کو بتا دوں۔“ اس کو یکدم خیال آیا تھا۔

”نہیں ابھی نہ بتاؤ۔ پہلے ہم جا کر پوچھیں دیکھتے ہیں۔ پھر!“ اس نے سر ہلایا۔ گاڑی بڑی تیزی سے ہمز کی جانب رواں دواں تھی اور ماہین کا دل شدت سے روتے ہوئے ماما کی زندگی کے لیے دعا گو تھا۔



”گاڑی تیز رفتاری کے سبب بے قابو ہو کر ٹرک سے ٹکرائی تھی۔ وہ تو ٹکڑا تھا کہ جان بچ گئی تھی۔ ورنہ اتنے شدید حادثے کے بعد اور گاڑی کی توڑ پھوڑ کو دیکھ کر مشکل سے ہی کہا جاسکتا ہے کہ ڈرائیو کرنے والا بچا ہو گا۔“ رضا انکل نہ جانے کے بتا رہے تھے۔ اس کی ساکت نظریں سامنے بیڈ پر سفید بیڈوں میں جکڑی ماما پر تھیں جن کی دونوں ٹانگیں بری طرح چلی جانے کی وجہ سے کٹ دی گئی تھیں سینے اور کندھوں میں بھی گہری چوٹیں آئی تھیں۔ چہرے پر شیشے کی کرچیاں لگی تھیں اور سارا چہرہ زخم آلود اور خوفناک سا نظر آرہا تھا۔ ایک پل کے بعد دوسری نظر ڈالنے کو بہت چاہیے تھی۔ وہ سسکا اٹھی۔

یہ سارا علوی تھی۔ وہ سارا علوی جس کی خوب صورتی، کشش اور حسن کی زمانے بھر میں دھوم تھی مگر اب وہ جس حال میں تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔

پورا ایک ماہ ہسپتال میں رہنے کے بعد نواز اکرم

اسے گھر لے آیا تھا۔ وہ دونوں ٹانگوں سے محذور ہو چکی تھی۔ اس کا اوپری دھڑ تقریباً ”مفلوج“ تھا۔ پورا چہرہ جگہ جگہ سے خراش آلود تھا۔ اس کی آنکھوں کی جوت بچھ گئی تھی۔ وہ زندہ تو تھی، مگر اسے زندگی سے محبت تھی نہ زندگی کی ضرورت۔ وہ دوائی نہیں کھاتی تھی۔ وہ اپنی بیماری سے تنگ آ گئی تھی۔ بے حد چڑچڑی، سڑیل مزاج، ہر آئے گئے سے بے حد برے انداز سے پیش آتی۔ بلکہ اکثر اوقات انہیں گالیاں دیتی تھی۔ چیتنی تھی۔ برتن اٹھا کر پھینک دیتی تھی۔

”کیوں آئے ہو تم لوگ؟“ ہیرا تماشا دیکھنے آئے ہو۔ میرا مذاق اڑانا چاہتے ہو۔ میں عبرت بن گئی ہوں نا؟ اس لیے دیکھنے آئے ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ جاؤ چلے جاؤ۔“ اور نواز اکرم اسی پل سب کو وہاں سے نکل کر کسی چھوٹے سے بچے کی طرح اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتا تھا۔ عجیب بات تھی نا۔!

ہاں عجیب بات تھی۔ جب سے وہ زخمی ہوئی تھی۔ لپانچ ہو کر بستر پر پڑی تھی۔ نواز اکرم نے اس کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا تھا۔ وہ نواز کو بھی گالیاں دیتی تھی۔ اسے برا بھلا کہتی تھی۔ اس پر برتن پھینک دیتی تھی۔ اور جب وہ چیخ چلا کر تھک جاتی تھی تو رونا شروع کر دیتی تھی۔

”مجھے معاف کر دینا نواز! میں نے تمہیں بہت ستایا ہے۔ تمہارے صبر کا امتحان لیتی تھی نا۔ اللہ نے مجھ سے بدلہ لے لیا۔ اللہ نے مجھے یہ سزا اسی لیے دی ہے کہ میں اچھی بیوی نہیں تھی اور تم بھی مجھ سے خوش نہیں تھے نا نواز! جاؤ، جاؤ چلے جاؤ مجھے مرنے دو۔ مجھے تنہا چھوڑ دو ریت کرو میری خدمت۔ مجھ سے بدلہ لو اپنا۔ جاؤ چلے جاؤ کسی اچھی عورت سے شادی کر لو۔ جو تمہارا خیال رکھے۔ تمہیں محبت دے۔ تم سے وفاداری کرے، میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔“ وہ چیخ کر اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرتی تھی اور نواز اکرم نے اس کی ساری خطائیں، سارے چرم معاف کر دیے تھے۔ کیونکہ اسے سارا سے محبت تھی۔

”میرب سے کہو۔ وہ واپس چلی جائے۔“ اس روز







”معیّن! آپ میرا پچھلا حساب کلیئر کرنے کے موڈ میں ہیں یا نیکسٹ منٹھ؟“ مسز شاہدہ معین نے بڑی نفاس سے توس کا آخری ٹکڑا کاٹنے کی مدد سے اپنے منہ میں منتقل کیا۔  
”میں۔۔۔ ایسا کرتا ہوں ابھی چیک لکھ دیتا ہوں۔“ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا اور کپ میں چائے ڈالنے لگے۔

”اگر کوئی مشکل ہے تو رہنے دیں، اگلے مہینے دے دیجئے گا۔“ بیگم صاحبہ نے شوہر کو ایک نظر دیکھا اور رعایت دینے کی پیشکش کی۔  
”اگلے ماہ بھی دینے ہیں تو میں ابھی کلیئر کر دیتا

نعمت ناز

## پھر چھ سات

ہوں۔“ انہوں نے چائے کا سب لیا۔  
”ٹھیک؟“ شاہدہ بیگم نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر فلک سے مخاطب ہوئیں۔

”بیٹی! آپ کا کیا پروگرام ہے؟“  
”کیسا پروگرام ممی؟ وہ چونک پڑی۔  
”یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہے؟“  
”لے لیتی ہوں۔“ فلک نے بادل نخواستہ کہا اور نہ

اپنے پیارے کالج اور عزیز سہیلیوں کو چھوڑنے کو دل تو نہیں چاہتا تھا۔ مگر سرحال یہ تو اسے کرنا ہی تھا۔  
”سبجیکٹس؟“ ممی نے مختصراً پوچھا۔

”میں بی ایس سی نہیں کروں گی؟“ وہ منمنائی۔  
”تو تم اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہو اب تک؟“ انہوں



نے ایک گہری سانس لی۔  
”ضد کی بات نہیں ہے ممی! میں نے صرف آپ سب کی وجہ ایف ایس سی کیا ہے ورنہ مجھے کوئی شوق نہیں تھا اتنے پورنگ اور خشک سبجیکٹس پڑھنے کا“  
اب مجھے میرا شوق پورا کرنے دیں۔ میں اردو ادب میں ماسٹر کرنا چاہتی ہوں۔“ فلک نے ہر بار کی طرح اس بار بھی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم میں یہ terms (جراثیم) کہاں سے آگئے؟ تمہارے پاپا فزکس کے پروفیسر، ممی بائیالوجی کی پروفیسر، بڑا بھائی ڈاکٹر، بڑی بہن بائیو ٹیکنالوجی میں ریسرچر، دوسری بہن

انجینئر اور تم نے اپنے لیے سب سے انوکھے شعبے کا انتخاب کیا ہے۔“ وہ حتیٰ جھنجھلا گئیں۔

”ہزاروں لوگ اردو ادب پڑھتے ہیں ممی! یہ کون سی انوکھی بات ہے؟“ فلک نے احتجاج کیا۔

”ہماری فیملی کے لیے تو انوکھی ہی بات ہے سہی بھی کوئی پروفیشن ہے آخر تم اس میں کرو گی کیا؟“ وہ بحث کے موڈ میں تھیں۔

”پہلے پڑھوں گی پھر پڑھاؤں گی۔“ فلک کے لہجے سے ہی نہیں چہرے اور آنکھوں سے بھی عزم جھلک رہا تھا۔

ماخذ اللہ ایف ایس سی میں A گریڈ اور میڈیکل کے ایٹھ ٹیوٹنٹ کی تیاری کے بجائے اردو ادب کی



راہداری میں بھاگنے کو ہیں، آخر تمہاری عقل کو ہوا کیا ہے؟ کہیں گھاس چرنے چلی گئی کیا؟ ممی کی طہریہ ٹون بتدریج غصے میں ڈھل گئی۔

”ممی؟“ اب ناراض ہونے کی باری فلک کی تھی۔  
”آپ نے بھیا“ آئی اور ایسا کے ساتھ کبھی اس طرح زبردستی نہیں کی، پھر میرے ساتھ کیوں؟“ فلک نے منہ بسورا۔

”انہوں نے کبھی ایسی فضول من مانی نہیں کی نہ ایسے بے وقوفانہ فیصلے کیے۔“ ممی نے چائے کا کپ میز پر رکھا۔

”اب اس موضوع پر مزید کوئی بحث نہیں ہوگی، فلک کو اپنے پریشون اور انجیکشن کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کا پورا حق ہے۔“ پیانے معاملہ ختم کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔

”بے وقوف لڑکی اپنا فیوچر برباد کر رہی ہے۔“ وہ بدبوائیں۔

فلک نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ ویسے بھی بات ختم ہو چکی تھی جس میں پیانے کی مہمانی شامل تھی، وہ اب مزید اب کشائی کر کے نیا پیئڈورا باکس نہیں کھولنا چاہتی تھی، لہذا چپ چاپ ٹیبل سے اٹھ گئی۔ مگر ایک تشکر بھری نظریاں پر ڈالنا نہیں بھولی اگر وہ مداخلت نہ کرتے تو یہ معاملہ کئی دن اور چلتا تھا۔

اس گھر کے سربراہوں یعنی ممی، معین صاحب اور شاہدہ بیگم نے آج سے اٹھائیس سال قبل اپنی شادی کے وقت یہ طے کر لیا تھا کہ انہیں اپنے بچوں کو کس قسم کا ماحول دینا ہے۔ دونوں کالج میں پڑھاتے تھے، گھر اور بچوں کی پرورش، تعلیم و تربیت اور تمام تر اخراجات میں دونوں برابر کے حصے دار تھے۔ کوئی فریق دوسرے سے کم یا زیادہ خرچ نہیں کرتا تھا، کام آپس میں بانٹ لیے گئے تھے۔ کچھ سہارا ہی کا تھا، جو صفائی ستھرائی کر جاتی اور کپڑے دھو جاتی مگر انھوں کلاس کے بعد ہر بچہ اپنا یونی فارم خود دھوتا اور میٹرک کے بعد ٹیوشن پڑھا کر اپنا جیب خرچ خود نکالتا۔ بچے چاروں ذہین تھے،

والدین کے بنائے گئے ضابطوں اور قوانین میں پوری طرح ڈھل کر اعلا تعلیم حاصل کی۔ بس ایک فلک تھی جو اپنے بہن بھائیوں اور والدین کے نقش قدم پر چلنے کے بجائے اپنے لیے الگ راستے چن رہی تھی۔



اپنے کمرے کی تفصیلی صفائی کر کے وہ فارغ ہوئی تو ایک ایک کر کے بھیا، آئی اور ایسا بھرا کر اپنا اپنا ناشتہ بنا کر کھائی کر اور برتن دھو کر فارغ ہو چکے تھے۔ بھیا کی اسپتال میں رات کی ڈیوٹی تھی، آئی اور ایسا کی چھٹی تھی وہ اپنی مرضی اور معمولات کے مطابق یہ دن گزار تیں۔ ممی، معین صاحب اور شاہدہ بیگم اپنے چھوٹے موٹے کچھ کام نپٹانے کے علاوہ اگلے دن کے ٹیکس کی تیاری کرتے حالانکہ اتنے سالوں کا تجربہ تھا مگر پھر بھی اپنے موضوع پر ہوم ورک کے بغیر وہ کبھی کلاس میں نہ جاتے تھی وجہ تھی کہ ان دونوں کا ہی شمار کامیاب اور قابل اساتذہ میں ہوتا تھا۔

فلک کا دل اچانک ہی ہر چیز سے اچاٹ ہونے لگا تو وہ اسٹڈی میں پہنچ گئی۔

”ممی! میں پچھو کے گھر چلی جاؤں؟“  
”کب آؤ گی؟“ ممی کو اس کا یہ معمول اچھی طرح معلوم تھا کہ ہر دوسرے ہفتے میں وہاں کا چکر ضرور لگاتی تھی۔

”رات تک آ جاؤں گی۔“ اس نے مبہم جواب دیا۔

”کتنے بچے تنگ؟“  
”دس گیارہ بچے تنگ۔“  
”یعنی کہ کھانا کھا کر آؤ گی۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

شاہدہ بیگم کا اپنا ایک الگ مزاج تھا۔ وہ اپنے تمام ہی رشتے داروں سے جا بے وہ میکے کے ہوں یا سسرال کے، ذرا تکلف اور فاصلے سے ملتی تھیں۔ حالانکہ وہ بہ لحاظ یا بد اخلاق نہیں تھیں بس کچھ مزاج اور کچھ مصروفیت

ان کا انداز لیے دیے والا ہی ہوتا۔ بچے بھی ان ہی پر گئے تھے سوائے فلک کے۔

”اب تم بھی نہیں رہیں بڑی ہو گئی ہو، ہر معاملے میں سمجھ داری اور عقل و شعور سے کام لیا کرو۔“ انہوں نے ناسمجھایا۔

”جی۔“ فلک نے جلدی سے سر ہلایا۔  
”اب میں جاؤں؟“  
”جاؤ۔“

اپنے کمرے میں آکر اس نے کپڑے بدلے، اپنے تراشیدہ بالوں میں کچھو لگایا اور اپنی ریسٹ وائچ باندھی، دوپٹہ سر پر اوڑھا اور گیٹ کھول کر باہر آ گئی۔ پچھو کا گھر زیادہ دور نہیں تھا، فقط دو گلیاں اور ایک سڑک کر اس کر کے ان کا گھر تھا مگر اس محلے اور پچھو کے گھر پہنچ کر کچھ یوں محسوس ہوتا جیسے کسی دوسری دنیا میں آ گئی ہو اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ پچھو کے گھر اور گھر ان کی دنیا ان سے تو مختلف ہی تھی۔ لوہے کا گیٹ، جس میں شاخو نادر ہی دن میں کندی لگانے کا تکلف کیا جاتا تھا، بڑے آرام سے کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو سامنے کا منظر دیکھنا اس ساتھ۔

صادق بھائی قدیمی جھنگا چارپائی پر لیٹے بلکہ دھنسنے ہوئے اچھے سروں میں گنگنائے کا پتھر فرار ہے تھے صادقہ تپا بالوں میں مہندی اور ناخنوں پر لسن کا عرق لگائے تخت پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ پچھو بھی وہیں براجمان تھیں اور جانے کون سا ساگ کاٹ رہی تھیں۔ فلک سوائے بالک کے اور کسی ہرے پتوں یا ساگ کے نام سے نا آشنا تھی۔ ہر بار پچھو ہی اسے بتاتیں یہ مولی کے پتے ہیں، یہ شاہجہم کے، یہ بیتوا ہے، یہ سرسوی، چولائی ہے اور یہ تیتھی اور فلک بے دھیانی سے ان کی فراہم کردہ معلومات پر یونی اثبات میں سر ہلائے جاتی۔

ماجد بھائی لکڑی کی کرسی پر بیٹھے موبائل کے ساتھ مگن تھے، کوئی گیم کھیل رہے تھے یا کسی کو میسجج قریب جائے بغیر اندازہ کرنا مشکل تھا۔ ماجدہ باجی پکن

میں تھیں، کچھ تلنے کی خوشبو آ رہی تھی، عتیقہ اور انیقہ سامنے والے کمرے میں بیوی پر ڈرامہ بھی دیکھ رہی تھیں اور ساتھ اس پر بھروسہ بھی کر رہی تھیں۔ فلک یا آواز بلند سلام کر کے تخت پر ہی بیٹھ گئی۔  
”کیسی ہیں مس اردو اب؟“ صادق بھائی اپنے گنگنائے کا پتھر ترک کر کے اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

”ٹھیک ہوں صادق بھائی؟ اور آپ سنائیں؟“  
فلک پچھو کے پاس بیٹھ گئی۔

”بھئی، ہم تو کچھ کچھ لے کر سنا رہے ہیں۔ ایویں اپنا بیلنس ضائع کرنے کا فائدہ۔“ ماجد بھائی نے اپنے سیل فون پر سے نظریں ہٹائے بغیر ہی مداخلت کی، وہ اور ان کا سیل فون ایسے ہی لازم و ملزوم تھے جیسے پھول کے ساتھ خوشبو، صبح کے سنک پروانہ اور چاند کے ساتھ تارے، یہ تشبیہات ماجد بھائی اپنے اور اپنے لاڈلے سیل فون کے لیے خود استعمال کرتے تھے۔

”گھر میں سب ٹھیک ہیں؟“ پچھو اس سے مخاطب تھیں۔  
”جی پچھو۔“

”معین سے کتنا تمہاری امی کے ساتھ، کبھی چکر لگا لیا کرے۔ اسے میٹروں گزر جاتے ہیں گھر آئے ہوئے، عید تہوار پر ہی آجائے تو آجائے۔“ پچھو اکثر ہی اس سے یہ شکوہ کرتی تھیں۔

”بس پچھو! وہ کالج کی مصروفیات ہی کچھ اس قسم کی ہیں۔ وقت بہت کم ملتا ہے فرصت کا اسی لیے۔“ ویسے وہ کہتے تو رہتے ہیں یہاں آنے کے بارے میں۔ فلک خفیف ہو کر پیانے کی صفائیاں پیش کرتی۔

”بی بی، وقت آج کل کسی کے پاس نہیں۔“ خاکروب سے لے کر صدر پاکستان تک سب مصروف ہیں۔ وقت تو نکالا جاتا ہے۔“ صادق بھائی بولے۔

”کیا پیو گی فلک، ٹھنڈا یا گرم۔“ پکن سے ماجدہ باجی نے آواز لگائی۔

”کچھ بھی مل جائے، فلک نے فضا میں تیرتی خوشبو



سو گھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کیا مل رہی ہیں۔  
 ”یہ تو راضی برضا ہیں۔“ صادق بھائی نے کلوا لگایا۔  
 ”نہ بی بی نہ ایسے راضی نہ ہونا“ اچھی طرح دیکھ بھال کر سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ ”ماجد بھائی بھی اسے تنگ کرنے میدان میں اتر آئے۔  
 ”ارے میری بی بی کو پریشان مت کرو سیدھی ساوی ہے بے چاری، تم آفتوں کا مقابلہ کرے گی کیا؟“ پچھو کے لہجے میں بی بی کی محبت بول رہی تھی۔  
 ”تمہارے بڑے بہن بھائی سب کیسے ہیں؟“ صادقہ آپا نے اب اس کی طرف توجہ کی۔  
 ”ٹھیک ہیں“ اپنی اپنی مصروفیات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ”فلک نے تحفہ“ جواب دیا۔  
 ”ہاں بھی بڑھے لکھے مصروف لوگ ہیں غریب رشتے داروں سے ملنے کا بھی تاہم ہی نہیں ملتا جو ہر وقت فارغ بیٹھے رہتے ہیں۔“  
 انھیں طنز بہ باتیں کرنے کی بیماری تھی اور فلک اس انداز گفتگو سے ہمیشہ گھبراتی تھی۔ بھلا وہ کیسے اور کیونکر اپنے گھر والوں کی صفائیاں پیش کرے؟ وہ لوگ اگر یہاں بہت کم آتے تھے تو یہاں سے بھلا کون ان سے ملنے جاتا تھا، سوائے پچھو کے۔ جن کی محبت جوش مارتی تو وہ ہاں چلی آتیں اور کبھی کبھار جمائیں بھی آجاتا، تو فلک کی آنکھوں کی روشنی اور بھی بڑھ جاتی۔ وہ تھا بھی تو ایسا، مگر اس وقت تو صادقہ آپا کے طنز نے اس کے چہرے کی جوت جیسے بچادی تھی۔  
 ”چلو بھی گرام گرم چپس کھاؤ، پکوڑے کھاؤ۔“  
 ماجدہ باجی بچن سے باہر نکل آئیں اور فلک کو اس انجھن سے نکال دیا جس میں ”صادقہ آپا نے اسے بھٹا کیا تھا۔“  
 ”آپ تو پسینے سے ہو گئیں۔“ فلک نے انہیں ہمدردی سے دیکھا۔ جن کا سالو چوگر می اور پسینے سے اور بھی کالا لگ رہا تھا، لیس پسینے سے تر بہم سے چپک

رہی تھی۔  
 ”ارے بھی ہمارے بچن میں اے سی تھوڑی لگا ہے۔“ دو بچے سے چرو خشک کرتے ہوئے ماجدہ باجی بیٹنے لگیں۔ ”انہیں بات بے بات بننے کی عادت تھی۔ انہیں نہ بڑھتی عمر کی کوئی فکر تھی نہ شادی نہ ہونے کا کوئی غم نہ گھر کے جملہ مسائل سے کوئی سروکار، ان کی اپنی الگ ہی ایک دنیا تھی جو بچن سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی۔ بات بے بات پر تو عمر لڑکیوں کی طرح دیر تک بے ساختہ نشیں اور سب سے زیادہ صادقہ آپا کو کف میں بھٹا کرتیں۔  
 ”اس میں ٹھٹھے لگانے کی کیا بات ہے؟“ اس وقت بھی صادقہ آپا کو ان کا بلا وجہ ہنسا برا لگتا تھا۔  
 ”تو کیا رونے کی بات ہے، دونوں کی زندگی ہے اسے بھی رویہ بیٹ کے گزار دو، کوئی بات ہے بھلا کیوں فلک؟“  
 ترنت جواب دیتے ہوئے وہ پھر ٹوٹ پیٹ کا اشتہار بن گئیں۔ اس بار ان کی کھلکھلاہٹ صادقہ آپا کو چڑانے کے لیے بھی اور یہی ہوا ان کے ہاتھ کے بلوں میں ہو گیا۔ انہوں نے کچھ سخت ست کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا مگر اس سے پہلے ہی صادق بھائی بول پڑے۔  
 ”دون؟ ہم نے تو چار دن سنے تھے دو آرزو کے دو انتظار کے“ انہوں نے چارپائی کی گھرائیوں سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔  
 ”یہاں نہ آرزو ہے انتظار ایسی شکلوں کی آرزو کون کرے گا اور انتظار کس کو ہو گا؟“ صادقہ آپا کو بدلہ لینے کا موقع مل گیا، انہوں نے خوب ٹاک ٹاک کر تیر پھینکے۔  
 مگر ماجدہ باجی تو بقول سب کے ڈھیٹ بڑی تھیں۔ اگر وہ ایسی باتوں کی جنہیں وہ گھر اور باہر کے لوگوں سے سینکڑوں بار سن چکی تھیں، دل پر لیتیں تو اب تک صادقہ آپا کی طرح کچھ کچھ نفسیاتی کیس بن چکی ہوتیں۔  
 ”جیسے بھی ہیں اچھے ہیں، خوش ہیں، شادی نہ ہونا

ایک غم ہے، شادی ہو کر بھی شادی شدہ زندگی نہ گزارنا اور بچ میں لکے رہنا دو غم ہیں۔ اللہ کا شکر ہے اس نے ایک غم ہی دیا۔“  
 ماجدہ باجی نے بڑی بے نیازی سے بڑی بہن کی شان میں گستاخی کی، جس کی دس سالہ ازدواجی زندگی کے پچھلے پانچ سال سیکے میں ہی گزرے تھے اور فی الحال واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وجہ؟ بے اولادی شوہر پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی پانچ سال میں ہی شوہر سمیت سسرال کے سب افراد کا ضبط جواب دے گیا، اور چونکہ معاشرے کے مروجہ اصولوں کے مطابق اولاد نہ ہونے کی صورت میں سزا ہمیشہ عورت ہی کا مقدر رہتی ہے لہذا ”صادقہ آپا کے شوہر کی دوسری شادی کی باتیں ہونے لگیں، بے چاری صادقہ آپا پہلے پہل تو اس خوش فہمی میں رہیں کہ ان کا کھوٹا مضبوط ہے یعنی شوہر مٹھی میں ہے، ان کا پلو چھوڑ کر ادھر ادھر نہیں جاسکتا پھر انہیں یہ غلط فہمی بھی تھی کہ پہلی بیوی کی موجودگی میں کوئی بھی اپنی بہن بیٹی کو دوسری بیوی بننے کے لیے کیونکر دے دے گا، مگر ان کا فہم ناقص اور خیالات پرکھنا ثابت ہوئے، اولاد کی چاہ میں شوہر ان کا پلو چھوڑا، گران کی مٹھی کی قید سے کب نکل گیا؟ انہیں علم تب ہوا جب دوسری کو بچ بچ اپنی آنکھوں سے اپنے گھر میں دیکھا، اس وقت انہیں یہ پتہ چلا کہ اٹھارہ برس سے لے کر اسی برس تک کے مرد کو پہلی دوسری بیوی کی چوٹھی یا کسی بھی شادی کے لیے بیوی کا حصول کوئی مشکل یا ناممکن نہیں۔ چاہے شادی کی وجہ کچھ بھی ہو۔  
 ”پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی جرم ہے“ میں عدالت سے رجوع کروں گی۔“ صادقہ آپا کے اوسان ذرا بحال ہوئے تو انہوں نے شوہر کو دھمکایا۔  
 ”ٹھیک ہے، پہلی بیوی کی موجودگی میں جرم ہے نا“ غیر موجودگی میں تو نہیں؟“ شوہر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا تھا۔  
 صادقہ آپا کے ہونٹوں پر چپ کی مر لگ گئی۔ شوہر کو

تین لفظوں کے اختیار کا زخم تھا۔ صادقہ آپا کچھ تو پہلے ہی حساس تھیں اب اور زور دینا ہو گئیں۔ سیکے کا رخ ایسا کیا کہ سسرال کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے تو کہا تھا کہ دونوں مل جل کر رہ لیں گی مگر صادقہ آپا کو یہ شراکت گوارا نہ ہوئی۔ نہ خلع لی نہ طلاق بس علیحدگی کی سزا خود کو دے بیٹھیں۔ حالات کی تلخیوں نے مزاج اور زبان میں کڑواہٹ بھری تھی جس کا بے دریغ استعمال ہر ایک پر کڑا تھا۔ چھوٹی کوئی بہن زیادہ ہی بڑبڑاتی تو انہیں نفسیاتی مریضہ کا خطاب دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال دیتی۔ سسرال اس وقت تو ان کے نشانے کی پر فلک بھی جو بے چاری چپ چاپ بیٹھی ان کی مشق سہم رہی تھی۔  
 ”ارے بھی تم یہ کھاؤ، فضول باتیں پھوڑو، یہ لو۔“ ماجدہ باجی نے بڑے اس کے آگے کی۔ بڑی سی ٹرے میں ایک طرف چپس اور دوسری جانب پکوڑوں کا ڈھیر تھا۔ سرخ مرجول کی خوب مٹھی چٹنی ایک کنوری میں تھی۔  
 وہ سب کے سب اپنی اپنی مصروفیات چھوڑ کر پکوڑوں، چپس اور چٹنی کے گرد یوں جمع ہو گئے جیسے جمع کے گرد رولنے اور تو اور عتیقہ اور انقیہ بھی بیوی کا پیچھا چھوڑ کر محفل کو رونق بخشنے آ گئیں۔  
 ”پکا پکا میل رہا ہے، تو زیادہ ہی مزے آرہے ہیں۔“ صادقہ آپا نے دونوں چھوٹی بہنوں کو گھورا۔ جن کا اوڑھنا پھوٹا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، جاگنا سونا، بیوی کے بغیر ادھورا تھا۔  
 سب گھر والوں کی متفقہ رائے تھی کہ ان دونوں کو ای نے لگاڑا ہے اور وہ سب یہ رائے دینے میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ امی ہی کی ڈھیل تھی نہ انہوں نے کسی کام کی کوئی ذمہ داری ان دونوں پر ڈالی اور نہ ہی وہ کسی بات پر روکتی توکتی تھیں۔  
 ”ہماری پچھو سیدھی بہت ہیں۔“ فلک نے ایک پکوڑے کو چٹنی میں ڈبوئے ہوئے پچھو کی طرف دیکھا۔



ایک عام سائیل کلاس محنت کش عورت کا سادہ سا چہرہ۔ کسی بھی قسم کے فیشن اور غارے، سرمئی سے پاک، بال کس کے پیچھے کی طرف سمیٹ سٹ کے ایک چھوٹا سا جوڑا بنا رکھا تھا اور ہاتھ آہستہ آہستہ سبزی بنانے میں مگن تھے۔

”پھپھو! آپ بھی لیں نا۔“ فلک نے ان سے کہا۔

”ہاں بچی بس تم کھاؤ میں سمجھوں گی میں نے کھا لیا۔“ وہ بڑی محبت سے بولیں۔

”مجھوں کے بارے میں تو سنا تھا کتب میں کہ مار اسے بڑی تھی اور درد لیلیٰ کو ہو تا تھا مگر یہ کون سی محبت ہے کہ کھائے کوئی اور پیٹ کسی کا بھرے۔“ ماجد بھائی نے سالم پکوڑا پختی میں ڈھویا اور منہ میں رکھا۔

”یہ مانتا ہے بچے! تم ابھی نہیں سمجھو گے، جب اپنے بچے ہوں گے تب یہ بات سمجھ میں آئے گی۔“ امی مسکرائیں۔

”آپ شادی کر سیں تو ان کے بچوں کو دیکھیں سب لوگ کہتے ہیں کہ بیٹھے بیٹھے بیٹوں کی کمائی کھا رہے ہیں۔“ صادق آپا اک دم تڑخ کر بولیں۔

”اے لو! میں کیا کمائی کھا رہی ہوں میں تو۔۔۔“ امی ان کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئیں۔

”لو! کاکیں ہو جائے تو لڑکوں کا میں کچھ سوچوں“ بھلا میری کیا غلطی ہے؟“ ان کا انداز مہربان تھا جیسے بچوں کی شادیاں ابھی تک نہ ہونے میں ان کا قصور ہے؟

”کون لڑکی؟“ پھتیسواں سال چل رہا ہے، عورت کو عورت اور اگر اس عورت کی کہیں شادی نہیں ہوگی تو کیا لڑکوں کو بھی بٹھا کر رکھو گی؟“ صادق آپا جھپٹتے ہوئے لہجے میں بولیں۔

ان کا لہجہ طنزیہ اور الفاظ بہت سخت تھے، ماجدہ باجی کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر کم از کم فلک کو تو بہت افسوس ہوا۔

”یہ بھی آخر انسان ہی ہیں ایک لڑکی کا امتگوں بھرا نازک سادل، ہر مار کیسے ہر وار کو بس بس کر سہا سکتا ہے۔“ فلک نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے رخ سے

سوچا۔

”ارے ہو جائے گی شادی، جب وقت آئے گا تو سب کے بیاہ ہو جائیں گے۔“ صادق بھائی نے منمناتے ہوئے امن کا سفید جھنڈا ہلانے کی کوشش کی۔ بن کا اتر ہوا چہرہ اور صادق آپا کا لب و لہجہ انہیں کچھ بھائے نہیں، آخر کو ماجدہ باجی انہیں وقت بے وقت چائے بنا کر دیتیں، دھلے ہوئے استری شدہ کپڑے ملتے اور وقت پر کھانا، بغیر ناک منہ چڑھائے ان کے آئے دن کی دوستیوں کی خاطر درازات۔ ماجدہ باجی کے علاوہ گھر میں اور کوئی ان گونا گوں صلاحیتوں کا مالک نہیں تھا۔

”سدرہ! ہما سینٹر سے کب تک آتی ہیں؟“ فلک نے موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے دھیرے سے سوال کیا۔

”آج کل تو دیر سے آرہی ہیں۔ اب بڑے بڑے کپڑوں کی کٹنگ اور سلائی سیکھ رہی ہیں نا تو دیر ہو جاتی ہے۔“ پھپھو نے رساں سے جواب دیا۔

”ارے تم ٹھیک سے کھاؤ نا، یہ لو! پکوڑا الو۔“ ماجدہ باجی نے مہمانداری بھائی اور رے میں بجا آخری پکوڑا اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا فلک نے ابھی بمشکل ایک پکوڑا اور دو چار پیس کھائے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے تڑے صاف ہو گئی۔

”ارے لو!، تکلف کیوں کرتی ہو، تمہارا اپنا گھر ہے۔“ ماجدہ باجی نے اسے ہچکچاتا دیکھ کر بڑے پیار سے کہا۔

”ہاں ہاں آپ کا اپنا گھر ہے، مستقبل کا۔“ عتیقہ شوقی سے بول کر خود ہی ہنسنے لگی، فلک حقیف ہو گئی، باقی سب بھی مسکرا دیے، سوائے صادق آپا کے جن کی تیوریوں کے بل ابھی تک کم نہیں ہوئے تھے۔

”جماگیر نہیں آیا ابھی تک؟“ پھپھو کو تشویش ہوئی۔

”آ رہا ہوگا، وگینوں میں تو دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔“ ماجدہ بھائی نے تسلی دی۔

”پتا نہیں کب آئے گا۔“ فلک نے مضطرب ہو کر کہا۔ اس سے ایک ایک بل کاٹنا محال ہو رہا تھا۔

”اور بھئی فلک، کچھ یوں بات کرو، چپ چاپ کیوں لٹی ہو پھپھو نے اسے مخاطب کیا جو واقعی بڑی دیر سے چپ بیٹھی تھی۔

”تس سے بات کروں اور کیا؟ میرے سارے لفظ آپ کا بیٹا لے گیا اور مجھے گونا گوا کر دیا۔“ فلک نے دل میں سوچا۔

”کوئی بولنے کا موقع دے تو بے چاری کچھ بولے،“ امی ہی رہی ہیں بس۔“ عتیقہ نے اس کی مشکل حل کر دی۔

”السلام علیکم! اک دم ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

”وعلیکم السلام! گیا بیٹا۔“ پھپھو کے چہرے پہ اطمینان کھگرایا، شہر آشوب کے حالات ایسے تھے کہ گھر سے نکلنے والا فرد جب تک گھر واپس نہ آجائے اس کی یقینیت واپسی کے لیے دل سے دعائیں ہی نکلتی رہتی تھیں۔

”آؤ شہزادے، بالکل صحیح موقع پہ آئے ہو۔“ صادق بھائی نے ہانک لگائی۔

”تمہارا مطلب مہمان سے ہے؟“ ماجدہ بھائی نے سوال کیا۔

”نہیں، میرا مطلب کھانے سے ہے۔“ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اچھا، میں کچھ اور سمجھا تھا۔“ صادق بھائی نے اپنی اڑھی سمجھائی۔

”پانی۔“ جماگیر، ان فقرے بازیوں سے بے نیاز ان کا کہیں موندے کر سی پڑھے گیا۔

”تم کیسی ہو لڑکی، گھر میں سب ٹھیک ہیں؟“ وہ ان کا کہیں موندے موندے فلک سے مخاطب ہوا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں اور گھر والے بھی۔“ وہ جماگیر کو دیکھتے ہوئے بولی، جس کا وجہ چہرہ اور شاندار وجود گھسی ہوئی جینز، شرٹ اور تھکاوٹ کے

لہاؤں آثار کے یاد دہانی کسی بھی دل میں اترنے کی بہتر راہ صاف نہ رہتی تھی۔ پھر اس کا دل لب و لہجہ، دل موہ لینے والے انداز اور دل بہانے والی باتیں، فلک یونہی تو اس کی اسیر نہیں ہو سکتی تھی جس پر کئی لڑکیاں چپکے چپکے ہی مر مٹی تھیں۔

عتیقہ، خندے پانی کی بوتل اور گلاس لے آئی۔

”یکے بعد دیگرے وہ دو گلاس غٹا غٹ چڑھا گیا۔“

”تم کیا کر رہی ہو؟“ وہ اچانک اس سے مخاطب ہوا۔

”میں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔“ فلک اس اچانک سوال پر گڑبڑا گئی۔

”ایڈیشن کا پوچھ رہا ہوں۔“ وہ بڑے اطمینان سے اس کے صبح چہرے پہ نظریں جمائے جواب کا منتظر تھا۔

”بی اے میں ایڈیشن لے رہی ہوں۔“ وہ کچھ سنبھلی۔

”ہوں تو دل کی بات مانی؟“

”اف! ایک تو یہ سب کے سب ہر بات بول دینے کے عادی ہیں۔ دل میں رکھ کر مناسب موقع محل کیوں نہیں تلاش کرتے۔“ فلک جڑ بڑھ گئی اتنے میں ماجدہ باجی جمانگیر کی پلیٹ لے آئیں جو انہوں نے پہلے ہی بچا کر رکھی ہوئی تھی۔

”میں بس ابھی دس منٹ میں آیا۔“ وہ پھرتی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

جتنی دیر میں وہ نہایا، ماجدہ باجی ہنڈیا چڑھانے میں مصروف ہو گئیں، عتیقہ اور انیقہ دوبارہ دیوی دیکھنے میں مگن ہو چکی تھیں، ماجدہ بھائی نے اونچے سروں سے گنگناٹا شروع کر دیا۔

”مجھے سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔“

”تمہاری ہنسون کی کہیں بات ولت چلی؟“ کچھ دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

”پرو پول تو آتے رہتے ہیں مگر ابھی کسی کو فاسٹل نہیں کیا۔“ فلک نے جواب دیا۔



”اپنے جیسے اونچے پرھے لکھے لوگ دیکھ رہے ہوں گے ماموں“ ممالی۔ ”صداقہ آپا کا لہجہ بدستور طنز پر تھا۔“

”انشاء اللہ پرھے لکھے قابل بچے ہیں میرے بھائی کے اللہ صبح جوڑمائے نصیب اچھے کرے۔“ پچھو کے سادہ سے لہجے میں محبت اور فخر چھپا ہوا تھا۔

”ہمارے لڑکے کسی قابل ہوتے تو اپنی بھتیجیوں کو کہیں اور تھوڑی جانے دیتی۔“ امی نے کچھ دیر بعد بڑی حسرت سے کہا۔

”یک میٹرک پاس الیکٹریشن اور دوسرا ایک معمولی سائیکل مین، ان نواب زادوں کے لیے اتنے اونچے اونچے خواب مت دیکھو۔“ صداقہ آپا کے لہجے میں کنوٹاٹ کھلی ہوئی تھی اور وہ دونوں نواب زادے ان باتوں سے بے نیاز اپنے شغل میں مگن تھے۔

”چلو“ میرا جگتیرا ماشاء اللہ بڑا لائق فائق ہے۔ اتنی اونچی پڑھائی کر رہا ہے اس کے لیے تو کوئی منہ نہیں کرے گا۔“ پچھو نے گویا خود کو تسلی دیتے ہوئے ایک نیا خواب تراشا۔

جما لکچر کچھ دیر بعد نہادھو کر آگیا۔ تروتازہ وجود اور مسکراتا چہرہ، فلک بے اختیار ہی یک ننگ اسے دیکھے چلی گئی۔ سادہ سے کرتا شلوار میں لمبوس نم بال، پیشانی پر کھمبے ہوئے وہ ہر انداز اور ہر لباس میں ہی قابل لگتا تھا۔

”آج تو چھٹی ہے، تم کہاں گئے تھے؟“ فلک نے سوال کیا۔

”سربراہ ایکسٹرا کلاسز لے رہے ہیں۔ سنڈے کو اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔“ جما لکچر اسے جواب دے کر ٹرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”تیڑی آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟“ فلک نے اس کی لمبی پلکوں کو غور سے دیکھا۔

”کیا بات ہے بی بی؟ گھر پر رکھ کر آئی ہو کیا؟“ صداقہ بھائی نے اک دم اسے مخاطب کیا۔

”کیا؟“

”پتی زبان اور کیا۔“ وہ بڑے مزے سے بے ساختہ

بولے۔ فلک کو ہنسی آگئی۔

”یہاں آکر ان کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔“ ماجد بھائی نے لقمہ دیا۔

کیا تم لوگ بے کاری باتیں لے کر بیٹھ جاتے ہو کوئی اور کام نہیں ہے تمہیں ماجد بھائی نے انہیں کہہ دیا۔

”کسی اللہ کے بندے کے پاس دوسروں کے ہونے تو مجھے عنایت کر دے“ اشد ضرورت کا سوال ہے۔“ ماجد بھائی نے اچانک تان لگائی۔

”میری طرف مت دیکھنا بھی، میرے پاس کچھ نہیں ہے اس وقت“ ماجد بھائی نے ان کی نظریں خود پر جمی دیکھیں تو انہیں انتہا کیا۔

”کیا کرے گا؟“ صداقہ بھائی نے سوال کیا۔

”بال کٹوانے ہیں اور موبائل میں بینکس ڈلوانا ہے کچھ دس“ ہمیں روپے اپنی جیب میں رکھوں گا بالکل ہی خالی ہے۔“

”بال کٹوانے کے پیسے نہیں ہیں اور موبائل میں بینکس ڈلوانا ضروری ہے۔“ صداقہ آپا غسل خانے سے باہر آچکی تھیں، طنز کرتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔

”یار تیرے پاس ہوں گے کچھ سوچ پاس۔“ ماجد بھائی نے جگتیر کو اپنی امید کا مرکز بنایا۔

”میرے پاس اس وقت صرف تیس روپے ہیں۔“

”انیقہ! اے انیقہ! پچھو سے بیٹے کی پریشانی دیکھی نہیں گئی، بیٹی کو آواز دے کر بلا لیا۔ تیرے پاس سو روپے ہوں تو بھائی کو دے دے، میں پھر بعد میں دے دوں گی“

”انہوں نے لجاجت سے بیٹی سے کہا۔

”تمہاری مشکل سے تو پانچ سو روپے جمع کیے تھے لان کے سوٹ کے لیے سوٹ بھی آیا نہیں، خرچے آجاتے ہیں۔ پرسوں بھی آپ نے سو روپے لے لیے تھے چینی منگوانے کے لیے، وہ ابھی واپس نہیں کیے، اب سو روپے کا مطالبہ اور آگیا۔“ انیقہ تنناتی۔

”ہنسنا! تو سوئی جگہ دو سو لے لیتا مجھ سے“ ابھی تو میرا کام کروے۔“ ماجد بھائی نے اسے پیار سے چکارا۔

”ہاں بس دے دیے دو سو“ یہی واپس مل جائیں“

”نہیں پچھو! چائے میں بہت دیر ہو جائے گی پھر کبھی سہی۔“ فلک مضطرب ہو رہی تھی کہ امی کی حلقی کا ڈر تھا۔

”چلو! میں چھوڑ آتا ہوں“ جما لکچر بھی کھانا کھا کر کھڑا ہو گیا۔

”بائیک لے جا شنراؤے۔“ صداقہ بھائی نے پیچھے سے ہانک لگائی، جب وہ دونوں سب کو خدا حافظ کہہ گئے دروازے سے نکل رہے تھے۔

”یہ بے وقوف لڑکی موٹر سائیکل سے ڈرتی ہے۔“ جما لکچر انہیں جواب دے کر باہر نکل گیا۔

”موٹر سائیکل سے نہیں ڈرتی۔ تم سے ڈرتی ہوں۔ لوگ بائیک چلاتے ہیں یا دوڑاتے ہیں تم اڑاتے ہو۔“

فلک نے دہشتہ ٹھیک سے سر پر جمایا اور اس کی ہمرائی میں چل پڑی۔

”ویسے میں نے خود بھی نہیں چاہا کہ تمہیں بائیک پر لے جاؤں۔“

”کیوں؟“

”مفرط لدی ختم ہو جاتا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا، ذرا باتیں کرتے ہوئے ایک ساتھ چلتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔“ وہ یونہی اکثر باتوں باتوں میں اپنے دل کی بات کہہ جاتا تھا۔

”کبھی کبھی مجھے بہت ڈر لگتا ہے جما لکچر۔“ فلک اچانک بولی۔

”جو ڈر گواہ مر گیا، جس خیال یا جس چیز سے ڈرو گی وہی مجسم ہو کر تمہارے سامنے آئے گی۔“ وہ نرمی سے گویا ہوا۔

”نصیب تو ایک حقیقت ہے نا۔“

”میں اس مفروضے پر یقین نہیں رکھتا، ہم اپنی قسمت خود بناتے ہیں۔“ جما لکچر کا انداز دو ٹوک تھا۔

”کتے تو سب ہی ہیں کہ وہی ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔“

اگر محبت کرنا میرے نصیب میں لکھا ہے تو پھر وہ شخص بھی ضرور لکھا ہو گا جس سے میں محبت کرتا ہوں



نیت اور کوشش ہو تو انسان اپنی من چاہی منزل تک ضرور پہنچتا ہے جہاں گیارہ لکھ لکھ میں بول رہا تھا۔  
 ”کوئی رکاوٹ آئی تو؟“ فلک کے خوب صورت چہرے یہ خدشات کے سامنے لرز رہے تھے۔  
 ”فکر کیوں کرتی ہو؟ مجھ میں اتنا دہم ہے کہ ہر رکاوٹ کو دور کر سکوں، جب وقت آئے گا تب دیکھنا، اس کا لہجہ برا مضبوط تھا۔  
 ”کب؟“

”بہت جلدی ہے کیا؟“ جہاں گیارہ نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔  
 ”نو نہی پوچھ رہی تھی۔“ اس کی رنگت میں نکلیاں گلنے لگیں۔  
 ”جائے جناب! گھر آگیا آپ کا۔“ بڑے سے سفید رنگ کے گیٹ کے سامنے وہ رُخا۔  
 ”آتی جلدی؟“ فلک نے ایک گہری سانس لی۔

”اندرا آجائے۔“  
 ”نہیں، پھر کبھی سہی، اس وقت تو بس مجھے چاہیے بستر و صوم سے گروں اور آنکھیں بند کر کے بے خبر ہو جاؤں۔“ جہاں گیارہ صبح چار بجے اٹھنے کا عادی تھا۔ رات حد سے حد گیارہ بجے تک سو جاتا تھا اور علی الصبح اٹھ کر پڑھائی کرتا تھا۔

”اور ویسے بھی اس وقت ممانی کے خراب موڈ کا سامنا آپ کریں، بندہ تو چلا۔“ اس نے پونہ مذاق میں کہا تھا مگر فلک بری طرح شرمندہ ہو گئی۔  
 ”تم تو جانتے ہو امی کا مزاج۔ وہ۔۔۔ بس۔“

”اچھا چلو اب اندر جاؤ اور اپنا خیال رکھنا، ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“ جہاں گیارہ اس کی بات کالی۔  
 ”اچھا، اللہ حافظ۔“ وہ چند لمحے کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی پھر گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔  
 حسب توقع امی کا موڈ آف تھا۔

”یہ تم تو دیکھ لیا کرو، جا کر بیٹھ جاتی ہو۔“ وہ برہم ہو رہی تھیں۔  
 ”چھپوٹے کھانے کے لیے روک لیا تھا اس لیے دیر ہو گئی۔“ وہ منتناتی۔

”کس کے ساتھ آئی ہو؟“

”جہاں گیارہ کے ساتھ۔“

”اچھا، اب جا کر سو جاؤ اور ایک گلاس دودھ ضرور لے لیتا۔“ انہوں نے نسبتاً نرم لہجے میں کہا۔

”جی اچھا۔“ وہ بڑی تابعداری سے کہتی ہوئی وہاں سے نکل آئی اور سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ پہلے بھی وہ اتنے شوق سے دودھ نہیں پیتی تھی اور اب تو بالکل ہی چھوڑ دیا تھا جہاں گیارہ بھی تو دودھ نہیں پیتا تھا۔  
 سیل فون، بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ کپڑے بدلنے چلی گئی۔ ڈھیلا ڈھالا سوئی اور آرام دہ شب خوابی کالباں پہن کر وہ بیڈ پر تکیہ کے سہارے نیم دراز ہو گئی۔  
 ”نیند ابھی آنکھوں سے دور تھی، وہ اٹھ کر ایک شایات کے قریب آ گئی اور ”خوشبو“ نکال لی۔ یہ جہاں گیارہ کا خوشبو تھی اور اسے دل و جان سے عزیز۔ شہرے سینوں میں جھونکے اور خوشبوؤں، رنگوں سے سچی شاعری بڑھتے ہوئے اس کا دل بھی خوابوں کی جاوہر گری میں سفر کر رہا تھا۔

رات بھر تیری تصویر نگاہوں میں رہی ہو گئی رات تیرے عکس کو تلتے تلتے پھر میں نے تصور کے کسی لمحے تیری تصویر پر لب رکھ دے آہستہ سے

بہت ہی کوئل جہیزوں میں گھری ہوئی تھی وہ جب اس کا سیل بجنے لگا تو آواز بند تھی مگر فون کے ارتعاش نے اس کا رنکاڑ توڑ دیا تھا۔  
 ”تم سوئی نہیں اب تک؟“

”روزانہ یہی سوال کرتے ہو اور میرا روز کا جواب یہی ہوتا ہے کہ تم سے بات کیے بغیر کیسے سو سکتی ہوں۔“ فلک ٹھنکنائی آواز میں بول رہی تھی۔

”روزانہ وہی جواب دیتی ہو، پور ہو گیا ہوں یا ابھی اپنا جواب چنچ بھی کر لیا کرو؟ جہاں گیارہ کی آواز میں شوخی نمایاں تھی۔

”ویسے تم مہرود حضرات اتنی جلدی بور کیوں ہو جاتے ہو ہر بار کچھ نیا چاہیے ہوتا ہے نا۔“  
 ”یہ ہماری فطرت ہے ہر بار کچھ نیا، کچھ تازہ یہ کیا

روزانہ کی برقی ہوئی چیزیں روزانہ کی دیکھی ہوئی ٹھیکیں تو یہ تو یہ بھی کوئی لائف ہے۔“  
 ”کسی روز مجھے بھی ایسے ہی کہہ دو گے۔“ فلک نہ جانے کیوں سنجیدہ ہو گئی۔

”ہو سکتا ہے، کیا پھر سو سام مرود حضرات کا کیا پتا کسی روز میں تم سے کہہ دوں۔“

اکتا گیا ہے وقت کی یکسانیت سے دل جی چاہتا ہے پھر کوئی تازہ واردات جہاں گیارہ سے بول رہا تھا وہ پیش میں آ گئی۔  
 ”بات سنو، زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے، جان سے مار دوں گی میں تمہیں۔“ اس نے دھمکی دی۔

”میری جان حاضر ہے، شوق سے مارو مگر پیار سے، غصے سے نہیں۔“ وہ ہنسنا فلک بے ساختہ ہنس پڑی۔  
 ”تم بہت بُرے ہو۔“

”تم بھی تو بہت بُری ہو۔“  
 ”کیوں میں نے کیا کیا ہے؟“

”زبردستی، میرے خیالوں میں، خوابوں میں، آنکھوں میں، دل میں زندگی میں گھسی چلی آ رہی ہو۔“  
 ”زندگی میں؟“

”ابھی کہاں؟“ فلک نے ایک گہری سانس لی۔  
 ”کیا مطلب؟ ابھی کہاں، تم ہو میری زندگی میں۔“

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔  
 ”یہ بات صرف تم اور میں کہہ سکتے ہیں یا سمجھ سکتے ہیں، دنیا والوں کی نظروں میں تو۔۔۔“ فلک نے بات اوھوری چھوڑ دی۔

”دنیا کی نظروں کے سامنے بھی رشتہ قائم ہو جائے گا۔ تم ایسی باتیں سوچ سوچ کر کیوں ہلکان ہوئی ہو؟ دیکھو اگلے سال میری اسٹریڈ کھیلٹ ہوگی، اس کے بعد تو کمری پھر نہیں بھی ماسٹر کرنا ہے، کچھ نا تم تو لگے گانا؟ جہاں گیارہ نے اسے سمجھا دیا۔

”ماسٹر لید میں بھی تو ہو سکتا ہے۔“  
 ”بعد میں کب؟“

”شادی کے بعد اور کب؟“ وہ جھنجھلائی۔

”تم شادی کے بعد ماسٹر کر دو گی تو مجھ سے محبت کون کرے گا؟“

”جہاں گیارہ کی سرسبز پلین۔“

”اچھا، اب تم سو جاؤ بہت نامم ہو گیا ہے۔ مجھے صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے پتا ہے نا۔“ اس نے جتایا۔

فلک نے ایک گہری سانس لی اور خدا حافظ کہہ کے سیل آف کر دیا۔ روز کی طرح آج رات بھی وہ جہاں گیارہ کو سوچتے ہوئے سو گئی تھی۔

\*\*\*

اس کا ایڈیشن ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے جب سویرا اسلام آباد سے آن دھمکی۔ بڑی خالہ کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی۔ امی کی عزیز ترین بھانجی اور فلک کی پیاری سی کزن اور دوست، چلبلی تھی مگر سمجھ داری اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ وکالت پڑھ رہی تھی رات نو بجے کی فلاٹ تھی دو گھنٹے تاخیر سے گیارہ بجے پہنچی بڑے بھیا اور فلک کو امی نے ایئر پورٹ بھیج دیا تھا۔

”بچے ایک ہفتے سے ٹی وی پر پیاری پیاری لوکیوں سے طوفان کی پیش گوئیاں سن رہا تھا، ہمیں کیا خبر تھی کہ طوفان بیچہ عرب کے بجائے اسلام آباد سے آئے گا۔“ قائد اعظم انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہوئے بڑے بھیا نے اپنی ازلی بذلہ سنبھلی کا مظاہرہ کیا۔

”بھولے بادشاہ، ہمارے سارے چھوٹے بڑے طوفان اسلام آباد سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ لاعلم ہیں۔“ سویرا نے اپنا ہینڈ بیگ ٹٹولتے ہوئے جواب دیا۔

”اور بھی ہماری مستقبل کی ڈاکٹر صاحبہ کے کیا حال ہیں؟“ سویرا نے فلک کی جانب دیکھا۔

”یہ غالب اور میروالی ڈاکٹری پڑھ رہی ہیں۔“ فلک سے پہلے ہی بڑے بھیا نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“

”میں نے آگے سائنس نہیں رکھی ہے۔“ اس بار







”اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہاری تعریف میں  
نہجی سے کام لیتا ہے۔“ اس نے گہری سانس لی۔  
”بانی داوے“ محبت میں ایک دوسرے کی تعریف  
کرنا ضروری ہے کیا؟“ فلک نے پر خیال نظروں سے  
اسے دیکھا۔  
”ہاں، اکثر و بیشتر کرنی چاہیے، دل کو اچھا لگتا  
ہے۔“ سویرا نے اثبات میں سر ہلایا۔  
”فاقن بھائی کرتے ہیں تمہاری تعریف؟“  
”اف“ وہ شخص۔۔۔ اگر وہ دیکھنے بھی میرے ساتھ  
گزارے اور کوئی اس سے پوچھے کہ میں نے کون سا  
رنگ پہنا ہوا تھا تو وہ یقیناً ”آئیں بائیں شائیں کرنے  
لگے گا۔“  
”فصول کی مبالغہ آرائی مت کرو، جیسے میں تمہیں  
اور فاقن بھائی کو جانتی نہیں ہوں۔“ فلک نے اسے  
گھور دیکھا۔  
”جب پتا ہے تو کیوں پوچھ رہی ہو۔“ سویرا نے اپنی  
نہی روکی۔  
”ویسے وہ اگر وکیل کے بجائے شاعر قسم کی چیز ہوتا تو  
ایک اچھے دیوان تو ضرور ہی لکھ سکتا۔“  
”جہاں گلی پر ٹیکل مائنڈ کا بندہ ہے اس نے ایک پار  
مجھ سے کہا تھا کہ میں۔۔۔ بہت زیادہ خوب صورت ہوتی  
یا کم ہوتی اسے کوئی فرق نہیں پڑتا، اسے مجھ سے محبت  
ہونا بھی ہو گئی، اب لب و رخسار اور زلفوں کی تعریف  
کیا کرنی۔“  
”پریٹیکل مائنڈ کا بندہ محبت کر سکتا ہے؟“ سویرا  
نے سوال اٹھایا۔  
”کیوں نہیں کر سکتا، دل تو سب کے ہی پاس ہوتا  
ہے اور تم میرا پوسٹ مارٹم کرنے کیوں بیٹھ گئی ہو،  
تمہیں پسند نہیں آ رہی۔“ فلک نے جھنجھلا کر اسے  
دیکھا جو گپ شب کے موڈ میں تھی۔ نہ چرے پر  
تھکن کے آثار نہ آنکھوں میں نیند۔  
”مجھے فکر لاحق ہو گئی ہے تمہاری۔“ سویرا ایک  
بیک سجدہ ہو چلی۔  
”کیوں؟“

”تم نے محبت کے نام پر جہانگیر کے کہنے سے خود  
اتنا بدل لیا کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور  
سے حیران کن بات یہ کہ تم نے اپنا کیرئیر بھی داؤ پر  
دیا، تم تو بہت اچھی اسٹوڈنٹ ہو، کسی بھی شعبے میں اپنا  
کیرئیر بنا سکتی ہو، تم اپنے فیوچر سے کیوں ٹھیک رہی ہو؟“  
”فلک جنگ سے اچھا اور باوقار پروفیشن اور کون سا  
ہے، میرے امی، بابا پیچھے نہیں ہیں کیا؟“ ڈاکٹر، انجینئر بننا  
ہی بس کیرئیر ہے؟“ فلک نے منہ بنایا۔  
”جس سے جیکٹ میں تمہارا بھی انٹرسٹ ہی  
نہیں تھا تم اس کی اچھی استاد کیسے بن سکتی ہو۔“  
”دنیا میں بہت سی عورتیں ہیں جو گھروں میں رہ کر  
گھر کی زندگی گزارتی ہیں۔ ضروری ہے کہ جاب کے  
لیے باہر نکلا جائے، شادی سے پہلے تو یہ سب چل جاتا  
ہے مگر شادی کے بعد ان سب مصروفیات سے لائف  
بہت ڈسٹرب ہو جاتی ہے ہو سکتا ہے میں کیرئیر و مین نہ  
بنوں۔“  
”اچھی خاصی برین واشنگ کر دی ہے تمہاری۔“  
سویرا نے بھڑکیا۔  
”تم بھی تو فاقن بھائی کی وجہ سے لاء ریڈ رہ رہی ہو۔  
انہوں نے بھی تمہاری برین واشنگ کی ہوگی۔“ فلک کا  
موڈ خراب ہونے لگا۔  
”میں نے فاقن کی وجہ سے اس پروفیشن کو چھوڑ  
نہیں کیا بلکہ اس پروفیشن کی وجہ سے فاقن کے لیے  
ہال کی۔ میری پہلی ترجیح میری انجکشن اور کیرئیر ہے  
اور فاقن کا انتخاب اس لیے کیا کہ لاء ہم دونوں کا  
پروفیشن ہے ہمیشہ ہے۔“ سویرا نے انتہائی سنجیدگی  
سے جواب دیا تھا۔  
”دنیا میں لاکھوں کوڑوں لوگ کبھی نہ کبھی کسی نہ  
کسی کی محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں مگر تمہاری باتوں  
سے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے میں نے کوئی انوکھا کام کر لیا  
ہے۔“ فلک نے رات کی سیاہی چھائے آسمان پر  
نظرس کیس جہاں چند راستروں کا سہرا غبار پھیلا ہوا  
تھا۔ کوئی روشنی تو میرے مقدر کی بھی ہوگی، وہ

جہاں سے بڑی دلی تھی۔



اگلے روز دوسرے میں لنچ سے فارغ ہو کر سویرا نے  
اپنی گھر جانے کا اعلان کیا۔  
”لے کر تو جا رہی ہوں مگر خبردار جو وہاں جا کر رکنے  
کے لیے پھیلیں رات میں واپس میرے ساتھ آنا۔“  
فلک نے اسے تنبیہ کی۔  
”وہ بہت شکر ہے مجھے لے جانے کے لیے آپ کی  
مدد اور رہنمائی کا، میں تو اس بڑے شہر میں جیسے کھو ہی  
جاتی۔“ سویرا ہنسی۔  
وہاں حسب توقع خالد کی بڑی ہوا اور ملازمہ کے سوا  
کوئی نہ تھا۔ خالد امی گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں  
استاد تھیں۔ وہ ابھی تک نہیں آئی تھیں، سعد اور فہم  
ایڈمی میں تھے، بڑے احمد بھائی آفس میں اور نرمیا  
ہسپتال میں تھے۔  
”اور سائے بھائی! کیا حال احوال ہیں۔ اس شہر  
اور شہریوں کے سویرا انکلیں پیار کر بیٹھ گئی۔  
”تمہارے سامنے ہی ہے سب کچھ، نہ شہر کے  
حالات اتنے ہیں نہ شہریوں کے، بس دعا کرو اللہ اسے  
امن کا شہر بنادے، امن ہو گا تو ساری مشکلات حل ہو  
جائیں گی۔“ بھابی نے کولڈ ڈرنک سرو کرتے ہوئے  
دوسری سے کہا۔  
”ہم تو پورے پاکستان کے لیے یہی دعا کرتے  
ہیں۔“ سویرا نے ایک گہری سانس لی۔  
”خالد امی تو آئے والی ہوں گی۔ فلک نے بج کولڈ  
ڈرنک کا گھونٹ بھرا۔  
”ہاں بس آنے ہی والی ہیں اس وقت تک آجاتی  
ہیں۔ بھابی نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔  
”کیا پکایا ہے، بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔“ سویرا  
نے فضا میں سوکھتے ہوئے ایک گہری سانس اندر  
کھینچی۔  
”مٹریاؤ دم پر ہے۔ رات کے قیہ کر لیے بھی ہیں،  
تم فون کر دیتیں، ہم کچھ اور بنا لیتے۔“ بھابی نے ملازمہ

کو کولڈ ڈرنک کے گلاس اور ٹرے لے جانے کا اشارہ  
کیا۔  
”بس میرے لیے تو یہی بہت ہے اور رہی بات فون  
کی تو سربراہ آخر کس چیز کا نام ہے۔“ سویرا نے  
جواب دیا۔  
وہ تینوں باتیں ہی کر رہی تھیں جب ایک ایک کر  
کے پہلے تینوں بچے پھر خالد امی اسکول سے آ گئے۔  
سویرا ابھاگ کر بچوں کی طرح ان سے لپٹ گئی۔  
”خالد امی! آپ مجھے اتنا یاد آ رہی تھیں، کیا باتوں؟  
بس بھائی بھائی چلی آئی آپ سے ملنے۔“ وہ یونی گلے  
لگی شروع ہو گئی۔  
”اتنی بڑی ہو گئی یہ لڑکی، حرکتیں ابھی تک وہی  
بچوں والی ہیں۔“ خالد مسکرا میں۔ ”آپ سے امی کی  
خوشبو آتی ہے مجھے۔“ وہ یونی گلے لگے بولی۔  
”میری یہ بیٹی کیسی ہے؟“ فلک  
کے سلام کا جواب دے کر انہوں نے اسے گلے لگایا۔  
”ایک شہر میں رہتے ہوئے مینوں میں شکل دکھاتی  
ہے یہ لڑکی۔“ انہوں نے فلک کا شکوہ سویرا سے کیا۔  
”خوب زور سے کان کھینچیں اس بلو ٹیڈی کے۔“  
سویرا نے بڑے مزے سے اسیں مشورہ دیا۔  
”اب لگ رہا ہے کہ وکیل بن رہی ہو، مشورے  
دینے آ گئے ہیں تمہیں۔“ بھابی مسکرائیں۔  
”یہ تو ہمارا قومی مزاج ہے، اس کے لیے وکیل بننے  
کی ضرورت تھوڑی ہے۔“ سویرا نے ہنس کر کہا۔  
”میں چیخ کر کے اور فریٹش ہو کر آئی ہوں۔“ خالد  
امی اٹھ کھڑی ہو گئیں۔  
”آپ کا لاڈ لایا، لایا، لایا، آتا ہے؟“ کھانے کے بعد  
آکس کریم سے لطف اندوز ہوتے سویرا نے خالد امی  
سے پوچھا۔  
”بس آتا ہی ہو گا ویسے اس کا کوئی ٹائم نہیں ہے۔  
کبھی جلدی بھی آجاتا ہے۔“  
کھانے سے فارغ ہو کر بھابی بچوں کو لے کر اوپر  
چلی گئیں۔ خالد امی سویرا اور فلک سے باتیں کرتے



گلیں۔

”خالہ امی! آپ اب جا کر آرام کریں، تھکی ہوئی ہیں، ہم لوگ ہمیں ایک دوسرے کو پہنچی دے دیں گے پھر سعد اور فدی بھی آجائیں گے۔“ انہیں جمانی لیتا دیکھ کر فلک نے کہا۔

”سعد آجاتا ہے تو پھر میں سو جاتی ہوں، صبح کی اٹھی ہوئی ہوتی ہوں۔“

”آپ فکر مت کریں، جا کر آرام کریں، آپ کے سپوت کو آج ہم ویلکم کریں گے۔“ سویرا نے بھی اصرار کیا۔

خالہ امی کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی جب سعد اگیا، شوخ چہلا اور بقل سویرا ڈراے باز۔

”یا اللہ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں! اسلام آباد اور کراچی دونوں کے چاند ہمارے گھر، اف میں بے ہوش نہ ہو جاؤں کہیں۔“ وہ لہرا کر گرنے کی ایکٹنگ کر رہا تھا کہ صوفے پہ بچ چکر گیا۔

”یہ ڈراے باز ابھی تک چنچ نہیں ہوا، ویسے کاویا ہی ہے۔“ سویرا نے فلک کو مخاطب کیا۔

”تو نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ سعد کا اصل ڈرامہ اب شروع ہوا تھا۔ ”میرے خوابوں کی کشتی بیچ منجھار میں ڈبو دی، قسم سے کبھی تو شدت سے دل کرتا ہے کہ تیرے اس ویل منگتیر پر دفعہ 302 لگوا کر سزا دلا دوں، آخر اس کی وجہ سے

میرے دل کا خون ہوا ہے۔“

”بچ سعد! میں تو اس خوش فہمی میں تھی کہ تم کچھ سدھر گئے ہو گئے، مگر تم تو پہلے سے بھی زیادہ بڑے ایکٹر بن گئے، افسوس فدی محبت بھی تمہیں کچھ سدھار نہیں سکی۔“ سویرا نے مسکراہٹ لبوں میں دباتے ہوئے تاسف سے کہا۔

”سدھار نہیں سکی؟ کیا مطلب؟ یہ کہو کہ میں

بگڑنے سے بچ گیا، میری توبہ مجھ میں نہیں آتا کہ میرا اتنا پند سم اور پیارا بھائی آخر کئی کئی گھنٹے مسکرائے بغیر اور لڑکیوں سے باتیں کیے بغیر کیسے رہ لیتا ہے، مجھے تو

وہ... ہونے لگتا ہے جو امی بولتی ہیں کیا ہے وہ مشکل سا دروازے نے ذرا کر کر سر ہچکایا۔ ”ہاں یاد آیا“ خفلقان! بس یہ ہی ہونے لگتا ہے مجھے، اور تم سناؤ اگل اور باقی سب کیسے ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو پھر رکا۔ ”وہ میرا رقیب روسیہ کیا حال ہیں اس کے۔“ وہ اب بھی شرارت سے باز نہیں آ رہا تھا۔ سویرا اور فلک ہنس پڑیں۔

”خالہ امی ٹھیک ہی بتاتی ہیں تم نے واقعی بچپن میں بھی انہیں بہت ستایا ہوگا، ہر بار ایک نئی شرارت کی اسٹوری سناتی ہیں تمہاری۔“ فلک ہنستے ہوئے بولی۔

”یار! لڑی تو یہ بھی بڑی پیاری ہے، اب دیکھو نا آتی اتنا کم ہے، دو چار ملاقاتیں ہوں، باتیں ہوں، پھر وہ فلک کو غور سے دیکھتے ہوئے چپنے لگا۔

”اے خردوار! جو مجھے ایسی ویسی نظروں سے دیکھا، اپنی یہ باتیں اور حرکتیں اپنی اسٹوڈنٹ قسم کی فرینڈز کے ساتھ کیا کرو۔“ فلک چیخی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خاندان کی ہر لڑکی مجھ سے کیوں بھاگتی ہے، حالانکہ بقل میری امی، لاکھوں میں ایک ہوں، ماشاء اللہ ہر سرور روزگار ہوں، خاندانی ہوں، شریف ہوں، پھر۔“ وہ انتہائی دکھی لہجے میں بول رہا تھا۔

”جھا مسٹر شریف! بات یہ ہے کہ تمہیں جاننے

والی ہر لڑکی تمہارا کیا چٹھا بھی جانتی ہے۔ اس لیے دور

بھاگتی ہے، اب ذرا تم سیریس ہو جاؤ اور۔“

”کس کے ساتھ؟“ سعد نے بڑی بے تابی سے

بات کاٹ کر معصومیت سے پوچھا۔

”تم۔“ سویرا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا کچھ مر

بنادے۔

سعد ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

کھانا کھاتے ہوئے وہ دونوں کو اپنے اکیڈمی کے

بارے میں بتانے لگا۔

”تین سال ہم نے ٹیوشن سینٹر چلایا، اب پچھلے سال سے انٹرنیٹ کے ذریعے غیر ملکی اسٹوڈنٹ کو ٹیوشن پڑھا رہے ہیں۔ ہم دس افراد کا گروپ ہے۔ اور سبجیکٹس کے ساتھ ہم لوگ قرآن اور عربی کی تعلیم بھی دے رہے ہیں۔“

”فاق! بھی پارٹ ٹائم یہ ہی کر رہا ہے، وہ میٹھس پڑھاتا ہے، رقم اکٹھی کر رہا ہے، باہر جانے کے لیے ہائر ایجوکیشن کے لیے انگلینڈ جائے گا۔“ سویرا بھی بتانے لگی۔

”تمہارے اتنے امیر لاکس دن کام آئیں گے، ہونے والے داماد کو تعلیم اسپانسر نہیں کر سکتے؟“ سعد پھر پڑی سے اتر گیا۔

”میں نے اور پیانا نے تو آفر کی تھی، وہ ماننا ہی نہیں، ویسے اتنا تو اس کے ابا بھی افرور کر سکتے ہیں، مگر وہ خود اپنے بل بوتے پر اپنا پیو چرنا چاہتا ہے۔“

”اف! میرا اٹیس سو ستر کا ہیرو، مجھے یہ ماسٹر پیس ملا کہاں سے؟“

”پھر وہی فضول باتیں۔“ سویرا کو ہنسی آگئی۔

”تم لوگ ویب ٹیم اور وائٹ بورڈ پر پڑھاتے ہو یا انٹرایکٹو بورڈ پر؟“ سویرا نے سوال کیا۔

”وہ! بڑی معلومات ہیں آپ کو؟“ سعد نے

آنکھیں پھیل کر اسے دیکھا۔

فاق سے ہی سنا ہے یہ سب، اس لیے پوچھ لیا۔

”ہم لوگ انٹرایکٹو بورڈ کے ذریعے پڑھاتے ہیں یہ

زیادہ موثر ہے، بس یار لوڈ شیڈنگ کا مسئلہ نہ ہو تو

ہماری محنت کا رزلٹ بہت زبردست آئے، ٹھیک

ٹھاک آمدنی ہے، مگر اچھی خاصی رقم جزیرہ نیو کی

فراہمی میں چلی جاتی ہے، بہت بڑا اضافی خرچہ ہے

یہ۔“ سعد شیدہ ہو گیا، ”تم نکھی وکیل، آخر

لوڈ شیڈنگ کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔“

اس نے اچانک پھر سویرا کو نشانہ بنایا۔

”ہاں، ہر کام ہمارا ہی ہے، ہم ہی سڑکوں پر نکلیں،

ہم ہی ڈنڈے کھائیں، پانی بلیک گھر بیٹھی حکومت اور

اپنے نصیبوں کو کوستی رہے، عوام خود بھی سدھر جائیں

تو کچھ نہ کچھ مسائل حل ہو ہی جائیں، کوئی شہر علاقہ، گلی، محلہ ایسا نہیں جہاں کنڈا سٹم نہ ہو۔“ سویرا بحث کے موڈ میں آگئی۔

”عوام کا کیا قصور، حکومت نے خود مجبور کیا ہے ہمیں ایسی حرکتیں کرنے یہ، سعدی نے اس کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے عوام کا دفاع کیا۔

”اف! اکتا پور کر رہے ہو تم دونوں، فلک سویرا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی جھلا کر بولی۔

”یہ ہی ہیں تمہاری وکیل صاحبہ، ورنہ میں تو اتنی اچھی! اچھی رہنا تنگ باتیں کرتا ہوں، کروں؟“ سعدی نے شرارت سے اسے دیکھا۔

”اپنا روانس اپنے پاس ہی رکھو۔“

”ہاں ہاں سنبھال کر رہی رکھا ہے، وہ جو میرے نصیب میں ایک بہت اچھی، بہت پیاری سی لڑکی ہوگی، نا اسی پر خرچ کروں گا، بے قدر لڑکیو! سعد لڑاکا عورتوں کی طرح بولا تھا۔

”احمد بھائی اور فدی کی کیا نا تمنگ ہیں؟“

”بڑے بھائی آجائیں گے سات بجے تک اور فدی ایک گھنٹے بعد آئے گا۔“ سعدی نے کباب کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔

جس وقت فدی آیا تو سلونی شام نے اپنے پچھلے پھیلائے شروع کر دیے تھے، رشنا کو یونیورسٹی سے آئے دیر ہو چکی تھی، کھانا کھا کر وہ سب کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہوئی تو وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔

خالہ امی اور بھابھی نیچے آچکی تھیں اور شام کی چائے کا اہتمام ہو رہا تھا، چائے پیتے ہوئے باتوں کا سلسلہ ایسا دراز ہوا کہ مغرب کی اذان سے ذرا پہلے پرنسوں کی چچھاہٹ پر سب چونکے اور ذرا دیر بعد ہی اللہ اکبر کی صدا مسجد سے آئے گی۔

”چلو بچو! نماز کی تیاری کرو، پھر ہم رات کے کھانے کا دیکھتے ہیں۔“ خالہ امی نے سو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، پھر وضو کے لیے اٹھ گئیں۔

ان کی شام اور رات یوں ہی باتوں اور مسکراہٹوں



کے درمیان گزری تھی۔ کھانا کھا کر بہت دیر بعد رات گئے سعد دونوں کو گھر چھوڑے گیا تھا، خالہ امی اور باقی گھر والوں کے بھی بے حد اصرار پر سویرا کی نہیں۔  
”ابھی تو میں یہاں ہوں نا“ جانے سے پہلے رکنے ضرور آؤں گی پکا وعدہ، کل بہت ضروری ایک جگہ جانا ہے۔“

”تمہیں کل کہاں جانا ہے؟ رات کو وہ سوئے لیٹیں تو فلک کو اچانک خیال آیا۔“

”تمہاری متوقع یا غیر متوقع سسرال۔“ سویرا اطمینان سے جواب دیتے ہوئے کوئلہ کریم سے ہاتھوں پر مساج کرنے لگی۔

”پچھو کے گھر! فلک اچھل کر بیٹھ گئی۔“

”ہاں، مگر تم اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟“

”تم وہاں جا کر کیا کرو گی؟“ فلک نے مشکوک نگاہوں سے اسے گھورا۔

”ظاہر ہے دیکھوں گی وہ لوگ کسے ہیں کیا ہیں؟“

”کیوں ہیں؟“ سویرا غیر سنجیدگی پر اتر آئی۔

”میری نظر سے دیکھو تو تمہیں شاید ہی کوئی برائی نظر آئے، لیکن اگر۔“

”نہ میں تمہاری نظر سے دیکھوں گی نہ اپنی نظر سے میں ایک جگہ کی غیر جانبدارانہ نظر استعمال کروں گی۔“ سویرا اس بار سنجیدہ تھی۔

”مگر می لارڈ یہاں منصف کی نہیں محبت کی نظر کی ضرورت ہے۔“

”ان نظروں سے تم دیکھتی ہونا کافی ہے۔“ سویرا بدستور سنجیدہ تھی۔

”اچھا اب تم سوو گی کب؟“ فلک نے منہ بسورا۔

”کیوں؟“ وہ بڑے اٹھماک سے مساج میں مصروف تھی۔

”ہمارے صاحب کا فون آئے گا۔“

”لاؤ تھوڑی سی کاٹن دو۔“ سویرا بے ساختہ بولی۔

”کیوں؟“

”کانوں میں لگاؤں گی۔“ وہ سادگی سے بولی تھی مگر فلک ہنس پڑی۔

”فائق بھائی تمہیں فون نہیں کرتے سونے سے پہلے؟“ فلک کا سوال اور انداز بڑی معصومیت لے ہوئے تھا۔

”وہ موصوف دن میں ہی کبھی کبھار مجھے یاد فرماتے ہیں، رات میں کل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ سویرا اس کا سوال سن کر ہنس پڑی۔

”اچھا! فلک اس کا جواب سن کر کچھ مایوس سی ہو گئی تھی۔“

”بات دراصل یہ ہے بے وقوف لڑکی! کہ محبت رات دن بات کرنے کی محتاج نہیں ہوتی، دل سے دل کا رابطہ کافی ہے، ہر وقت کا اظہار اور اقرار بے معنی ہوتا ہے۔“

”جی نہیں، محبت کو بار بار اظہار کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اقرار کی بھی۔“ فلک نے فوراً اس کی بات سے اختلاف کیا۔

”ہاں! میں اس کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔“ سویرا نے سر ہلایا۔

”تم تو مجھے بڑی بی ہو۔“

”عمر کا تعلق سن پیدا نش سے نہیں انسان کے شعور سے ہوتا ہے۔“

”جی یہ موٹی موٹی شعور لا شعور کی باتیں فائق بھائی کو سنانا مجھے تو نیند آ رہی ہے۔“ فلک نے خاصی بد تمیزی سے اس کی بات کاٹ کر جمائی لی۔

”سو جاؤ، تم تو ویسے بھی نیند میں ہی ہو، جاگ کب رہی ہو۔“ سویرا کے الفاظ اور انداز دونوں ہی معنی خیز تھے۔ فلک اتنی بے وقوف یا سیدھی تو نہ تھی۔ بین السطور چھپا ہوا مفہوم کچھ نہ کچھ سمجھ گئی۔

”تمہاری ان باتوں کے جواب میں کل دوں گی۔“ فلک تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

”ولاٹل ڈھونڈو گی۔“

”ہوں۔“ فلک نے مبہم سی ہوں کی باتھ میں موبائل پکڑے اس کا رواں رواں تیل بچنے کا منتظر تھا۔

اور تب ہی اس کے دل کی مراد برآئی تھی۔



واپسی کا سفر ذرا سنجیدہ اور خاموش تھا۔ اسے کچھ کہہ اندازہ تھا کہ سویرا کیا کہے گی۔ مگر پھر بھی وہ اس کی رائے کی منتظر تھی۔

”یہ لوگ اور یہ ماحول تمہارے لیے بالکل بھی موٹا سیل نہیں، گھر کے قریب پہنچ کر سویرا نے چپ اردوزہ توڑا۔“

”صرف اس لیے کہ وہ غریب ہیں یا ان کے ہاں ہماری طرح کے بے معنی تکلفات نہیں؟“

”نہیں، غریب ہونا کوئی عیب یا برائی نہیں، مگر اسے دراصل پر مسلط رکھنا اور خود کو اور حالات کو بدلنے کی کوشش نہ کرنا بہت بڑی برائی ہے۔“

”مجھے زندگی جمانگیر کے ساتھ گزارنی ہے، اس میں اتنی اہمیت نہیں ہے کہ وہ اپنے حالات بدل سکے، چند سال لکھیں گے اسے اسٹیبلشمنٹ ہونے میں۔“ فلک نے صفا پیٹیشن کی۔

”میں پھر ہی کہوں گی کہ تم بہت بے وقوف ہو اور پلیز مائنڈ مت کرنا، جمانگیر کا سب سے نمایاں پس پوائنٹ یہ ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہینڈ سم ہے اور میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہوسیار بھی ہے، اس کی تعلیم، قابلیت اور صلاحیت اپنی جگہ، مگر تم اس کے ساتھ وہ زندگی نہیں گزار سکو گی جس کے تم خواب دیکھ رہی ہو، ریشیل لائف خواہوں کی زندگی سے مختلف اور ذرا دلچ بھی ہوتی ہے۔“ سویرا محسوس کیا۔

فلک کے چہرے کی جوت کم ہونے لگی۔

”تم کچھ زیادہ ہی انتہا پسند بن رہی ہو، نہ میں کوئی شہزادی ہوں نہ وہ لوگ غریب رعایا، مانا کہ ہمارے ماحول میں تھوڑا بہت فرق ہے، مگر اتنا بھی نہیں جتنا بھانک نقشہ تم کھینچ رہی ہو۔“ فلک نے احتجاج کیا۔

مگر اس کا یہ دعو اچھ اچھا غلط بھی نہیں تھا۔ دو ماہ بعد جب پچھو جمانگیر کے لیے اسے مانگے آئیں تو امی، ابو سمیت سب گھر والے حیران تھے اور جب فلک کی مرضی بتا چلی تو یہ حیرانی ریشال میں بدل گئی۔ پاپا خاموش تھے، امی اتنی غصے میں تھیں کہ انہوں نے خود فلک سے کوئی بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا، یہ فریضہ آپلی کے

جسے میں آیا، اس پر بھی فلک نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ امی کے مقابلے میں آپلی سے بات کرنا زیادہ آسان تھا۔

”پچھو تمہاری مرضی سے آئی ہیں؟“ آپلی سخت شاکلہ تھیں۔

”جی! وہ منمنائی۔“

”سب کچھ جانتے بوجھتے بھی تم نے اتنا بڑا اسٹیڈ لیا، ایک گھر اور ماحول میں چند گھنٹے گزارنا اور بات ہے اور ساری زندگی گزارنا اور بات، تم نے یہ سوچا بھی کیسے؟“

”مجھے زندگی جمانگیر کے ساتھ گزارنی ہے، اس کی قابلیت پر کوئی شک ہے آپ کو؟“

”مجھے اس پر کوئی شک نہیں کہ وہ قاتل ہے اور اس بات پر بھی کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے گھر والوں سے نہ الگ ہے نہ مختلف، باغرض یہ شادی ہو بھی جائے تو تم کسی الگ سیارے پر تو اس کے ساتھ گھر بسانے سے رو ہیں، پچھو کے گھر لانے سے ایک نیا تعلق اور نیا رشتہ قائم ہو جائے گا، کیسے بھلاؤ گی؟“

فلک خاموش رہی۔

”دیکھو! یہ خیال دل سے نکال دو، ہمارا ان کے ساتھ کوئی بیچ نہیں ہے۔“ آپلی نے مزید سمجھایا۔

”صرف اس لیے کہ وہ غریب ہیں اور کم تعلیم یافتہ ہیں۔“ فلک نے ذرا جھجکتے ہوئے لہجے میں کہا، لے دے کے اس کے پاس یہ امی ایک جذباتی دیبل رہ جاتی تھی۔

”فلک! ہمارے ماں باپ نے ہمارے لیے بہت محنت اور جدوجہد کی ہے، امی خود سے کبھی کچھ نہیں کہتیں، مگر پاپا بتاتے ہیں کہ شادی کے بعد دس سال انہوں نے ایسے گزارے کہ موٹا جھوٹا کھلیا اور پرتنا شادی کے قریب امی کا گریجویشن بھی کیمپلٹ نہیں تھا، یہ دس سال انہوں نے اپنی تعلیم بھی مکمل کی، بچے بھی پیدا کیے، پالے، گھر داری بھی کی، جاب بھی کی، اگر وہ بھی اپنی غربت، کم تعلیم اور اس پسماندہ اور فرسودہ ماحول سے سمجھوتا کر لیتیں تو شاید آج ہمارا گھر اور ہمارا



حال، پھپھو کی فیملی سے مختلف نہ ہوتا۔ آپنی نے چند لمحوں کا توقف کیا پھر دوبارہ گویا ہوئیں۔ ”شادی ایک فرد سے نہیں اس کے پورے گھر اور ماحول سے ہوتی ہے، ان سب کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا پڑتا ہے، گزارا کرنا پڑتا ہے۔“

”میری ان سب کے ساتھ بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔“ فلک نے جتانے والے انداز میں کہا۔

”ہی اور پاپا کی بالکل بھی مرضی نہیں ہے کہ تمہاری انجوائمنٹ کھیلٹ ہونے سے پہلے رشتے یا شادی وغیرہ کا معاملہ طے کیا جائے اور جہاں تک اسے ساتھ تو قطعی نہیں۔“ آپنی نے صاف صاف بات کی۔

”ویسے تو ہمارے گھر والے بہت لبرل اور روشن خیال بنے ہیں، ہر فرد اپنے معاملات میں خود مختار اور آزاد ہے اور میں اپنی لائف کا سب سے اہم فیصلہ اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی۔“ دکھ اور صدمے سے فلک کی آواز بھرا رہی تھی۔

”ہمارے پیرنس نے ہمیں خود اعتمادی کی دولت دی ہے، خود پر اعتماد کرنا سکھایا ہے، مگر تم نے اس کا بہت غلط فائدہ اٹھایا، اپنے معاملات میں آزادی دینے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔ یہ حق اور اختیار بہر حال ان ہی کے پاس ہے، تم اپنی پاپا کو یا ان کی مرضی کو کیسے انکوار کر سکتی ہو۔“ آپنی سخت سچے میں بولیں۔

وہ رو پڑی۔

”رونے سے کیا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا؟“ آپنی نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

”میں اس سے محبت کرتی ہوں، شدید محبت۔ میں جہاں تک کے بغیر نہیں رہ سکتی، میں مر جاؤں گی، اس کی جدائی کے تصور سے میری سانسیں رکنے لگتی ہیں۔“

فلک، آپنی سے یہ سب کہنا چاہتی تھی، مگر کہ نہ سکی، فقط بے بسی سے انہیں دیکھ کر رو رہی تھی۔

\*\*\*

مگر جہاں تک اس نے یہ سب کہا اور اس کے علاوہ

اور بھی وہ سب کچھ جو اس کے دل میں تھا۔

”مجھے اندازہ تھا کہ تم اتنی آسانی سے میری نہیں ہو سکتیں اور پلینڈ سٹریٹ کرنا، مگر ممانی جان شروع سے ہی ہم لوگوں کو اپنا رشتہ دار رکھتے ہوئے کتراتے ہیں انہوں نے کبھی پرانے رشتوں کو اہمیت نہیں دی تو کسی نئے رشتے کی کیا امید رکھی جاسکتی ہے ان سے۔“

جہاں تک کے لہو پہ ایک پھپھو کی مسکراہٹ تھی۔

بلکی سی بڑھی ہوئی شیو اور تھوڑے سے پریشان چہرے کے ساتھ بھی وہ اتنا پنڈ سم لگ رہا تھا کہ فلک نے اختیار اسے دیکھ چلی تھی، اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ جہاں تک اس کی ماں کے متعلق جو کچھ کہہ رہا تھا اس پر اعتراض ہی کر دیتی کیونکہ جہاں تک بات غلط تھی۔ اسی کا ملنا جتنا رشتے داروں سے ذرا کم ہی ہوتا تھا۔ مگر انہوں نے اپنے کسی بچے کو بھی ان قریبی رشتوں سے نہ ملنے سے روکا اور نہ ہی ان کے خلاف کبھی بھڑکانے کی کوشش کی۔

”تم سن رہی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”کیا؟“ وہ ایک دم چونکی۔

”مگر تمہارے گھر والے نہیں مانتے تو ہم کورٹ میں ج کر لیں گے۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بول رہا تھا۔

”کورٹ میں ج؟“ فلک نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”اور ویسے بھی میرے گھر والے تو سب راضی ہیں، ای تو کل ہی ہمارا نکاح پڑھوایں، کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے، تم بتاؤ، ایکری کرتی ہو یا نہیں؟“ اس نے گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی۔

اتنا بڑا قدم، محبت کی تمام شدت اور بہادری اپنی جگہ، مگر یہ انتہائی فیصلہ۔ فلک کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

”بولو، پارک کی سٹی بیچ پر رکھے اس کے سرو ہاتھ کو جہاں تک رہتا تھا۔“

کیا کروں؟ ڈھلتی سہ پہر سورج کی کرنوں کو سمیٹ رہی تھی، ایک لارڈو جھونکے سے اس کا آئینل سر سے سرکا دیا، فلک کا دل یوں تیز تیز دھڑکنے لگا جیسے

کی پالیوں کا بچہ توڑ کر ہر نگل آئے گا۔

”کچھ وقت انتظار کر لیں تو۔“ کیا پتا آگے چل کر حالات بہتر ہو جائیں، ہو سکتا ہے گھر والے مان جائیں۔“ فلک نے کمزور سی امید کا ہاتھ تھانے کی کوشش کی۔

”نہیں مائیں گے۔“ جہاں تک کے ایک گری سانس لے کر اس کے صلیج چہرے پر نظریں جمادیں۔ فلک کا دل ڈوبنے لگا۔

”کوئی اور حل نہیں؟“

”اگر تمہارے پاس ہے تو بتاؤ۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”میں کیا بتاؤں؟ میرا تو دل ہی کام نہیں کر رہا، کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”تو پھر جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔“

”بہت مشکل ہے جہاں تک یہ کس طرح جاسبل ہے کہ میں۔۔۔“ اس نے بات اور دھوری پھوڑ دی۔

”مگر یہ جاسبل نہیں ہے تو مجھے بھول جاؤ، یہ خیال دل سے نکال دو کہ ہم بھی ایک ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک اس کے الفاظ سے زیادہ پتہ چلا تھا، فلک اسے دیکھتی رہ گئی۔

”یہ تم کہہ رہے ہو؟“ وہ بے یقینی کی کیفیت میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”تم خود سوچو میں یہ انتہائی قدم کیسے اٹھا سکتی ہوں، میرے پیرنس کی عزت خاک میں مل جائے گی۔“

فلک گڑبلائی۔

”یا تو گھر والے اور ان کی عزت، یا پھر میں اور میری محبت، دونوں میں سے جسے چاہو جن لو، اختیار بھی تمہارا اور مرضی بھی تمہاری۔ وہ لب بچنے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اتنا کھوڑا اتنا تنگ دل کیوں بن رہا تھا، فلک کا ذرا سہا دل سمجھنے سے قاصر تھا۔

”چلو اٹھو، میں لیٹ ہو رہا ہوں۔“

فلک اٹھ کھڑی ہوئی، اس کی ہر اہی میں چلتے ہوئے آج پہلی بار اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپ

رہا تھا۔ آگے جانے والے رستے اچانک ہی ایک گہری تاریکی میں کھو گئے تھے۔ وہ حیران پریشان کھڑی بے بسی سے ان اندھیروں کو دیکھ رہی تھی، جس نے اس کی منزل کے ساتھ ساتھ اس کے خوش رنگ خوابوں کو بھی نکل لیا تھا۔

سہ پہر ڈھل کر شام کو خوش آمدید کہہ رہی تھی اور فلک کو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ اس کی محبت بلکہ زندگی کی آخری شام ہو۔

\*\*\*

گھر کے ماحول میں ایک واضح تناؤ در آیا تھا۔ معین صاحب اور شاہدہ بیگم کی خاموشی فلک کو کھائے جا رہی تھی۔ بڑے بہن، بھائیوں نے اپنے اپنے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی یہ اور بات کہ فلک کی سمجھ میں اس وقت کسی کی بات نہیں آ رہی تھی، اور ویسے اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس معاملے میں گھر والوں کا رد عمل اتنا سخت ہو سکتا ہے۔

”وہ ہائی انجوائمنٹ پرسن ہے، اگر اس جیسا قابل شخص بھی میرے گھر والوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تو پھر ان کے معیار یہ کون سا پرسن پورا اترے گا۔“ وہ حیران ہو کر سوچ رہی تھی۔ پھر یہی بات اس نے سویرا کے ساتھ شیئر کی۔

”تم نے جہاں تک سے کہا تھا کہ پھپھو کورشتے کے لیے بھیجے؟“ سویرا نے پوچھا۔

”نہیں! مجھے تو بالکل بھی علم نہیں تھا، یہ ہی اندازہ“ وہ اچانک ہی آئی تھیں، میں خود حیران تھی، جہاں تک نے بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا تھا۔“

”اب؟“

”اب کیا؟ جتنا تو بچکی ہوں کہ کوئی بھی راضی نہیں، ای تو مجھ سے بہت ہی ناراض ہیں۔“ فلک نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

”ہونا بھی چاہیے۔“ سویرا کا اطمینان قابل دید تھا۔

”تم بھی ان ہی کی فیور کر رہی ہو؟“ فلک ناراضی



سے بولی۔

”یہ بتاؤ جمانگیر کیا کہتا ہے؟“ سویرا نے مزید جرح کی۔

”وقت“ فلک کچھ کہتے ہوئے ہچکچائی۔ ”وہ بھی پریشان ہے کیا کہے گا؟“ فلک نے دانستہ گول مول جواب دینے کی کوشش کی۔

”ڈاکٹر اور وکیل سے کچھ چھپانے یا غلط بیانی کرنے سے اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ جو بھی بات ہے سچ سچ بتاؤ۔“ سویرا ہزاروں میل دور فون کے دوسرے سرے پر تھی، مگر پر بھی اس نے فلک کی ہچکچاہٹ محسوس کر لی تھی۔

”وہ کہہ رہا تھا کہ اگر گھر والے نہیں مانے تو پیچھو ہمارا نکاح کر دو اس کی۔“ فلک نے بڑی مشکل سے آدھا سچ اگلا۔

”اچھا! اور اگر پیچھو بھی اس کا خیر کے لیے تیار نہ ہوتیں تو وہ کورٹ میں جج کی آفر کرتا؟“ سویرا قریب قریب اس پوائنٹ تک پہنچ گئی تھی جسے وہ چھپانے کی سستی کر رہی تھی۔

”تم میری ہیلپ کر دینا۔“ ”اگر مجھے محسوس ہوتا کہ تمہیں واقعی میری مدد کی ضرورت ہے تو میں ضرور تمہارے کسی کام آتی، مگر تم کہہ رہی ہو کہ کنویں میں گرنے میں تمہاری مدد کروں، تم خود بتاؤ بھلا میں ایسی ہیلپ کیسے کر سکتی ہوں۔“ سویرا نے بے حد نرمی سے اسے سمجھایا۔

”تم بھی میری فیملنگز نہیں سمجھ رہیں، تم سمیت ہر کوئی بس ان کا گھر، گھر والے اور ماحول دیکھ رہا ہے، میری اور میری فیملنگز کی، میری لائف کی، کسی کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں، مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ پسند سے اپنا لائف بائرنر چھنے کا؟ اپنی مرضی سے لائف گزارنے کا؟ جسے دیکھو مجھے سمجھانے پر اور نصیحتیں

کرنے پر تھکا ہوا ہے تم میری بہن، ہو میری دوست ہو، تم سے بڑی امید تھی مجھے، مگر تم بھی میری مخالفت کر رہی ہو۔“ فلک روہاسی ہو گئی۔

”ہماری زندگی کا ہر معاملہ ہماری مرضی یا پسند سے

ملے نہیں ہوتا۔ بہت ساری باتیں اور چیزیں ناگوار گزرتی ہیں، مگر قدرت نے ان میں ہمارے لیے بھلائی رکھی ہوئی ہے۔ ذرا حقیقت پسند اور غیر جانبدار ہو کر سوچو تو تمہیں مجھ سمیت کسی کی بھی باتیں ہرگز نہیں لگیں گی۔ ویسے میرا مشورہ تو یہ ہی ہے کہ انہی خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دو، جہاں تیرے کو کہ جب تک تمہاری انجکشن کمپلیٹ نہیں ہو جاتی وہ اس معاملے میں بالکل خاموشی اختیار کرے، جب وقت آئے گا تب حالات کے مطابق کوئی مناسب اسٹینڈ لے لے۔

”وہ کہتا ہے کہ گھر والے آج نہیں مان رہے تو کل بھی نہیں مانیں گے۔“

”بلاوجہ کے مفروضے کو قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وقت آنے دو، پھر دیکھو قدرت کیا فیصلہ کرتی ہے۔“ سویرا بول رہی تھی۔

فلک کو اس کی بات سے اتفاق نہ تھا، مگر وہ کچھ کہنے کے بجائے خاموش ہو گئی۔

”تم سمجھ رہی ہو یا نہیں کیا کہہ رہی ہوں؟“ ”میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا فرق پڑتا ہے، مجھے تو بس یوں لگ رہا ہے کہ میں ویران جزیرے پر کھڑی اکیلی فرد ہوں، نہ ساحل نظر آتا ہے، نہ شے، نہ سارے کے لیے جس کی طرف دیکھتی ہوں وہ منہ پیہم لیتا ہے، میں کیا کروں؟“ فلک بہت دل شکستی سے کہہ رہی تھی۔

”میرے پاس ایک خبر ہے تمہارے لیے، سوچا تھا کچھ عرصے بعد بتاؤں گی، مگر اب مجھے لگتا ہے کہ بتا دینا چاہیے۔“ سویرا نے اس کے جذباتی مکالمے نظر انداز کر کے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”میں اس وقت خود بھاسی کے پھندے پہ جھول رہی ہوں، مجھے کسی خبر سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ فلک بے زاری سے بولی۔

”مگر یہ بات تمہارے متعلق ہے اور تمہیں ضرور اس سے دلچسپی ہونی چاہیے۔“ سویرا نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

فلک کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اب سویرا کے آگے مزید کچھ بولنا بے فائدہ ہے۔ اسے جو کچھ کہنا ہے وہ بتا کر ہی دم لے گی۔

”خالہ امی کی خواہش ہے کہ وہ تمہیں اپنی بہو بنائیں اور سعد کی مرضی بھی یہی ہے، آئی تھنک کہ وہ تمہیں لائیک کرتا ہے۔“ سویرا نے بلی ہیلے سے باہر نکالی۔

”تمہیں یہ نیوز پلیٹن کس نے سنایا؟“ فلک مشکوک ہوئی۔

”بہر حال“ مجھے اس خبر میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے، تم ان فضول باتوں کو چھوڑ دو اور میرے مسئلے کا حل نکالو۔“ فلک نے بے زاری ظاہر کی۔

”تم اپنی مرضی کا حل چاہتی ہو جو پاسبل نہیں۔“ سویرا نے ایک گہری سانس لی۔

”تم کراچی نہیں آسکتیں، ایک آدھ ہفتے کے لیے؟“

”بالکل بھی نہیں، ان دنوں تو بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے، اور تمہارے مسئلے کافی الجھال یہ ہی ایک حل میری سمجھ میں آ رہا ہے، جو تمہیں بتا چکی ہوں کہ جہاں تیرے کو اس وقت خاموشی اختیار کرے اور مناسب وقت آنے پر یہ بات اٹھائے۔“

”وہ نہیں مانے گا۔“ فلک بے ساختہ بولی تھی۔

”آج تک تم نے اس کی ہر بات مانی ہے، اب یہ بات تم اس سے منواؤ۔“ سویرا نے زور دے کر کہا۔

”میں یہ کیسے کروں؟“ فلک منمنائی۔

”جیسے محبت کی ہے، کسی کی بھی پروا کیے بغیر۔“ سویرا نے صاف گوئی سے کہا۔ فلک اس کی بات سن کر

جانے کیوں خفیف سی ہو گئی۔

”میں کوشش کروں گی۔“ وہ کچھ دیر بعد آہستہ سے

گویا ہوئی۔

”گھر۔“ سویرا نے اطمینان کا سانس لیا۔

”اب ذرا یہ کوشش کر کے دیکھو، پھر آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ سویرا نے ایک دو باتیں اور کر کے

اسے تسلی دی۔

فون بند کر کے فلک کتنی ہی دیر یوں ہی بیٹھی رہی۔

\*\*\*

فلک نے اس کے سامنے تجویز رکھی تو سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا۔

”تم بالکل تو نہیں ہو گئی ہو، میں جلد سے جلد تمہیں اپنا بنانا چاہ رہا ہوں، اور تم بڑے آرام سے کہہ رہی ہو کہ میں خاموشی اختیار کر کے انتظار کروں اگر خاموشی سے انتظار کرنا ہوتا تو اپنا پروپوزل کیوں بھیجتا۔“ وہ بہت غصے میں بول رہا تھا۔

”مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ پیچھو نے تمہیں بھی نہیں بتایا تھا۔ بس خود ہی فیصلہ کر کے ہمارے گھر آئیں، فلک نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ وہ میری پسند اور مرضی سے آگاہ تھیں، جب ہی تو تمہارا پروپوزل لے کر آئیں، وہ اکدم گڑ بڑایا۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کر رہے ہو، کیا کہہ رہے ہو، مگر کم از کم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، کچھ عرصے کی بات ہے شاید سب کچھ ٹھیک اور اچھا ہو جائے۔“ فلک کا لہجہ ملتی جلتی نہ ہو گیا۔

”یہ کچھ عرصے کی نہیں بلکہ کچھ سالوں کی بات ہے اور یہاں منٹوں سیکنڈوں میں دنیا، حالات اور لوگ بدل جاتے ہیں، سالوں بعد کی کیا گارنٹی ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ میں کوئی رسک نہیں لے سکتا، میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے، اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتی ہو تو تمہیں میرا ساتھ دینا پڑے گا۔“

جہاں تک وہ ہٹ و ہٹ دھرمی سے بولا۔

”تم میرا امتحان کیوں لے رہے ہو؟“ وہ روہاسی ہو گئی۔

”تو کیا ہوا؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ سچ محبت کرتی

ہو یا صرف دعو ہے۔“ وہ بہت دلکشی سے مسکرایا تھا۔

”میرا دل چاہ رہا ہے میں مجاؤں۔“ فلک کی ستارہ سی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔



”ان آنسوؤں کا مطلب سمجھتی ہو؟“ جمائگیر نے اس کی لبالب بھری آنکھوں میں جھانکا جو بس چھلکنے کو تیار تھیں۔

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں نہ مجھ پر اعتبار ہے نہ خود پر اور نہ ہماری محبت، تمہیں بس دنیا اور دنیا والوں کا خوف کھانے جا رہا ہے تمہیں بتاؤ یہ محبت اور خوشیاں تمہیں میرے علاوہ کوئی اور دے سکتا ہے؟“ اس نے ذرا جھک کر سوال کیا۔

”نہیں۔“ فلک کا سر بے اختیار نفی میں مل گیا۔

”پھر مجھے بھروسہ کیوں نہیں کرتیں؟“

”کرتی ہوں جمائگیر! مگر میرے گھر والوں کی عزت سے مجھے وہ بھی تو عزیز ہے۔“ فلک بے بسی سے ہونٹ چبانے لگی۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو ذلیل کرنا چاہتا ہوں؟ وہ میرے بھی رشتے دار ہیں نہ بھی ہوتے تو تمہارے حوالے سے مجھے عزیز ہوتے ان کی عزت مجھے پیاری نہیں؟“ جمائگیر کا لہجہ نرم اور دھیمہ ہو گیا۔

”دیکھو!“ سمجھنے کی کوشش کرو بات صرف اتنی سی ہے کہ میرے گھر والوں کی موجودگی میں ہمارا نکاح ہوگا وہ بھی صرف امی اور دونوں بڑے بھائی، میرا ایک دوست بھی میرا ساتھ دینے کو تیار ہے۔ اس کا ایک فلیٹ رہنٹ پر تھا ابھی خالی ہوا ہے، وہ وہاں سارے انتظامات کروے گا، کسی کو کالوں کاں خبر بھی نہیں ہوگی، رہی بات تمہارے گھر والوں کی اور ان کی عزت کی تو ہم اس نکاح کو دنیا بھر میں نشر نہیں کریں گے، اگر ایسا کرنا ہو تا تو میں اپنی بہنوں کو اس معاملے میں شریک کرتا، مگر جانتا ہوں کہ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں ان سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ وہ کوئی راز راز میں رکھیں، میری ماں کی بات اور ہے وہ کسی اور بات کا خیال کریں نہ کریں اپنے بھائی اور بیٹی کی عزت کا خیال ضرور کریں گی، اور رہی بات تمہارے گھر کی تو صرف ماموں اور ممانی کو اس بات سے آگاہ کیا جائے گا تاکہ ان کے پاس انکار کی یا کوئی رکاوٹ ڈالنے کی

گنجائش نہ رہے۔“ جمائگیر نے تفصیل سے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

”مجھے کچھ وقت تو دو سوچنے کے لیے۔“ فلک نے اس کی بات سن کر کافی دیر بعد کہا۔

”ایک دو دن کا پیس؟“ جمائگیر نے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

اور وہ گو گو کی کیفیت میں تھی۔

\*\*\*

وہ ایک گہری سانس لے کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ چند ہی دنوں میں اس کے چہرے کی شادابی اور خوب صورتی ماند پڑنے لگی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے لگے تھے۔

”دیکھو فلک!“ اس نے آنکھیں بند کر کے خود کو مخاطب کیا اور تمام تر توجہ ایک ہی نکتے پر مرکوز کی ”تمہیں اپنے لیے خوشیاں خود آگے بڑھ کر لینا ہوں گی۔ اپنے اندر جرات اور ہماوری پیدا کرو۔ فیصلہ کرنے کی جرات اور اس پر ڈٹے رہنے کی جرات، دنیا تمہارے قدموں میں ہوگی، کسی سے مت ڈرو، خوف اور اندیشے ہماری زندگی اور خوشیوں کے دشمن ہیں۔“

کئی بار دل میں یہ بات دہرا کر اس نے چند گہرے گہرے سانس لیے اور آنکھیں کھول دیں۔ وہ بہت حد تک خود کو پرسکون محسوس کر رہی تھی۔ یہ طریقہ اسے جمائگیر نے ہی ایک بار بتایا تھا اس نے کہا تھا کہ وہ جب بھی کسی مشکل یا ٹینشن میں ہوتا ہے تو ایسے ہی کرنا ہے۔

”میری ہر مشکل اور ٹینشن یوں منوں میں غائب ہو جاتی ہے۔“ اس نے بڑے اعتماد سے چٹکی بجا کر کہا تھا۔ فلک نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا اور وہ چہرے انگیز طور پر خود کو بہت ہلکا چھلکا محسوس کر رہی تھی۔

\*\*\*

آج کالج سے واپس براس نے اپنا سر پھپھو کے گھر کی طرف کر لیا۔ ارادہ اچانک ہی بنا، مگر نہ اس نے سوچا

تھا کہ رات کو فون کر کے جمائگیر کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دے گی، مگر یونیورسٹی سے واپسی کے دوران کا اس کا یہ ارادہ اچانک ہی بدل گیا شدت سے اس کا دل چاہا کہ وہ خود جمائگیر کے روبرو اسے یہ بات بتائے کہ اس نے کسی کی بھی پروا کیے بغیر اپنے لیے محبت اور جمائگیر کی ہم سفری کا انتخاب کیا ہے۔

وہ تصور میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ حیرانی، بے تحاشا مسرت اور شادابی کے رنگ وہ سوچ سوچ کر مسکرا رہی تھی۔

گھر کا دروازہ حسب معمول کھلا ہوا تھا۔ یہاں کنڈی وغیرہ لگائے کا تکلف شاذ و نادر ہی کیا جاتا تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے وہ رکی، بیک سے رومال نکال کر چہرہ صاف کرنے لگی۔ اندر سے جمائگیر کی آواز آرہی تھی۔ فلک کی توقع کے عین مطابق وہ آج اس وقت گھر پر ہی تھا، وہ طمانیت سے مسکرا دی اور دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”بھائی! نکاح کی تصویریں ضرور بنانا، اندر سے جمائگیر کی چھوٹی بہن کی آواز آئی تھی۔ فلک کا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا۔

”اس نے تو کہا تھا کہ یہ بات امی کے علاوہ اور کسی کے علم میں نہ ہے نہ ہوگی۔“ فلک کا دل یکدم ہی اندیشوں میں گھر گیا۔

”بیگم صاحبہ کی تو عزت کا جالوس نکل جائے گا، بڑی آن بان شان والی بیٹی ہیں ہماری پروفیسر ممانی بیگم۔“ جمائگیر کا ایک ایک لفظ زہر میں بچھا ہوا تھا۔ باہر کھڑی فلک پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔

”کیا نکاح نامے کی فوٹو کاپیاں دیواروں پہ لگواؤ گے۔“ چھوٹی والی کے ہنسنے کی آواز آئی۔

”یوٹیوب کسی مرض کی دوا ہے، انٹرنیٹ کے دور میں دیواروں پر اشتہار کون لگاتا ہے بے وقوف۔“ دوسری بہن کی آواز آئی تھی۔

”تم لوگ بلاوجہ باتیں بنا کر خوش ہو رہے ہو، فلک مان بھی جائے گی یا نہیں؟“ ماجدہ آپا نے سوال کیا۔

”جہاں تک میں اسے جانتا ہوں تو وہ اب تک



فیصلہ کر چکی ہوگی، جو میری مرضی کا ہے، اور آج رات تک اس کا فون بھی آجائے گا۔“ جہانگیر نے بڑے اعتماد سے دعو کیا۔

”جل چھوڑ جاگیر کیوں میری بچی کے پیچھے رہ گیا ہے تو؟ اس کی زندگی خراب نہ کر، اس کا دل دھلنے کا کوئی کام نہ کر۔“ پیچھو کی آواز میں التجائی تھی۔

”آپ بے کار میں پریشان ہو رہی ہیں۔ میں اس کی زندگی کیوں خراب کروں گا؟ نکاح کروں گا تو رخصتی بھی کرواؤں گا۔ اسے تھوڑی کوئی تکلیف دوں گا میں تو بس اس کی عالم فاضل مہی کو سبق سکھانا چاہتا ہوں۔ اسے دکھاؤں گا کہ جس قابلیت، عزت اور اسٹیٹس کا ڈھول پیٹ کر اس نے میری ماں اور گھر والوں کو رنجش کیا تھا۔ اس کی بیٹی نے ان ہی جاہل غریبوں کو اپنے لیے چنا۔ ساری تعلیم و تربیت دھری کی دھری رہ جائے گی۔“ جہانگیر کا زہر ملا لب و لہجہ فلک کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اسے یوں لگا کہ کوئی کند چھری سے اسے زہن کر رہا ہو۔

”تو بھی پاگل ہے، اب سالوں پرانی بات ہو گئی وہ“ میں تو بھول بھال بھی گئی اور مجھے بدلہ لینے کی ضد چڑھ گئی میں تو تیرے سامنے بول کر پچھتاؤں۔“ پیچھو کی آواز میں بے زاری کا رنگ نمایاں تھا۔

”نہانی نے بھی تو حد کر دی تھی امی! خاندان بھر کے سامنے ہماری بے عزتی کی تھی۔ بیٹی نہیں دینی تھی نہ دیتیں، ہماری ماں کو اور ہمیں جاہل کے خطاب تو نہ دیتیں۔“ ماجدہ اپنے بھائی کی حمایت کی۔

”ایمان داری سے سوچوں تو غلطی میری بھی تھی۔ مجھے سب کے سامنے بچی کے ہاتھ میں انگوٹھی نہیں پہنانی چاہیے تھی۔ کوئی زبردستی کا سودا تھوڑی ہے، میں نے یہ سوچا کہ میرا بھائی مجھے انکار نہیں کرے گا۔ یہ بھول گئی کہ کوئی بھی ماں ہونے والی انجینئر بنی کار شہنسی پامبر سے کیسے کرے گی۔ بھابھی کا غصہ ٹھیک ہی تھا۔“ پیچھو کے لہجے میں مایوسی اور اداسی کے رنگ گلے ملے تھے۔

فلک کا ہاتھ سارے کے لیے بے اختیار ہی

دروازے پر ٹک گیا۔ دباؤ بڑا تو وہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ سب لوگ سامنے ہی بیٹھے تھے۔ فلک کو یوں اچانک وہاں کھڑا دیکھ کر سب کے چہرے فق ہو گئے۔

”تسہ تمہ۔ اس وقت؟“ جہانگیر دکھایا۔ اس کی سرسراتی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔

فلک نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ایک نظر ان اجنبی چہروں کو دیکھا اور پلٹ گئی۔ ڈنگا گئے قدموں سے گھر واپسی کا سفر بہت آہستہ اور تکلیف دہ تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے آتش فشاں کے ہانے سے دھکا دے کر اندر پھینک دیا ہو۔

ایک ناقابل بیان تکلیف تھی جس نے اسے سرے پاؤں تک گھرے میں لیا ہوا تھا۔ اسے نہیں معلوم وہ گھر تک کیسے پہنچی۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کا سیل فون کئی بار بج چکا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے موبائل آف کر کے ایک طرف ڈال دیا۔

\*\*\*

اگلی صبح سیدھی مہی، پاپا کے بیڈ روم میں پہنچی۔ ”کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ مہی اس کی بے حد متورم آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ دیکھ کر پہلے حیران پھر پریشان ہو گئیں۔

”میں کچھ دنوں کے لیے اسلام آباد جانا چاہتی ہوں، سویرا کے پاس۔“ فلک نے نظریں جھکا کر اپنا مدعا بیان کیا۔

”ٹھیک ہے چلی جانا، بٹ آریو آل رائٹ؟“ انہوں نے اس کے قریب آکر تشویش سے اسے دیکھا۔

”مہی۔“ فلک کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے ”آئی ایم سوری مہی، آئی ایم ریلی سوری۔“ اس نے بڑی مشکل سے پچھو کے دوران کہا۔

”اس لوکے! مگر یہ رونا بند کرو جلدی سے، شاماش۔“ انہوں نے بیٹی کو چپکارتے ہوئے اس کا سر تھپکا۔ جہاں دیدہ خاتون تھیں، بیٹی کے کچھ کے بغیر

ہی بہت کچھ سمجھ گئی۔ ”بی بیو، زندگی اور حالات کا سامنا بہت وقار کے ساتھ مکران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کرنا چاہیے، یوں سر جھکا کر رونا بزدلوں کا کام ہے۔“ انہوں نے نرم لہجے میں نصیحت کی۔ میں آج ہی تمہاری ٹکٹ کروا دیتی ہوں، سویرا کو بھی فون کروں گی، اور کچھ؟“

”بس۔“ فلک نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں جھپکتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”پاپا۔“ کچھ دیر بعد اس نے جھپکتے ہوئے سوال کیا۔

”نن سے میں بات کر لوں گی یو ڈونٹ وری۔“ فلک جب چپ کھڑی ہو گئی، وہ انہیں تنہا کر رہا تھا۔ مگر حلق میں آنسوؤں کا گولہ چھن رہا تھا۔

”اپنے روم میں جاؤ اور ریٹ کرو۔“ انہوں نے فلک کا رخسار تھپتھپایا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

\*\*\*

نوٹ بک پر جھکی بڑے انہماک سے وہ کچھ لکھ رہی تھیں۔ بالوں کی ایک لٹ بار بار رخسار پر جھول رہی تھی، جسے وہ ہر بار کان کے پیچھے اڑا لیتی۔

”اب بس بھی کرو، کب سے بلاری رہی ہوں، تم تو آج ہی سارا کام مکمل کر کے اٹھو گی، ایک دن ملتا ہے پچھٹی کا۔“ اسے بھی بند کمرے میں کام کر کے گنوار رہی ہو، ذرا موسم تو دیکھو۔“ سویرا نے روانی سے بولتے ہوئے کھڑکی کے بھاری پردے سمیٹ دیے۔ کمرہ یک دم ہی روشن ہو گیا۔

”کیسا ہو رہا ہے موسم؟“ فلک نوٹ بک پر جھکے جھکے مسکرائی۔ ”بارش کی خوشبو سے بھری خوش گوار اور ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکے اسے اپنے چہرے پہ محسوس ہوئے تو اس نے ایک گہری سانس لی۔

”بہت بے ایمان۔“ سویرا کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر باہر کا جائزہ لینے لگی۔

”چلو لان میں چلیں۔“ فلک نے سب چیزیں سمیٹ کر ایک طرف کرسیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”فائق کا فون آیا تھا۔ کل صبح چار بجے کی فلائٹ ہے۔“ گیلی، نرم گھاس پر چل قدمی کرتے ہوئے سویرا نے ہولے سے اسے بتایا۔ فائق اپنی تعلیم مکمل کر کے وطن واپس لوٹ رہا تھا۔ سویرا کو بھی وکیل بنے سال بھر سے زیادہ ہو گیا تھا اس نے بیرسٹر اختیار احمد کا چیمبر چوائن کیا ہوا تھا۔ اور دو ماہ بعد سویرا اور فائق کی شادی تھی۔

”اس میں اتنا خوش ہونے کی کیا بات ہے؟“ اس کے چہرے پہ بھرے خوشی کے رنکوں کو دیکھتے ہوئے فلک نے اسے چھیڑا۔

”محبت کا ساتھ جو ملنے والا ہے۔“ سویرا نے بے اختیار ہی جواب دیا تھا۔

”محبت؟“ فلک نے جھومتے پھولوں کی خوش رنگ، نرم ہنکھٹیاں غور سے دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔

”ایک بات پوچھوں؟“ فلک کے چہرے کے تاثرات اتنے واضح تھے کہ سویرا کو اپنے یوں بے دھڑک بولنے پر پشیمانی ہونے لگی تھی۔

”ممت پوچھو۔“ فلک کی پھلکی سی اداس مسکراہٹ



کو ہوا کے خوش گوار جھونکوں نے حیرت سے دیکھا اور اسے اپنی آغوش میں لینے کو آگے بڑھے۔

”وہ مجھے اب نہ اتنا یاد آتا ہے نہ ایسے یاد آتا ہے“ جیسے پہلے کیا کرتا تھا، آج سے تین سال پہلے جب میں یہاں تھی تھی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد فلک خود ہی بولنے لگی تھی۔ ”جو جذبہ ضد اور انتقام سے شروع ہو وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے، مگر محبت ہر گز نہیں۔“ جب یہ بات سمجھ میں آئی تو اس کی یادوں کی لہر خود بخود ہم بڑتی چلی گئی۔ ایک روز یقیناً ”مجھ بھی جائے گی۔“ ایک گرمی سانس لے کر فلک کین کی کرسی پر ٹپک گئی۔

”چلو چھوڑو، کوئی اور بات کرتے ہیں۔“ سویرا نے جلدی سے موضوع بدلا۔ ”جب تمہارا ماسٹر زکھیاٹ ہو جائے گا تو ہم ایک زبردست سی پارٹی ارنج کریں گے۔ مگر یہاں نہیں کراچی میں تاکہ سب لوگ شریک ہو سکیں، بس تم رزلٹ بہت اچھا لانا، میری تاک مت کٹا دینا، اپنی ذمہ داری۔ یہاں ایڈمیشن دلا کر تمہیں پردھایا ہے، اب نام روشن کرنا میرا۔“ سویرا بالکل بڑے بوڑھوں والے انداز میں بول رہی تھی۔

”چھا داوی اماں!“ فلک نے مسکراہٹ لیوں میں دیا۔ ”کبھی تو کھل کر بنس لیا کرو، اتنی خوب صورت بنسی ہے تمہاری، بنوس۔“

”جو خود خوب صورت ہوتے ہیں نا انہیں ہر شے میں خوب صورتی نظر آتی ہے۔“ فلک نے بڑی محبت اور مان سے اس پیاری سی بن اور دوست کو دیکھا، جس نے اس کے ساتھ ہر شے کا حق ادا کیا تھا۔ اس کے آبلہ آبلہ وجود پر اپنی محبت، نرمی اور ہمدردی کے پھائے رکھ کر اسے پھر سے مسکراتا اور جینا سکھایا تھا۔

”تمہاری یہ گشتہ خوب صورتی میں نے نہیں کسی اور نے ڈھونڈ کر نکالی ہے۔“ سویرا نے آسمان کی جانب دیکھا جہاں سے ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔

فلک چپ ہو گئی، اسے اندازہ تھا یہ بات کس نے

کہی ہوگی۔

”سعد کہہ رہا تھا ایک روز کہ اس لڑکی کی مسکراہٹ بہت خوب صورت ہے، ورنہ خود تو یہ بس ایویں سی ہے۔“ سویرا اپنی سعد کے فون اکثر سویرا کے پاس آتے رہتے تھے، کبھی کبھار مختصر سی ہیلو ہائے فلک سے بھی ہو جاتی تھی۔

”بارش بھی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ ہے نا، سارے داغ دھبے صاف کر کے ہر شے نکھار دیتی ہے۔“ سویرا نے گرتی بوندوں کو اپنے چہرے پہ محسوس کیا۔

”ہوں۔“ فلک چپ چاپ گرتی بوندوں کو دیکھ رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے کہ سعد کی محبت بڑی شفاف اور خالص ہے۔“ کچھلے سارے نقش اور داغ دھبے تمہارے دل اور زندگی سے مٹا دے گی، اسے ٹھکراتا مت پلیر۔“ سویرا نے کئی بار کہی ہوئی بات کو پھر دہرایا۔

”کوشش کروں گی۔“ فلک نے چند لمحوں بعد جواب دیا۔ برستی بوندیں تیز ہو کر جسم و چال کو گدگدا رہی تھیں۔ اور بدلتی رت فلک کو اچھی لگ رہی تھی۔

”کوشش نہیں یقین کرنا۔“ سویرا نے زور دے کر کہا۔

”چھا۔“ وہ مسکرائی۔

”اند رچا لوگی یا میں بیٹھوگی؟“

”یہیں اچھا لگ رہا ہے۔“

فلک نے نئی رت کی خوب صورت پھوار میں خود کو بھگنے دیا۔ گلشن اور جس کے موسم میں کب تک زندگی گزرتی۔ آنے والے نئے موسم کو تو خوش آمدید کہنا ہی تھا۔ وقت کی آوازیں ہی تھیں اور ایک روز دل کی آواز بھی یہ ہی ہو جاتی تھی۔ ایک سراب کے پیچھے ایک سائے کے تعاقب میں جو نقصان اٹھایا تھا اس کی تلافی کا وقت قریب تھا۔



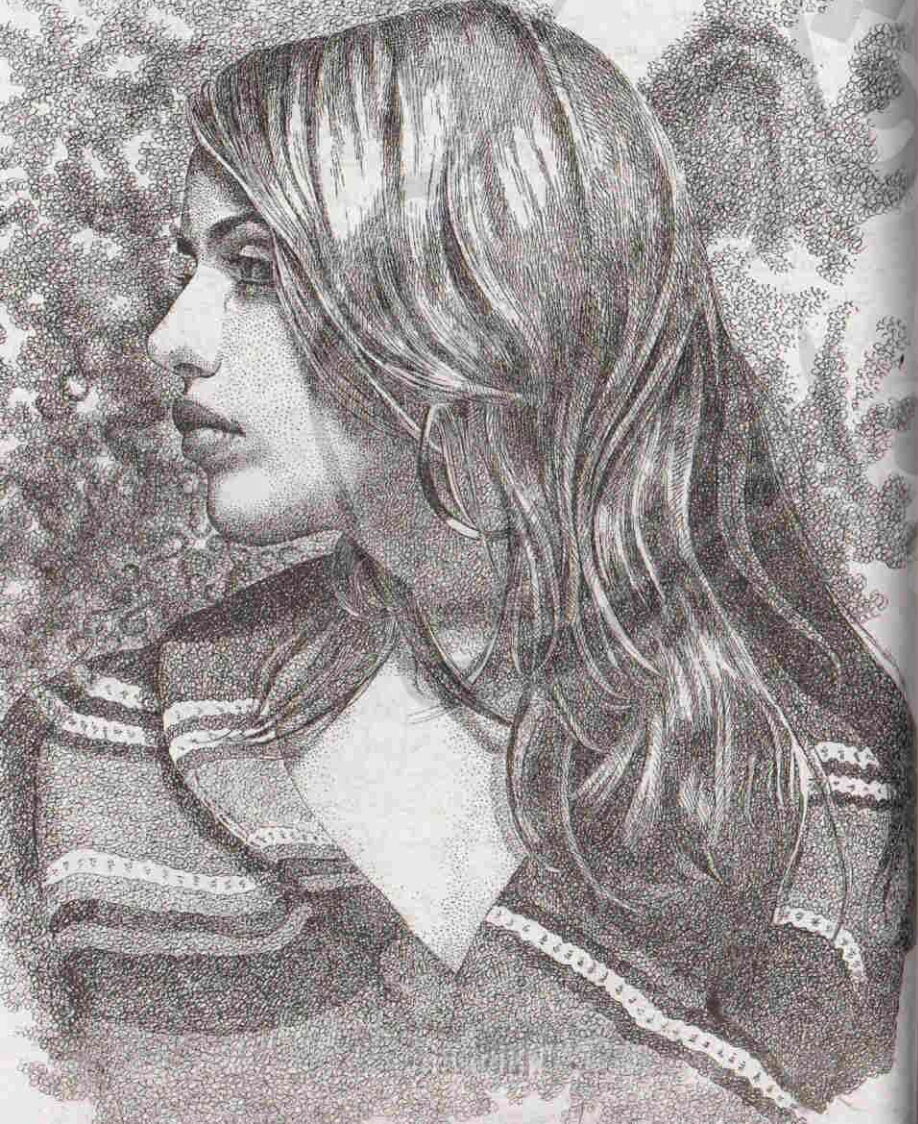
# سہ ماہی

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے، جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرا اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرا چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں دواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی ”جنت“ کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چچی میں بیتے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اپنے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ شمالی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم ”اس“ کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے، جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے ویل دوست مسعود کے ساتھ بھاگ بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیخ فریبا کی مریض ہے، جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ نئے نئے اس نے نوکروں کے سارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

نہینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاش کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی اینکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور محبتی خاتون ہیں۔ ولی ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شہیدہ العباس طبعیتاً سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے، جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ





پھیلی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شعیبہ تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبید اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شعیبہ تنوی کا منگیت رہے وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

شعیبہ العباس، ثروت و انیال کی اولاد ہے جسے انہیں وانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بد مزاج اور غصیلہ بنادیا۔ وہ انیبا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے نجسیت بہن بھائی فلمی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انیبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انیبا پر بری نظروں والے پروہ جے ڈی کے دوست سعدی کو بیٹ ڈالتا ہے۔ صرف بے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

پیارے بڑے پر شکم و انیال، شعیبہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں تو شعیبہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں شکم و انیال کو دیکھ کر گلتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرا اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر وادادینا لے گا۔

”اتفاق“ ماوی کا ٹکراؤ شعیبہ سے ہوتا ہے جس سے ماوی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجھلاہٹ میں شعیبہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ شعیبہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ شعیبہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو بے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر بے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا بے بغیر چلا جاتا ہے جس پر شعیبہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاق ”ان کی بے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ شعیبہ اسے گھریلاتی ہیں۔ شعیبہ، ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر جب کالے دردی سے مل ہو تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شعیبہ کو بے ڈی کا اپنی ماں اور شعیبہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں ہے۔

جس پر وہ بے ڈی کو تنبیہ بھی کرتا ہے۔ انیبا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث وانیال صاحب شعیبہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ماوی، ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان، ماں سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے شعیبہ، ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبید، نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور ہزار نام پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبید کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے، وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرا کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دین رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پر دین محمد کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بے جا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں، بیشک کے لیے بھیجے کا فیصلہ سنا تا ہے تو ماں رو رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو جاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پہنچنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہنگ آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔ دین محمد، جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت و انیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر سکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھینچاؤ کا کچھ اندازہ ہے۔ وانیال حسن، ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

شعیبہ، ماوی کے سامنے ماوی کے اوراق پلٹی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شعیبہ العباس، ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ، رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ شعیبہ، ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

شعیبہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن شعیبہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی شعیبہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی معذور تھا۔ شعیبہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

شعیبہ نے کہا کہ ماوی آتش پیشکش ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایبیمبسی حرکت میں آجائے گی۔ شعیبہ نے ماوی سے کہا، وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہو گا تاکہ حویلی جاسکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہر سے شادی کر سکے۔ شہر کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو شعیبہ نے خواب آور گولیوں کا کھا کر خود کشی کی کوشش کی۔

## ۱۸ اٹھارویں قسط

خاموش شام چپ چاپ دھرتی پر اتر آئی تھی۔

یہ اواکل اکتوبر کے دن تھے مضافوں میں ماناؤں سی اداسی رچی بسی محسوس ہوتی تھی۔ پچھلے دو روز سے برسنے والی بارشوں نے خنکی بھی بھادی تھی۔

کبھی کبھی ہوا چلتی تو ہاتھ پیروں میں سنسنی سی دوڑا دیتی تھی۔

ماوی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہسپتال کی عمارت پر جھکا ہوا آسمان بھی ایک گہرے سائے کی زد میں لگتا تھا۔ خود اس کے دل کی بھی عجیب حالت تھی ایسے جیسے ہر طرف محض سناٹا ہو خاموشی ہو۔ سوچنے سمجھنے کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔ وہ جانے کب سے ہسپتال کے اس کارڈیو میں کھڑی تھی، بالکل سامنے لان تھا۔ اپنے ٹکچے تراؤ زور، شرٹ پر اس نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی اور پیروں میں گھریلو سے سلپرز تھے۔ میو ایسی افرا تفری میں ہسپتال لانا پڑا کہ اسے اپنا حلیہ درست کرنے کی سہلت بھی نہ مل سکی تھی۔ اٹھتے ہوئے بالوں کو اوپر سے سمیٹ کر کچھو میں پلیٹ رکھا تھا جس سے دو چار ٹیسٹ نکل کر اس کے چہرے کے اطراف میں بکھری ہوئی تھیں۔

خدا معلوم وہ تنہا ہی ایسی طرح بے مصرف کھڑی رہی پھر اشاف نرس کے پکارنے پر پلٹی۔

”آپ کو ڈاکٹر صاحب آفس میں بلا رہے ہیں۔“

ماوی نے آہستگی سے سر اٹھات میں بلایا اور اس کے پیچھے چل دی۔ ڈاکٹر کے پاس تسلی آمیز باتیں تھیں۔ ماوی نے سب خالی الذہنی کی کیفیت میں سنا۔

”مئی کب تک ہوش میں آجائیں گی؟“

”معدہ تو ہم نے واش کر لیا ہے۔ یعنی آپ کی مدد اب خطرے سے باہر ہیں لیکن ہوش میں آنے میں انہیں کم



سے کم تو اور زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے تو لگ ہی سکتے ہیں۔ اس نے ایک بار پھر آہستہ سے سر ہلایا اور کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

چند منٹ بعد وہ می کے سرہانے کھڑی انہیں بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ بے سدھ پڑی تھیں اور رگت بے حد زرد معلوم ہو رہی تھی۔

یہ کبھی اس کی یاں، جس نے اپنی ضد منوانے کے لیے وہ انتہائی قدم اٹھالیا تھا جس کے بعد ماوی مسلسل ضمیر کی عدالت میں کھڑی تھی۔

ایک خلش کوئی بوجھ سا لگتا تھا دل پر اور سمجھ تو جیسے بالکل ہی جواب دے چکی تھی۔ می کی ضد کے آگے وہ بھلے ہی مجبور نہ ہوتی لیکن اس اقدام نے اسے بالکل ہی مغلوب کر دیا تھا۔ دنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں تھا جو اسے اپنی مرضی کے برخلاف کوئی کام کرنے پر مجبور کر سکے سوائے می کے اور اسی ایک انسان نے بالآخر اسے قائل کر ہی لیا تھا۔

”می! میں نہیں جانتی آپ نے جو داستان مجھے سنائی وہ صحیح ہے یا غلط۔ اس میں سچ اور جھوٹ کا تناسب کتنا ہے۔ بابا کی موت فطری تھی یا انہیں قتل کیا گیا تھا۔ اور یہ بھی نہیں کہ وہ عورت اتنی ہی بری ہے جتنا آپ جانتی ہیں یا اس سے کچھ کم زیادہ۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ اپنے ہاتھوں سے مجھے موت کے منہ میں دھکیل رہی ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں جن سکیورٹیز کا آپ نے مجھے بھلا دیا ہے ان کی حیثیت محض ہوا میں محل بنانے سے زیادہ کچھ نہ ہوگی۔ لیکن اب میں وہی کروں گی جو آپ چاہتی ہیں کیونکہ آپ کو کھونے کا حوصلہ میرے اندر نہیں ہے۔“

اسی نے کرسی گھسیٹ کر بیڈ کے قریب کی اور دونوں بازوؤں کے سرہانے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لی تھیں۔

”میں اس حویلی میں ضرور جاؤں گی اس لیے نہیں کہ مجھے اپنے بابا کے قاتل کا سراغ مل جائے یا ان کے حصے کی جائیداد ملے۔ میں صرف اس لیے اس حویلی میں جانا چاہتی ہوں تاکہ اس عورت سے مل سکوں۔ جس نے آپ کی نفسیات میں اپنے ناروا رویوں سے اتنی گرہیں لگا دیں کہ میں انہیں چاہ بھی نہیں کھول پاری۔ کیونکہ یہ کوئی عام گرہیں نہیں ہیں یہ نفسیاتی الجھاؤ ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ عورت نے آپ کو نفسیاتی مریض بنا دیا۔ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔“

وہ در تکہ دل ہی دل میں شینہ سے مخاطب رہی تھی۔

”تم نگاہوں سے جلدی واپس آگئے۔ میرا خیال تھا ہفتہ دس دن تو رو کو گے۔“ اس روز پنج کے دوران شبیہ نے جلال سے پوچھا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میرا ارادہ تو یہی تھا لیکن۔۔۔ جلال نے اس آخری لفظ کو پر سوچ انداز میں کچھ زیادہ ہی لمبا کر دیا تھا۔ وہ تو ابھی تک شبیہ کو بھی ماوی کے متعلق اپنے خیالات نہیں بتا سکا تھا بچا کہ والدین اور دادی سے اس متعلق بات کرنا۔ کچھ اس کی کم ہمتی۔ کچھ گھر کا سخت ماحول۔

جتنے دن حویلی میں رکھا منصوبہ بنا تا رہا اور پھر تھک ہار کر واپس آگیا۔ کس بات کی جلدی تھی اسے کہ گھر والوں کو اپنی پسند سے اتنی جلدی آگاہ کیا جاتا۔ اس سے بڑے بھائی موجود تھے اور ان کی شادی سے پہلے اس کی شادی کا ذکر بے جا ہی ہوتا۔

”لیکن کیا؟“ شبیہ نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ ”پھر کسی دوست کا فون آگیا ہو گا کہ اسے اپنی کسی مشکل میں تمہاری اشد ضرورت ہے اور تم بھاگے بھاگے واپس آگئے ہو گے۔“ اس نے شرارت بھرے انداز میں جتایا جلال

زور سے ہنس دیا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں کسی دوست کے لیے جلدی واپس نہیں آیا۔ اپنے لیے آیا ہوں۔“

”اس بات پر یقین تو نہیں آ رہا۔ لیکن خیر تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔“ شبیہ کا انداز سابقہ تھا، جلال محض مسکرا دیا۔

”حویلی میں سب کیسے ہیں؟ دادو کی طبیعت کیسی ہے۔“

”سب ٹھیک ہیں۔۔۔ دادو کی طبیعت بھی اب بہتر ہے۔۔۔ بلکہ بالکل ٹھیک ہیں۔“ جلال نے تسلی آمیز انداز میں کہا تھا۔

”ہوں۔۔۔“ شبیہ نے پانی کا گلاس لیوں سے لگاتے ہوئے پل بھر کے لیے اسے دیکھا۔ ”تمہاری غیر موجودگی میں وہ بھی آئی تھیں۔“ اس کا انداز کچھ جھجک آمیز تھا۔ اس کے انداز میں کچھ خاص تھا۔

”کون؟“ جلال نے کچھ چونک کر اسے دیکھا۔ شبیہ دل جمعی سے کھانا کھا تا رہا۔ جلال کو اس کی خاموشی کھلی تھی۔

”کس کی بات کر رہے ہو؟“

”بابا کی انیس وائف۔“ اس نے دھیمی آواز میں چند منٹ بعد کہا تھا۔

”شروت آئی آئی تھیں؟“ جلال کے لیے یہ خبر کچھ غیر متوقع تھی۔

”اور تم نے یقیناً ان سے مس بی ہو کیا ہو گا؟“ جلال نے پر یقین انداز میں کہا وہ تو جیسے شبیہ کی رگ رگ سے واقف تھا۔

شبیہ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”شباباش۔۔۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ جلال نے بے ساختہ کہا۔ شبیہ نے بے زاری سے چچ رکھ کر کرسی کی پشت سے کمر لگالی۔



”میں نے ارادی طور پر کچھ نہیں کہا جلال!۔۔۔ بس پتا نہیں انہیں سامنے دیکھ کر مجھے کیا ہو جاتا ہے۔“ اس کے انداز میں اندامت بھی تھی بے زاری بھی۔  
 ”غلطی میری نہیں ہے۔ انہیں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“  
 ”تو اس میں نئی بات کون سی ہے؟ تمہاری غلطی تو کبھی بھی نہیں ہوتی۔۔۔ کسی بھی معاملے میں نہیں۔“ جلال نے سلگ کر کہا۔  
 ”اچھا اب تم مجھے شرمندہ کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت گلٹی ٹیل کر رہا ہوں۔ خامخواہ اپنا پیپر لوڑ کیا۔ غیر متعلقہ لوگوں پر اپنا غصہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“  
 اس کا مزاج عود کر آیا تھا۔ جلال نے اسے غضب ناک نظروں سے گھورا لیکن اس موضوع کو کسی اور وقت تک کے لیے ٹال دیا۔  
 ”تنوی تمہارا پوچھ رہی تھی۔“

”اچھا۔“  
 ”گفت بھجوا یا ہے اس نے تمہارے لیے۔ اندر بیڈروم میں رکھا ہے لے لیتا۔“  
 ”اس۔“ شبیہ حیران ہوا۔ ”یہ ان محترمہ کو کیا سوچتی؟“  
 ”اسی سے پوچھ لیتا۔“  
 ”ہاں۔ پوچھوں گا۔“

”اب اس کی کلاس نہ لیتا شروع کر دینا اتنی سی بات ہے۔۔۔ خود تمہیں تو کبھی توفیق ہوتی نہیں اسے کوئی تحفہ دینے کی۔ اس نے ہمت کر لی ہے تو باتیں نہ سنانا اسے۔“ جلال کا انداز کچھ ایسا تھا شبیہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی پھر کچھ یاد آنے پر بولا۔  
 ”بانی داوے۔ تمہاری وہ دوست بھی آئی تھیں؟“  
 ”کون؟“

”وہ لڑکی۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔ وہ جو بہت بد تمیزی ہے۔ پتا نہیں ایسی لڑکیوں کو تم دوست بھی کیسے بنا لیتے ہو۔“ اس کے انداز میں سخت ناپسندیدگی تھی۔ جلال فوراً سمجھ گیا۔  
 ”ماوی آئی تھی؟“

”ہاں تمہارا کانٹیکٹ نمبر مانگ رہی تھی۔“  
 ”پھر تم نے دیا؟“ جلال نے بے قراری سے پوچھا تھا۔  
 ”نہیں۔“ وہ جز کر بولا۔ ”مجھے تم پر بہت غصہ ہے جیڑی! ساری زندگی میں ایک لڑکی سے دوستی کی بھی تو کسی سے۔۔۔ ماوی نہ اب بھر کی بد تمیز اور منہ پھٹ لڑکی۔ زہر لگتی ہیں ایسی اور کافرڈنٹ لڑکیاں۔“ اس کا انداز ہنوز تھا۔  
 ”خیر۔ اب اتنی بھی بری نہیں ہے وہ۔“ جلال نے فوراً کہا تھا۔ شبیہ بغور اسے دیکھنے لگا۔ جلال گڑبڑا گیا۔  
 ”اے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

شبیہ نے نفی میں سر ہلایا اور اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔  
 ”یہ ماوی والے سلسلے میں میری خاک مد کرے گا۔ رشتہ طے ہونے لگا تو سب سے پہلے یہ مخالفت میں کھڑا ہو جائے گا۔“ جلال فکر مند سے سوچ رہا تھا۔ ”اور مجھ سے غلطی ہوئی۔ گاؤں جانے سے پہلے ماوی کو انفارم کر دینا چاہیے تھا۔ نہ وہ یہاں آئی نہ شبیہ ٹھکنا۔“ اسے یہی سوچ لاحق تھی۔



کھڑکی سے آنے والی چمکی دھوپ نے کمرے میں روشنی بکھیر رکھی تھی۔  
 شبنم نے چپ چاپ بیڈ پر لیٹی چھت کی طرف دیکھ رہی تھیں، تقریباً ”تین گھنٹے پہلے انہیں ہوش آچکا تھا لیکن وہ نقاہت کے زیر اثر تھیں۔ اس کے باوجود گاہے گاہے ماوی پر نظریں ڈالتی تھیں وہ صوفے پر بیٹھی تھی اور بے حد سنجیدگی سے تازہ اخبار کے مطالعے میں مصروف تھی اس وقت سے اس نے کوئی بات نہیں کی تھی نہ ہی شبنم کو ان کی غلطی کا احساس دلایا تھا۔ وہ بس خاموش تھی اور اس کی یہی خاموشی شبنم کو مستقل وسوسوں میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔ اسی وقت ادھ کھلے دروازے پر دستک دے کر نرس اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دو اؤٹ کیڑے تھے وہ سیدھی شبنم کی طرف آئی اور بڑے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر انجیکشن تیار کرنے لگی۔  
 ”ایکسکیوز می سسر! کیا ڈاکٹر شجاع آن ڈیوٹی ہیں؟“ ماوی نے اخبار سینٹے ہوئے پوچھا تھا۔  
 ”جی ہاں۔۔۔“ نیم! آپ اپنا بازو آگے کیجئے مجھے انجیکشن لگانا ہے۔“ نرس نے ماوی کو جواب دے کر شبنم سے کہا تھا۔

”نہیں سسر! مجھے انجیکشن نہیں لگوانا۔۔۔ آپ اسے واپس لے جائیں۔“ شبنم نے ضدی پن سے کہا تھا۔  
 ماوی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یکدم رک کر انہیں دیکھنے لگی۔  
 ”دیکھیے۔۔۔ یہ آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔“ نرس شبنم سے اصرار کرنے لگی لیکن وہ مستقل اس کی بات ماننے سے انکار کیے جاری تھیں ناچار نرس نے ماوی سے امداد چاہی۔  
 ”آپ ہی انہیں سمجھاؤں۔“

شبنم نے ماوی کی طرف دیکھا ان کی آنکھوں میں جو تحریر تھی اسے ماوی یا آسانی بڑھ سکتی تھی۔  
 ”خیر کرنا بند کریں می لمبی ہو گا جو آپ چاہتی ہیں اور اسی طریقے سے جس طریقے سے آپ کی خواہش ہے۔ میں حویلی جانے کے لیے تیار ہوں اور۔۔۔ اور جلال سے نکاح کرنے کے لیے بھی۔ اس لیے پلیز۔ اب آپ مجھے مہینٹلی ٹارچر کرنا بند کریں۔“

ماوی نے بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس کا جملہ مکمل ہونے تک شبنم کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا اور انہوں نے اپنا بازو بھی نرس کے آگے کر دیا تھا۔ ماوی نے یہ پورا جملہ عربی زبان میں کہا تھا اس لیے نرس کے پلے خاک بھی نہ بڑکا شبنم اسے سہولت سے اس کا کام کرنے دے رہی تھیں اس کے لیے یہی کافی تھا۔  
 ماوی بو جھل قدموں سے باہر نکل آئی تھی۔

”میں ممی کے سامنے ہاں بھر کر انہیں مزید کوئی احمقانہ قدم اٹھانے سے روک سکتی ہوں۔ جلال ایک مہینہ کے لیے ٹور نوٹ کیا ہوا ہے۔ اس کے واپس آنے سے قبل مجھے کوئی نہ کوئی ایسا انسان ڈھونڈنا ہو گا جو ممی کو ان کا فیصلہ تبدیل کرنے کے سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکے۔“  
 اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔



جلال پہلے گھر گیا وہاں سے سیدھے ہسپتال کی راہ لی۔ اسے تو یہ سوچ سوچ کر ہی پریشانی لاحق ہوئے جاری تھی کہ بے چاری ماوی نے اس ساری صورت حال کو تنہا کیسے سنبھالا ہو گا۔  
 ”وہ بے چاری سیدھی سادی معصوم لڑکی۔۔۔ ماں کی بیماری نے تو یقیناً ہاتھ پیر پھلا دیے ہوں گے اور اس شبیہ کا حال دیکھو۔ کیا تھا جو اسے میرا کانٹیکٹ نمبر دے دیا ہوتا۔ ماوی کس کس کے ساتھ میرے پاس آئی ہوگی۔“



اس کی فکر مندی کی کوئی حد نہ تھی۔ دوسری جانب ماویٰ اسے سامنے پا کر حیرت منہ "گڑبڑا گئی۔ جلال کے ٹور ٹوٹنے ہوئے کاسن کروا اچھی خاصی مطمئن ہوئی بیٹھی تھی لیکن اس طرح اچانک اس کا سامنے آجانا برا پریشان کن تھا۔ فوری طور پر وہ اپنے تاثرات بھی نہیں چھپا سکی۔

"تم کہاں سے آگئے؟ تم تو ٹور ٹوٹ گئے ہوئے تھے۔" اس نے بوکھلاہٹ بھرے انداز میں صدمے سے چور آواز میں کہا۔

جلال اس انداز پر سٹپٹا گیا۔  
 "نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ میں تو۔۔۔"

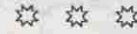
"جھوٹ مت بولو تمہارے بھائی نے مجھے خود بتایا تھا۔" ماویٰ نے تیزی سے کہا تھا۔ جلال ایک لمحہ میں ساری بات سمجھ گیا۔

"ہاں۔۔۔ میں گیا تو تھا لیکن آج ہی واپس آگیا۔۔۔ پتا نہیں کیوں۔ مجھے لگ رہا تھا آپ کو میری ضرورت ہے۔ اسی لیے میں جلدی واپس آگیا۔"

ماویٰ نے بدلی سے اسے دیکھا۔ اگر وہ اتنی بدلی کا شکار نہ ہوتی تو یقیناً دیکھ پاتی۔ جلال کی آنکھوں میں اس کے لیے محض پسندیدگی یا محبت ہی نہیں عقیدت اور خلوص بھی تھا۔

"تو ماویٰ بی بی! یہی ہے جو بالآخر آپ کو کرتا ہے۔ ممی کی مرضی یا تقدیر کی اس بے نکلی بازی کو آپ کو چلنا ہی پڑے گا۔"

اس کے دل و داغ میں جیسے بگو لے سے اٹھنے لگے تھے لیکن بظاہر وہ پرسکون دکھائی دیتی تھی اور چند منٹ کے بعد وہ جلال کو ممی کے پاس لے جا رہی تھی۔



جب تک ٹینے ہسپتال میں داخل رہیں جلال مستعدی سے ان کی دیکھ بھال کرتا رہا، ایک تو یہ کہ دل کی اچھائی ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی دوسرے دل کے نئے نئے جذبات کے ہاتھوں بھی مجبور تھا ہر حال ان تمام دنوں میں اس نے ٹینے آئی اور ماویٰ کا بہت ساتھ دیا اس دوران کئی بار اسے ماویٰ کی غیر معمولی شجیدگی خاموشی اور رکھائی محسوس ہوئی لیکن ہر بار وہ اسے ٹینے آئی کی خرابی طبیعت کی وجہ قرار دے کر سر جھٹک دیتا۔

جس روز ٹینے آئی کو گھر جانے کی اجازت ملی اس سے ٹھیک اگلے روز جلال نے اپنے سیل فون پر ماویٰ کی کال ریسیو کی تھی۔

"میں چاہتی ہوں آج تم منہ ہمارے ساتھ کرو۔"

اس روز جلال کو کسی ضروری کام کے سلسلے میں ہائی کورٹ جانا تھا لیکن ہر اہم کام کو نظر انداز کر کے اس نے ماویٰ کے گھر جانے کو ترجیح دی۔ اس روز بھی ٹینے ہی اس سے باتیں کرتی رہیں۔ اگلی دو تین ملاقاتوں میں ماویٰ کی رکھائی ختم ہوئی لیکن بات چیت میں وہ کم ہی حصہ لے رہی تھی۔ کئی بار جلال کے دل میں خیال آیا کہ وہ ماویٰ سے اس کی خاموشی کی وجہ معلوم کرے لیکن پھر ہر بار یہی وہ اپنے خیال کو ٹال دیتا۔

"اس بیماری نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھا ہے ورنہ میری بڑی خواہش تھی کہ میں اپنی ساس سے اپنے شوہر کی جائیداد حاصل کروں۔ یہ ماویٰ تو کبھی کبھار بہت جذباتی بن کا مظاہرہ کرتی ہے اور اکثر کہتی ہے کہ جب بھی موقع ملا، وہ اس عورت سے اپنا حق ضرور وصول کرے گی لیکن میں چاہتی ہوں جلد از جلد اس کے فرض سے فارغ ہو جاؤں۔ میرے دل کے سکون کے لیے یہی کافی ہے۔"

انہوں نے جلال کو اپنے ماضی سے بڑی تفصیل سے آگاہ کر دیا بس یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی تھی کہ ان کے ماضی کی کوئی ٹریڈ اس سے بھی ملتی ہے۔ ماویٰ چپ چاپ سنتی رہتی لیکن کچھ کچھ باتوں پر اس کی برداشت بالکل بواب دے جاتی تھی۔

"ممی پلیر! ماویٰ نے چڑ کر کہا تھا وہ ان کا مافی الضمیر سمجھتی تھی بھلا اس سے بہتر یہ بات کون سمجھ سکتا تھا کہ وہ بات کو گھما پھرا کر کس پوائنٹ تک لا رہی ہیں۔

"ارے ماویٰ! جلال سے کچھ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کوئی غیر تھوڑا ہی ہے۔ میں نے اسے بیٹا کہا ہی نہیں مانا بھی ہے۔ اس سے بھی دل کا دکھ نہیں کھوں گی تو کس سے کھوں گی۔"

بعض اوقات تو ان کی باتیں سن کر ماویٰ حیران ہی رہ جاتی تھی وہ اس قدر چالپوسی کی زبان بولتی تھیں کہ وہ چیخ و تاب کھا کر رہ جاتی۔ یوں لگتا تھا ان کے پاس عزت نفس نام کی کوئی چیز ہی نہ رہی ہو اور وہ ماویٰ کے اندر سے بھی اس چیز کو کھرچ کر نکال دینا چاہتی ہوں۔

ایک روز تو انہوں نے حد ہی کر دی۔

"میں تم دونوں کے درمیان خود کو بہت مس فٹ محسوس کرتی ہوں، مجھے لگتا ہے تم لوگوں کو ساتھ وقت گزارنا چاہیے تاکہ ایک دوسرے کو بہتر طریقے سے سمجھ سکو۔ ارے ہاں جلال! تم ماویٰ کو کل ڈنر پر کیوں نہیں لے جاتے؟"

"فار گاڈ سیک ممی! ماویٰ نے دلی زبان میں انہیں ٹوکنے کی کوشش کی تھی لیکن ٹینے نے سنی ان سنی کر دی۔

"شیور آئی! اوائے ناٹ! جلال کی تو دل کی خواہش پوری ہو رہی تھی وہ کیونکہ انکار کرنا یا ٹال مٹول سے کام لیتا۔ ماویٰ کا دل چاہا اس کا سر بھاڑ دے۔

"جو میں چاہتی ہوں جب وہ کرنے کی ہاں بھر ہی لے ہے تو جلال سے ہنس کر بات کرنے میں کیا برائی ہے؟ جلال کے جانے کے بعد ٹینے نے پہلی بار اسے سرزنش کی تھی۔

"مجھے کبھی مجھے اپنا آپ کال کر ل کی طرح گلے لگتا ہے۔" ٹینے کی بات کے جواب میں ماویٰ نے سر دلبجے میں کہا تھا۔

"تمہارا دل غ تو ٹھیک ہے ماویٰ! ٹینے بری طرح بھڑک اٹھی تھیں۔

"ٹھیک ہے یا شاید نہیں ہے۔ ہر حال میں خود میں اور ایک کال کر ل میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتی۔ وہ بھی کسی مقصد کے لیے اپنا آپ کسی مرد کو پیش کرتی ہے۔ میں بھی یہی کر رہی ہوں۔ میں جلال کو اپنا آپ پلیٹ میں رکھ کر پیش کر رہی ہوں۔ آپ کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اللہ جانے ابھی اور کتنے اپنے معیار سے گرے ہوئے کام کرنا پڑیں گے مجھے اپنی ہی نظروں سے گرانے کے لیے بے حد شکریہ ممی!"

اس نے بے حد سرد اور ناگوار لہجے میں کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ ٹینے چپ چاپ اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی تھیں۔



"تمہیں زندگی کیسی لگتی ہے جلال!"

"الغفل" کے خواب ناگ ماحول میں کھانا کھاتے ہوئے ماویٰ نے محض برائے بات جلال سے پوچھا تھا۔

"خوب صورت" بے حد خوب صورت۔ بلکہ مجھے تو زندگی سے عشق ہے کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کاش! میں



زندگی کو قید کر کے رکھ سکتا۔“

جلال نے بے حد بے ساختگی سے کہا تھا۔ ماویٰ نے لحظہ بھر کے لیے اسے دیکھا پھر نہ لگی۔ اسے جلال کی بے ساختگی پر بے وجہ ہنسی آئی تھی۔ دوسری جانب جلال بس اسے دیکھ گیا۔ اس ایک بل میں اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ زندگی اسے زیادہ خوب صورت لگتی ہے یا یہ لڑکی۔ جس سے ملے اسے شاید دو یا تین مہینے ہوئے تھے اور جس کی محبت میں جہلا ہوئے بشکل چھبیس دن۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ اسے صدیوں سے جانتا ہو۔ اس کا ہر انداز، ہر آواز اسے پہلے سے زیادہ خوب صورت لگتی تھی۔

”مجھے زندگی بہت خوب صورت لگتی ہے لیکن آپ سے زیادہ نہیں۔“

جلال نے ایک بار پھر بے ساختگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ماویٰ کی ہنسی کو مکمل طور پر بریک نہیں لگا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں تعجب سا سمٹ آیا تھا۔ جلال گڑبڑا گیا۔

”میرا مطلب ہے۔ آپ آج بہت خوب صورت لگ رہی ہیں۔“

”صرف آج۔“ اس صورت حال پہ ناخوش ہونے کے باوجود ماویٰ کی رگ طرافت پھڑکی۔ ”کیا میں ہر روز خوب صورت نہیں لگتی؟“

”نہیں۔ ہر روز لگتی ہیں۔“

”یعنی نہیں لگتی۔“ ماویٰ نے مایوسی سے کہا۔ ”میں تو سمجھتی تھی میں ہمیشہ خوب صورت لگتی ہوں۔ اچھا ہوا تم نے میری خوش قسمتی دور کر دی۔ میں یونہی اترا تھی۔“

”یہ آپ کا حق ہے آپ کو اترا نا بھی چاہیے۔“ جلال نے اسے مایوس ہوتا دیکھ کر تیزی سے کہا تھا یوں جیسے وہ ماویٰ کو مایوس ہونے نہ دینا چاہتا ہو۔ ماویٰ کو پھر ہنسی آئی۔

”تم بہت اچھے ہو جلال! بہت ہی اچھے۔“ اور مجھے اس بات کا افسوس ضرور رہے گا کہ تم جیسا معصوم انسان میرے ہاتھوں بے وقوف بنوایا جا رہا ہے۔ اگر مجھے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے جیسی بے وقوفی پھر کر سکتی ہوں تو میں تمہیں ضرور ساری حقیقت سے آگاہ کر دیتی۔ لیکن میری مجبوری ہے جلال! اپنی ماں کی ضد پوری کرنے کے لیے مجھے تمہیں دھوکے میں رکھنا ہی پڑے گا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا جلال!“

گلاس کے کناروں پر انگلی پھیرتے ہوئے وہ کہری سوچ میں گم ہو گئی تھی جبکہ جلال کا بس نہ چلنا تھا اپنی بصارت میں اس کا چہرہ قید کر لے۔

\*\*\*

کھڑکی سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ سنہری اور نرم گرم سی محسوس ہوتی تھی دھوپ کی کرنیں سپدھی کا پٹ پر ماویٰ کے پیروں کے قریب پڑ رہی تھیں اور ماویٰ سر اٹھائے عجب خالی خالی نظروں سے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ کہی نہ سمجھ میں آنے والی ذہنی کیفیت کا شکار تھی۔

ہر چند منٹ کے بعد اس کا ذہن کسی نئی سوچ کی طرف مبذول ہو جاتا تھا ہر پہلی سوچ سے دوسری سوچ کی طرف سفر کرتے ہوئے وہ پچھلی سوچ کے لیے فکر مندی محسوس کرتی کہ آخر وہ سوچ کیا رہی تھی۔

کبھی اسے محسوس ہوتا وہ بالکل خالی الذہن ہو چکی ہے اور کم سے کم آج کی تاریخ میں اس کے پاس سوچنے کے لیے یا کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہے جس طرح وہ متبادل سوچوں کا شکار بھی ٹھیک اسی طرح ہر چند منٹ کے بعد اس کی نظریں پیروں کے قریب پڑے اس کاغذ کی طرف چلی جاتی تھیں۔ جس کی رو سے وہ جلال الدین بھٹی کی منکوہ قرار دی جا چکی تھی۔ ہر دن عام سا ہوتا ہے ہر دن گزرے ہوئے دن جیسا ہی ہوتا ہے بس اس دن میں پیش

آنے والے واقعات و حادثات اس دن کو خصوصیت عطا کر دیتے ہیں تو یہ بھی ایک عام سادہ تھا جسے می کی ضد نے خصوصیت عطا کر کے اس کے اور جلال کے لیے یادگار بنا دیا تھا۔

وہ می کی ذہنی حالت پر جتنا حیران ہوئی وہ کم تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیرانی ماویٰ کو ان کی بہت مکمل قسم کی پلاننگ پر ہو رہی تھی وہ جیسا چاہتی تھیں انہوں نے ویسا کروا لیا تھا۔ کبھی کبھی ماویٰ کو یہ بھی لگتا تھا حالات واقعات بھی ان سے پوچھ کر ترتیب پا رہے ہیں۔ انہوں نے پہلے جلال کے ذہن و دل میں اس کے لیے جذبات پیدا کیے۔ پھر ماویٰ کو قائل کیا اور اب بالآخر وہ جلال سے ماویٰ کا نکاح بھی کروا چکی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنے اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے لمبا چوڑا ڈرامہ ترتیب دیا تھا بیماری کا ڈرامہ، ٹیوشنل ایکٹنگ، ہر گھسا پٹا طریقہ انہوں نے آزمایا اور دلچسپ بات یہ کہ جلال جیسا آدمی ان کی باتوں میں آگئی گیا۔

کیا ہو رہا تھا اور کیا ہوئے والا تھا۔ ماویٰ کچھ نہیں جانتی تھی اسے صرف اتنا پتا تھا۔ زندگی میں اس سے زیادہ مجبور وہ کبھی نہ ہوئی تھی۔

اسی وقت دروازہ کھول کر شمیمہ اندر داخل ہوئیں۔ ماویٰ نے گردن گھما کر دروازے کی جانب دیکھا۔ شمیمہ کے یوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر اطمینان تھا۔

”میں بہت خوش ہوں ماویٰ! کامیابی کی طرف پہلا قدم بڑھا دیا ہے ہم نے۔“ شمیمہ نے پر جوش انداز میں کہا تھا۔

”آپ نے کامیابی کی طرف بڑھایا ہو گا۔ میں نے تو بریادی کی طرف ہی بڑھایا ہے۔“ ماویٰ نے گردن واپس گھماتے ہوئے سر دھری سے کہا تھا۔

”اور آپ خوش کیسے نہ ہوں گی! آخر آل وہی ہو رہا ہے جو آپ چاہتی تھیں۔“ اس کا کڑوا الجھن سن کر شمیمہ کے چہرے پر سایہ سالہر گیا۔

”ہاں۔ وہی ہو رہا ہے جو میں چاہتی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں تمہیں بریاد کر رہی ہوں۔“ انہوں نے وضاحتی لہجے میں کہا تھا۔

”اوہ کم آن می! افار گاڈ سیک۔ خود کو اور مجھے اس طرح کی باتوں سے دھوکا دینا بند کر دیں۔“ ماویٰ جیسے پھٹ ہی پڑی تھی۔

”آپ نے یہ سب میری بھلائی کے لیے کیا جو بھی ہو رہا ہے، انجام کار اس کا فائدہ میری ہی ذات کو پہنچے گا۔ یہ سب دراصل آپ کے ذہنی مغرورے ہیں اور کچھ نہیں۔ اس سب کا اگر کسی کو فائدہ پہنچے گا تو وہ بابا جان ہیں اور مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ انہیں بھی اور حقیقت اس سے کوئی فائدہ نہ ہو گا جو انسان اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہے اسے دنیاوی وسائل بھلا کیا فائدہ یا خوشی پہنچا سکتے ہیں باقی رہی میری بات۔ تو مجھے اس میں نقصان ہی نقصان ہے۔ آپ نے ایک بار بھی سوچا ہے اگر شہروز کو میرے نکاح کی خبر مل گئی تو کیا ہو گا؟ شہروز مڑ کر میری شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گا اور آپ جانتی ہیں ناں شہروز میرے لیے کیا ہے؟ وہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے می! اور آج مجھے ایسا لگ رہا ہے آپ کی ضد کی وجہ سے میں نے جلال سے نکاح نہیں کیا بلکہ شہروز کو کھو دیا ہے۔“ وہ رو باہمی ہو گئی تھی۔

”نہیں ماویٰ! ایسا کبھی نہیں ہو گا۔“ شمیمہ نے جلدی سے کہا تھا۔ ”شہروز کی طرف سے تو تمہیں میں گارنٹی دے سکتی ہوں۔ اول تو اسے پتا ہی نہیں چلے گا۔ دوسری بات یہ کہ پتا چل بھی گیا تو وہ تمہیں نہیں چھوڑے گا۔ میں جانتی ہوں یہ تم سے کتنی محبت کرتا ہے اور محبت کرنے والے کبھی تمہیں نہیں چھوڑتے۔“ وہ اسے بچوں کی طرح ہسلارہی تھیں۔ ماویٰ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا۔

”محبت کرنے والے تمہیں چھوڑتے لیکن موت کے منہ میں تو دھکیل سکتے ہیں ناں۔ آپ بھی تو یہی کر رہی



”وقت تم پر خود ثابت کرے گا کہ میں نے جو بھی کیا وہی ٹھیک تھا۔“ شیمینہ سو فیصد پر یقین تھیں اور اگر آپ غلط ثابت ہو گئیں تو۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ شیمینہ نے رسان سے کہا۔ ”بھی تم غصے میں ہو، جذباتی ہو کر صرف منفی پہلو تلاش کر رہی ہو لیکن گزرتا وقت تم پر ہر چیز واضح کر دے گا اور تمہیں میرے فیصلے کے پوزیشنوں پر واضح نظر آنے لگیں گے۔“ شیمینہ اسے سمجھاتی چلی گئیں لیکن ماوی کے اندر باہر جیسے غم غصے سے آگ سی ہوئی تھی۔

”میں نے آپ سے کہا تھا مجھے کچھ دیر اکیلا رہنے دیں۔ کیا آپ تھوڑی دیر مجھے تنہا چھوڑنے نہیں دے سکتیں؟“

ماوی نے رکھائی اور دوسری سے کہا تھا۔ شیمینہ کا چہرہ یکدم پھر تاریک ہوا۔ اپنے تئیں وہ سمجھ چکی تھیں نکاح کے بعد انہیں ماوی کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت یا غصے کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا لیکن ان کے خیالات کم سے کم اس معاملے میں غلط ہی ثابت ہو رہے تھے۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی لیکن اس وقت میرے لیے ایک اور فوری کرو۔ جلال تم سے چند منٹ بات کرنا چاہ رہا ہے۔ تم ذرا اچھے طریقے سے۔“

”پلیز اب میں مزید کوئی ڈرامہ نہیں کر سکتی۔“ اس نے مطالبے پر ماوی نے تشریح کرنا تھا۔ ”عام انسان ہوں میں۔ کوئی اداکارہ نہیں کہ اپنے موڈ سے ہٹ کر بھی ہنسون، کبھی روؤں۔“

”میں جانتی ہوں لیکن اتنا جی مشکل کام نہیں ہے یہ۔“ اب کی بار شیمینہ نے بھی سختی سے کہا تھا۔

”آپ کے نزدیک تو ہر کام ہی آسان ہے سوائے اپنی ضد چھوڑنے کے۔“ ماوی نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔

”چھتاہم نہ ہنسا۔ لیکن محل سے بات تو کر سکتی ہو۔ جلال اسی میں مطمئن ہو جائے گا۔“

”بھول جائیں۔ میں اس وقت کسی کی بھی شکل نہیں دیکھنا چاہتی نہ اپنے موڈ سے ہٹ کر کوئی کام کرنا چاہتی ہوں۔“

”بے جا ضد مت کرو ماوی! شیمینہ نے لجاجت سے کہا تھا۔

”لیکن اس سے قبل کہ ماوی کچھ کہتی، دروازے پر خفیف سی دستک ہوئی ان دونوں نے بیک وقت دروازے کی جانب دیکھا۔ دونوں کے لیے ہی اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہ تھا کہ دستک دینے والا کون ہے۔

شیمینہ نے منت بھری نظروں سے ماوی کو دیکھا تھا۔

”جہاں خود پر اتنا جبر کر رہی ہو وہاں میری خوشی کے لیے تھوڑا اور سہی۔ تمہارا ذرا سا غلط رویہ بتا دیا کھیل بگاڑ دے گا۔“

”خوشی۔۔۔ جب کہ آپ کو صرف اپنی بڑی ہے۔ مجھے ہرگز نہیں پتا تھا آپ اتنی خود غرض ہیں۔“ اس کے انداز میں کمزوری در رہی تھی۔ شیمینہ نے قدرے مطمئن ہو کر اس کا کندھا ہتھکپایا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

جلال خفیف سی گھبراہٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔

”ندر آ جاؤ جلال!“

”آئی! کیا میں ماوی سے بات کر سکتا ہوں؟“

”اسے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ تمہاری بیوی ہے جب چاہو بات کر سکتے ہو۔“ شیمینہ اسے اندر آنے کا راستہ دے کر باہر نکل گئیں۔ دوسری جانب ماوی کا خون ہی کھول اٹھا تھا، لیکن وہ ضبط کیے کھڑی رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ کوشش کے باوجود مسکراہٹ یا خوش مزاجی کا تاثر بھی وہ چہرے پر نہیں لاسکی تھی۔

جلال نے اس کو بغور دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑا چھوٹا سا سنہری کیس اس کی طرف بڑھا دیا۔

”گو کہ موقع ہونے کے باوجود ایسی صورت حال تو نہیں ہے کہ کسی فارمیٹ میں پڑا جائے۔ میں جانتا ہوں آپ آئی کی وجہ سے پریشان ہیں لیکن یہ میرے دل کی خوشی ہے۔“ جلال کا جھجک آمیز انداز۔ ماوی نے خاموشی سے کیس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

جلال اس قدر خوش تھا کہ اسے ماوی کی سر دھری بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”میں بہت خوش ہوں ماوی! لیکن سچی بات ہے کہ میں یہ سب اس طرح سے نہیں چاہتا تھا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں آپ کو روایتی طریقے سے اپنا بناؤں۔ میرے گھر والے شادی میں شرکت کرتے اور سب اس خوشی کو سلیب میٹ کرتے۔ لیکن آئی کی بیماری کی وجہ سے ہمیں یہ قدم جلدی اٹھانا پڑا مگر میرا وعدہ ہے، رخصت تو میں آپ کو روایتی طریقے سے ہی کرواؤں گا۔ مجھے کچھ وقت چاہیے تاکہ میں ان لوگوں کو قائل کر پاؤں۔ تھوڑا وقت گزرنے کا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں ابھی میرے نکاح کی خبر سن کر وہ سب خفا ہوں گے لیکن آپ سے ملیں گے تو خوش ہوں گے۔ مجھے امید ہے، آپ اتنا انتظار کر لیں گی میرے لیے۔ محبت میں تو انسان بہت کچھ کر لیتا ہے۔“

وہ بے چارہ ٹھہر ٹھہر کر رول رہا تھا۔ ماوی کے آگ ہی لگ گئی تھی محبت والی بات سن کر۔

”جلال! میں تنہا رہنا چاہتی ہوں۔“ اس نے بے ساختگی سے کہا تھا لیکن اگلے ہی پل اسے اپنے سخت لہجے کا احساس ہو گیا۔

”تم پلیز برا مت ماننا۔ میں ایک چوتھلی اس سب کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ میرے سر میں بھی درد ہے اگر تم مجھے کچھ دیر آرام کرنے دو تو میں اچھا مل کر دوں گی۔“

”آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ سر میں درد ہے میں ڈاکٹر۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ ماوی نے جلدی سے کہا۔

”میں تھوڑا آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

جلال اسے آرام کرنے کی تاکید کر کے چلا گیا۔ ماوی بے زار ہو کر بیڈ پر گر گئی۔

”اتنا معصوم اور سیدھا انسان ہے یہ۔ اور میں اس کے ساتھ کیا کر رہی ہوں۔“ اس کا ضمیر اسے مستقل کچوکے لگا رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





میں آج کی تقریب میں اگر شدید کوفت کا شکار تھی۔ نہ کوئی جان بچان والا بندہ نظر آ رہا تھا اور نہ ہی کوئی شناسا صورت مگر کوئی شناسا ملتا بھی تو کیسے بالکل اجنبیوں کی محفل میں شریک تھی۔

دراصل دولہن کے بھائی ارسلان صاحب اور میرے میاں احمد افس کو لیکر تھے اور تھوڑے دنوں پہلے میری بھیلی شادی میں ارسلان صاحب شریک بھی ہوئے تھے اور ”گفٹ“ بھی دے کر گئے تھے۔

میری ساس پرانے خیالات کی مالک تھیں۔ شادی بیاہ پر دیے گئے تحائف اور روپوں کو شخص ”چڑھاوا“ سمجھنے والی اور موقع ملنے پر یہ چڑھاوا ترنت مار دینے والی موجب ارسلان صاحب کی بہن کی شادی کا کارڈ موصول ہوا تو ساس صاحبہ نے حکم جاری کر دیا۔

”بسوا تم بھی احمد کے ساتھ شادی میں شرکت کرو اور تحفہ بھی دینا ہے۔“ سو حکم حاکم مرگہ مفاجات کے تحت احمد کے ساتھ مجھے بھی شادی میں جانا پڑا۔

دو تین عورتوں سے پوچھ کر دولہن کی والدہ کا سراغ لگایا۔ ان کے پاس جا کر احمد کے حوالے سے اپنا تعارف کروایا۔ وہ بے چاری بیٹی کی رخصتی کی وجہ سے اتنی حواس باختہ لگ رہی تھیں کہ غور سے ہماری بات سنی بھی نہیں۔ بہر طور ہم گفٹ پیک انہیں تھما کر ایک نشست سنبھال کر بیٹھ گئے۔ نہ تسلی تھی کہ تقریب کے اختتام پر جب تحائف کھلیں گے تو گفٹ پیک بر جلی حریف میں ”احمد“ کا نام لکھا دیکھ کر ہماری موجودگی کفر ہو جانے کی عسوی سوچ کر تعارف میں

مزید وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

اطمینان سے بیٹھ کر میں گرد پیش کا جائزہ لینے لگی تھی۔ وہی روایتی سی پچھل مچی ہوئی تھی جو کسی بھی شادی والے گھر (سوری) کو کسی بھی شادی ہال (کا خاصہ) ہوتی ہے۔ گھروں میں تو شادیوں کے زمانے ہی لہر گئے بھی۔

میری نیل پر چند خواتین پہلے سے براجمان تھیں۔ انجان صورتیں تھیں سورجی مسکراہٹ کے ساتھ سلام دعا کرنے پر اکتفا کیا۔ ایک بھلی ہنس خاتون نے تو چند منٹوں تک مجھے کہنی دینے کی کوشش بھی کی لیکن چونکہ نیل پر موجود بانی خواتین آپس میں رشتہ دار تھیں سو مجھ سے گفتگو کرنے کی صورت میں اسے ”فیملی گوسپ“ سے محروم ہونا پڑا سو چند لمحوں بعد اس نے بھی گرون دوبارہ اپنی رشتہ دار خواتین کی طرف موڑ لی تھی۔

میں نے ان کی گفتگو کی طرف دھیان لگانے کی کوشش کی لیکن مجھے ان کی فیملی پالیسیکس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ فلاں کی، سو زبان دراز ہے۔ بڑی ممالی کی بھلی صاحبزادی کا کسی سے چکر چل رہا ہے۔ پھوپھو بیگم اپنے خورو بیٹے کے لیے خاندان سے باہر کی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ ایسے ہی ڈیڑھوں موضوعات تھے اور مزے کی بات یہ تھی کہ کسی ایک موضوع پر لگ کر گفتگو ہو ہی نہ رہی تھی۔ جیسے ذرا سی دیر میں ریموٹ سے چینل تبدیل کیے جاتے ہیں ایسے ہی ان خواتین کی گفتگو کے موضوعات بدل رہے تھے ورنہ ہو سکتا ہے کہ اگر کسی ایک ہی موضوع پر بات ہوتی اور مجھے پورے سیاق و سباق کا پتا چلتا تو کسی حد تک مجھے بھی ان کی گفتگو میں دلچسپی پیدا ہو جاتی۔

فی الوقت تو میں دانتوں پر دانت جمائیاں روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ ابھی تو بارات بھی نہیں پہنچی تھی۔ شہر کے شہر میں شادی تھی پھر بھی اتنی تاخیر مجھ سے باہر تھی۔

اللہ اللہ کہ بارات کی آمد کا غلطہ اٹھا تھا۔ دولہن والوں کے عزیز رشتہ دار بھی کچھ الٹ ہو بیٹھے۔ کچھ

قریبی عزیز بارات کے استقبال کو اٹھے۔ باقی مشتاق اور متحس نگاہوں سے بارات میں شامل خواتین کی ہڈیاں میں آمد کا نظارہ کرنے لگے۔

خواتین کی باتوں سے یہ تو اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ دولہن غیروں میں جا رہی ہے سو سب ہی فطری اشتیاق لیے دولہا کے رشتہ داروں کو دیکھ رہے تھے۔ لڑکیاں بالیاں ہنستے مسکراتے باراتی خواتین پر پھولوں کی پتیوں پھجھار کر رہی تھیں۔ بلکہ کچھ شوخ لڑکیاں تو گیلی پتیوں سے ایسے ٹاک ٹاک کر نکلنے لے رہی تھیں جیسے ان کے میک اپ خراب کرنے کا ارادہ ہو۔ باراتی خواتین بھی یہ سب آنچوائے کرتی، چروں کے آگے ہاتھ کرتے ہوئے ہنستے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اتنے میں ایک ناخوش گوار صورت حال رونما ہو گئی۔ لڑکیوں کی اس بے ضروری شرارت پر دولہا کی کسی قریبی رشتہ دار کو غصہ آ گیا تھا۔

”آپ لوگوں کو کسی نے مہمانوں کے استقبال کی تمیز نہیں سکھائی؟“

پانی میں تر تہنکھٹیاں اس کے چہرے پر کیا پڑیں کہ اس کا پارہا ہل گیا۔

”ہم تو مہمانوں کا استقبال ایسے ہی کرتے ہیں۔“ سائے بھی خاندان کی سب سے منہ پھٹ لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے بنا کسی لحاظ کے جواب دے دیا۔

خاتون کے چہرے کی تمام اہٹ دیکھنے کے لائق تھی۔ اس نے لڑکی کو بے نقط سادی تھیں۔ سزا سی دیر میں ماحول میں عجیب سی گرا گری سی پیدا ہو گئی تھی۔ اتنے میں دولہن کی خالہ صورت حال سنبھالنے آگے بڑھیں۔ ”معاف کیجئے گا، بن اپنی ہے“ تا سمجھ ہے ابھی۔ ”انہوں نے لاجب سے خاتون کو مخاطب کیا۔

”پہلے ہی بتا دیجئے جس بچی کو ہم بیاہنے آئے ہیں وہ بھی ایسی ہی نا سمجھ تو نہیں۔“ وہ خاتون ماش کی دال کی طرح اٹھنے جا رہی تھیں۔ دولہن کی خالہ بہت عاجزی و انکساری سے انہیں منانے میں لگی ہوئی تھیں۔ بہت مشکلوں سے وہ رام ہوئی تھیں۔ دولہن کی خالہ



نے سکون کا سانس لیا لیکن وہ خاتون آگے بڑھیں تو لڑکیاں خالہ پر چڑھ دوڑی تھیں۔

”کیا ضرورت تھی خالہ ان کے اتنے نیچے لگنے کی؟“ ابویں اتنا غصہ کر رہی تھیں۔ آپ کو چاہیے تھا دو چار آپ بھی سنائیں انہیں۔ ”لڑکیوں سے خالہ کا لجا جات بھرا انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

”چھاپس اب یہ جھگڑنا ختم کرو۔ اتنی مشکلوں سے بات سنبھالی ہے۔ تم لوگوں کو صورت حال کی نزاکت کا احساس ہی نہیں۔“ وہ لڑکیوں کو منتشر ہونے کی ہدایت کرتی آگے بڑھ گئی تھیں، لیکن لڑکیاں پھر بھی خاص درویش کھڑی ہو کر کھڑی رہی تھیں۔

”اگل ہیں یہ لڑکیاں۔“ بھی دولہا والے ہیں۔ ہر طرح کا خزا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ لڑکی والوں کا کام صرف ناز برداری ہی تو ہے۔“ میرے ساتھ بیٹھی خاتون نے تاسف آمیز انداز میں تبصرا کیا۔ ہر حال افسوس تو مجھے بھی تھا۔ گھر آکر میں نے احمد سے بھی اس واقعے کا تذکرہ کیا تھا۔



”عجب تک چڑھے سے بارانی تھے۔ آپ کے دوست کی بہن تو چھٹن گئی بے چاری۔“ مجھے واقعی لڑکی پر ترس آ رہا تھا۔

”اگرے چھوٹا بارالڑکی اگر سمجھ دار ہوئی تو جانے کے ساتھ ہی میاں کو مٹھی میں کر لے گی اور میاں کا ساتھ ہو تو ہر طرح کے تیز طرار سسرالی رشتہ داروں سے نمٹنا جاسکتا ہے۔“ احمد نے مجھے چھیڑا تھا۔

”سو تو ہے۔“ میں بھی کھکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اور دو چار ہینے بعد کی بات تھی۔ مجھے ایک اور تقریب میں شرکت کرنی پڑی۔ اس بار شادی بڑوس میں ہو رہی تھی۔ ہمارے گھر سے چار گھر چھوڑ کر شہناز کا گھر تھا۔ چار پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ خالص دھوم دھڑکے سے شادی کے فنکشن جاری تھے۔

مایوں مہندی کی رسموں میں تو میری ساس بھی میرے ساتھ شریک تھیں بلکہ شادی والے دن انہیں زیر دست قسم کا قلو ہو گیا۔ ”لفافہ“ پہنچانے کی ذمہ داری اس بار بھی میرے ناتواں کندھوں پر آن پڑی۔

خیر! اس تقریب میں اگر مجھے خوب مزہ آیا۔ کالونی کی سب خواتین مدتوں بعد اس تقریب کے بہانے اکٹھی ہوئی تھیں۔ ان سے گپ شپ میں مزے سے

وقت گزار رہا تھا۔ بات پڑناں میں پیچھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اسٹیج پر رسمیں جاری تھیں۔ سائلی سلونی سی شہناز پر خوب روپ چڑھا تھا۔ اب اللہ جانے یہ قدرتی روپ تھایا ہوئی پارلر کے میک اپ کا کرشمہ تھا۔

ہر حال گورے چنے دو لہا (دولہا کے گورے رنگ کے بھی قدرتی ہونے میں شبہ تھا) کے پہلو میں بیٹھی وہ خوب بچ رہی تھی۔ فوٹو سیشن جاری تھا کہ اچانک اسٹیج پر بد مزگی پیدا ہو گئی۔

”گب سے آپ لوگ ہی بیٹھ بیٹھ کر تصویریں کھنچو رہے ہیں۔ ہمارے بچے کھڑے منہ دیکھ رہے ہیں اب کچھ ہمیں بھی موقع دیجئے۔“ دولہا کی چچی نے دولہن والوں سے شکوہ کیا۔

”بہن! آج کا فنکشن تو ہمارا ہے، ویسے پر اپنے

ارمان جی بھر کر پورے کر لیجئے گا۔“

شہناز کی مامی نے تو ہنس کر ہی کہا تھا لیکن دولہا کی چچی جواب سننے ہی بھڑک اٹھی تھیں۔ تن فٹن کرتی اسٹیج سے اتری تھیں۔ ان کے پیچھے انہیں منانے کو شہناز کی والدہ اور بھابھی لپکی تھیں۔ ذرا سی بات تھی لیکن بد مزگی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ دولہا کی چچی کے مزاج ہی نہ مل رہے تھے، شہناز کے گھر والے انہیں منانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔

ہماری نیل چونکہ اسٹیج کے قریب تھی سو ساری صورت حال کا لائیو نظارہ کر رہے تھے۔ جانے کیوں دولہا کی چچی کی شکل مجھے شہناز کی لگ رہی تھی۔ کتنی دیر تک میں ذہن پر زور ڈالتی رہی۔

پھر جرب دو ٹن والوں کی معافی تلانی کے بعد معاملہ سلجھ گیا۔ تب جا کر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ تو ارسلان صاحب کی خالہ تھیں وہی خالہ جو چند ماہ پہلے انتہائی لیا جت سے اپنی بھانجی کے سسرال والوں کو رام کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ آج نہ صرف ان کا حلیہ بدلا ہوا تھا بلکہ پوری کی پوری باڈی لینگویج ہی بدلی ہوئی تھی۔

چمکیلا بھڑکیلا سوٹ، فٹل میک اپ اور مزاج کا طغیان۔ خدا کی پناہ! میرا تو بچ چاہا کہ ان کے پاس جا کر انہیں وہ تقریب یاد دلاؤں جب وہ دولہا والوں کے سامنے ”مین مین کر رہی تھیں“ لیکن ظاہر ہے اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ گھر جا کر حسب معمول احمد کو آج کی تقریب کی روداد سنائی تو انتہائی تاسف سے یہ واقعہ بھی وہ پر لیا۔ وہ ہنس پڑے۔

”ہو تا ہے یا! اس میں اتنی حیرانی اور افسوس کی کیا بات ہے؟“

”نہیں احمد! مجھے تو زندگی میں پہلی بار ایک ہی انسان کے دو اتنے متضاد روپ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

”ہو سکتا ہے یہ تمہارا پہلا اتفاق ہو لیکن غور کریں تو اپنے آس پاس ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی۔ ایک خاص وقت میں ہمارا طرز عمل کچھ اور ہوتا ہے اور کسی

دوسرے وقت میں اس سے بالکل الٹ۔ بس یوں کچھ لو کہ اپنے سے زور آور کے سامنے ہم خود بخود پسپائی اختیار کر لیتے ہیں اور ایسے ہی کسی موقع پر کمزور مد مقابل ہوں تو اس پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ میری جان! ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کے دو چہرے نہ ہوں۔“

احمد نے رسائی سے مجھے سمجھایا تھا۔ اس وقت تو میں نے مزید بحث سے گریز کیا تھا کہ گھڑی کی سوئیاں کبہ رہی تھیں کہ اب سوئے میں مزید تاخیر کی گئی تو صبح دیر سے آنکھ کھلنے کی صورت میں ساسو ماں کی توریال چڑھی ملیں گی جو جلدی سے شب خوابی کا لباس اٹھا کر وائش روم کا رخ کیا۔ شاور لیے بغیر مجھے نیند ہی نہ آتی تھی۔



”احمد! میرا فیورٹ ڈرامہ آنے والا ہے۔“ ریموٹ مجھے دے دیں۔ ”بیز روم میں میرا اور احمد کا زیادہ جھگڑا ریموٹ پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ہی ہوتا تھا ورنہ اگر لاؤنج میں بی وی دیکھ رہے ہوتے تو وہاں میری ساس کی بلا شرکت غیرے حکمرانی ہوتی۔“

ریموٹ ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ ایک منٹ میں زبیدہ آبا کے ٹونگے دیکھ رہی ہوتیں تو اگلے منٹ چھلانگ لگا کر اٹار پر یوار ”میں جھانک آئیں۔ دو منٹ بعد کیوں دی اور چار منٹ بعد کوئی بھی پاکستانی ڈرامہ۔ غرض ایک گھنٹے میں بارہ مسالوں کی چاٹ کھانے سواری دیکھنے کے بعد میں اٹھ کر کچن کی راہ لیتی کہ رات کا کھانا ہمارے ہاں جلد کھالیا جاتا تھا۔ کھانے کے بعد برتن وغیرہ سمیٹ کر میں اپنی اور احمد کی چائے لے کر اپنے

بیز روم میں آ جاتی۔ یہاں میری حکمرانی قائم تھی۔ ہاں، تبھی کبھار احمد بھی ضد پکڑ لیتے جیسا کہ آج ہو رہا تھا۔ کوئی ٹاک شو آ رہا تھا جس میں حسب معمول سیاست دانوں کے مابین گرامر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر ریموٹ پر کنٹرول حاصل کرنے کی ناکام کوشش کے بعد میں ان کے ساتھ وہ بی پروگرام دیکھنے لگی کہ سیاست میں تھوڑی بہت دلچسپی تو میں بھی رکھتی تھی۔ انکو برسن ایک — وزیر سے کسی معاملے پر

استفسار کر رہا تھا اور وہ بلاوجہ اس پر اور ساتھ بیٹھے اپوزیشن رکن پر چڑھ دوڑ رہا تھا۔ ”توبہ ہے احمد! یہ بندہ پچھلے دور حکومت میں اسی پروگرام میں آتا تھا تو کیسے اس انکو برسن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہو تھا۔ آج تو اس کی ٹون ہی مختلف ہے۔“ مجھے حیرت ہو رہی تھی۔

”ہاں! جب یہ اپوزیشن میں تھا۔ اب ماشاء اللہ سے صاحب اختیار اور صاحب اقتدار ہے۔“ احمد نے طنزاً ”کما

”اس دن آپ ٹھیک کبہ رہے تھے۔ بہت سے لوگ دو چہرے رکھتے ہیں۔“ مجھے ان کی کچھ دن پرانی بات یاد آئی تو قائل ہوتے ہوئے بولی۔

”ہم غلط کب کہتے ہیں جناب! احمد نے ہنس کر کہا۔ میں بھی مسکرا دی تھی۔



احمد کا آفس کا کوئی مسئلہ الجھ گیا تھا۔ گھر آکر بھی دیر تک فائلوں میں سر کھاتے رہتے۔ چھٹی والے دن بھی انہوں نے اپنے ماتحت کو کام کے لیے گھر بلوایا تھا۔

میں ڈرائنگ روم میں چائے دینے گئی تو احمد اس کی کسی غلطی پر بری طرح جھڑک رہے تھے۔ وہ بے چارہ منمنکر ”سواری سرائیس سر“ کرتا رہا۔ اسی وقت احمد کے سیل فون پر ان کے پاس کا فون آ گیا۔ وہ بھی شاید کوئی فائل ہی گھولے بیٹھا تھا۔ اب ”میں سر سواری سر“ کہنے کی باری احمد کی تھی۔ مجھے زوروں کی ہنسی آ گئی۔ چائے کی ٹرے پکڑانے کے لیے دروازے پر

ہلکی سی دستک دی۔ احمد یا ہر نگلے۔ چہرے پر اس کی تازہ سی جھاڑ کے اثرات نمایاں تھے۔ مجھے چھینٹنے کی ہمت نہ ہوئی ورنہ ضرور کہتی کہ آج مجھے آپ کے بھی دو چہرے دیکھنے کو مل گئے۔

لوگوں کا اس انداز میں مشاہدہ ایک اچھا مشغلہ تھا جو میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ بی وی دیکھتی جب بھی یہ ہی موازنہ کرتی رہتی۔ ہمارے ملک کے حکمران جب اپنے ملک میں ہوتے تو ان کی باڈی لینگویج ایسی ہوتی



جیسے وہ شہنشاہ وقت ہوں اور باقی سب رعایا اور وہی حکمران غیر ملکی دوروں پر جاتے یا کوئی طاقت ور غیر ملکی شخصیت ان سے ملنے آتی تو ان کے لبوں سے چپکی خوشامدی مسکراہٹ ہی جدا نہ ہوتی۔ ہرگز مرتے دن کے ساتھ میں احمد کے فلسفے کی قائل ہوتی جاری تھی۔



آج میں بہت دن بعد اپنے میکے گئی تھی۔ امی میری آمد پر خوش بھی تھیں اور خفا بھی۔ کل شام میں نے انہیں فون کر کے کہا تھا کہ میں صبح صبح ان کے ہاں پہنچ جاؤں گی لیکن وہاں جاتے جاتے شام ہی ہو گئی تھی۔ گلے لگاتے ہی انہوں نے اتنی دیر سے آنے پر شکوہ کر ڈالا تھا۔

”تسا ہے نابوڑھی ماں انتظار کرتے کرتے سوکھ جاتی ہے پھر بھی جلدی نہیں آسکیں۔“  
”سوری امی اور اصل صبح تا عہ آگئی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ اس کے میاں کا آف تھا۔ بہت دن بعد اس کا آنا ہوا تھا پھر ماں نے کہا کہ منڈ منڈوئی اتنے دن بعد آئے ہیں۔ کیا کہیں گے کہ بھانج دو گھڑی بھی ان کے پاس نہ بیٹھ سکی۔ اسے گھر شام کو چلی جانا۔“ میں نے چپکے سے جو حقیقت تھی انہیں بتا ڈالی۔

”بہت خوب ہیں تمہاری ساس۔ اپنی بیٹی کا تو بڑا خیال ہے اور ہم اپنی بیٹی سے ملنے کو ترستے رہیں۔“ امی خفگی سے بولیں۔

”چھا! خفگی چھوڑیں۔ احمد کہہ رہے تھے کہ رات یہیں رک جانا۔ کل آفس سے واپسی پر مجھے لیتے جائیں گے۔“ میں نے انہیں منایا۔ حسب توقع وہ خوش ہو گئی تھیں۔

احمد رات کا کھانا کھا کر واپس چلے گئے۔ میں امی کے پیڑروم میں بیٹھ کر گزرے دنوں کا حال احوال سناتے لگی۔ ردا بھابی چائے دینے آئیں تو میں نے انہیں بھی محفل میں شمولیت کی دعوت دی۔

”بیٹھیں نا بھابی! ابھی تک آپ کے کام نمٹے نہیں۔ لیکن چھوڑ دیں۔ میں سمیٹ لوں گی۔“ میں

نے فراخ دلی سے آفر کی۔  
”نہیں! لیکن تو سمٹ گیا۔ بس اب جاکر سو رہی ہوں۔ سر بھاری بھاری ہو رہا ہے۔“ وہ آہستہ سے کہتے ہوئے پلٹ گئی تھیں۔

”خیریت یہ ردا بھابی کو کیا ہوا؟ ابھی ابھی سی لگ رہی تھیں۔“ میں نے حیرت سے امی سے استفسار کیا ردا بھابی خاصی خوش مزاج خاتون تھیں اس لیے ان کا بدلہ بلا سانداز مجھے ہضم نہ ہوا تھا۔

”ہونا کیا ہے۔“ میکے جانے کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔ میکے بھی تو شہر کے آخری کونے پر ہے۔ پورے دو گھنٹے وہاں پہنچنے کے لیے چاہیے ہوتے ہیں اظہار

بے چارے کی ہفتہ دس دن میں ایک چھٹی ہوئی ہے۔ بچہ اتنے دن کی تھکن اتارے یا بیوی کی خوشی کی خاطر مزید تھکن چڑھالے۔ اس نے کہہ دیا کہ آج ڈرائیونگ کا موڈ نہیں۔ ہو بیگم نے میری حمایت چاہی لیکن میں اظہار کو کاغذ کو مجبور کرتی پھر تم نے بھی آنا تھا۔ اتنے دنوں بعد بھابی سے ملاقات نہ ہو پاتی تو کتنا جی دکھتا تمہارا اور پھرچ کون تو ہم نے تو گھر کے سیاہ سفید کا مالک ردا کو ہی بنا رکھا ہے۔ میں تو یکن میں جاؤں تو پتا نہیں چلتا کہ کس ڈبے میں وال ہے تو کس میں چینی۔ وہی مختار کل ہے۔ احمد نے آنا تھا اتنے پر تکلف کھانے کا اہتمام اکیلی میری جان سے کب ممکن تھا۔“ امی نے رسالت سے کہا۔

”صحیح کہہ رہی ہیں امی! اور پھر بے چارے اظہار بھابی کیوں اتنی مشقت برداشت کریں جیسے ہم جانتے نہیں کہ لاگت ڈرائیو سے ان کی کتنی جان جاتی ہے۔ بھابی کا گھر والوں سے ملنے کو بی کر رہا تھا تو اسے کسی بھابی کو بلا لیتیں۔ ساء اللہ چھوٹے بڑے ملا کر کل پانچ بھابی ہیں ان کے اور گھر میں گاڑی بھی ہے اور بانیک بھی۔“ میں نے امی کے موقف کی تائید کی۔

”اور نہیں تو کیا۔“ امی نے سر ہلاتے ہوئے ٹرے میں سے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ میں اپنا کپ اٹھا کر گھونٹ بھرے لگی اور گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جڑ گیا جہاں ردا بھابی کے آنے سے ٹوٹا تھا۔

کچھ کہنے کا وقت نہیں یہ۔ کچھ نہ کہو، خاموش رہو اے لوگو خاموش رہو۔ ہاں اے لوگو، خاموش رہو

سچ اچھا، پر اس کے جلو میں، زہر کا ہے اک پیالہ بھی پاگل ہو؛ کیوں ناتیق کو سقراط بنو، خاموش رہو

حق اچھا۔ پر اس کے لیے کوئی اور مرے تو اور اچھا تم بھی کوئی منصوبہ ہو جو سولی پہ چڑھو؟ خاموش رہو

اُن کا یہ کہنا سورج ہی دھرتی کے پھیرے کرتا ہے سر آنکھوں پر، سورج ہی کو گھومنے دو۔ خاموش رہو

مجلس میں کچھ جس ہے اور نہ نجیر کا آہن چبھتا ہے پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، ہاں پھر سوچو، خاموش رہو

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں، من میں کیا کیا موسم ہیں اس بگیلے کے بھید نہ کھولو، سیر کرو، خاموش رہو

آنکھیں موند کنارے بیٹھو، من کے رکھو بند کواڑ انشائی لو دھسا گا لو اور لب سی لو، خاموش رہو

ابن انشا





وہ جو حال تھا وہی حال ہے کہوں کس طرح نیا سال ہے  
وہی زندگی کہ وہاں ہے کہوں کس طرح نیا سال ہے  
وہی بے یقینی ہے کہ وہی ناامیدی ہے چار سو  
جو بھی ہے سراپا سوال ہے کہوں کس طرح نیا سال ہے  
وہی دوست و پاؤں ہی چشم و لب جو گہن میں تھے وہ گہن میں ہیں  
وہی سخن جس پر زوال ہے کہوں کس طرح نیا سال ہے  
وہی انتشار سی زندگی ہے وہی غبار سی زندگی  
وہی سانس لینا محال ہے کہوں کس طرح نیا سال ہے  
وہی پھول پھول پہ تنلیاں ہیں ڈری ہوئی کہ مری ہوئی  
وہی بے بسی جو کمال ہے کہوں کس طرح نیا سال ہے  
وہی خواب ہیں کہ عذاب ہیں وہی روز و شب کے سب ہیں  
وہی گردشِ مہ وصال ہے کہوں کس طرح نیا سال ہے  
حسن عباسی

### رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے  
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض  
کیا کہ میں حضرت ابوذرؓ سے محبت کرتا ہوں۔  
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تم نے ان  
کو یہ بات بتا دی ہے؟“  
میں نے کہا: ”نہیں۔“  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”انہیں بتا دو۔“

پھر جب میری حضرت ابوذرؓ سے ملاقات ہوئی  
تو میں نے کہا۔

”مجھے آپ سے اللہ کے لیے محبت ہے۔“  
انہوں نے جواب میں مجھے دعا دی۔ پھر میں نے  
واپس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا۔ حضور صلی اللہ علیہ  
وسلم نے فرمایا۔

”اپنی محبت کے بتانے میں بھی اجر و ثواب ملتا  
ہے۔“ (طبرانی)

### حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان،

جب جسم موت کے لیے ہے تو اللہ کی راہ میں شہید  
ہونا سب سے بہتر ہے۔  
بشری باجوہ عطاریہ۔ اوکاڑہ

### حسن اخلاق،

کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا: ”انسان میں کتنے  
عیب ہوتے ہیں؟“

جواب ملا: ”بے شمار لیکن ایک خوبی سب پر  
پردہ ڈال دیتی ہے اور وہ ہے حسن اخلاق۔“  
تمو، اترک، کراچی



### دس محرم الحرام،

دس محرم الحرام کو چاند، ستارے، زمین اور  
آسمان، جنت اور دوزخ بنائے گئے۔  
اسی دن ذوق غرق نیل ہوا۔

اسی دن حضرت یوسفؑ کنویں سے باہر آئے۔  
اسی دن زین پر پہنسی مارش ہوئی۔  
اسی دن حضرت یعقوبؑ کی بیٹائی لوٹائی گئی۔  
اسی دن حضرت یونسؑ بچلی کے پیٹ سے باہر  
آئے۔

اسی دن حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ پیدا  
ہوئے۔

اسی دن حضرت امام حسینؑ نے کربلا میں شہادت  
پائی۔

اسی دن قیامت آئے گی اور یہ دن بہت برکتوں  
والا ہے۔

صالحہ۔ اقصیٰ۔ میر بلوچ آزاد کشمیر

### قابل غور،

ایک مرتبہ ایک عورت ایک نفسانی معالج کے  
پاس گئی اور شوہر سے روز جھگڑنے کی شکایت کرتے لگی۔  
”ڈاکٹر صاحب ہم دونوں ہر وقت لڑتے رہتے ہیں،  
بات بات پر شوہر عقوق کرنے لگتا ہے اور خیر مجھے  
بھی عقوق آجاتا ہے۔“

اس پر اس ڈاکٹر نے کہا: ”اس کا علاج نہایت آسان  
ہے۔ تم شہر کی گودن کے تین بالے آؤ۔“

عورت ہمت کر کے چڑھا کر گئی اور شیر کے لیے کچھ  
گوشت لے گئی، جسے شیر نے کھا لیا۔ عورت کا ڈر کچھ کم  
ہوا اور وہ روزانہ شیر کے لیے گوشت لے جانے لگی۔



پہلے وہ گوشت دُور سے پھینکتی تھی پھر نزدیک سے پھینکتی تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ گوشت کھانے لگا تو بچے میں ہاتھ ڈال کر اس کی گردن پر بیدار کرنے کی کوشش کرتی۔ جب شیر اس سے کافی مانوس ہو گیا تو اس کے گردن پر ہاتھ پھرتے ہوئے تین بال بکچھ لیے اور معالج کے پاس لے آئی۔ اس پر اس نے کہا۔  
 ”رکتے انھوں کی بات ہے کہ تم اپنے رویے اور نرم دلی سے شیر کو تو مانوس کر سکتی ہو، جو وحشی ہے مگر ایک مرد اور وہ بھی تمہارا شوہر، تم سے مانوس نہیں ہوتا، مسرت الطاف احمد کراچی

### اقوال زریں

- صرف بد دعائیں ہی خوشیوں کے راستے بند نہیں کرتیں بعض اوقات صبر بھی سکھ کی راہ کی دھول بن جایا کرتا ہے۔
- آنکھوں دیکھا جھوٹ نہیں ہوتا مگر کبھی کبھار مفہوم وہ نہیں ہوتا جو ہماری عقل سمجھتی ہے۔
- جو چیزیں پُر اسرار ہوتی ہیں وہ پر تشش بھی ہوتی ہیں۔
- ہر عمل کے اندر اس کا انجام یوں چھپا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔
- خاموش انسان خاموش بانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں اور خاموشی خود ایک راز ہے۔
- مہوش ڈوگر۔ گوجرانوالہ

### خوشبو جیسی باتیں

- شک و شبہ اور تذبذب کی گنجائش جہالت کی تارکی میں ہوتی ہے اور جہاں علم کی روشنی نمودار ہوتی ہے وہاں ہر چیز جیسی، ہودوسی نظر آ جاتی ہے۔
- رشتے اپنائیت کے ہوں یا غلوں کے، اتنے ہی نازک ہوتے ہیں جتنے آبگینے۔ ذرا سی ٹھیس لگی تو ٹوٹ گئے۔ بدگمانی نے مرا آٹھایا تو پکنا چوڑ ہو گئے پھر ان پر کیسا فخر، کیسا مان؟
- زخم ہمیشہ اس سے ٹھیک ہوتے ہیں جو انہیں غایت کرنا ہے اور کبھی کبھی تو یہ اس کے بس کی بھی بات نہیں رہتی۔

- جتنا کسی کا ساتھ بڑا ہو، اتنا ہی اس کی بے وفائی کے لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ تبدیلی کا شائبہ کاغذ پر قلم سے۔
- جب جب اعتبار کا بوجھ بڑھتا ہے تبھی انسانوں کی اصل اوقات کا پتا چلتا ہے کہ وہ کتنا اعتبار سنبھال سکتے ہیں۔

آمنہ اجالا۔ ڈھیر کی

### خاموشی

اگر ہم زبان کی پھیلانی ہوئی مصیبتوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ خاموشی میں کتنی راحت ہے۔ زیادہ بولنے والا انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ سچ اور جھوٹ کو ملا کر بولے۔ اُس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ سوچ سکے کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا۔  
 (واصف علی واصف)  
 تحریم۔ گوجرہ

### منہ پر تعریف

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والد بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی نے ان کے پاس آکر سلام کیا۔ لوگوں میں سے ایک آدمی نے اس کے منہ پر اس کی تعریف کرنا شروع کر دی۔  
 حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ”تم نے تو اس آدمی کو فزع کر ڈالا۔ اللہ نہیں دیکھ کرے تم اس کے منہ پر اس کے دین کے بارے میں اس کی تعریف کر رہے ہو۔“

### مسلمان کی ضرورت پوری کرنا

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں ایک مہینہ یا ایک ہفتہ یا چنداں اللہ چاہے اس وقت تک مسلمانوں کے کسی ایک ٹکڑے کی ضروریات زندگی پوری کروں یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں حج پر جج کروں۔

### صدقہ

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت سعدیہ رضی اللہ عنہا

ہیں کہ ایک دن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے ایک لاکھ درہم صدقہ کیے پھر اس دن ان کو مسجد میں جانے سے صرف اس وجہ سے دیر ہو گئی کہ میں ان کے کپڑے کے دو ٹول کناروں کو ملا کر سیوا۔  
 لاکھ درہم سب دوسروں کو دے دیے اپنے اوپر کچھ نہ لکایا۔

### دل کو دل سے راہ

حضرت مجاہد کہتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت ابن عباس کے پاس سے گزرا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔  
 ”یہ آدمی مجھ سے محبت کرتا ہے“  
 لوگوں نے پوچھا۔ ”اے ابو عباس آپ کو کیسے پتا چلا؟“  
 انہوں نے کہا۔ ”اس لیے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“

### حسن یوسف اور حسن مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یوسفؑ کو دیکھ کر عورتوں نے ہاتھوں پر پھیر بیاں چلائی تھیں، میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیں تو بیٹے پر پھیر بیاں چلا لیتیں۔  
 حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ جو عورتوں کا چاند جبکہ رہا تھا اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم طرح دھاری دار چادر پہنے ہوئے مسجد نبوی کے صحن میں بیٹھے تھے۔ ہم بھی چاند کو دیکھتے، تبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو دیکھتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا جمال جو عورتوں رات کے چاند سے زیادہ تھا۔ سبحان اللہ۔  
 شانزہ باشم۔ قصور

### تم جو چاہو تو سنو

- رشتے اور سودے میں بہت فرق ہے۔ رشتے قائم کیے جاتے ہیں اور سودے طے کیے جاتے ہیں۔
- کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جنہیں نبھاتے ہوئے پل صراط پر سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔
- کچھ تعلق اتنے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن کچھ رشتوں کو قائم رکھنے کے لیے انصر وری ہوتی ہے۔

- اپنے آپ سے زبردستی مت گریں ورنہ ٹوٹ جائیں گے۔
- زندگی ایک ایسی ٹرین ہے جو ہمیشہ ایسے اسٹیشن پر رکتی ہے جہاں آپ اترنا نہیں چاہتے۔
- بعض اوقات پھیلانی ٹھی اور کے ساتھ کی جاتی ہے اور اس کی قدر کوئی اور کرتا ہے۔
- اگر آپ سب کچھ کو پکے ہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو سب کچھ کھو دیتا ہے اُس کے پاس پانے کے لیے لوری دنیا ہوتی ہے۔
- ڈاکٹر کو مل ستار۔ جامشورو

### قسمت

- قسمت وہ مارکیٹ ہے جہاں جدوجہد چیزوں کی قیمت بڑھاتی ہے اور کٹائی انہیں گھٹاتی ہے۔
- قسمت انسان اور جدوجہد کے درمیان ایک متحرک سنگر ہے۔
- قسمت ملکیت کے طور پر نہیں، آزمائش کے طور پر تھما ہے پاس آتی ہے۔
- قسمت ہم سے وہی کچھ چھیتی ہے جو ہم کو دیدی ہے۔
- ہماری قسمت کا فیصلہ ہماری زبان کی نوک پر ہوتا ہے۔
- قسمت ہمارے معاملات کو ہماری تمنائوں سے بہتر طور پر چلاتی ہے۔
- رقیہ اسماعیل۔ یزمان

### تاکید

- ہمیشہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کریں کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔
- اپنی چھوٹی چھوٹی فضیلت خیریتوں سے بچیں کیونکہ ایک چھوٹا سا سوراخ بہت بڑے جہاز کو ڈبوئے کی طاقت رکھتا ہے۔
- تو واقعی انسان خسارے میں ہے۔ جب



اللہ تعالیٰ اس کی بخشش کے لیے کوئی راستہ پیدا کرتا ہے تو وہ خود ہی اس راستے کو بند کر کے اللہ کی ناراضی کا سبب بنتا ہے۔  
نمیدہ کوثر

اور کوراگد مار تگ کہہ کر مسکار کا جواب دے دیتے  
شاہدہ شبیر رانا - رحمان گڑھ

### سقراط

• سقراط نے جو دنیا کا پہلا فلسفی شمار کیا جاتا ہے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ کیونکہ وہ لکھنا جانتا ہی نہیں تھا۔  
• سقراط انتہائی بد صورت تھا۔ اس کے شاگرد نے اس کی مثال ایک ایسے مجسمے سے دی تھی جو ادھر سے تو نہایت مضحکہ خیز ہوتا ہے لیکن اس کے اندر دیوتا کی تصویر ہوتی ہے۔  
• سقراط کی ماں واپہ تھی اور وہ خود مجسمہ ساز تھا۔  
• سقراط کبھی پسہ کمانے کے بارے میں پیچیدہ نہ تھا کیونکہ اس کی بیوی ہر وقت لڑائی رہی تھی۔  
• سقراط کی قوت پر داشت کمال کی تھی۔ شہر میں وہ واحد شخص تھا جو ننگے پیر برف پر گھومتا دیکھتا تھا۔  
• سقراط نے نو جوانی میں میدان جنگ میں بہادری کا انعام حاصل کیا تھا۔  
• تحریم گجرہ

### باتیں خلیل جبران کی

• سجائی دختر و جبران ہے۔ تجزیہ، تنقید اور مباحثہ انسانوں کو سجائی سے دودھ دکھاتا ہے۔  
• خواہش بھی ایک طرح کا مشغول ہے۔  
• رانا اودے خوف کے درمیان بٹوارہ مگر ڈی کے جانے سے زیادہ مارا گیا اور نازک ہے۔  
• جہنم کا خوف بجائے خود جہنم سے جبکہ جنت کی خواہش بجائے خود جنت۔  
• ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ فادوں میں رہنے والے بھی تک موجود ہیں جبکہ غار ہمارے دل میں۔  
• ہم جیسے موسیٰ کے ساتھ بدلتے رہیں لیکن موسیٰ ہمیں نہیں بدل سکتے۔  
• حراقیشی - بلال کالونی ملتان

### قائد اعظم محمد علی جناح

• ممتاز مفتی اپنی کتاب "لام دین" میں لکھتے ہیں۔  
• قائد اعظم کے کردار سے میں بے حد متاثر تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے بدترین دشمن بھی ان کے کردار کے معترف تھے۔ کبھی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ قائد کے کردار پر حرف زنی کر سکے۔ قائد کی دنیا میں عزت کیوں نہ ہوتی۔ ان میں ہر وہ بات موجود تھی جس کا میں معترف تھا۔ جدید تعلیم سے آگاہ تھے۔ اصولوں کے پابند تھے۔ ہیرا پھیری نہ خود کرتے اور نہ دوسروں کو کرنے دیتے۔ عقل و خرد کے قائل تھے۔ جذبات سے مغلوب نہ ہوتے تھے۔ مجھے ان سے صرف ایک شکایت تھی۔ سوچنا انہوں نے سیاست کو کیوں اپنا رکھا ہے۔ اگر ہیرا پھیری کرنے کی صلاحیت موجود نہیں تو ہیرا پھیری کے اکھاڑے میں کیوں اکھڑے ہیں؟ بڑے بڑے سیاسی اقدامات کا مجھے شعور نہ تھا۔ البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر میں اکثر سوچتا تھا۔ مثلاً گاڈ بھی جی اپنے آپ کو "مہاتما" کہلاتے تھے۔ اخباروں میں بھی ان کا نام مہاتما گاڈ بھی چھپتا تھا لیکن قائد اعظم انہیں ہمیشہ مسٹر گاڈ بھی کہہ کر بلاتے تھے۔

• بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ آخر قائد انہیں مہاتما کہہ کر بلانے سے کیوں گزر کر رہتے تھے؟  
• یہ نہیں کہ مجھے مہاتما سے مفہوم کا علم نہ تھا۔ میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ مہاتما کا مطلب عظیم انسان ہے لیکن اس حقیقت کا شعور نہ تھا کہ اگر آپ کسی کو بابر اعظم انسان کہہ کر بلائیں تو انجانے میں آپ اس کو عظیم مان لیں گے تو پھر اس کی بات کو رد کرنا مشکل ہو جائے گا۔  
• پھر سلام کرنے کی تفصیل تھی۔ مہاتما کا مذہبی جیب بھی قائد سے ملنے کو دو دلوں ہاتھ جوڑ کر مانتے رہے جاتے اور پھر جھک کر انہیں مسکارا کرتے۔ اس کے برعکس قائد مذہبی اخلاق سے لڑی کو جھوٹے اور ایک خشک

## شاعری سے بولتی ہے

### بالو مای قادری

ہم خوش ہوں یا فخر وہ، شاعری ہماری ہر کیفیت کو خوبصورتی اور آسانی سے بیان کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس میں تنگ نہیں کہ وہ بات جسے اگر عام زبان میں کہنا چاہیں تو بہت سے لفظ بولنے پڑیں مگر وہی بات جب شعری زبان میں کہیں تو محض چند الفاظ میں بہت دلکش طریقے سے ہم اپنی بات کہہ سکتے ہیں۔

قارئین! ہونا معاف کیجئے گا کہ میرے پاس زیادہ تر شاعری ایسی ہے کہ مجھے شعراء کے نام معلوم نہیں۔ بس جہاں سے کچھ اچھا پڑھا یا سنا لکھ لیا۔

شاعری بھی دگر ہوتی ہے اپنے دل کے داپھوں کو اپنے دل کی حسرتوں کو اپنے لفظوں میں پرو کر اپنی آنکھوں میں بھلو کر مسکرا دے۔

• محنت کی فطرت کو ظاہر کرتی ہوئی امجد اسلام امجد کی یہ نظر جانے کہاں سے پڑھ کر ڈاکٹری میں سجائی تھی یا ڈاکٹری کو سجایا تھا اس سے۔  
• محنت کی طبیعت میں یہ کیسا پیچنا قدرت نے رکھا ہے کہ یہ جتنی بھی پرانی، جتنی بھی مضبوط ہو جائے اسے تازہ تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے یقین کی آخری حد تک دلوں میں لہلہاتی ہو نگاہوں سے پکٹی ہو، لبوں میں جگمگاتی ہو ہزاروں طرح کے دلکش، حسین بالے بناتی ہو اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے محنت مانگتی ہے یوں تو وہی اپنے ہونے کی

کہ جیسے طفل سادہ شام کو اک بیج بولے اور شب کو بار ہا لٹے زمین کو کھود کر دیکھے کہ بودا اب کہاں تک ہے محنت کی طبیعت میں عجب تکرار کی خواہش ہے کہ یہ اقرار کے لفظوں کو سننے سے نہیں ٹھکتی کچھ سننے کی گھڑی ہو یا کوئی ملنے کی ساعت ہو اسے بس ایک جی وطن ہے

کہو مجھ سے محنت ہے نہیں مجھ سے محنت ہے کہو مجھ سے محنت ہے

شاعری جو احساس کی برتھیاؤں میں تخیل کی جسم کرتی ہے اور انسانی تخیل کو آسائش دیتا اور دنیا دہی سے گویا ہاتھ بڑھا کر پھیر لو۔  
• میں نہیں کم ہوں تم کہیں کم ہو پھر بھی ایسا لگتا ہے ہر جگہ میں ہوں ہر جگہ تم ہو

• اعتبار ساجد کہ جن کی شاعری پہلے اختیار ہی اعتبار کر لینے کو دل چاہتا ہے۔ جانے کیوں۔ میرے پسندیدہ شعراء میں میر فرہست ہیں۔  
• کبھی تو نے خود بھی سوچا کہ یہ پیاس ہے تو کیوں ہے تجھے پائے بھی میرا دل جو آداس ہے تو کیوں ہے

مجھے کیوں غم بزرگ ہے یہ دھواں دھواں سامویم یہ بولے شام بھر مجھے راس ہے تو کیوں ہے



تجھ کھوکھلے سوچتا ہوں میرے دامن طلب میں  
کوئی خواب ہے تو کیوں ہے کوئی آس ہے تو کیوں ہے

کبھی پوچھ اس کے دل سے کہ یہ خوش مزاج شاعر  
بہت اپنی شاعری میں جبراً داس ہے تو کیوں ہے

تیرا کس نے دل بچھایا میرے اعتبار ساجد  
یہ چراغ، بجز اب تک تیرے پاس ہے تو کیوں ہے

پروین شاکر کو جب بھی پڑھائیوں لگا یہی حقیقت  
بے یار و مددگار ہی حقیقت تھی۔ سوچتی ہوں جو وہ  
مزید ہمارے درمیان رہ جائیں تو ہمارے ادب میں  
اور کتنی حقیقتوں کا اضافہ ہوتا۔

۵۔ سبز مدہم روشنی میں سُرُخ آنچل کی دھمک  
مردِ مکرے میں چلتی گرہاں سانسوں کی مہک

سلیس ملبوس پر آنچل بھی کچھ دھلکا ہوا  
بازوؤں کے تحت طے میں کوئی نازک بدن

گر مٹی رخسار سے دھکی ہوئی مضرب ہوا  
زرم زلفوں سے ملائم انگلیوں کی چھیر چھاؤ

سُرخ ہونٹوں پر شرارت کے کسی لمحے کا عکس  
ریشمیں بانہوں میں چڑی کی کبھی مدھم کھٹک

شرنگیں بھجوں میں دھیرے سے کبھی جاہت کی آت  
دو دلوں کی دھڑکنوں میں گونجی تھی اک صدا

کاشیتے ہونٹوں پہ بھی اللہ سے صرف اک دُعا  
کاشش یہ لمحے ٹھہر جائیں، ٹھہر جائیں دُعا

منوچہر میں کہتے ہیں۔

۶۔ بند ہوتی کتابوں میں اُڑتی تلساں ڈال دیں  
کس نے رسوں کی آگ میں لڑکیاں ڈال دیں

خوف کیسا ہے کہ نام اس کا کہیں زرب لب بھی نہیں  
جس نے ہاتھوں میں ترے ہرے ساج کی جوڑیاں ڈال دیں

اب رسم تعارف ہو جائے۔ نام باتو اور مائی  
”تخلص رکھتے ہیں۔ پاکستان کے دل“ لاہور، میں  
رہتے ہیں۔ اور تعارف اتنی کہ علم اگر اسناد کا محتاج ہوتا  
تو آج بہت سے لوگ جاہل کہلاتے۔ آخر میں ناچیتہ  
کی ذاتی کاوش۔ بہت سی دُعاؤں کے ساتھ آپ  
بہنوں کی آرا کی منتظر۔

۷۔ بے پردگی میں بھی ہوتا ہے کبھی پردہ نشین  
کبھی لاکھ پردوں میں چھپا ہوا ہونٹوں کی نظر آتا ہے  
ستاروں کے سفر پہ لکھو جب بھی مائی دیکھتا  
وہیں کہیں اس پاس میرا بھی گھر آتا ہے



خالد خالد

## خالد خالد کیوں تیرے دل میں

زوباریہ خالد لاہور

نیمہ رات نے آئے چراغوں کو بھٹا دیا کروڑوں  
رات بھر کسی کا جلنا ہم سے دیکھا نہیں جانا

مسترت الطاف احمد کراچی  
لوگ کیوں بس کے اُڑتے ہیں کبھی سوچا ہے

کس لیے جاں سے گزرتے ہیں کبھی سوچا ہے  
جو نظر آتے ہیں آئینہ سی پوشاؤں میں

وہ بھی تھی میں اُڑتے ہیں کبھی سوچا ہے  
شریاد رشید بلدیہ ٹاؤن کراچی

چالیں اس کی بھی تھیں کیا کیا لیکن  
ہم بھی اک عمر گزارے ہوئے تھے

کول عدنان کراچی  
یہ پرندے، یہ شجر، یہ آدمی، یہ جانور

چاہتا ہوں ممکن زلیمت کی سچائیاں  
فریال صلاح الدین کراچی

ہو اسے کتنے برس نامہ و پیام کے بعد  
درخت اک اود گرا کیسے اہتمام کے بعد

نمرو مذاق لاہور  
چار لفظوں میں کیسے سمیٹے گا

گردش دو جہاں کا قفس ہے  
الماں تنویر ہزارہ

میں نے اے دل تجھے سینے سے لگایا ہوا ہے  
اور تو ہے کہ مری جان کو آیا ہوا ہے

زرتاشہ شیرازی  
شامل تو ہوئے سبھی اک مجلس میں  
لیکن کوئی کسی کو کبھی پہچانتا نہ تھا  
سب چل رہے تھے یوں تو بڑے اعتماد  
لیکن کسی کے پاؤں تلے راستہ نہ تھا

سیدہ لوبا سجاد  
سرطور ہو سر حشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے

وہ کبھی ملے، وہ نہیں ملے، وہ بھی ہی وہ نہیں ہی  
نہ ہوا نہ یہ جو میرا بس کہ یہ عاشقی ہے ہوش نہیں

میں ان ہی کا تھا، میں ان ہی کا ہوں وہ میرا نہیں تو نہیں ہی  
بینش نورین سرگودھا

کوئی حرف وفا نہ حرف سادہ  
میں خاموشی کو سننا چاہتی ہوں

میں بچپن کے کسی لمحے میں رُک کر  
کوئی جگنو پکڑنا چاہتی ہوں

راشدہ گلزار لاہور  
نہ یہ غم نہ یہ ستم نیا، کہ تیری جفا کا گلہ کریں !!

یہ نظر تھی پہلے بھی مضرب یہ تک تو دل میں بھی کی ہے  
فاخرہ ریاض احمد لور شریفہ

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تنویش تو ہے پر کیا کیسے  
ہر راہ جو ادھر کو جاتی ہے قتل سے گزر کر جاتی ہے

ایس عطاریہ لاہور  
تجھے محبت کرنا نہیں آتا

تجھے محبت کے سوا کچھ نہیں آتا  
زندگی گزارنے کے دو ہی طریقے ہیں

اک تجھے نہیں آتا اک تجھے نہیں آتا  
حمز جٹ

زندگی تو کب کی ہو گئی خاموش  
دل تو بس عادتاً دھڑکتا ہے

مان جٹ  
قبولیت کا ہے کون سا پل کیسے خبر!  
تو مذاق میں بھی بھول جانے کی بات مکر



جب افریقیوں کی آنکھ کھلی تو ان کے پاس بائبل تھی اور مبلغوں کے پاس زمینیں۔  
مریم عادل۔ اورنگی ٹاؤن

**تلاش**  
خبر ملی ہے کہ دو نشتوں والا ایک چھوٹا طیارہ مشرقی پنجاب کے ایک قبرستان میں گر کر تباہ ہو گیا۔ مقامی گاؤں کے سکھوں نے اب تک پانچ سولائشیں برآمد کر لی ہیں۔ باقی لاشوں کی تلاش کے لیے کھدائی کا کام جاری ہے۔  
فرحت شاکر۔ حیدر آباد

**محبت و اپنائیت**  
راز مراد آبادی پان، بہت کھاتے تھے اور گالیاں بھی خوب دیتے تھے۔ ان کے ہاں گلی دینے کا مطلب اپنائیت و محبت کا اظہار تھا۔ ایک دفعہ بیمار پڑ گئے۔ تو صیف بھسم نے فون پر خیریت دریافت کی۔ ان کی بیگم نے جواب دیا۔  
”جی ماشاء اللہ اب رو بہ صحت ہیں۔ آج پان بھی کھایا ہے اور گالیاں بھی خوب کی ہیں۔“

**تعارف**  
ایک صاحب نے اپنے شو فر کو ڈانٹا۔ ”کار کی بچھلی سیٹ پر ایک سنہرا بال کیسا نظر آ رہا ہے، میری بیوی کے بال تو کالے ہیں مگر تو بھی وہ؟“  
شو فر نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں ابھی صفائی پیش کرتا ہوں جناب!“  
”صفائی دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ صاحب بولے۔ ”بس تعارف کروادو۔“  
گفت عرفان۔ کورنگی

**الیکٹرک انجینئر**  
انٹرویو پینل کے ایک آفیسر نے سکھ امیدوار سے سوال کیا۔  
”اچھا تو آپ الیکٹرک انجینئر کی آسانی کے لیے تشریف لائے ہیں؟“  
”جی سر!“  
”اچھا تو یہ بتائیے کہ بجلی کی موٹر کیسے چلتی ہے؟“  
”بہت آسان سوال ہے جی! ایسے۔۔۔ گڑ گڑ ٹٹ۔۔۔ گڑ گڑ ٹٹ۔۔۔“ سکھ امیدوار نے اطمینان سے جواب دیا۔  
ترجمہ رشاد۔ جھنگ

**شوق**  
کرکٹ کا ایک شوقین بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔  
”کیا بات ہے؟“ اس کے دوست نے پوچھا تو اس نے افسردگی سے کہا۔  
”بیوی نے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے کرکٹ نہ چھوڑی تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔“  
”اوہ! واقعی پریشانی کی بات ہے۔“ دوست نے ہمدردی سے کہا۔  
”ہاں! یقین کرو، میں اپنی بیوی کو بہت مس کروں گا۔“ شوقین نے آرزو کی سے جواب دیا۔  
بھیم عابد۔ پاپوش نگر

**تبلیغ**  
عیسائی مبلغ پبل بار افریقا آئے۔ اس وقت افریقیوں کے پاس زمینیں تھیں اور مبلغوں کے پاس بائبل۔ انہوں نے افریقیوں کو مذہب کی تعلیم دی۔ افریقیوں نے آنکھ بند کر کے ان کی تعلیم پر عمل کیا اور

سحر خان  
موج کو ترکی قسم، ہم تھے محبت کے ولی  
فلک کے در پہ نہ جھکے تو سمت در ہوتے  
نوشین اقبال نوشی  
گاؤں بدرمجان  
کچھ دھڑکتا تو ہے پہلو میں رہ رہ کر  
اب خدا جانے تیری یاد ہے یا میرا دل  
پارس بلوچ  
بندو بچے، سوئی گھیاں ان دیکھے ان جانے لوگ  
کس نگری میں آنکھیں ہیں ساجد، ہم دیوانے لوگ  
ایک ہم ہی ناواقف ٹھہرے روپ لڑکیوں سے  
بھیس بدل کر ملنے والے سب جانے پہچانے لوگ  
سمیع  
اک شخص میری زندگی میں ایسا بھی ہے محسن  
وہ میری زندگی ہے لیکن میں اس کا ایک لمحہ بھی نہیں  
سکھوں  
زندگی کی حقیقت نہ پوچھیے محسن  
کچھ پر غلوس لوگ تھے، برباد کر گئے  
نمرہ، افسر  
زندگی بھر کون کسی کا ساتھ دیتا ہے قرآن  
خشک پتوں کو تو درخت بھی گرا دیتے ہیں  
شازیہ رانا  
علم و حکمت کا جنہیں شوق ہو وہ آئیں نہ ادھر  
فلسفہ عشق میں کچھ بھی نہیں حیرت کے ہوا  
آسیہ جاوید  
میری آنکھوں میں نے خواب بسائے آئے  
پھر سے جگنو میرے کمرے کو سجانے آئے  
آؤ تعمیر کریں پیار کا اک تاج محل  
اس سے پہلے کہ ہمیں، بھر لائے آئے  
تمثیل اصغر  
زندگی اب کے میرا نام نہ شامل کرنا  
گریہ طے ہے کہ بھی کھیل دوبارہ ہوگا  
الماں تنویر  
وفاق ورق پر تیری عبادت، تیرا خاضہ، تیری حکایت  
کتاب ہستی جہاں سے کھولی تیری محبت کا باب نکلا



انعم، خیر  
حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے  
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے  
حارثہ  
مجھ سے کہتا ہے کبھی دل میں ملانے میں  
کیسے کیسے میرے دشمن کو سوال آتے ہیں  
یہ جو ہم روتے ہیں چھپ کر کبھی تنہائی میں  
رفتہ رفتہ تجھے آنکھوں سے نکال آتے ہیں  
فارہ، زینب مختیار  
آج پھر تیری یاد مانگی تھی  
آج پھر وقت ہم کو ٹال گیا  
تو دسمبر کی بات کرتا ہے  
ہمارا تو سارا سال گیا  
بشری نوید باجوہ  
تیری مصروفیتیں جانتے ہیں  
اپنے آنے کی خبر کیا کرتے  
جب تارے ہی نہیں مل پاتے  
لے کر ہم محسوس و فخر کیا کرتے  
یسری ستار  
نہیں سچا میں اپنے شعر کی طرح  
مجھے اس پریشانی بہت ہے  
مریم، سائرہ منیر احمد  
بھولوں کی غماش میں اگر وہ بھی ہوا  
اک بار تو گلاب کو بڑی آگ لگے گی  
آمنہ، اجالا  
گیا وہ آفتاب منوشتاں دامن میں کیا لے کر  
وہی ظلم و ستم، جبر و تہر، مکرو و ریالے کر  
رضوانہ شکیل راؤ  
جس نے دکھا ہے مجھے اپنی نگہبانی میں  
اب سنبھالے گا وہی بے سرو سامانی میں  
ایسا لگتا ہے کہ تو دیکھتا رہتا ہے مجھے  
ایسا لگتا ہے کہ میں ہوں تیری نگہبانی میں  
شائستہ اکبر  
نیا سفر ہے، نئی منسٹر لیں، نئے حالات  
نہ تو صوبہ گزرے ہوئے کا۔۔۔ ان کے نقش قدم



## قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے غرضی سے محفوظ رکھیں۔

### کم ظرف شوہر

”میرے شوہر بہت ہی کم ظرف انسان ہیں، کل انہوں نے بچی کے گلے کے سارے پیسے نکال لیے۔“ ایک خاتون نے اپنی سہیلی سے شکوہ کیا۔

”اوہ! یہ تو واقعی بڑی ٹھٹھا حرکت ہے۔“ سہیلی نے جواباً کہا۔

”اور نکالے بھی اس وقت۔۔۔ جب اس میں اتنی رقم جمع ہو گئی کہ میں اس سے ایک نیا سوٹ خرید سکتی تھی۔“ خاتون نے افسوس سے کہا۔

مدیحہ احمد رحیم یار خان

### میرا بانیچہ

”ہیلو۔۔۔ فلائٹ شیڈن؟“

”جی ہاں۔ فرمائیے! ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟“

”جی سنئے! میں نے ایک ماہ پہلے ہی نیا بانیچہ لگایا ہے۔“

”ہاں! لٹے کے پودے تو ابھی کافی چھوٹے ہیں اور گلاب کی قلموں نے بھی ابھی پھوٹنا شروع کیا ہے۔“

”لیکن اس سے ہمارا کیا تعلق؟“

”جی! اس میں کچھ پودے تو خاصے نایاب ہیں۔ جو میں نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیے ہیں۔“

”ارے بھئی! یہ کوئی نرسری نہیں ہے۔ فلائٹ شیڈن ہے۔“

”جی ہاں! مجھے معلوم ہے۔ دراصل میرے پڑوس میں آگ لگ گئی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ جب آپ لوگ آگ بجھانے آئیں تو میرے بانیچے کو خراب کر دیں۔“

نسرین اختر میٹروول

پروڈیوسر سے مل کر اسی میں کام کروں۔ وہ پروڈیوسر سے ملی اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ پروڈیوسر نے اسے کاسٹ کرنے سے انکار کر دیا۔ دراصل وہ اسے کاسٹ کرنے کے لیے رشوت کے طور پر پچاس ہزار روپے مانگ رہا تھا۔

اداکارہ نے ایک سیاست دان کی منت سماجت کی کہ

اسے پچاس ہزار روپے دے دیے جائیں تو وہ بہت جلد لوٹا دے گی۔ سیاست دان نے پچاس ہزار روپے دے دیے۔

کچھ دنوں بعد وعدے کے مطابق اداکارہ نے سیاست دان کو ایک عجیب چیز پیش کی۔ سیاست دان حیرت سے بولا۔

”تم کو میرے پیسے دینے تھے مگر یہ تو ”لوٹا“ ہے؟“

اداکارہ اٹھلا کر بولی۔

”جناب! یہ ”لوٹا“ ہی ہے۔ میں نے کہا نہیں تھا کہ بہت جلد لوٹا دوں گی۔“

ناویہ ارشد۔ کوہاٹ

### زبردست نشہ

جلبان میں ایک صاحب کو ایک مشروب پیش کیا گیا،

گلاس خالی کرتے ہوئے وہ بولا۔

”اس میں تو زبردست نشہ ہے، مجھے تو تمام چیزیں ہلتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔“

جلبانی میزبان نے جواباً کہا۔

”اس میں کیا خاک نشہ ہوگا، یہ تو نمٹا کر کا جوس ہے اور چیزیں اس لیے ہلتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں کہ یہاں زلزلہ آ رہا ہے۔“

نسیم سحر گلشن اقبال

نہیں ہو رہا تھا۔“

”ایسے بد بخت کو تو تمہیں کچل دینا چاہیے تھا۔ تم نے ایک شخص کو بچانے کے لیے اتنے مسافروں کی زندگی خطرے میں ڈال دی؟“ لوگوں نے غصہ سے کہا۔

”تو وہی تو کر رہا تھا، مگر جیسے ہی ٹرین اس کے قریب پہنچی، وہ کھیتوں میں گھس گیا۔“ منگھ ڈرائیور نے سادگی سے جواب دیا۔

عظمیٰ وسیم بہار کالونی

### ایک سے بڑھ کر ایک

ونشن چرچل کے بہت سے دشمن تھے۔ ایک دن ایک بلیک میٹنگ کے دوران ایک عورت نے کہا۔

”اگر تم میرے شوہر ہوتے تو میں تم کو زہر دے دیتی۔“

”سینس میڈم!“ وہ بولے۔ ”اگر آپ میری بیوی ہوتیں تو میں خود زہر کھا لیتا۔“

ڈاکٹر کول۔ جامشورو

### ازرا ہمدردی

ایک صاحب محلے کی کریانے کی دکان پر چنزوں کی قیتوں کے سلیے میں بحث و تکرار کر رہے تھے اور دکان

بھی ٹی بی ٹی تھی۔ ان کے دوست پاس ہی کھڑے تھے وہ بولے۔

”بھائی! سب دکانوں سے آپ سودا اودھار لیتے ہیں لیکن اودھار آپ نے آج تک چکایا نہیں۔۔۔ تو پھر قیتوں پر بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اصل میں یہ دکان دار بہت اچھا آدمی ہے۔۔۔“

ان صاحب نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں اس کا نقصان کم سے کم ہو اس لیے چیزوں کی قیمتیں کم کر رہا ہوں۔“

مست الطاف احمد۔ کراچی

### قابل دید

ٹیلی ویژن کے لیے ایک ڈرامے کی ریکارڈنگ ہونے والی تھی۔ ایک نئی اداکارہ نے سوچا کہ یہ ڈراما بہت بڑے بجٹ پر تیار کیا جا رہا ہے، کیوں نہ میں بھی

دو سال سے۔۔۔۔۔“

گاؤں کے سرکاری اسکول کی چھت گر چکی تھی۔ دیواریں آدھی سے زیادہ ٹوٹی ہوئی تھیں۔ دروازے کھڑکیاں سب غائب تھیں۔ بچوں کے ساتھ آوارہ کتے بھی آکر کلاسوں میں بیٹھنے لگے تھے بلکہ لینے لگے تھے۔ ایک روز ناصر عبدالکرم کلاس میں داخل ہوئے تو کتہنشی رنگ کے ایک کتے کو دیکھ کر یکدم چلا اٹھے۔

”کم از کم اس بد بخت کو تو نکال دو۔ یہ دو سال سے یہی کلاس اینڈ کر رہا ہے۔“

سہلی افضل۔ ملیر کینٹ

### غلطی

ایک مزدور تنخواہ کا لفافہ لے کر کیشمر کے پاس آیا اور بولا۔

”صاحب! اس میں پانچ روپے کم ہیں۔“

”چھپلی بار جب تمہارے لفافے میں پانچ روپے زیادہ چلے گئے تھے، تب تم کیوں میرے پاس نہیں آئے؟“

کیشمر نے پوچھا۔

”تب آپ نے پہلی بار غلطی کی تھی، جسے میں نے برواشت کر لیا مگر دوسری بار میں آپ کی غلطی برواشت نہیں کر سکتا۔“ مزدور نے جوش سے کہا۔

فرزانہ اطہر۔ ناظم آباد

### بدلہ

ایک ٹرین پٹری سے اتر کر قریبی کھیتوں میں گھس گئی۔ اسے دوبارہ پٹری پر لانے میں کافی دیر لگ گئی۔

اس واقعہ نے تمام مسافروں کو خوف زدہ کر دیا۔ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو ناراض مسافروں نے ٹرین کے سکھ ڈرائیور کو گھیر لیا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔“ ڈرائیور نے مطمئن سے جواب دیا۔

”ایک آدمی پٹری پر عین بیچ میں کھڑا تھا اور میرے منسل ہارن دینے کے باوجود اس سے مس







قدر طویل خاموشی آخر قارئین کو کس بات کی سزا دی جا رہی ہے آپ کی کمائیوں کا وہ بے ساختہ اور گہرا فلسفیانہ انداز بے حد یاد آتا ہے۔ بجائے کیا وجہ ہے کہ بہت بڑی بڑی اور بے حد اچھا سبق آموز لکھنے والی مصنفین کیلی وژن کو ہی پیاری ہو کر رہ گئی ہیں، خواتین کے بچوں کا ایک اور بہت معزز اور قابل نام محترمہ فریدہ اشفاق صاحبہ! چاہے میں عمر اور یادداشت کے آخری حصے کو ہی کیوں نا بچ جوں میری یادداشت سے شاید آٹھویں جماعت میں پڑھا کردار کبھی مجھ نہیں ہو سکتا، شاید آٹھویں جماعت میں پڑھا جانے والا ”موسم تھا بے قرار“ آج ایم اے میں پینتے کے بعد بھی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے اور یہ کمال یقیناً ”فریدہ اشفاق صاحبہ“ کا ہو سکتا ہے۔ عزیزہ سید، تنزیل ریاض، رفعت سراج اور وہ سب ہی نام جو یقیناً

بچوں کی شان رہے بجائے کیوں اور کہاں گم ہوئے شعاع کا معیار بے شک اپنی جگہ قائم ہے لیکن معیار میں ہلکی سی دُڑار آیا ہی چاہتی ہے اور وجہ آپ خود بھی جانتے ہیں وقت کے ساتھ انسان بدل جایا کرتے ہیں تو کہانی کیا چیز ہے لیکن تحریر کا معیار بدلے تو کہانی کی پوری ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے اور پڑھنے کا لطف بھی نہیں رہتا۔ اگرچہ میں کیا اور میری رائے کیا لیکن پھر بھی یہ ضرور کہوں گی آپ کی مصنفین کی ہر تحریر سوچ کو پختگی اور روشنی مہیا کیا کرتی ہے تو کیا ہی اچھا ہو کہ معیار پر کسی بھی قسم کا سمجھوتا کرنے سے قطعی گریز کیا جائے!

پیاری سحر شعاع کی بزم میں خوش آمدید آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ لازمی آپ کا خط اور آپ کی رائے روہی؟ اتنی پاپوسی کیوں؟ ایک بار اگر خط شائع نہ بھی ہوتا تو اگلی بار سہی۔ بار بار دستک سے تو بندہ روزانے کھل ہی جایا کرتے ہیں۔ معیار پر سمجھوتے کا سوال ہی نہیں ہو سکتا ہے کچھ نئی مصنفین کی تحریروں میں آپ کو ناچنگی محسوس ہوئی ہو، بہ حال ہم خیال رہیں گے۔ آپ نے شعاع کی اس ماہ کی تحریروں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ آئندہ تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

اسماء سعید نے پشاور سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ لکھتی ہیں

میں 1992ء سے شعاع کی قاری ہوں لیکن صرف دوبارہ خط لکھے۔ میں نے اپنی شادی شدہ اور غیر شادی شدہ

زندگی میں شعاع اور خواتین کو اپنا بہترین ہم سفر اور رہنما پایا ہے۔ یہ رسالے ہر لحاظ سے مکمل ہیں۔ شعاع دوسے تین دن میں بڑھ کر ختم کر لیتی ہوں پھر خواتین کا انتظار شروع کر دیتی ہوں، پھر تین چار دن میں وہ بھی ختم تو پھر رائے رسالے لکھنا ہوتی ہوں۔ جو اپنے ساتھ جینز میں لائی تھی۔

اسماء خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ ہم مثبت سمت کی جانب رہنمائی کریں۔ قارئین ہمارے ساتھ ہیں یہ جان کر ہمارا حوصلہ بڑھ جاتا ہے بلکہ ہمیں شعاع کو مزید بہتر بنانے میں بھی مدد ملتی ہے۔

امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

مریم کاشف نے گلستان جوہر کراچی سے ای میل کی ہے لکھتی ہیں

پورے دس سال بعد کاغذ قلم سنبھالے آپ کو خط لکھنے بیٹھی ہوں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کوئی کہانی پڑھتے ہوئے سوچتی کہ آپ کو مفصل تبصرہ بھیجوں لیکن یہ خیال ہمیشہ خیال ہی رہا۔ خواتین اور شعاع ہمارے لیے جزو زندگی ہیں۔ خوراک، پانی اور ہوا کی طرح ان کے بغیر بھی گزر نہیں ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمیں ان ڈائجسٹوں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جان سے ہمارے مصنفین کی سبق آموز تحریروں نے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا۔ میں تو کہتی ہوں تمام نوجوان لڑکیوں کو یہ ڈائجسٹ ضرور پڑھنے چاہئیں۔

سورق سو سوتا۔ لیکن پیاری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح دل میں اتر گئیں۔ لوگوں تک دین اور پیاری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند باتیں پہنچا کر آپ بڑی تیزی سے گزر رہے ہیں۔ ستارہ شام بہت اچھی جارہی ہے لیکن ہمیں انبیاء کے نام پر اعتراض ہے کیونکہ کہانی میں یہ نام پڑھتے ہوئے ذہن میں کچھ اور خیالات آتے ہیں۔ ہم آئندہ ریاض کا نام پڑھیں اور ہمیں تنزیلہ ریاض یاد نہ آئیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کی مرگ برگ اور من شرا خلق آج بھی ذہن کے گوشوں میں محفوظ ہیں۔ کمال کا

لکھتی ہیں ہماری گزارش ہے کہ انہیں واپس لایا جائے۔ پھر دوبارہ شب کی طرف بڑھے۔ عالیہ بخاری کا طرز تحریر بہت پرکشش اور توجہ دینے والا ہے۔ میں انہیں شوق سے پڑھتی ہوں۔

عائشہ فیاض اچھا لکھتی ہیں لیکن اس بار ان کی کہانی نے متاثر نہیں کیا۔ نفیسہ بیکم یقیناً نئی لکھنے والی ہیں لیکن بہت اچھا اور سبق آموز لکھتی ہیں۔ آپ سے دو گزارشیں ہیں ایک اور یا مقبول جان کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں اور دوسری گزارش ہے کہ عزیزہ سید، نکلت سیمہ

رفعت سراج، رخسانہ نگار اور تنزیلہ ریاض کو آواز دیں ہم ان کی خوب صورت تحریریں پڑھنے کے لیے بے تاب ہیں۔

آخر میں نبی راز سے کچھ کہنا چاہوں گی کہ پلیز کہانی لکھتے وقت ذہن میں کوئی مقصد ضرور رکھا کریں اور نام مانوس رکھا کریں ورنہ کہانی کی طرف کم اور ناموں کی طرف دھیان زیادہ رہتا ہے۔ اپنی کہانی کا مصنف نہیں بلکہ قاری کی نظر سے جائزہ لیں۔ چند الفاظ جو دوسروں کی زندگی بدل دیں آپ کے لیے صدقہ جاریہ بن سکتے ہیں۔

پیاری مریم! دس سال تک آپ ارادے باندھتی رہیں۔ توڑتی رہیں شکر ہے کہ اس بار آپ کو کامیابی ہوئی۔ تفصیلی تبصرے کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ اب دوبارہ دس سال تک کے لیے غائب نہ ہو جائیے گا۔

ایمن تحریم نے سرگودھا سے لکھا ہے ٹائٹل میں ماڈل کی میٹر کنگ اور ایئر رننگز بہت اچھے تھے اور اب آتے ہیں آمنہ جی کی شادی کی طرف تو بہت بہت مبارک ہو۔ شاید آفریدی کا انٹرویو شائع کریں پلیز۔ مذہم امتحانوں کی وجہ سے مختصر خط لکھا ہے۔

پیاری ایمن! اللہ تعالیٰ اس امتحان میں ہی نہیں ہر امتحان میں آپ کو کامیابی دے آمین۔ شاید آفریدی کا انٹرویو ضرور دیں گے۔ تھوڑا انتظار کریں۔

فرح المسلم نے گرین ٹاؤن لاہور سے شرکت کی ہے، ٹائٹل میں لڑکی کی فیل آستین بہت اچھی لگیں۔ اس بار کے تینوں ناول بہت زبردست تھے۔ ”وہ اک میل“ ناول

میں بھائی کا کردار بہت ہی اچھا لگا۔ تیسہ رزاقی کا ناول بھی ہمیں بہت پسند آیا اور افسانوں کی تو کیا ہی بات تھی۔ فرحت اشتیاق، عمیرہ احمد اور رخسانہ نگار سے درخواست ہے کہ کوئی قسط وار ناول شروع کریں پلیز۔ بیوٹی ٹپس میں چھائیوں کے لیے گھریلو نوٹک بتاویں۔

نیوز کاسٹر رضوان رونق، ریزہ راجہ اور اداکار مسیح خان کا بعد فیملی انٹرویو دیں۔ رضوان رونق کا لازمی پلیز پلیز۔ پیاری فرح! اشاعت کی پسندیدگی کے لیے شکریہ انٹرویو کی فراہم ٹوٹ کر لی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

احمد پور شرقیہ ضلع بہاولپور سے رمیضاء خان بلوچ نے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ہمیں دوبارہ خط لکھنے پر مجبور کر دیا ہے اکتوبر اور دسمبر کے ڈائجسٹ کے نہ دونوں ہی مکمل تھے۔ ہر کہانی چاہے وہ ناول ہو ٹائٹل افسانہ اپنی اپنی جگہ ہی مکمل تھے۔ اس کے علاوہ ماہ دسمبر کے ڈائجسٹ صفحہ نمبر 171 پر رمیضاء خالد کے ناول ”وہ اک میل“ کے اس شعر سے ہمیں ڈھارس ہوئی اور ہم نے خط لکھ دیا۔

اک طرز تقافل، سو وہ ان کو مبارک ہو اک عرض تنہا ہے سو ہم کرتے رہیں گے ہم شعاع کو مسلسل 16 سال سے پڑھتے آ رہے ہیں۔ سورق دیکھ کر خوشی ہوئی (علاوہ دوپٹے کے) کہانیاں تو سب ہی اچھی تھیں پر جو بیٹ پکڑ پکڑ کر فائزہ جی نے ہنسایا تو گھر والوں کو ہم پر پاگل کا گمان ہونے لگا۔ عالیہ جی آپ اور کتنا غلم کریں گی بے چارے خیام پر۔ آپ نے پہلی قسط سے لے کر 46 قسطوں تک اس مسلسل غلم کیے اور ابھی تک بھی آپ کا دل نہیں بھرا غلم کرنے سے اور بے چارہ اعجاز اور جویا تو خواہوا ہی جیسے ہوئے ہیں حالانکہ ان کی شادی تو اب ہو جانی چاہیے۔ ایسے ہی دونوں کو لڑکا رکھا ہے پر ناول ہے زبردست اور تین ماہ سے کہانی آگے بڑھ رہی ہے اور جہاں آمنہ ریاض صاحبہ کی شادی کی خوشی ہوئی وہی ”ستارہ شام“ نہ بار غصہ بھی بہت آیا۔ عائشہ فیاض کا ”زندگی تو پیاری ہے“ زبردست۔ عائشہ جی نے واقعی بہت اہم موضوع پر لکھا کہ کتنے ہی لوگ جو بے نام زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہمیں ان کے بارے میں خبر نہیں



ہوتی اور حکومت ان کو شانتی کارڈ نہیں دیتی۔ یہ بات پڑھ کر بہت دکھ ہوا کیونکہ اس میں ان کا تو کوئی تصور نہیں تھا۔ نفیسہ بیگم کا افسانہ ”دل بیدار پیدا کر“ اگرچہ پرانی کہانی تھی پر انداز اچھا تھا اس طرح سدرہ سحر عمران کا ”پنا گھر“ بھی کچھ ایسا ہی تھا یعنی تعہیم ایک ہی تھی اور افسانے دو تھے۔ صانور نے ساڑھے چھ صفحات کے افسانے میں عورت کی ذات کو بند کر دیا۔

بیاری رمیصا اے ہد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ ردی کی نوکری میں بھی نہیں گئے کیونکہ وہ ہمیں موصول ہی نہیں ہوئے ہو سکتا ہے آپ نے کافی عرصہ پہلے لکھے ہوں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہمارے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ سولہ سال سے شعاع کی قاری ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شعاع کا معیار برقرار ہے اور آپ اس کی تحریروں سے مطمئن ہیں۔

فرحت اور سدرہ قلم نگ سے شریک محفل ہیں شعاع سے میری وابستگی بیس سالہ پرانی ہے ہمارے محلے میں ایک باجی شعاع پڑھتی تھیں تو ہم ان سے دس روپے کا خرید کر پڑھتے تھے پھر شعاع سے ہماری محبت بڑھتی گئی جو آج تک قائم ہے اس میں کہانیاں، بہت اچھی ہوتی ہیں اور ناول بھی۔ سلسلہ پیارے نبی کی بیاری باتیں بہت اچھا لگتا ہے اور شعاع کی تمام راسخو زبانی مثال آپ ہیں۔

بیاری فرحت اور سدرہ اشعار کی بزم میں خوش آمدید۔ اتنے طویل عرصہ میں پہلی بار شرکت کی اور اتنا سرسری تبصرہ۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا صرف ”سب اچھا ہے“ سے بات نہیں بنتی۔

آمنہ آجالانے ڈوہڑی سے لکھا ہے دعا ہے نیا آنے والا سال وہ تمام خوشیاں لوٹا دے جو ہم سے چھین گئی ہیں۔ خاص طور پر سندھ کے باجی جواب کے ہونے والی بارشوں سے مصیبتوں کے ایک نہ ختم ہونے والے گھیرے میں قید ہیں۔ دعا ہے کہ نیا آنے والا سال امت مسلمہ اور سندھ کے باسیوں کے لیے آسانیاں لائے۔ آمین۔

نئے سال کے موقع پر یہ شعر۔

یہ کچھ دن ہیں کہ تیور آسمان کے ناموافق ہیں گلابی موسموں کو آ کے پھر انعام کرنا ہے اس بار ناسٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ مکمل ناول میں آسیہ رزاقی صاحبہ کے نام پر نگاہ ڈی تو جیسے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی اور ہم خوش ہو گئے عداوتوں، نفرتوں، بغض و بدگمانیوں و تعصبات کی دھند میں جھنسی خربہست می سفاک حقیقتیں کا پردہ چاک کر گئی۔

آغاز تا اختتام تک دلچسپی برقرار رہی۔ ویلڈن آسیہ رزاقی صاحبہ ہماری دلی دعا ہے کہ آپ اسی طرح لکھتی رہیں۔ دوسرا مکمل ناول رمیشہ خالد کا وہ ایک پل، ہمارے خیال میں ایک نئی راسخو ہونے کے ناتے ان کی کافی اچھی تحریر تھی۔ ہاں البتہ کہانی کی غیر ضروری طوالت نے سچ میں کچھ بور سا ضرور کر دیا۔ اگر ہماری سچیجی ہوئی تو اس کا نام میزاب رحمت رکھیں گے۔ افسانوں میں اس بار سدرہ سحر کا افسانہ ”پنا گھر“ اس ماہ کی بہترین تحریر تھی۔ ثریا انجم کا افسانہ کہ چیاں اس لڑکی کی کہانی جس کا دل بیک وقت دو کشتیوں پر سوار تھا۔ مونا سید کا ”ابھی اک خواب باقی ہے“ کافی اچھی تحریر تھی۔ ”پھر یوں ہوا“ صائمہ اکرم کی یوں تو ایک گفتگو تحریر تھی لیکن پڑھتے ہوئے مزہ نہیں آیا ”دل بیدار پیدا کر“ نفیسہ بیگم کا افسانہ ایک اثر انگیز اور سبق آموز تحریر تھی۔ بہت پسند آئی۔ اس بار شعاع سونا سونا لگا۔ کیونکہ اس بار اشعار نہیں تھے۔

بیاری آمنہ! اللہ تعالیٰ آپ کی دعائیں قبول فرمائے۔ آمین۔ حالیہ بارشوں میں سندھ کے باسیوں پر جو گزری ہے اور جو گزر رہی ہے اور وہ ابھی تک جس عذاب میں مبتلا ہیں اس پر ہر حساس دل خون کے آنسو روتا ہے۔ افسوس ناگ بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو اہل اقتدار ہیں یا جوان کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ انہیں ان کا احساس تک نہیں ہے، مشکلات حل تو کیا کرتے اضافہ ہی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہی امید وہ ہی دعائیں قبول کرنے والا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ اشعار کا سلسلہ پچھلے ماہ شامل نہ ہو سکا اس بار شامل ہے۔

پوٹھ قلم جو گیاں سے نازیہ اشتیاق چوہدری نے لکھا ہے

چار پاؤں دن پہلے شعاع ملا، ناسٹل پیارا تھا۔ میں نے

پہلے بھی آپ سے یہ بات کی تھی پلیز ناولٹ یا افسانوں میں کوئی ناول یا ناولٹ ایسا ہو جیسے پڑھ کر بے ساختہ ہنسنے مگر انے کو جی چاہے۔ زندگی میں آج کل ٹھوڑا سا مسکرائے کی بھی بڑی قیمت ہے۔ فائزہ افتخار صاحبہ بیٹنیک یو سوچ بہت خوب صورت ناول تھا آپ کا۔ پڑھ کے فریض ہو گئے۔

اس کے بعد آئے رمشاجی کے ناول کی طرف۔ بہت زبردست ناول تھا۔

افسانے بھی اچھے تھے سارے۔ نمبرون پر سدرہ سحر عمران صاحبہ کا انا گھر تھا اور غیرت مند کو پڑھ کر بس یہی سوچ ذہن میں آتی کہ کیا بھائی ایسے بھی ہوتے ہیں اف اثنا و بہشت ناگ سا افسانہ پلیز ٹھوڑا ہلکا پھلکا رکھا کریں ہاتھ اور کیا؟

مجموعی طور پر پورا ڈائجسٹ اس بار زبردست تھا۔ بیاری نازیہ! اشعار کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

نبیلہ اسلم نے ایک (گاہن باسید) سے لکھا ہے نومبر کا شعاع ملا، ناسٹل بہت پسند آیا۔ ”مان جاؤ“ فائزہ افتخار کی بہت ہی اچھی کاوش تھی میری زندگی ہے تو بس ٹھیک ہی تھا۔ باقی ناولٹ بھی بس ٹھیک ہی تھے۔ پلیز ماما ملک سے کہیں وہ کچھ اچھا سا لکھیں۔ نمبر احمد، شمع بخاری، عمیرہ احمد کمال گم ہیں اور فرحت اشتیاقی پلیز پلیز کچھ لکھیں نیا سا۔ آپ کی تحریروں کا ہمیں بہت شدت سے انتظار رہتا ہے۔ میں کہانی لکھنا چاہتی ہوں پلیز طریقہ بتا دیں۔

نبیلہ جس طرح آپ نے خط لکھا ہے۔ اسی طرح کہانی بھی لکھی جاتی ہے۔ کہانی لکھنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں ہے۔ اگر آپ میں صلاحیت ہے تو ضرور لکھیں۔ نوک پلک سنواریں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

زینب مختیار نے ملتان سے لکھا ہے

ناسٹل کچھ خاص نہیں تھا۔ آمنہ ریاض کی شادی کی خبر پڑھ کر ستارہ شام نہ ہونے کا افسوس خوشی میں تبدیل ہو گیا۔ آمنہ ریاض کو شادی کی مبارکباد۔

نعت اور احمد دونوں بیشہ کی طرح زبردست تھیں۔ پھر

”پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری باتیں“ پڑھیں۔ جو انسان کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ افسانوں میں ”غیرت“ بازی لے لیا۔ عائشہ فیاض کے ناولٹ میں ہادی اور بہان کا کردار اچھا لگا۔ مکمل ناول میں ”اک پل“ بہت زبردست تھا۔ ”میزاب رحمت“ نام بہت اچھا تھا اور پلیز ”میزاب“ کا مطلب بتا دیں اور عبد کو اس کے غور کی اچھی سزا ملی میزاب نے اس کو کھلا دیا۔

رامنا خان اور صاحبہ قمر کے انٹرویو کی فرمائش ہے۔ بیاری زینب! اشعار کی بزم میں خوش آمدید رامنا خان اور صاحبہ قمر کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

میزاب کے لفظی معنی پر نالہ کے ہیں لیکن اس کو آبشار یا جھرنہ کے معنی میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔

زوبارہ خالد نے لاہور سے لکھا ہے

سب سے پہلے تو آمنہ ریاض کو شادی بہت بہت مبارک ہو۔ ناسٹل اچھا لگا لیکن ماڈل کا نام ضرور اندر دے دیا کریں۔ فائزہ افتخار کے ناول ”مان جاؤ“ نے خوب ہنسایا اور اختتام بھی اچھا تھا ہر شارے میں کوئی نہ کوئی مزاحیہ تحریر ضرور شامل ہونی چاہیے آسیہ رزاقی کا ”انجام بخیر“ اور رمشا خالد کا ”وہ اک پل“ بھی پسند آئے۔ ”صبح ستارہ“ ناولٹ کی کتنی اقساط باقی رہ گئی ہیں؟ ناولٹ ”زندگی تو پیاری ہے“ میں مجھے سب سے اچھا کردار ہادی کا لگا۔ افسانوں میں سب سے زیادہ اچھے ”چمید“ اور ”پھر ہوا یوں“ لگے۔ مجھے اور میری بہن (بشری خالد) کو نمرا، اقراء کا انتخاب سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے اور ہم رسالہ آتے ہی سب سے پہلے ان کا انتخاب پڑھتے ہیں۔ آپ نے مستقل سلسلہ شعاع کے ساتھ ساتھ کیوں ختم کر دیا ہے؟ پلیز اس کو دوبارہ شروع کریں۔ یہ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے اور یہ بھی بتائیں کہ عمیرہ احمد کب تشریف لائیں گی۔

بیاری زوبارہ عمیرہ احمد کب تشریف لائیں گی۔ یہ تو وہی بتا سکتی ہیں ہم آپ کا سوال ان تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کے ساتھ ساتھ سلسلہ ختم نہیں کیا گیا ہے۔ ہم مختلف مواقع پر قارئین سے سروے کرتے ہیں تو اس بنا پر یہ سلسلہ شامل نہیں ہوا ہے۔ مزاحیہ تحریروں ہمیں بھی



بہت اچھی لگتی ہیں۔ اگر مصنفین لکھیں تو ہم ضرور شامل کریں گے۔  
عائشہ فیاض اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان طور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ٹوپیہ نصیر نے سیا لکھٹ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں بڑھائی کے ساتھ ساتھ شعاع، خواتین اور کرن بھی باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ میری کرن اور چچی جان بھی باقاعدگی سے پڑھتی ہیں اور چچی جان کی وجہ سے ہی ہم لوگ ریگور پڑھتی ہیں۔

اب آتے ہیں شعاع کی طرف۔ ٹاسٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا اور حمد و نعت تو ہمیشہ کی طرح زبردست پھر بارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں۔ عالیہ بخاری کا ”دیوار شب“ اچھا جا رہا ہے۔ پلیز جویا اور معاذ کو ملا دوں۔

رمشا خالد نے بہت ہی زبردست لکھا۔ وہ اک بل پڑھ کے بہت اچھا لگا کاش کہ سارے بھائی میزاب کے بھائی جیسے ہوں۔ خیال رکھنے والے۔ مگر ایسا ہوتا نہیں ہے اور آخر میں میزاب کا فیصلہ بہت اچھا لگا۔

شاعری بچ بولتی ہے میں کرن کا انتخاب اچھا تھا اور وینا ملک کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ اللہ اسے تھوڑی سی عقل دے (آمین)

اور آخر میں آمنہ ریاض کو بہت بہت مبارک باد اور میری ایک دوست اور پیاری سی کرن ثناء اسلام بھی شادی کے بندھن میں بندھ گئے ہمیں بھول چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں دنیا جان کی خوشیاں عطا فرمائے۔ آمین۔ شعاع کو باقاعدگی سے پڑھنے والی کرنز ثناء، انعم ارسہ اور چچی جان (شائستہ) ہیں۔

فائزہ افتخار کا ناول بہت ہی زبردست رہا۔ پڑھ کے ہنستے ہی رہے۔ زبردست لکھا آپ نے۔

ٹوپیہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ بہت خوشی ہوئی آپ نے خط لکھا۔ اپنی شائستہ چچی کو بھی ہمارا سلام اور شکریہ پہنچا دیں اور ثناء، انعم، ارسہ سے کہیں کہ وہ بھی ہمیں خط لکھ کر شعاع کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار

کریں۔ عقل کی ضرورت دینا ملک نہیں ہمارے میڈیا کو ہے۔ دینا اپنی بیلٹی کے لیے بہت سوچ سمجھ کر یہ حربہ اختیار کر رہی ہے۔ میڈیا اسے شہرت دے رہا ہے۔ آمنہ ریاض تک آپ کی مبارک باد پہنچائی جا رہی ہے۔

ساتھ منیر احمد لاہور سے تعریف لائی ہیں، لکھا ہے ٹاسٹل پر سرسری سی نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گئے، آپ سے ریکویسٹ ہے کہ پلیز نیچل نظاروں کو بھی مد نظر رکھا کریں۔ سب سے پہلے وہ ہی ناول پڑھا جس کا انتظار تھا، جی ہاں، فائزہ افتخار کا مکمل ناول ”مان جاؤ“ بہت ہی عمدہ لکھا رائٹر نے، فائزہ جی کا تو انداز ہی نرالا ہے۔

عالیہ جی! آپ سے تمہ دل سے درخواست ہے کہ جس طرح یقینی سالار کو ملوایا آپ نے، اسی طرح اب جویا معاذ کا امتحان بھی اب بس کریں اور انہیں ملو ادیں! ”زندگی پیاری ہے“ عائشہ فیاض کا سپر ہٹ + زبردست ناول، بہت خوب صورتی سے اپنا ایک پیغام وہ ہم تک ہمارے دلوں تک پہنچا گئیں۔

FM 103 کے آر جے اظہر حسین اور علی ظفر کے انٹرویو کی فرمائش کی تھی۔ کچھ مہینے پہلے، وہ کب تک شائع ہو جائے گا، تصویر کے ساتھ اور پوان میں پڑا اور چاکلیٹ لاواؤ کی ترکیب بتا دیں۔ پلیز اوون میں، اوون کے بغیر جیسے بھی۔۔۔

بندھن میں آمنہ جی اور ان کے شریک حیات کا انٹرویو شامل کریں شادی کی تصویر کے ساتھ!

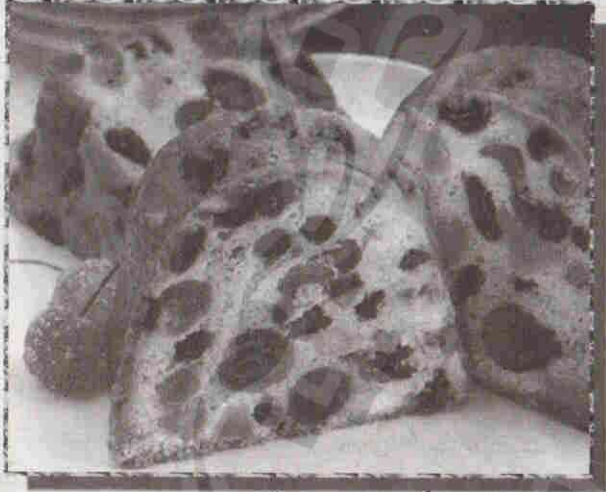
پیاری ساترہ! آپ کی تمام فرمائشیں نوٹ کر لی گئی ہیں۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔



ماہنامہ خواتین، خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے چرواں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل، جس ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت میں ڈراما، فلم، ٹیلی ویژن اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

## موسم کے پیکوان

خالہ جیلاقی



### پلین فروٹی کیک

اجزاء:

- 2 کپ میدہ
- 2 کپ کھانے کے چمچے
- 1 کپ مکھن
- 2 عدد انڈے
- 2 عدد چینی
- 2 کپ کریم
- 1 کپ دہلا ہنسٹس
- 1 کپ فوڈ کلر (پیل)
- 1 کپ اشرفی اور کشمش
- آدھا کپ ترکیب:

چینی ملا لیں۔ الگ سے کریم اور فوڈ کلر کس کر لیں۔ انڈے الگ پھینٹ کر اس میں مکھن کس کر لیں۔ ان تمام آمیزوں کو الگ الگ اچھی طرح کس کرنے کے بعد آپس میں ملا دیں۔ (میدہ، انڈے اور مکھن سہولت سے یکجان نہیں ہوتے، اس لیے انہیں پہلے علیحدہ کس کریں پھر سب کو ملا کر) پھر نیلا ہنسٹس چھی ملا دیں۔ اب اشرفیاں اور کشمش بھی کس کر دیں۔ سانچے میں ڈالنے سے قبل برتن پر ایک چمچہ کھی مل دیں اور براؤن کانفڈ سیٹ کر کے آمیزہ ڈال دیں۔ تھوڑی سی اشرفیاں اور کشمش آمیزے کے اوپر بھی ڈال دیں۔

بیک کرنے کے لیے بہت سارے چکنے پتھر ایک بڑے ٹیلے میں ڈال کر چولہے پر گرم ہونے کے لیے رکھ دیں۔ تقریباً ایک گھنٹے میں وہ صحیح طور پر بیک

ایک بڑے پالے میں میدہ، مکھن، ماؤڈر اور



کیں گے۔ پھر کیک کا سانچہ اس تیل میں پھروں پر رکھ کر ڈھکن بند کر دیں۔ کم از کم آدھے گھنٹے بعد چھری سے چیک کریں۔ اگر سخت محسوس ہو تو سمجھیں کیک تیار ہے ورنہ مزید آدھے گھنٹے کے لیے بیک کریں۔ ایک گھنٹے کے اندر کیک اچھی طرح بیک ہو جاتا ہے۔ لیجئے مزید ارپلین فرونی کیک بغیر اودن کے تیار ہے۔

### چکن تندوری پڑا

اجزاء :

میدہ	3 کپ
چینی	2 کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
خمیر	1 کھانے کا چمچ
انڈا	1 عدد
پسی سیاہ مرچ	ایک چائے کا چمچ
پسا گرم مسالا	1 چائے کا چمچ
لسن اورک پیسٹ	1 کھانے کا چمچ
چکن	ڈیڑھ پاؤ
کئی سرخ مرچ	حسب ذائقہ
لیموں کا رس	1 کھانے کا چمچ
فوڈ کلر (سرخ)	1 چینی
موزریلا چیز	آدھا کپ
ٹماٹو پیسٹ	ڈیڑھ کپ
چائیز نمک	1 چائے کا چمچ
سرکہ	1 کھانے کا چمچ
تیل	4 کھانے کے چمچے

ترکیب :

میدہ چھان کر اس میں نمک، چینی، خمیر اور انڈا ڈال کر کس کر دیں اور نیم گرم پانی سے گوندھ کر مکمل کا کپڑا ڈھک کر ایسی جگہ پر رکھیں جس کا درجہ حرارت زیادہ ہو (چولے کے پاس مناسب رہے گا)۔ فرائنک پان میں تیل گرم کر کے اورک لسن کا پیسٹ سنہرا کر لیں۔ چکن کیوز بغیر یوں کا چکن ابال

کر کیوز میں کٹ لیں) کئی ہوئی سرخ مرچ، نمک، چینی، سرکہ، پسی سیاہ مرچ، چائیز نمک، ٹماٹو پیسٹ (ٹماٹو کو بھاپ سے گلا کر اس کا چھلکا اور بیج نکال کر باریک پس لیں اور تھوڑا سا الگ رکھ لیں اور فوڈ کلر (سرخ) کیونکہ چکن تندوری سرخ ہوتا ہے) ڈال کر سنہرا کر لیں۔

گوندھ ہوئے آنے کی موٹی سی روٹی بنالیں پھر اسے ٹرے میں رکھیں۔ اس پر تھوڑا سا ٹماٹو پیسٹ لگائیں اور فرونی کیا ہوا آمیزہ اس پر اچھی طرح پھیلا دیں۔ اس کے اوپر موزریلا چیز بھی لکدو کش کر کے چھڑک دیں۔

ایک بڑا ٹوالے کر اسے چولے پر خوب گرم کریں۔ اس پر پڑا والی ٹرے (مناسب ہو گا کہ توڑے سے چھوٹی کوئی ٹرے ہو یا فرائنک پان بھی مناسب رہے گا) رکھیں۔ کئی ٹائٹ ڈھکن سے اچھی طرح بند کر دیں تاکہ ہوا وغیرہ نہ جاسکے۔ ہلکی آنچ پر بیک ہونے کے لیے چھوڑ دیں۔ 45 منٹ بعد بیک ہو جائے گا۔ اس دوران ڈھکن ہٹا کر دیکھنے سے گریز کریں۔ بغیر اودن کے مزید ارچکن تندوری پڑا تیار ہے۔

### چکن ویجی ٹیبل سوپ

اجزاء :

1 پاؤ	مرغی کا گوشت
3 کلاس	پانی
آدھا کپ	مٹر
آدھا کپ	مکئی کے دانے
حسب ذائقہ	نمک
حسب ذائقہ	چائیز نمک
ایک چائے کا چمچ	پسی کالی مرچ
ایک کھانے کا چمچ	سویا سوس
ایک کھانے کا چمچ	باریک کٹنا ہوا ہرا دھنیا
2 کھانے کے چمچے	کارن فلور
1 عدد	انڈا

ترکیب :

چکن کو پانی میں ڈال کر ابالیں مٹر کے دانے بھی ساتھ ہی شامل کر دیں۔ چکن گل جائے تو نکال کر ریشہ کر لیں اور دوبارہ اس بنی میں شامل کر دیں۔ گاجر، ابلے ہوئے مکئی کے دانے، نمک، کالی مرچ، سویا ساس اور چائیز نمک، بھی بنی میں شامل کر دیں۔ جب سبزیاں گل جائیں تو آدھے کپ پانی میں کارن فلور گھول کر شامل کر دیں اور پیچہ چلائی رہیں۔ جب سوپ

گاڑھا ہونے لگے تو انڈا پیسٹ کر شامل کر کے تیزی سے چمچہ گھمائیں۔ مزے دار سوپ تیار ہے۔ سویا سوس کے ساتھ پیش کریں۔

### شہناجی کے کباب

اجزاء :

1 کلو	سفید شہناج
آدھی پیالی	چنے کی دال
6 عدد	لسن کے جوے
چھوٹا سا کلوا	اورک
6 عدد	ٹماٹو لال مرچ
8 عدد	کالی مرچ
2 کھانے کے چمچے	دھنیا
2 کھانے کے چمچے	کارن فلور
2 سلاکس	ڈبل روٹی
1 عدد	انڈا
1 کھنٹی	ہرا دھنیا
2 عدد	ہری مرچ
1 عدد	پیاز
حسب ذائقہ	نمک
1 پیالی	تیل

ترکیب :

شہناج کو چھیل کر دھو لیں، پھر ابال لیں۔ جب شہناج گل جائیں تو پانی سے نکال کر کانٹے سے بھرتہ بنائیں۔ پھر چھلکی میں رکھ کر دیا دیا کر شہناج کا اضافی پانی

نکال کر بالکل خشک کر لیں۔ چنے کی دال میں چھلے ہوئے لسن کے جوے، اورک، ٹماٹو لال مرچ، نمک اور کالی مرچ ڈال کر ابال لیں۔ جب دال گل جائے تو باریک پس لیں پھر شہناج اور دال کو مکس کر لیں۔ ساتھ ہی سلاکس، کارن فلور اور انڈا بھی ملا دیں، پھر گیلے ہاتھ کر کے کباب بنائیں۔ پیاز اور ہرا مسالا بھی ساتھ ملا دیں یا اندر بھر کر کباب بنائیں۔ ہلکی آنچ پر ہلکے تیل میں مل لیں۔

### مصری پلاؤ

آدھا کلو	قیمہ
آدھا کلو	چاول
1 چائے کا چمچ	نمک
1 کھانے کا چمچ	اورک، لسن پیسٹ
1 چائے کا چمچ	پسا گرم مسالا
آدھی کھنٹی	ہرا دھنیا
6 عدد	ہری مرچ
حسب ذائقہ	نمک
آدھی پیالی	تیل
ایک کڑائی میں تیل گرم کر دیں۔ اس میں اورک، لسن پیسٹ، نمک اور مرچ ڈال کر بھون لیں۔ پھر قیمہ دھو کر ڈال دیں اور آدھا کپ پانی شامل کر کے اسے گل جانے تک پکائیں پھر بھون کر اس پر ہرا مسالا چھڑک دیں۔	
چاولوں میں نمک ڈال کر ایک کئی ابال لیں اور اس میں پکا ہوا قیمہ مکس کر لیں اور آدھا کپ تیل ڈال دیں۔	
بند گو بھی گرم پانی میں ڈال کر چھوڑ دیں، پھر 5 منٹ بعد نکال لیں اور اس کے پتے الگ کر لیں۔ پھر بند گو بھی کپتوں پر تھوڑے سے چاول رکھیں اور فولڈ کر دیں۔ (چاپیں تو دھاگے سے بند کر دیں) پھر پتلی میں ڈال کر اسے دم دے دیں، ڈش میں چاول نکال کر فولڈ کے ہوئے گو بھی بند چاول بھی ایک طرف سیادیں۔	
راہتہ کے ساتھ پیش کریں۔	





ہمارے ہاں بھارتی فنکاروں کو بلاوجہ قوس کیا جاتا ہے جبکہ بھارت میں ہمارے چیمپلز دکھائے تک نہیں جاتے۔ ہمارے ہاں بھارتی فنکاروں کے بل بورڈز نظر آتے ہیں لیکن وہاں کے بل بورڈز پر کس بھی ایمان علیٰ وزیرہ احمدی ایرج منظور نظر نہیں آتیں۔ (ان ہی کی تصویریں دیکھیں ہیں جی یا آمنہ شیخ بھی؟) آمنہ کا کہنا ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں کہ اگر کوئی مائی نیشنل کمپنی یا برانڈ ہماری مارکیٹ میں آتا چاہے تو اس کے لیے ہمارا ٹیلنٹ استعمال کرنا لازمی قرار دیا جائے۔ (اور اگر آپ کو بھارتی فلم کی پیش کش ہوئی تو انکار کریں گی کیا؟)

گمشدہ

خبر کی ڈھیروں تعریفوں میں سے ایک خاصی معروف تعریف ہے کہ ”کتا آدمی کو کاٹ لے تو خبر نہیں بنتی“ لیکن اگر آدمی کتے کو کاٹ لے تب خبر بنتی ہے۔ لیکن جناب! یہ تو گئے وقتوں کی بات تھی کہ اب تو اس میں تبدیلی آچکی ہے۔ اب تو ہر ملک کچھ کریں، تو خبر نہیں بنتی۔ وہ کچھ نہ کریں تو خبر بنتی ہے۔ ویٹا ملک کو خبروں میں رہنے کا فن آتا ہے۔ جب ہی تو وہ

کی آشنا کو تقویت دینے والے اعصام لا تعداد پرستار خواتین کی موجودگی میں اپنی گھریلو زندگی میں امن برقرار رکھنے میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا، تاہم فی الحال تو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوب صورت شخصیت کی مالک فابا بھی عوامی پسندیدگی کی سند حاصل کر چکی ہیں، اسی لیے وہ ”بیوٹی فل بھابی“ کے لقب سے نوازی گئی ہیں۔

زندگی کا یہ خوشگوار سفر شروع کرنے پر اعصام فابا اور ان دونوں کے اہل خانہ بے حد خوش ہیں۔ ولی دعا ہے کہ ان کی یہ خوشیاں سدا قائم رہیں۔ (آمین)

جان

معروف اداکارہ لیلیٰ ایک عرصہ سے اداکاری سے دور ہیں (یہاں مراد اسکرین پر اداکاری سے ہے) آف دی اسکرین سے نہیں۔ لیلیٰ اپنی گھریلو زندگی میں گم نہیں، لیکن بھلا ہو معروف فلم ساز و ہدایت کار پرویز رانا کا کہ وہ لیلیٰ کو گھر سے نکال ہی لائے۔ (اپنے گھر سے نہیں، لیلیٰ کے گھر سے) پرویز رانا نے لیلیٰ کو ایک فلم کی پیش کش کی ہے، فلم کا نام بھی انہوں نے لیلیٰ کے نام پر رکھا ہے، یعنی ”لیلیٰ میری جان“ (اف!) فلم کی ابتدائی کارروائی مکمل ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ اس کی شوٹنگ کا آغاز بھی جلد ہی ہو جائے گا۔

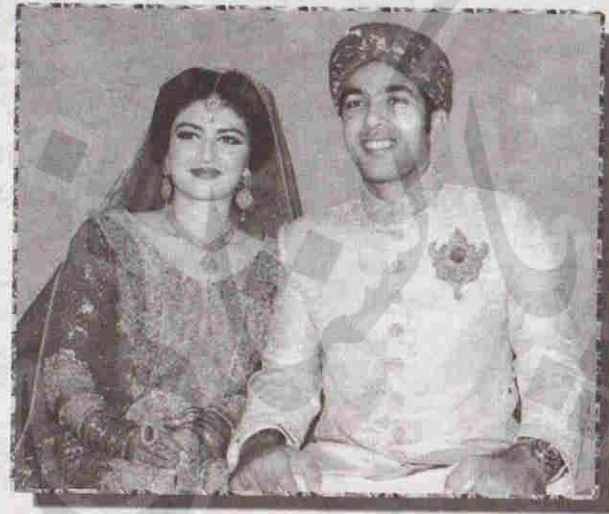
لیلیٰ کو شوہر میں قدم رکھے ایک طویل عرصہ بیت چلا ہے، مگر ان کے کریڈٹ پر اب تک کوئی کامیاب فلم یا خاص قابل ذکر کام نہیں ہے، سوان کی سابقہ کارکردگی کو مد نظر رکھتے ہوئے فلمی حلقے لیلیٰ کو ناسٹل رول دینے کو خاصا بڑا رسک قرار دے رہے ہیں، تاہم پرویز رانا کا کہنا ہے کہ ”لیلیٰ تو میری جان ہے، اسی لیے فلم کا ناسٹل بھی ”لیلیٰ میری جان“ رکھا گیا ہے۔“ (آپ کو پسند ہیں پرویز جی! تو اس کی سزا بے چارے ناظرین کیوں نکلیں؟)

شکوہ

معروف اداکارہ و ماڈل آمنہ شیخ کو شکوہ ہے کہ

غزل ٹوکان

رکھنے کیلئے



تو وہیں گولڈن شیروانی اور سرخ کلاہ میں ملبوس اعصام الحق بھی کسی یونانی شہزادے سے کم نظر نہیں آ رہے تھے۔ خوشیوں کی وہمبلیٹن ثرائی اٹھائے دونوں بے حد مسرور نظر آ رہے تھے۔

ٹینس میں اعصام کے شریک کھیل، بھارتی کھلاڑی روہن بونپنا خاص طور پر لاہور پہنچے اور اعصام اور ان کی شریک حیات کو اپنی دعاؤں کا تحفہ دیا۔ روہن کی شرکت سے اعصام اور روہن کے درمیان شدید نوعیت کے اختلافات کی وہ تمام افواہیں بھی دم توڑ گئیں جو چند ماہ قبل اعصام اور روہن کی جوڑی ٹوٹنے پر پھیل گئی تھیں۔

بھارتی کھلاڑی کے ساتھ کامیاب جوڑی بنا کر امن

خوشی کا سماں

”مبارک تمہیں خوشی کا یہ سماں۔“

یہ مبارک باد آپ کے گئے نہیں ہے بھئی! بلکہ ٹینس کے شہزادے اعصام الحق کے لیے ہے جو خیر سے 17 دسمبر 2011ء کو اپنی شہزادی فابا اکمل کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ واضح رہے کہ ان دونوں کی منگنی جولائی 2011ء میں ہوئی تھی۔

اعصام الحق کی زندگی کا سب سے بڑا یہ مکسڈ ڈبلز میچ گولف کلب لاہور میں منعقد ہوا جو دس لاکھ روپے کے مہر کے عوض انہوں نے جیت لیا۔ اس موقع پر سرخ اور گولڈن اینگا زیب تن کیے شرمائی شرمائی فابا جہاں یوں جیسے حسن کی مالک دکھائی دے رہی تھیں





آئے دن کچھ نہ کچھ ایسا کرتی رہتی ہیں۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ ان کے پاس کچھ کرنے کو نہ رہا تو وہ ”غائب“ ہو گئیں۔ بھارتی میڈیا میں شور مچ گیا اور یوں دینا بھارتی میڈیا پر چھا گئیں۔ بھارتی میڈیا کا کہنا تھا کہ ”وینا کے ویزے کی مدت ختم ہو گئی ہے، لہذا وہ واپس بھارت کے راستے پاکستان چلی گئی ہیں۔“

لوگ انہیں ڈھونڈتے رہے اور وہ بمبئی کے آگ و ڈھول کے ایک پرسکون کمرے میں میم یہ تماشا دیکھتی رہیں۔ جب اس تماشے سے جی بھر گیا تو وینا اچانک منظر عام پر آئیں اور کہا۔

”میں کہیں کم نہیں ہوئی تھی۔ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کر کے تھک گئی تھی تو آرام کی نیت سے فون بند کر دیا تھا۔ میں نے اپنی والدہ کو بتا دیا تھا۔ انہیں پتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔“ (لو، اگر لوگ!)

اس بیان سے لوگوں کی تسلی تو کیا ہوئی، خود وینا کی بھی نہیں ہوئی، جب ہی تو انہوں نے اگلے ہی دن دوسرا بیان دلخیز دیا کہ۔

”مجھے اشمیت سے تعلقات ٹوٹنے کا صدمہ پہنچا تھا لہذا اس کا غم منارہی تھی۔ سو خود کو کمرے میں بند کر

لیا تھا۔“ (لوگ تو خوشیاں ہی مناتے ہیں، مگر وینا تو ہم بھی مناتی ہیں۔)

وینا نے مزید بتایا کہ گو وہ مضبوط اعصاب کی مالک ہیں، لیکن اس غم کو بھولنے کے لیے انہیں ادویات کا سہارا لینا پڑا۔ (ہرک شاہ، محمد آصف اور اب اشمیت۔۔۔ کیا ابھی تک عادی نہیں ہوئیں لی بی بی!)

وینا نے مزید کہا کہ ”اشمیت سے میل جول، کچے دھاگے کا رشتہ ثابت ہوا۔ اسے توڑنا آسان نہیں تھا، مگر یہ کڑوا کھونٹ پینا ہی پڑا۔“ (اور کون جانے! یہ گھونٹ ابھی اور کتنی مرتبہ پینا ہے۔)

وینا اس بات پر خوش ہیں کہ لوگوں نے انہیں ڈھونڈا تو اس کا مطلب ہے کہ لوگوں کو ان کی پروا ہے، ورنہ وہ تو سمجھتی تھیں کہ کسی کو بھی ان کی پروا نہیں ہے۔

(لوگ تو بہت سادہ ہیں دینا جی! ہر بار آپ کی چال میں آجاتے ہیں اور آپ بھی اتنی سادہ ہیں کہ کبھی چال بدلتی ہی نہیں۔ وہی جھوٹ، وہی ڈرائے)

### یہ بیان کالمانہ

شاعری، افسانہ، ناول، مزاح، تحقیق، انشائیہ اور تنقید جس صنف کو لے لیا جائے سیکڑوں قد آور شخصیات نظر آئیں گی جنہوں نے مادری زبان اردو نہ ہونے کے باوجود اپنی پوری زندگی اس کی ترویج و اشاعت میں لگا دی۔

(زنگار۔۔۔ عامر خاگانی)

امریکا کی اب افغانستان میں بھی وہی پوزیشن ہے جو اس کی دست نام میں تھی اس کے فوجی اور سول حکام اقرار کر رہے ہیں کہ وہ جنگ ہار رہے ہیں اور اس کا زمہ دار پاکستان کو ٹھہرا رہے ہیں۔

(ذاکر حسین)



### خلیفہ ہارون الرشید

ہارون رشید کو ممدی نے ہادی کے بعد جانشین مقرر کیا تھا۔ موصی سے روایت ہے کہ اسی رات ہارون رشید کے ہاں اس کا بیٹا عبداللہ مامون پیدا ہوا۔ اس معاملے کے علاوہ دنیا میں ایسا بھی نہیں ہوا کہ ایک ہی رات میں ایک خلیفہ کی وفات ہو، دوسرا تخت خلافت پر بیٹھے اور تیسرا پیدا ہوا ہو۔ ہارون رشید کی کنیت پہلے ابو موسیٰ تھی لیکن بعد میں ابو جعفر کی کنیت سے پہچانا گیا۔ ہارون رشید بہت ہی بلند پایہ اور عظیم خلیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کے بادشاہوں میں بھی بلند مرتبت تھا، وہ اہل علم کا دوست اور قدر شناس تھا۔ جو لوگ اس کی تعریف کرتے ان کو بہت سا انعام عطا کرتا وہ خود بھی اعلا مرتبہ کا شاعر تھا۔

ابو معاویہ کا کہنا ہے کہ ”ایک دن میں ہارون کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے بیٹھا کسی آدمی نے میرے ہاتھ دھلائے ابو معاویہ بتا دینا تھے مجھ سے ہارون نے پوچھا۔

”کیا آپ اس آدمی کو جانتے ہیں جس نے آپ کے ہاتھ دھلائے؟“ میں نے نفی میں جواب دیا تو ہارون نے کہا۔

”میں نے آپ کے علمی مرتبہ کی تعظیم کے لیے بذات خود آپ کے ہاتھ دھلائے ہیں۔“

ہارون الرشید نے اپنے دربار میں ایسے مشاہیر اور عالم جمع کیے جو نہ عباس میں کسی کو بھی میر نہ آسکے، آل برک اس کے وزیر تھے تمام ابو یوسف قاضی تھے، شاعر دربار مروان بن ابی حفصہ تھا، فضل بن ربیع جیسا عظیم اور مشہور زمانہ شخص اس کا وزیر دربار تھا۔ عالم ابراہیم موصی اس کے دربار میں گائے والا تھا اور ملکہ زبیدہ اس کی بیوی تھی۔ اس طرح ہارون الرشید کا دور حکومت بنو عباس میں بے مثال دور تھا۔ اس کے دور حکومت کو عروسِ حسینہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

الصباح طبری کا کہنا ہے۔

”ایک دفعہ سفر کے دوران ہارون نے مجھ سے مخاطب

### امت الصبور



ہو کر کہا کہ ”اے صاب! شاید آج کے بعد تم مجھ سے دیکھ سکو۔“

میں نے کہا ”امیر المومنین ان شاء اللہ آئندہ بھی ملاقات ہوگی اور اللہ تعالیٰ آپ کو بخیریت وعافیت واپس کر دے گا۔“

یہ سن کر وہ مجھ اس راستے سے ہٹ کر ایک طرف لے گیا جہاں کوئی بھی نہ تھا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اے صاب! یہ ایک راز کی بات ہے اسے پوشیدہ رکھنا۔“

انتا کہہ کر ہارون نے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر مجھے دکھایا، اس کے شکم پر ریشم کی پٹی لپی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”یہ دیکھو، یہ میرا مرض ہے جس کو میں نے لوگوں سے چھپایا ہوا ہے اس کے باوجود میرے فرزندوں کا یہ حال ہے کہ انہوں نے اپنے الگ الگ محافظ میرے ساتھ لگا رکھے ہیں۔ میرے بیٹے ان کے ذریعے میری ایک، ایک سانس کو شمار کر رہے ہیں لیکن میری عمر کا دور بردھتا جا رہا ہے میں نے اپنا سارا حال تمہیں بتا دیا ہے۔“

پھر اسی وقت بزدوں نسل کا گھوڑا جو بہت ہی کمزور و لاغر تھا منگوایا اور اس پر سوار ہو کر اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مرجان کی طرف چل دیا اور اسی بیماری کی حالت میں طوس پہنچ کر 193ھ میں فوت ہو گیا۔“

ایک دفعہ ایک زندیق کو گرفتار کر کے ہارون الرشید کے سامنے لایا گیا ہارون نے اس کا سر قلم کرنے کا حکم صادر کیا اس پر زندیق نے پوچھا۔

”آپ نے مجھے قتل کرنے کا حکم دیا ہے؟“





ادارہ

## حضور

کریں اور اسے اچھی طرح مٹس کر لیں۔ اب اس مخلوق کو سر کی کھوپڑی پر لگائیں اور 20 منٹ تک خشک ہونے کے لیے چھوڑ دیں، پھر کسی بھی معیاری شیمپو سے بال دھولیں۔

2 ایلو وبرا کا کنڈیشنر:

بالوں میں نمی کے تناسب کو برقرار رکھنے کے لیے یہ کنڈیشنر نہایت مفید ہے۔ ایلو وبرا کا ایک بڑا پتہ لیں اور اس میں سے جیل نکال لیں۔ اس جیل کو یا تو پانی میں اچھی طرح مٹس کر کے سرد ہونے کے بعد آخر میں استعمال کریں یا پھر سرد ہونے سے پہلے بالوں کی جڑوں میں اس کا سانچ بھی کر سکتے ہیں۔

3 چائے اور لیمون کا کنڈیشنر:

چائے کی پتیوں کو ایک گلاس پانی میں ایال کر چھان لیں، اب اس میں ایک عدد لیمون کا رس شامل کر کے اچھی طرح مٹس کر لیں اور بالوں کو شیمپو کرنے کے بعد اس مخلوق سے سر کو اچھی طرح کھینک لیں۔

4 لیمون اور شہد کا کنڈیشنر:

آدھا چائے کا چمچ شہد میں ایک عدد لیمون کا رس شامل کر کے اچھی طرح مٹس کر لیں۔ اب اس مخلوق کو

موسم سرما کو تمام موسموں میں سب سے خوب صورت اور خوش گوار موسم تصور کیا جاتا ہے، لیکن اکثر لوگوں کے لیے یہی خوش گوار موسم جلد اور بالوں سے متعلق بے شمار مسائل پیدا کرنے کا سبب بھی بنتا ہے۔

موسم سرما میں خواتین کی ایک کثیر تعداد بالوں میں خشکی، بالوں کے سروں کا پھٹنا، بالوں کا گرنا، وغیرہ جیسے مسائل سے دوچار رہتی ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ اس موسم میں بالوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ بالوں کی چمک و بک اور صحت برقرار رہ سکے۔ بالوں کی دیکھ بھال کے لیے دوسرے تو کئی مصنوعات مارکیٹ میں دستیاب ہوتی ہیں، لیکن چونکہ یہ پروڈکٹ مصنوعی ہوتی ہیں، لہذا ان میں شامل کیمیکلز بالوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس لیے مناسب ہو گا کہ بالوں کی نگہداشت کے لیے قدرتی اشیاء کا استعمال کیا جائے کیونکہ قدرتی طریقوں سے بالوں کا علاج اور دیکھ بھال کرشمہ مصنوعات کے مقابلے میں زیادہ سستا، محفوظ اور قابل اعتماد طریقہ ہے، جس کے بالوں پر کسی بھی قسم کے منفی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔

موسم سرما میں اگر ان پیدہ چیزہ باتوں کو دھیان میں رکھا جائے تو کافی حد تک ان مسائل سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔

### بالوں کے لیے قدرتی اشیاء سے بنے کنڈیشنر

1 خشکی کے لیے اورک کا کنڈیشنر:

سرویلوں میں سر کی کھوپڑی پر خارش اور خشکی بڑھ جاتی ہے جو سر کی خشکی کو مزید بڑھاتا ہے۔ اس کنڈیشنر کو میٹھے میں دو مرتبہ استعمال کرنے سے سر کی خارش اور خشکی میں حیرت انگیز طور پر کمی واقع ہوگی۔

اورک کا کنڈیشنر بنانے کے لیے ایک پیالے میں

ایک چائے کا چمچ اورک کا جوس، ایک چائے کا چمچ کھانے کا تیل اور ایک چائے کا چمچ لیمون کا رس شامل

آغاز کیا۔ خلعہ بنی عباس میں وہ پہلا آدمی ہے جس نے گویوں کے مدارج مقرر کیے اور طبقات میں ان کو تقسیم کیا۔ ہارون کی شاعری میں اس کا وہ مرثیہ بڑا زیورست ہے جو اس نے اپنی لونڈی ”ہیلانہ“ کی وفات پر لکھا۔

مرثیہ کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔  
”جب ہیلانہ نے وفات پائی تو مجھے شدید دکھ ہوا اور میں بہت دھمی ہوا جب ہیلانہ نے وفات پائی اور وہ مجھ سے جدا ہو گئی تو میری زندگی کا لطف ختم ہو گیا۔ جیسا میں تھا ویسا نہ رہا میرے لیے وہ ایک کائنات تھی جب وہ قبر میں گئی تو میرے لیے دنیا بانی نہ رہی بلکہ جدا ہو گئی اس دنیا میں بہت سے انسان ہیں لیکن تیری وفات کے بعد میں نے کوئی انسان نہیں دیکھا جب تک دنیا میں ہوا شاخوں کو ہلاتی رہے گی۔ اللہ کی قسم! اے ہیلانہ میں تجھے نہیں بھول سکتا۔“

ہارون الرشید کی موت کی وجہ درباری طیب بن جس کا نام جبریل ابن نعتیشوع تھا۔ اس نے ہارون کا ایک عضو کاٹنا چاہا پھر اس نے فیصلہ کیا کل صبح تک انتظار کیا جائے شاید یہ صبح تندرست اٹھے لیکن وہ اسی روز مر گیا۔ وفات سے پہلے ہارون نے خواب دیکھا تھا کہ میں طوس کا حکمران بن گیا ہوں۔

صبح اٹھ کر وہ بہت رویا اور کہا ”میری قبر تیار کرو جب قبر تیار ہو گئی تو اونٹ پر سوار ہو کر قبر پر گیا۔ قبر کی طرف دیکھ کر کہا اے ابن آدم! اب اس کو اختیار کر۔“ پھر کچھ لوگ اس کے حکم سے قبر میں اترے اور اندر بیٹھ کر قرآن پاک کا ختم کیا اور خود اتنی دیر قبر پر بیٹھ کر سنا رہا۔

ابولشعیص نے ہارون کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا وہ تمام مرثیوں میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ مشہور شاعر ابو نواس کی نظم کا آخری شعر اس طرح ہے۔  
”دو چاند تھے ان میں سے ایک چاند بغداد میں طلوع ہوا (امین الرشید اس وقت بغداد میں تھا) اور دوسرا طوس کی سرزمین میں غروب ہو گیا۔“

(ابن عطار یہ بارہ قطعہ)

ہارون نے کہا ”تاکہ خلق خدا تیرے فتنے سے بچی رہے۔“

اس پر زینب نے کہا۔ ”آپ مجھے قتل تو کروادیں گے مگر ان ایک ہزار احادیث کا کیا بنے گا جن کو میں نے خود وضع کر کے ہر طرف پھیلا دیا ہے اور وہ سب من گھڑت ہیں، ان میں ایک لفظ بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا موجود نہیں۔“

ہارون نے کہا۔ ”اے خدا کے دشمن تو کس خیال میں ہے۔ یہ ابو اسحاق فزاری اور عبد اللہ بن مبارک ان احادیث کو ایک ایک کر کے اصول احادیث پر پرکھیں گے اور وہ اصول حدیث سے اس کا موڑ دل ہونا ثابت کریں گے۔“

اسحاق موصلی نے ایک بار ہارون الرشید کے سامنے قصیدہ گایا جس کا ترجمہ دین ذیل ہے۔

”جو عورتیں تجھ کو جیتی تھیں تو میں نے ان کو نصیحت کی کہ تجھ کی عادت کو چھوڑ دو۔ مال تو اتنی جانی چیز ہے لوگ تو سخاوت کو پسند کرتے ہیں اور تجھ کو دنیا میں کوئی بھی دوست نہیں رکھتا۔“

دولت تو عارضی شے ہے بخیل کو بخل کی عادت ہوتی ہے لیکن میرا نفس ایسا نہیں کہ مجھے کوئی تجھ سے کہے میں مفلسی سے کیوں خوف کھاؤں اور دولت مندی کی عظمت کو کیوں نہ بیان کروں جب کہ میرے بارے میں امیر المومنین کی اچھی رائے ہے۔“

ہارون الرشید نے یہ باتیں سن کر کہا ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں اے فضل! اس کو ایک لاکھ درہم عطا کر دو۔ اللہ کی قسم! ایسا خوب اشعار کہے ہیں سب باتیں بہت خوب ہیں۔“

میں نے یہ سن کر عرض کی۔

”امیر المومنین آپ کا یہ فرمان تو میرے اشعار سے بھی زیادہ بلند مقام رکھتا ہے۔“

یہ سن کر ہارون نے فضل سے کہا ”اس کو ایک لاکھ درہم اور دے دو۔“

ہارون ہی سب سے پہلے ٹھٹھ دوڑ کے کھیل میں حصہ لینے والا تھا اور اس نے ہی نشانہ بازی کے کھیل کا



تھوڑے سے پانی میں ڈال کر بالوں پر لگائیں اور تھوڑی دیر بعد سادہ پانی سے بالوں کو اچھی طرح کھگال لیں۔

کنڈیشنر لگاتے وقت اس بات کا دھیان ضرور رکھیں کہ یہ سر کی کھوپڑی اور بالوں کی جڑوں میں نہ جا سکے۔ بالوں میں اضافی چمک پیدا کرنے کے لیے ہر کے کوپانی میں ملا کر سردھولیں۔

5 انڈے کا کنڈیشنر :

4 چائے کے چمچے بے پی آئل، 2 عدد انڈے کی زردی اور 2 کپ پانی انڈے کی زردی کو اچھی طرح پھینٹیں، حتیٰ کہ وہ جھاگ بن جائے۔ اب اس میں بے پی آئل شامل کر کے دوبارہ پھینٹیں۔ اب اس میں پانی شامل کر کے اپنے سر کی کھوپڑی اور سارے بالوں پر اچھی طرح لگائیں۔ تھوڑی دیر تک لگا رہنے دیں، پھر کسی اچھے شیمپو سے بالوں کو دھو لیں۔

خشک اور بے جان بالوں کے لیے ماسک :

خشک، بے جان اور کمزور بال موجودہ دور میں ایک اہم مسئلہ بنتے جا رہے ہیں جس کا اکثر خواتین کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بالوں کو صحت مند اور زندگی سے بھرپور بنانے کے لیے قدرتی اشیاء سے بنے گھریلو ماسک کا استعمال بالوں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

1 کیلے کا ماسک : 2 کپے ہوئے کیلے، 2 چمچ شہد اور آدھا کپ دودھ۔

کیلے کو اچھی طرح کانٹے کی مدد سے پیسٹ بنالیں۔ اب اس میں دودھ شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں اور اپنے بالوں کی جڑوں سے لے کر آخری سروں تک لگائیں، تقریباً 20 منٹ تک لگا رہنے دیں پھر دھو لیں۔

2 زیتون کے تیل کا ماسک :

5 چائے کے چمچ نیم گرم تیل میں دو انڈے شامل کر کے اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اب اس مکسچر کو

برش کی مدد سے بالوں پر لگائیں۔ اس کے بعد سر کو شاور کیپ یا پلاسٹک کی تھیلی سے ڈھانپ دیں۔ تقریباً 20 منٹ تک اس ماسک کو لگا رہنے دیں پھر کسی نرم شیمپو سے بالوں کو دھو لیں۔ یہ خراب اور روکھے بالوں کے لیے بہترین ماسک ہے۔

3 انڈے کا ماسک :

انڈے کا ماسک خراب، روکھے اور خشک بالوں میں نمی کو برقرار رکھنے اور ان کی نشوونما کو بڑھانے کے لیے بہترین سمجھا جاتا ہے۔ ایک پیالے میں دو چائے کے چمچ زیتون کا تیل، ایک چائے کا چمچ سرکہ اور ایک عدد انڈا ملا کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب اسے کسی برش یا کنگھی کی مدد سے بالوں پر لگائیں تاکہ سارے بالوں پر برابر مقدار میں لگ جائے۔ تھوڑی دیر تک لگا رہنے دیں۔ پھر شیمپو سے سردھولیں۔

4 وہی کا ماسک :

انڈے کی سفیدی کو اچھی طرح پھینٹ لیں، جب تک کہ یہ جھاگ نہ بن جائے۔ اب اس میں 6 چمچ وہی شامل کر کے بالوں کا ماساج کریں۔ تقریباً پندرہ سے بیس منٹ تک لگا کر رکھیں، پھر کسی اچھے شیمپو سے سر دھو لیں۔

5 ناریل کا ماسک :

تازہ ناریل کا ایک ٹکڑا لیں اور اسے اچھی طرح پیس کر کریم بنالیں۔ اب اس کریم سے بالوں کا ماساج کریں اور گرم تولیے سے سر کو اچھی طرح لپیٹ لیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد شیمپو سے سردھولیں۔

6 میتھی کا ماسک :

مٹھی بھر میتھی کو رات بھر کے لیے پانی میں بھگو کر رکھیں۔ صبح ان بیجوں کو پانی میں پیس کر پیسٹ بنالیں۔ اب اسے بالوں پر لگائیں اور تقریباً 20 منٹ تک لگائے رکھیں، پھر شیمپو سے بالوں کو دھو لیں۔

